ستمبر 2013
ماہنامہ
کرن
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
اس شمارے کے ساتھ
کرن کتاب
ننھے تارے
www.paksociety.com

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---- 600 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 6000 روپے

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

ستمبر 2013

جلد 36 شمارہ 6

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

کرن کا ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

پاکستان کی تاریخ میں ماہِ ستمبر ایک اَن مٹ موڑ کی یاد تازہ کرتا ہے جب بزدل دشمن نے رات کی تاریکی میں وطنِ عزیز پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ پاکستانی فوج کے جیالے سپاہیوں نے اس حملے کا مقابلہ انتہائی جوش اور ولولے سے کیا اور دشمنوں کو دندان شکن جواب دیا۔ پاکستان کی مسلح افواج کے لاتعداد سپاہیوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر وطنِ عزیز کی سالمیت پر کوئی حرف نہ آنے دیا۔

پاکستان ہماری شناخت ہے۔

وطنِ عزیز کو آج بھی اندرونی و بیرونی دشمنوں کا سامنا ہے۔ ہم اپنے وطنِ عزیز کی تعمیر و ترقی کے بجائے گروہی و انفرادی مفادات کے حصول میں الجھ کر اتنے بے پروا ہو گئے ہیں کہ ہمیں اپنے وطن کے استحکام اور سالمیت کی بھی پروا نہیں رہی۔ آئیے یومِ دفاعِ پاکستان کے موقع پر ہم سب ایک ہو کر 1965ء کا جذبہ دلوں میں جگا کر یہ عہد کریں کہ ہر طرح کے تعصبات سے بالاتر ہو کر وطن کے اندرونی و بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کریں گے اور وطنِ عزیز کی حفاظت دل و جان سے کریں گے۔

اس شمارے میں،

- بھی جعفری سے شاہین رشید کی ملاقات،
- "میری بھی سنیے" میں جگن کاظم قارئین کے روبرو،
- "آواز کی دنیا سے" میں اپنا کراچی FM 107 کے آر جے "سید جاسم علی" کی باتیں،
- "مقابل ہے آئینہ" میں اس ماہ ثمینہ اکرم مقابل ہیں،
- فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول "دستِ کوزہ گر"،
- فاخرہ گل کا طویل مکمل ناول "میرے ہمنوا کو خبر کرو"،
- "شوقِ شہادت"، رفاقت جاوید کی تحریر،
- "چل دیے اس راہ"، نوشین سرور کا مکمل ناول،
- شازیہ جمال نیر کا مکمل ناول "خوابوں کا جہاں"،
- "اے وطن تیرے لیے"، حیا بخاری کا دلچسپ ناولٹ،
- "وہ اک پری ہے"، ریحانہ امجد بخاری کا ناولٹ،
- فرح طاہر قریشی کا ناولٹ "یہ زندگی"،
- نسرین خالد، شہناز رانا، رابعہ افتخار اور اُمِّ حسن کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

مفت،

بچوں کی نگہداشت پر مشتمل معلوماتی کرن کتاب "ننھے تارے"، کرن کے ہر شمارے کے ساتھ مفت پیش خدمت ہے۔ استفادہ کریں۔

حمد باری تعالیٰ

مالکِ دونوں جہاں
مالکِ دونوں جہاں

روز و شب کی خامشی
سب کی سب تجھ پر عیاں

تُو کہ ذرّہ میں نہاں
تو امینِ آسماں

مالکِ دونوں جہاں
یہ مصیبت کے لمحے

جانگسل سے مرحلے
اور میں سورج تلے

صرف تیرا سائباں
مالکِ دونوں جہاں

کرن سید

نعت رسول مقبول

ہر وقت تصوّر میں مدینے کی گلی ہے
اب در بدری ہے نہ غریب الوطنی ہے

وہ شمعِ حرم جس سے منوّر ہے مدینہ
کعبے کی قسم رونقِ کعبہ بھی وہی ہے

اس شہر میں بک جاتے ہیں خود آکے خریدار
یہ مصر کا بازار نہیں شہرِ نبیؐ ہے

اس ارضِ مقدس پہ ذرا دیکھ کے چلنا
اے قافلے والو یہ مدینے کی گلی ہے

نظروں کو جھکائے ہوئے خاموش گزر جاؤ
بے تاب نگاہی بھی یہاں بے ادبی ہے

اقبال عظیم

عینی جعفری سے ملاقات

شاہین رشید

اسکرپٹ اچھا ہو' مکالمے جاندار ہوں تو پھر فنکار کا فن نکھر کر سامنے آتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل حسینہ معین کا سیریل "مایا میری بہن" اسکرین پہ آیا اور ناظرین نے نہ صرف حسینہ معین کو خوش آمدید کہا بلکہ اس سیریل کو بہت شوق سے دیکھا بھی بلاشبہ ڈرامہ بہترین تھا اور اس میں سب سے مشکل رول "مایا" کا تھا جسے عینی جعفری نے نبھایا اور خوب نبھایا کہ اب یہ سیریل بھی ان کی یادگار سیریلز میں شمار ہوگا۔

آج کل آپ انہیں "اسیرزادی" میں دیکھ رہے ہیں۔ عینی کم کام کرتی ہیں مگر بہت دل لگا کر۔۔۔ اردو نہیں آتی مگر ڈرامے میں اردو ایسے بولتی ہیں جیسے بہت مہارت ہو اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنے کردار پر بہت محنت کرتی ہیں۔

★ "کیسی ہیں عینی اور کیا رسپانس ملتا ہے جب آپ کوئی ڈرامہ کرتی ہیں؟"

✳ "بہت اچھا رسپانس ملتا ہے۔ جب میں نے ڈرامہ سیریل "ڈریمر" کیا تھا تب بھی لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔ مگر "مایا میری بہن" میں تو بہت زیادہ ہی میری پرفارمنس کو پسند کیا گیا۔ حقیقت ہے کہ لوگوں نے مجھے اس سیریل سے ہی ٹھیک طرح سے پہچانا ہے اور میں آج بھی کہیں جاتی ہوں تو لوگ مجھے میرے اصلی نام کی بجائے مایا ہی کہہ کر بلا رہے ہوتے ہیں۔"

★ "اس رول کے لیے آپ کا انتخاب ہوا تھا یا نیلم منیر والا کردار ملا تھا؟"

✳ "اس کے لیے ہی یعنی "مایا" کے رول کے لیے ہی میرا انتخاب ہوا تھا اور اقبال انصاری نے ہی میرا انتخاب کیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی فنکارہ ہو جو بہت زیادہ مشہور نہ ہو یا پھر بالکل نئی ہو' تو مجھے بلایا گیا اس سیریل کے لیے کیونکہ میں نے زیادہ ڈرامے نہیں کیے تھے اور میں دوسروں کی بہ نسبت اس فیلڈ میں نئی اور فریش تھی۔ لیکن مجھ سے پہلے انہوں نے آڈیشن بھی لیا کہ ان کی نظر میں یہ رول مشکل تھا مگر پھر انتخاب میرا ہی ہوا۔"

★ "یہ تو ایک ڈرامہ تھا لیکن اصل زندگی میں ایسا ہو تا کہ آپ کو پتا چلتا کہ آپ اپنے والدین کی سگی اولاد نہیں ہیں تو کیا ری ایکشن ہوتا آپ کا؟"

✳ "دکھ اور تکلیف تو اپنی جگہ ہوتی ہی لیکن آپ نے دیکھا ہو گا کہ لڑکی کو بہت اسٹرونگ دکھایا کہ وہ اپنا حق کسی کو لینے نہیں دیتی تو میں بھی اپنے حق پہ قائم رہتی اور لے کر رہتی۔ ناانصافی تو مجھ سے برداشت ہی نہیں ہوتی۔"

★ "اس سیریل کے بعد تو بہت آفرز آئی ہوں گی تو کیا کیا پروجیکٹس ہیں؟"

✳ "ماشاء اللہ سے بہت آفرز آئی ہیں اور آج کل بھی "مومل پروڈکشن" کے لیے ایک سیریل کر رہی ہوں ان کے ساتھ میرا پہلا سیریل ہو گا اور اس کے بعد کوئی دوسرا سیریل سائن کروں گی۔ کیونکہ میں ایک وقت میں ایک ہی سیریل کرتی ہوں مجھے اچھا نہیں لگتا کہ چار چار سیریلز میں ٹانگ پھنسائے رہوں اور ایسا میں اس لیے کرتی ہوں کہ بندہ ایک کرے مگر پوری توجہ کے ساتھ کرے۔ پورے موڈ کے ساتھ کرے اور جو سیریل کر رہی ہوں اس کا نام "اسیرزادی" ہے اور ہمایوں سعید ایک فلم بنا رہے ہیں "میں ہوں شاہد آفریدی" اس میں بھی میں ہوں۔ یہ تقریباً" مکمل ہے اور بہت ممکن ہے کہ جب میرا یہ انٹرویو شائع ہو وہ فلم ریلیز ہو چکی ہو۔ ان کے علاوہ کمرشلز شوٹس تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ جیسے لان کے شوٹس ہو گئے' موبائل فون کے شوٹس ہو گئے اور اسیرزادی جس کا میں نے ذکر کیا ہے بہت ممکن ہے کہ یہ رمضان المبارک یا اس کے فوراً" بعد آن ایئر ہو جائے۔"

★ "کیٹ واک یا ریمپ پہ بھی ماڈلنگ کرتی ہیں؟"

✳ "نہیں جی میں صرف کمرشلز کرتی ہوں۔ میگزین کمرشلز بھی کرتی ہوں جیسے کسی کا فیشن شوٹس ہو گیا تو ماشاء اللہ کافی مصروف رہتی ہوں۔ کمرشلز کا کافی کام ہوتا ہے میرا۔"

★ "یعنی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں کام ہی کام اور پیسہ ہی پیسہ؟"

✳ "بس جی اللہ کا بڑا کرم ہے اور میری کوشش ہوتی ہے کہ پرسنل لائف اور پروفیشنل لائف کو بیلنس کر کے چلوں۔"

★ "اچھا گڈ۔۔۔ کچھ بتائیں پرسنل لائف کے بارے

میں اور کون کون اس فیلڈ میں ہے؟"

* "میرا پورا نام قرۃ العین جعفری ہے اور سب پیار سے عینی کہتے ہیں ظاہر ہے کہ اب اتنا لمبا نام تو کوئی لے نہیں سکتا۔ 9 جون کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ کینیڈا سے اپنی تعلیم مکمل کی اور میری دو چھوٹی بہنیں ہیں اور آپ نے "مہر جعفری" کا نام تو سنا ہی ہوگا وہ ——— چھوٹی ہے اس نے فلم "لمحے" پروڈیوس کی ہے اور اس فلم کو نیویارک میں ایوارڈز بھی ملے ہیں بہترین اداکاری پہ آمنہ شیخ کو اور بہترین فلم پروڈیوسر کا مہر کو۔ تو وہ اس فیلڈ میں ماشاءاللہ بہت نمایاں ہے اور مہر سے جو چھوٹی ہے وہ فی الحال ایک ادارے میں انٹرنشپ کر رہی ہے اور شادی کا سلسلہ اللہ پر چھوڑا ہوا ہے جب وہ بہتر سمجھے گا شادی بھی ہو ہی جائے گی اور میں لو اور ارینج دونوں پر یقین نہیں رکھتی کیونکہ شادی لو اور ارینج سے نہیں چلتی انڈر اسٹینڈنگ سے چلتی ہے۔"

★ "آگے کیا کرنا ہے اس فیلڈ میں اور اس فیلڈ میں آمد کیسے ہوئی؟"

* "ابھی تو ویسے ہی بہت مصروف ہوں اور آگے کی پلاننگ نہیں کی ہے اور نہ ہی کرتی ہوں۔ بس جو ہو رہا ہے اچھا ہی ہو رہا ہے اور اس فیلڈ میں کیسے آئی تو اس کا جواب کچھ یوں ہے کہ مجھے اداکاری کا بہت شوق تھا ہمیشہ سے اور کم عمری میں تھیٹر پہ بھی پرفارم کر چکی ہوں مگر اداکاری میں آنے کی اجازت دیر سے ملی کیونکہ میرے والدین نے کہہ دیا تھا کہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو پھر اداکاری میں آنا تو بس اس لیے تھوڑی دیر میں آئی۔"

★ "آپ کی خالہ "عذرا محی الدین" اس فیلڈ سے وابستہ ہیں فیلڈ میں آنے کے لیے ان سے بھی کچھ مدد ملی؟"

* "بالکل جی بالکل...... وہ اس فیلڈ میں ہیں تو مجھے آسانی ہوئی اس فیلڈ میں آنے کی انہوں نے مختلف لوگوں سے مجھے ملوایا میرے بارے میں بتایا میری ایک دوست فرح کریم پروڈیوسر تھی تو اس نے "زپ" سیریل میں کام دلوایا تھا تو ڈرامہ سیریل "زپ" اور "ڈر ہمر" تقریباً ایک ساتھ چلے تھے اور پھر کچھ کمرشلز بھی ملنا شروع ہو گئے تو کمرشلز بھی آن ایئر ہوئے۔"

★ "کیسی لگ رہی ہے شوبز کی دنیا...... سب اچھا ہے یا کچھ برا بھی ہے؟"

* "بہت اچھی لگ رہی ہے یہ فیلڈ اور بہت انجوائے کر رہی ہوں اور میرے ساتھ فی الحال ایسی کوئی بات نہیں ہوئی کہ میں اس فیلڈ کو برا کہوں۔ ابھی تک تو سب اچھا ہی اچھا ہے۔"

★ "آپ سمجھتی ہیں کہ آپ اس فیلڈ کے لیے ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہیں؟"

* "پرفیکٹ تو کوئی بھی انسان نہیں ہوتا، تھوڑی بہت کمی تو ہوتی ہی ہے اور کام کے لحاظ سے تو مجھے لگتا ہے کہ میں پرفیکٹ ہوں۔ ہر لحاظ سے ہر طرح کے رول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ بس تھوڑی سی کمی یہ لگتی ہے کہ میری ہائیٹ چھوٹی ہے مجھے تھوڑا لمبا ہونا چاہیے تھا۔"

★ "آپ نے کینیڈا سے تعلیم حاصل کی دل نہیں چاہا وہاں مستقل قیام کو؟"

* "شاید آپ کو معلوم نہیں ہے، میں کینیڈا کی شہری بھی ہوں اس لیے جب دل چاہے وہاں جا کر مستقل قیام کر سکتی ہوں تو میں کینیڈا اور سنگاپور میں بالترتیب 9 سال اور 8 سال رہ چکی ہوں اور اب پاکستان میں ہوں باہر کی دنیا میں، میں نے دیکھا ہے کہ ہم آرام سے آزادی کے ساتھ سڑکوں پر چل سکتے ہیں، لائف کو انجوائے کر سکتے ہیں۔ جبکہ پاکستان میں خاص طور پر کراچی میں ہم اپنی زندگی کو بالکل بھی انجوائے نہیں کر سکتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب یہاں اتنے پرابلمز ہیں تو پھر پاکستان میں رہنے کی کیا وجہ ہے تو میں یہی جواب دیتی ہوں کہ میری فیملی یہاں ہے اور پھر میرا کام بھی یہیں ہے۔"

★ "اس فیلڈ میں مشکل کیا ہے؟"

* "کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اگر آپ کو اپنے کام سے دلچسپی ہے تو پھر کام کام نہیں رہتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ اپنی جاب پہ جاتے ہیں تو بہت اکتائے اکتائے سے رہتے ہیں کہ ہائے کام کرنا پڑے گا۔ مگر میں ایسا نہیں سوچتی کیونکہ مجھے کام شوق اور دلچسپی کے ساتھ کرنا اچھا لگتا ہے۔"

★ "کردار کون سے پسند ہیں اور جو کر چکی ہیں اس میں کون سا پسند ہے؟"

* "کافی کردار ہیں جو میں کرنا چاہتی ہوں جیسے فیری ٹیل کا کوئی کردار ہو تو وہ بھی میں کرنا چاہوں گی اور اگر کوئی بہت ہی مزے دار Horror فلم بن رہی ہو تو اس کا کردار کرنے میں بہت مزا آئے گا ویمپائر ——— کا کردار کرنا چاہوں گی اور اسی طرح مدر ٹریسا یا بے نظیر بھٹو یا کسی بھی مشہور خاتون کی زندگی پر کوئی فلم بن رہی ہو تو اس کا لیڈنگ رول کرنے کی خواہش ہے۔ بس میں چاہتی ہوں کہ اسٹرونگ عورت کا کردار ہو جو میں کروں اور اب تک جو کردار کر چکی ہوں اس میں "مایا" کا کردار میرا یادگار کردار تھا اور اب "اسیر زادی" کا کردار ایک بہترین رول ہوگا۔ پھر فلم "میں ہوں شاہد آفریدی" میں بھی میرا رول اچھا ہے۔"

★ "ڈراموں کے کردار چلتے پھرتے لوگوں کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں کیا اور کبھی ایسا کردار کیا کہ سوچا ہو کہ میں بھی تو ایسی ہی ہوں؟"

* "جو بھی کردار ڈراموں میں دکھائے جا رہے ہوتے ہیں وہ چلتے پھرتے انسانوں کے ہی کردار ہوتے ہیں اور میرے خیال سے ان سے متاثر ہو کر ہی رائٹر اسٹوری لکھتا ہے اور میں نے ابھی تک ایسا کردار نہیں کیا کہ جس کے لیے میں کہہ سکوں کہ یہ میری زندگی کے قریب ہے یا میں ایسی ہوں۔ تھوڑی تھوڑی

باتیں تو مل سکتی ہیں مگر زیادہ نہیں' جیسے "مایا" میں کچھ کچھ کوالیٹیز ایسی تھیں جو مجھ میں بھی تھیں۔ کردار وہ ہی اچھے ہوتے ہیں جو آپ کی زندگی کے برعکس ہوں۔"

★ "ڈراموں کے علاوہ کبھی مارننگ شو ہوسٹ کرنے کا شوق ہوا؟"

✲ "میں مارننگ شو میں شرکت نہیں کرتی' آپ ہوسٹ کرنے کی بات کر رہی ہیں۔ ہاں میرا کوئی کام ہو یا کوئی سیریل آن ایئر ہونے والا ہو اور ٹیم کو بلایا ہو تو چلی جاتی ہوں ورنہ تو نہیں جاتی اور ہوسٹنگ کا تو سوچ بھی نہیں سکتی۔"

★ "لوگ کہتے ہوں گے کہ مغرور ہے۔ آتی نہیں ۔۔۔ ویسے احساس ہوتا ہے کہ میں بڑی آرٹسٹ بن گئی ہوں۔ مجھے لوگوں سے دور رہنا چاہیے تھوڑا سا؟"

✲ "نہیں مجھے لوگ ایسا کچھ نہیں کہتے' کیونکہ میں ہر ایک سے بہت اچھی طرح ملتی ہوں اور مغرور کیوں ہوں گی میں بھی سب کی طرح ہی ایک انسان ہوں۔ لیکن میں نے لوگوں میں دیکھا ہے کہ تھوڑی سی بھی شہرت ملتی ہے تو ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے جبکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ ضروری ہے کہ آپ اس جگہ کو بھی یاد رکھیں جہاں سے آپ آئے ہیں۔"

★ "اپنے ڈرامے دیکھتی ہیں؟"

✲ "ہاں جی کبھی کبھار دیکھ لیتی ہوں اس لیے نہیں دیکھتی کہ میں نے کام کیا ہوا ہوتا ہے۔ بلکہ اس لیے دیکھتی ہوں کہ اپنی غلطیوں کو نوٹ کر کے آئندہ نہ دہرانے کا عہد کروں اور باقاعدہ ٹی وی پہ نہیں دیکھتی بلکہ ٹائم ہوتا ہے تو پھر کمپیوٹر پہ دیکھ لیتی ہوں۔"

★ "سب تعریف کرتے ہیں؟ کبھی کسی نے کہا کہ یوں نہیں یوں کرنا چاہیے تھا؟ ۔۔۔ مطلب اچھائی برائی؟"

✲ "بھئی لوگ اب صاف گو ہو گئے ہیں' اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہتے ہیں۔ اگر میری تعریف کرتے ہیں تو مجھے میری برائیاں یا غلطیاں بھی بتاتے ہیں۔ اور دوست رشتے دار زیادہ تنقید کرتے ہیں اور اچھا کرتے ہیں' مگر دیگر لوگ زیادہ تر تعریف ہی کرتے ہیں اور آپ کو پتا ہے تعریف سے دل تو خوش ہو جاتا ہے مگر کچھ سیکھنے سمجھنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس لیے مجھے پوزیٹو وے میں تنقید اچھی لگتی ہے۔"

★ "ہمارے ہاں کوئی کام اپنے وقت پر نہیں ہوتا۔ آپ کے خیال میں لوگ کن کاموں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟"

✲ "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ' ہم ادھر ادھر کی باتوں میں اپنا وقت بہت ضائع کر دیتے ہیں۔ پھر یہ کہ دوسرے لوگ ہمارے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں' سوسائٹی ہمارے بارے میں کیا سوچ رہی ہے پھر دوسروں کے بارے میں باتیں کرنا' برائیاں کرنا' چغلیاں کرنا وغیرہ وغیرہ۔۔۔ بس ان باتوں میں ہم سب ہی اپنا وقت بہت ضائع کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے اور دوسروں کی زندگی میں جھانکنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔"

★ "آج کل عبایا پہننے کا بہت رواج چل پڑا ہے۔ لڑکیاں بہت خوب صورت عبائے' پہنتی ہیں۔ آپ کے خیال میں یہ فیشن ہے یا ضرورت؟"

✲ "میرا تو خیال ہے کہ نہ فیشن ہے اور نہ ہی ضرورت ہے۔ لیکن جو خواتین یا لڑکیاں حجاب کرتی ہیں یا عبائے پہنتی ہیں ان کے لیے اچھا ہے لیکن میرا نہیں خیال کہ یہ ضروری ہے انسان ویسے ہی اپنے اچھے حلیے میں رہے تو اسے کسی حجاب یا عبائے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو اس کو فیشن بھی نہیں کہوں گی۔"

★ "اپنی شاپنگ کہاں سے کرتی ہیں؟"

✲ "چونکہ ہم کراچی میں رہتے ہیں اور کراچی سے قریب ترین دبئی ہے تو میں اپنی شاپنگ کے لیے دبئی ہی جاتی ہوں لیکن سب تو دبئی نہیں جا سکتے لیکن جو جا سکتے ہیں وہ دبئی سے ہی شاپنگ کیا کریں اور ویسے اگر دیکھا جائے تو ڈالمن مال فورم اور سنڈے بازار سے شاپنگ کرنے میں مجھے مزا آتا ہے اور سنڈے بازار سے تو بڑی

عجیب عجیب اور بہترین چیزیں بھی مل جاتی ہیں۔"

★ "کسی بھی ڈرامے کا کوئی سین جو مشکل سے ہوا ہو بہت ری ٹیکس کے بعد؟"

✲ "چونکہ ابھی تک لوگوں کے ذہنوں میں "مایا" سیریل ہے تو اس لیے اس کے حوالے سے بات کروں گی۔ ایک سین تھا جس میں جاوید شیخ جو میرے والد کا رول کر رہے تھے' بہت بیمار ہوتے ہیں تو اس سین کے لیے ری ایکشن دینا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اکثر سین ایسے ہوتے ہیں جو کرتے وقت ذہن میں آجاتے ہیں۔ جیسے ڈانٹ مار جو کہ بچپن میں ہم کھا چکے ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ فیملی میں یا قریب میں کسی کو مرتے ہوئے یا شدید بیمار نہیں دیکھا تو ایسی فیلنگز بھی نہیں آرہی تھیں تو بس اس سین میں مشکل ہوئی تھی اور کچھ سین ایسے تھے کہ جس میں سچ سچ رونا آگیا تھا۔"

★ "فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔ پاکستان میں تو فلمیں بنتی نہیں تو پڑوس میں جائیں گی؟"

✲ "میں کبھی بالی ووڈ جا کر کام نہیں کروں گی کیونکہ مجھے چھوٹے چھوٹے کپڑے پہن کر ڈانس کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے اور نہ ہی مجھے گھر سے اجازت ملے گی اور نہ ہی لالی ووڈ کی فلمیں کروں گی جس میں عجیب عجیب سے کپڑے پہننے پڑتے ہیں اور ڈانس بھی بہت ہی غلط قسم کے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر رول اور خدا کے لیے اور اب "میں ہوں شاہد آفریدی" جیسی فلمیں بنیں گی تو میں ضرور کام کروں گی ۔۔۔ لیکن چونکہ یہاں اچھی فلمیں بننے کا چانس ہی نہیں ہے تو میں صرف ڈراموں پر ہی توجہ دوں گی۔ رومینٹک رول کرنا بھی پسند ہیں کیونکہ رومینس بھی زندگی کا ایک حصہ ہے۔"

★ "والد کیا کرتے ہیں اور زیادہ تر ملک سے باہر رہنے کی وجہ؟"

✲ "میرے والد بینکر ہیں میری پیدائش سے پہلے والدین سنگاپور میں رہتے تھے کچھ عرصہ سعودی عرب میں بھی گزارا میں جب گیارہ سال کی تھی تو پاکستان آ گئی تھی میں نے "او" اور "اے" لیول پاکستان سے کیا اور پھر Megill یونیورسٹی مانٹریال کینیڈا سے گریجویشن کیا اور زیادہ تر ملک سے باہر رہنے کی وجہ والدین ہیں کیونکہ جہاں وہ ہوں گے وہاں میں ہوں گی۔"

★ "فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟"

✲ "مجھے فلمیں دیکھنے کا بہت شوق ہے چاہے وہ انگریزی ہوں یا انڈین پاکستانی اردو فلمیں اور میوزک سے بہت دلچسپی ہے خود بھی گاتی ہوں باقاعدہ سیکھ بھی رہی ہوں اور شاید آپ بہت جلد بہ حیثیت گلوکارہ کے بھی مجھے اسکرین پہ دیکھیں گے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عینی جعفری سے اجازت لی۔

✲ ✲

جگن کاظم

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"مہربانو۔"

2 "شوبز کا نام؟"
"جگن کاظم۔"

3 "پیار کا نام؟"
"کوئی نہیں جبکہ میرا دل چاہتا ہے کہ لوگ مجھے مہربانو کہہ کر پکارا کریں۔"

4 "تاریخ پیدائش/شہر؟"
"7جنوری1981ء/لاہور۔"

5 "قد/اسٹار؟"
"قد تو کبھی ناپا نہیں 5فٹ سے تو زیادہ ہی ہے اور اسٹار کیپری کورن ہے اور میرے خیال میں جتنے بھی آرٹسٹک مائنڈ کے لوگ ہیں ان کا اسٹار یہی ہوتا ہے۔"

6 "بہن بھائی/میرا نمبر؟"
"تین بہن بھائی ہیں۔ بڑی بہن اور ایک چھوٹا بھائی میرا نمبر دوسرا ہے۔"

7 "تعلیمی قابلیت؟"
"گریجویٹ ہوں سوشیالوجی میں اور ڈپلومہ لیا ہے میڈیا ٹیکنو کلچر میں اور تمام تعلیم کینیڈا سے حاصل کی اور اب سائیکلوجی میں ماسٹرز کرنا چاہتی ہوں۔"

8 "شادی؟"
"پہلی شادی کے بارے میں تو سب کو پتا ہے جو کامیاب نہیں ہوئی ماشاء اللہ ایک بیٹا ہے جس کا نام حمزہ ہے۔ اب عنقریب شادی کرنے کا ارادہ ہے۔ (اب ہو چکی ہے)۔"

9 "میرا مشن ہے کہ؟"
"میرا مشن ہے کہ ایک ایسا ادارہ بناؤں جہاں ایسی خواتین کو تحفظ دوں جن کے گھر والے جیسے بھائی یا والد ان کے شوہر اور دیگر لوگ تشدد بھی کرتے ہیں اور ان کی حق تلفی بھی کرتے ہیں۔ انہیں نہ صرف تحفظ ملے گا بلکہ ہم ان کے لیے روزگار کے مواقع بھی فراہم کریں گے۔"

10 "زندگی کب مکمل ہوئی؟"
"جب میرا بیٹا حمزہ پیدا ہوا۔"

11 "اسکینڈل بنا؟"
"نہیں۔۔۔ الحمد للہ کوئی اسکینڈل نہیں بنا۔ انسان خود اچھا ہو اور خود اعتمادی اور ایمانداری کے ساتھ کام کرے اور سب کو عزت دے تو کبھی اسکینڈل نہیں بن سکتا۔"

12 "میرا لکی نمبر؟"
"میں دو لکی نمبرز کا ذکر کروں گی۔ ایک میرا اپنا نمبر 7 کہ اس تاریخ کو میں پیدا ہوئی اور دوسرا 23 کہ اس تاریخ کو میرا بیٹا پیدا ہوا۔"

13 "عشق کیا ہے؟"
"وہ جنونی کیفیت ہے جو کسی کے لیے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ جیسے خدا سے عشق اور جیسے بیٹے سے عشق یا کسی سے بھی عشق میں انسان ٹوٹ کر سامنے والے کو چاہتا ہے۔ میں اپنے بیٹے سے جنون کی حد تک عشق کرتی ہوں اور عشق بار بار نہیں ہوتا۔"

14 "میں مزاجاً کیسی ہوں؟"
"بہت بااخلاق ہنس مکھ مگر غصے کی بھی تیز ہوں۔"

15 "آج کل کی مصروفیات؟"
"مارننگ شو کر رہی ہوں اداکاری کر رہی ہوں اور ساتھ ہی ماڈلنگ بھی کر رہی ہوں۔"

16 "کس کے کہنے پر شوبز چھوڑ سکتی ہوں؟"
"اپنے بیٹے کے کہنے پر۔۔۔ اس کی تو میں کوئی بات ٹال ہی نہیں سکتی۔"

17 "ملک سے باہر رہی مگر پھر بھی؟"
"مگر پھر بھی دل ہے پاکستانی۔ میں سمجھتی ہوں کہ پاکستان سے اچھا کوئی ملک ہو ہی نہیں سکتا اور میں باہر کون سا رہنے گئی تھی پڑھنے ہی تو گئی تھی۔"

18 "کیا کشش شوبز میں لے کر آئی؟"
"اداکاری کا جنون پیسہ نہیں کیونکہ پیسہ ہمیشہ سے ہی بہت رہا ہے۔"

19 "میں بچپن سے خواب دیکھتی تھی؟"
"کہ میں شوبز میں آؤں اور ایک اچھی اداکارہ بنوں جبکہ گھر والے راضی نہیں تھے۔ بہت ضد اور لڑائی

کے بعد اس فیلڈ میں آنے کی اجازت ملی۔"

20 "فیوچر پلاننگ؟"

"ایک تو میں نے بتایا کہ فلاحی ادارہ کھولنا چاہتی ہوں اور دوسری پلاننگ ڈائریکشن کی طرف آنا چاہتی ہوں اور ڈراما ڈائریکٹر بننا چاہتی ہوں۔"

21 "مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے؟"

"رومینس.... بہت زیادہ رومانٹک مزاج ہوں اور میں تو خواب بھی رومینٹک ہی دیکھتی ہوں۔"

22 "مجھے خوشی ہوتی ہے؟"

"جب لوگ مجھے پہچان کر میرے قریب آتے ہیں اور مجھ سے آٹوگراف لیتے ہیں اور میری تعریف کرتے ہیں۔"

23 "میں انجوائے کرتی ہوں؟"

"میوزک سے مجھے رومانٹک گانے پسند ہیں۔ مجھے غزلیں اور گیت بہت پسند ہیں مجھے خود بھی گانے کا شوق ہے مگر مجھ میں صلاحیت نہیں ہے۔"

24 "مطالعہ کتنا ضروری ہے؟"

"بہت ضروری ہے اور مجھے تو نا صرف مطالعہ کا شوق ہے بلکہ مجھے لکھنے کا بھی شوق ہے اور میں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے جو کہ ان شاءاللہ جلد شائع ہو گی اور چونکہ میری زندگی میں چار خواتین ایسی آئی ہیں جنھوں نے میری زندگی بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے تو یہ کتاب انہی پر لکھی ہے میں نے۔"

25 "میں خواب دیکھتی ہوں؟"

"ہاں.... میں خواب دیکھتی ہوں۔ مگر سوتے میں نہیں، بلکہ جاگتے میں دیکھتی ہوں اور جو خواب دیکھتی ہوں اسے پورا بھی کرنے کی کوشش کرتی ہوں ان کو حقیقت کا رنگ دینے میں لگ جاتی ہوں۔"

26 "اگر شوبز میں نہ ہوتی تو؟"

"تو پھر میں ایک اچھی شیف ہوتی کیونکہ مجھے کچن سے لگاؤ ہے اور میں بہت اچھی کوکنگ کرتی ہوں۔"

27 "اب تک کیا کیا کر چکی ہوں؟"

"کافی کچھ کر چکی ہوں۔ کافی تعداد میں ڈرامے کیے۔ مارننگ شو کے علاوہ دیگر شوز بھی کیے.... شہزاد رائے، میکال ذوالفقار اور جل کے ساتھ ان کی ویڈیوز میں ماڈلنگ بھی کی ہے۔"

28 "کھانے میں میری پسندیدہ چیزیں؟"

"دال چاول، چائنیز نہاری اور ہر چیز کے ساتھ اچار لازمی ہونا چاہیے تب ہی تو کھانے کا مزا ہے۔"

29 "میں کہلوانا چاہتی ہوں کہ؟"

"کہ جگن ایک بہت اچھی ماں ہے، جو اپنے بیٹے کی بہترین تربیت کر رہی ہے۔"

30 "ٹی وی پہ آمد کس عمر میں ہوئی؟"

"ساڑھے چار سال کی عمر میں اور پہلا کمرشل کیا تھا اور اس کمرشل کے تقریباً" چھ ماہ بعد ایک اور کمرشل کی آفر آ گئی تھی۔"

31 "میں برا مان جاتی ہوں؟"

"جب کوئی یہ کہتا ہے کہ جگن کاظم بہت منہ پھٹ ہے، جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہے۔ اصل میں سچ لوگوں کو برداشت نہیں ہوتا اور میں بولے بغیر رہ نہیں سکتی۔"

32 "تہوار جو شوق سے مناتی ہوں؟"

"مذہبی تہوار تو سب ہی مناتے ہیں لیکن اگر آپ پرسنل تہوار کی بات کریں تو مجھے اپنے بیٹے کا برتھ ڈے اور اپنی ماں کا برتھ ڈے منانا بہت اچھا لگتا ہے۔"

33 "پسندیدہ چینلز؟"

"مجھے ہم اور پی ٹی وی بہت پسند ہیں۔ پی ٹی وی پہ تو آپ آج کل میرا مارننگ شو دیکھ ہی رہے ہوں گے اور ہم کے ڈرامے بہت اچھے ہوتے ہیں۔"

34 "مجھے افسوس ہوتا ہے کہ؟"

"کہ میں نے اس فیلڈ میں آنے میں دیر کیوں کر دی اگر میں پڑھائی کے لیے کینیڈا نہ جاتی تو بہت پہلے اس فیلڈ میں آ چکی ہوتی۔"

35 "موڈ خراب ہو جاتا ہے؟"

"اگر کوئی کام وقت پر نہ ہو رہا ہو۔ کیونکہ میں اپنے کام میں بہت پنکچوئل ہوں اور کام کا شیڈول دو تین دن پہلے ہی بنا لیتی ہوں اگر اس کے مطابق کام نہ ہو رہا ہو تو پھر زبردست موڈ خراب ہو جاتا ہے۔"

36 "ایک بات جس کا میں خاص خیال رکھتی ہوں"

"میں لباس کے معاملے میں بہت خیال رکھتی ہوں۔ ڈرامے میں مجبوری کے تحت کبھی کبھار بغیر آستین کے کپڑے پہن لیتی ہوں جبکہ عام زندگی میں کبھی نہیں پہنتی اور نہ ہی زرق برق بھڑکیلے کپڑے پہنتی ہوں۔"

37 "شہرت نے شخصیت کو بگاڑا؟"

"ہاں بگاڑا ہے تھوڑی بدمزاج اور چڑچڑی ہو گئی ہوں۔ اب ہجوم میں جانے کو زیادہ دل نہیں چاہتا۔"

38 "مرد کب برے لگتے ہیں؟"

"وہ مرد جو اچھا لگنے کے لیے میک اپ کرتے ہیں مگر اپنا جسم صاف نہیں کرتے اکثر ان کے جسم سے اور منہ سے بو آ رہی ہوتی ہے۔"

39 "زندگی کا ایک بہترین سال؟"

"2006ء جب میرا بیٹا حمزہ پیدا ہوا۔"

40 "سیاست سے میرا لگاؤ؟"

"کوئی خاص نہیں بلکہ میرا تو دل چاہتا ہے کہ پتا نہیں میں ان کرپٹ سیاست دانوں کے ساتھ کیا سلوک کروں کہ یہ سدھر جائیں۔ اپنا پیٹ بھرتے ہیں مگر اپنے عوام کے لیے کچھ بھی نہیں کرتے۔"

41 "ایک راز جو کم لوگوں کو معلوم ہے؟"

"اب اگر جواب دے دوں گی تو راز کہاں رہے گا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ میں ایک بہت اچھی کک بھی ہوں۔"

42 "پیاس کے وقت پسندیدہ مشروب؟"

"پانی اور اورنج جوس۔"

43 "کھانا نہیں کھاتی جب تک؟"

"ٹیبل پہ اچار سرکے میں ڈوبی ہوئی ہری مرچیں اور رائتہ نہ ہو۔"

44 "والدین کی نصیحتیں جو بھول نہیں سکتی؟"

"ہمیشہ سچ بولنا چاہیے کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو رہا ہو۔ اور اپنے لیے جو پسند کرنا وہ دوسروں کے لیے بھی پسند کرنا اور یہ نصیحتیں میرے بہت کام آ رہی ہیں۔"

45 "اغوا کرنا چاہتی ہوں؟"

"شبانہ اعظمیٰ کو اور ان سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ زندگی میں اتنی کامیابیاں آپ نے کیسے حاصل کیں۔ مجھے بھی طریقہ بتائیں۔"

46 "شادی کی پسندیدہ رسمیں؟"

"مہندی کی رسم بہت پسند ہے اور جوتا چھپائی کی بہت ترس آتا ہے دولہا پہ کہ اس کی جیب خالی ہو رہی ہوتی ہے۔"

47 "مذہب سے میرا لگاؤ؟"

"جو ایک مسلمان کو ہونا چاہیے۔ مصروفیات کی وجہ سے اگرچہ پانچ وقت کی نماز نہیں پڑھ پاتی لیکن موقع ملے تو قضا پڑھ لیتی ہوں اور ظہر اور عصر کبھی قضا نہیں کرتی۔"

48 "بچپن میں اکثر لوگ کہتے تھے کہ؟"

"مجھے یاد ہے کہ اکثر بڑے بزرگ اور دیگر نماز روزے کے پابند لوگ جب مجھ سے ملتے تھے تو کہتے

تھے کہ تمہارا فیوچر بہت برائیٹ ہے اور یہ کہ تم بہت اچھی ماں ثابت ہوگی' میرا خیال ہے ایسا تو ہوا ہے۔ ماشاء اللہ مستقبل بھی روشن نظر آرہا ہے اور اپنی دانست میں ماں بھی اچھی ہوں۔"

49 "صبح اٹھتے ہی دل چاہتا ہے کہ؟"

"دانت صاف کروں.... اور ایکسرسائز کروں۔"

50 "میں حیران ہوتی ہوں؟"

"جب لوگ دوسروں کی قسمت پر رشک کرتے ہیں۔ حالانکہ ضروری نہیں کہ جو ہمیں خوش و خرم نظر آرہا ہے وہ اصل میں بھی ایسا ہی ہو۔ جیسے ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ اس طرح ہر خوش نظر آنے والا انسان خوش نہیں ہوتا۔"

51 "ایک گلوکار جس کو بہت سنتی ہوں؟"

"راحت فتح علی خان۔"

52 "اپنے مسائل شیئر کرتی ہوں؟"

"اپنی ماں سے اور اپنی خالہ ریحانہ سہگل سے۔"

53 "میں بارش انجوائے کرتی ہوں؟"

"اپنے بیٹے کے ساتھ اور دوستوں کے ساتھ۔"

54 "میرے والٹ میں ہر وقت موجود چیزیں؟"

"کسی ڈاکو نے پڑھ لیا تو مصیبت ہو جائے گی۔ کیونکہ میرے والٹ میں پیسے اور اے ٹی ایم کارڈز لازمی ہوتے ہیں۔"

55 "مجھے ڈر لگتا ہے؟"

"کیڑوں سے خاص طور پر لال بیگ سے۔ میری جان جاتی ہے اس سے۔"

56 "کیا محبت کے بغیر زندگی ادھوری ہے؟"

"بالکل ادھوری ہے محبت ہم سے بہت کچھ کرواتی ہے ہمیں جینا سکھاتی ہے محبت کا ایک رنگ نہیں ہوتا بہت رنگ ہوتے ہیں۔ ہر رنگ پیارا ہوتا ہے۔"

57 "کس کے لیے جان دے سکتی ہیں؟"

"صرف اور صرف اپنے بیٹے حمزہ کے لیے۔"

58 "میرے ہوش کا پہلا دکھ؟"

"جب میں نو سال کی تھی تو میری نانی کا انتقال ہو گیا یہ میرے لیے بہت بڑا صدمہ تھا کیونکہ نانو بہت پیار کیا کرتی تھیں۔"

59 "مجھے یاد ہے اب تک؟"

"کہ جب میں کینڈا میں تھی تو میں نے ایک فلم میں کام کیا تھا اور اس فلم سے مجھے اتنا پیسہ ملا تھا کہ میں نے ایک اپارٹمنٹ خرید لیا تھا۔"

60 "میرے فرصت کے اوقات؟"

"میرے فرصت کے اوقات اپنے بیٹے کے ساتھ گزرتے ہیں اور اگر کوئی یہ کہے کہ آپ کو فرصت کیسی مل جاتی ہے اتنا کام کر کے.... تو حقیقت یہ ہے کہ میں ایک وقت میں ایک ہی کام کرتی ہوں۔ اس لیے ٹائم نکالنا میرے لیے مشکل نہیں ہے۔"

61 "میں کبھی شک نہیں کر سکتی؟"

"اپنی فیملی کے کسی بھی ممبر پر اور اپنی خالہ ریحانہ سہگل پر۔"

62 "ایک کردار جو میں کرنا چاہتی ہوں؟"

"ذہنی مریضہ کا کردار کرنا چاہتی ہوں۔ ایسے کرداروں میں پرفارمنس کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔"

63 "مجھے غصہ آتا ہے؟"

"جھوٹے' مکار اور کمینے لوگوں پر اور کنجوس لوگوں پر بھی۔"

64 "میری پہلی کمائی؟"

"14 سال کی عمر میں پی ٹی وی سے ایک شو کیا تھا اس شو کو کرنے کے مجھے 8 ہزار روپے ملے تھے جو کہ میرے لیے بہت بڑی رقم تھی۔"

65 "ایک بات جو کہنا چاہتی ہوں؟"

"ہمیشہ مسکرائیں لوگوں کی عزت کریں تاکہ آپ کی بھی عزت ہو۔"

☆ ☆

سید جاسم علی

شاہین رشید

جب ہم ایف ایم ٹیون کرتے ہیں تو کسی بھی آر جے کی دو باتیں ہمیں فوری طور پر متاثر کرتی ہیں۔ ایک اس کی اچھی آواز اور دوسرا اس کا انداز گفتگو اور پھر ہم محو ہو کر اس کا پروگرام سنتے چلے جاتے ہیں اور یوں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی بلکہ اس بار بھی "آواز کی دنیا" کی ایک خوب صورت آواز سے آپ کی ملاقات کروائیں گے "سید جاسم علی" ایف ایم 107 میں اپنی آواز کا جادو جگاتے ہیں۔

★ "کیسے ہیں جاسم صاحب؟"

✻ "الحمد للہ ٹھیک ٹھاک۔"

★ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

✻ "ہم لوگوں کا تعلق ہندوستان سے ہے اور ہم اردو اسپیکنگ لوگ ہیں اور والدہ کا تعلق گجرات سے اور والد کا تعلق یوپی سے ہے اور میں دبئی میں پیدا ہوا۔ والدین کی شادی 1977ء میں ہوئی تو وہ دبئی شفٹ ہو گئے اور 17 جون 1978ء میری تاریخ پیدائش ہے اور دبئی میں ہی میں نے اولیول اور پھر اے لیول تک تعلیم حاصل کی پھر امارات ایئرلائن میں ایئرپورٹ پر میں نے پانچ سال کام کیا پھر ایک گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا جس کی وجہ سے مجھے پاکستان آنا پڑا کیونکہ میرا Visa کینسل ہو گیا تھا۔ وہاں دبئی میں تعصب بہت ہے۔ دبئی میں زیادہ تعداد ہندوستانیوں کی ہے اور وہ مسلمانوں کے لیے بہت بغض رکھتے ہیں اور مسلمانوں کی کاٹ کرتے ہیں اس وجہ سے مجھے واپس پاکستان آنا پڑا۔"

★ "حالانکہ آپ کی تو پیدائش بھی وہیں کی ہے اور تعلیم بھی۔۔۔ خیر پاکستان واپسی کب ہوئی؟"

✻ "بے شک مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ شہریت نہیں دیتے' اپنے کئی اصولوں میں وہ بہت سخت ہیں خیر میں 18 فروری 2005ء کو پاکستان آگیا اور پھر میرا دبئی جانا نہیں ہوا۔ پاکستان آیا تو ابتدا میں کچھ کالز سینٹرز میں کام کیا۔ پھر پتا چلا کہ ایک ریڈیو چینل میں آڈیشن ہو رہے ہیں۔ تو اس وقت سب لوگوں نے میری بہت حوصلہ شکنی کی کہ تمہاری تو نہ آواز اچھی ہے نہ تمہیں بولنے کا سلیقہ ہے اور نہ ہی تمہارے پاس بولنے کے لیے الفاظ ہیں جو کہ ایک پریزنٹر کے پاس ہونے چاہئیں تو بہت دل برا ہوا تھا اور جناب یہ چینل تھا ایف ایم 103 ظاہر ہے میرا پہلا تجربہ تھا اور مائیک سے دوستی بھی نہیں تھی۔ لیکن شکر ہے کہ میں نے اس چیز کو نگیٹو نہیں لیا بلکہ پوزیٹو لیا اور سوچ لیا کہ کچھ نہ کچھ کر کے دکھانا ہے۔ پھر اس سال کے آخر میں معلوم ہوا کہ ایف ایم 107 میں ایک انگلش آر جے کی ضرورت ہے تو میں گیا آڈیشن دینے تو کافی لوگ تھے ان میں دو شارٹ لسٹ ہوئے اور ان میں ایک میں تھا اور ایک لڑکی تھی وہ گجراتی تھی تو اسے چانس نہیں ملا مجھے چانس مل گیا اور یوں فرسٹ جنوری 2006ء کو میں نے اپنا پہلا شو کیا تھا اور پھر اس کے بعد میں نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔"

★ "آپ دبئی کے اے لیول۔۔۔ پانچ سال کا تجربہ جاب کا تو پھر پاکستان آکر جاب کے لیے اپلائی کیوں نہیں کیا؟"

✻ "دیکھیں میں کچھ کہوں گا تو پھر یہ تعصب والی بات ہو جائے گی۔ میں فروری 2005ء میں پاکستان آیا۔ اور یہاں کراچی آکر میں نے مارچ 2005ء میں کراچی ایئرپورٹ پہ امارات ایئرلائن میں اپلائی کیا تو تین لڑکے سلیکٹ ہوئے تھے ان میں ایک میں بھی تھا اور دو لڑکے جو سوئی دھاگے کی فیکٹری سے نکل کر آئے تھے ان کے پاس کوئی تجربہ بھی نہیں تھا سول ایوی ایشن میں کام کرنے کا مگر پھر کیا ہوا یہ بیان کرنا نہیں چاہوں گا کہ پھر بات آگے سے آگے نکل جاتی ہے۔ خیر ایف ایم 107 میں 2009ء تک میں نے پروگرام کیے۔ پھر 2009ء کے دسمبر میں ہم ٹی وی والوں نے ایک چینل لانچ کیا "ہمارا ایف ایم" کے نام سے تو میں نے 21 دسمبر 2009ء کو اس ایف ایم کو جوائن کیا اور یہاں میں نے نئے طریقے سے نئے انداز سے اپنی زندگی کا آغاز کیا کیونکہ اس ایف ایم میں 'میں پروڈیوسر کے عہدے پر ہائر ہوا وائس اوور بھی کیا اور ایک پریزنٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا اور سینئرز کے ساتھ رہ کر اسکرپٹ لکھنا سیکھا کہ اگر کوئی کمرشل لکھنے کے لیے آیا ہے تو آپ اسے کس طرح لکھیں گے اور جب 2009ء میں پاکستان اور آسٹریلیا کی کرکٹ سیریز ہوئی تو اس کا پہلا اسکرپٹ میں نے لکھا اور اس پر وائس اوور بھی کی اور اس کی ایڈیٹنگ بھی کی جو کہ ہم ٹی وی پر چلا تھا اور ریڈیو پر بھی چلا۔ ہم ٹی وی والے میری آواز سے واقف نہیں تھے اور انہوں نے جیسے ہی میری آواز سنی ایک تہلکہ سا مچ گیا کہ یہ کون ہے یہ

کس کی آواز ہے۔

عمر سلطان جو میرے لیے بڑے بھائیوں کی طرح ہیں ان سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ تو انہوں نے ایک فیور کیا کہ ٹی وی والوں سے بات کی اور کہا کہ جاسم ہائر ہوا ہے ریڈیو کے لیے یہ ٹی وی کے لیے اپنی آواز نہیں دے گا اور اگر دے گا تو آپ جاسم کو Pay کریں۔

کام اچھا سیٹ ہو گیا تھا اور میں بھی سیٹ ہو گیا تھا کہ جولائی 2010ء میں ہمارا ایف ایم 94.6 بند ہو گیا تو میں تقریباً "7-8 ماہ بے روزگار رہا۔ لیکن اس دوران کینیڈین انگلش اسٹور کے لیے مجھے شوز کرنے کا موقعہ ملا انٹرنیٹ کے تھرو اور شوز باقاعدہ ریکارڈ ہوتے تھے اسٹوڈیو کے اندر اور جو شو میں کرتا تھا اس کا عنوان تھا کہ "گانا توڑے گا" اس میں مجھے کچھ فنی ——— باتیں کرنا ہوتی تھیں اور ان سے جڑا کوئی گانا بھی سنانا ہوتا تھا۔ اور آپ یقین کریں کہ میں اتنا بے سرا گاتا تھا کہ کیا بتاؤں مگر اس کے باوجود پروگرام ہٹ ہو گیا تھا یہ میری لک تھی کہ میں ہٹ ہو گیا کیونکہ میرا ہی شو سب سے زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ ابھی اس پروگرام کو کرتے ہوئے 3'4 ماہ ہی ہوئے تھے کہ پتا چلا ایف ایم 105 میں آڈیشن ہو رہے ہیں وہاں جا کر ٹرائی کیا تو وہاں میں سلیکٹ ہو گیا اور پھر تقریباً "14 یا 15 ماہ میں نے ایف ایم 105 پہ کام کیا اور بہت بہت اچھا وقت میرا اس ایف ایم پہ گزرا۔ بس پھر پتا نہیں کیا ہوا' کچھ میرا بھی دل بھر گیا اور کچھ مینجمنٹ کا بھی میں نے اس جاب کو خدا حافظ کہہ دیا۔"

★ "پھر دوبارہ ایف ایم 107 کا رخ کیا یا آفر آئی؟"

❋ "ایف ایم 107 میں اجنبی بھائی ہیں جو پہلے نیٹ ورک ہیڈ ہوا کرتے تھے اب پروگرامنگ ہیڈ ہیں ان سے چونکہ میرے بہت اچھے تعلقات ہیں تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آج کل کیا ہو رہا ہے تو میں نے کہا کہ فارغ ہوں۔ کچھ بھی نہیں کر رہا تو انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس آجاؤ اور پروگرام کرو۔ پھر میٹنگ ہوئی تو انہوں نے کہا "چلتے چلتے" شو کا نام ہے جو شام 5 بجے سے رات آٹھ بجے تک ہو گا جو آپ پیر منگل اور بدھ کو کریں گے اور باقی دن عاطف مظہر کریں گے' اب پروگرام شروع کیے ہوئے ایک یا دو ہی ہفتے ہوئے ہوں گے کہ عاطف مظہر کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو اس کے دن خالی جا رہے تھے پھر وہ دن بھی مجھے مل گئے تو مسلسل چھ دن مجھے پروگرام کرنا پڑتا تھا۔ مگر پھر اجنبی بھائی خود آگئے تو جمعرات جمعہ اور ہفتہ کے پروگرام مجھے ملے رمضان المبارک میں مسلسل شوز کیے۔ تو جناب ریڈیو کے علاوہ کمرشلز اور دیگر پروگراموں کے لیے وائس اوور کرتا ہوں۔"

★ "اور آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ "ڈبنگ" بھی کرتے ہیں۔ کچھ اس کے بارے میں بھی بتائیں؟"

❋ "جی ہاں ــــ یہ جو آج کل ترکی کے ڈرامے آ رہے ہیں ان کی ڈبنگ کے لیے مجھے بھی بلایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے میں نے "عشق ممنوع" کے لیے ڈبنگ کی مگر اس سے بھی پہلے جیو کے لیے بچوں کا ایک سیریل تھا "پاریہ ممی پاپا کی جان" میں سیکنڈ لیڈ ہیرو کی آواز میری تھی۔ اس کے بعد آفر ملی "اردو ون" سے ایک اسپینش ڈرامہ تھا اس کے ایک کردار کی ڈبنگ کی۔"

★ "آپ کی بات کاٹ رہی ہوں کہ ڈبنگ کے ساتھ ساتھ کسی سیریل میں اداکاری کرنے کا بھی اتفاق ہوا؟"

❋ "نہیں تو ایسی آفر نہیں آئی اور ابھی تک مجھے کسی نے آزمایا بھی نہیں ہے۔"

★ "آپ کی صلاحیتوں کا آہستہ آہستہ پتا چلے گا' اب تک کتنے ڈراموں کی ڈبنگ کر چکے ہیں؟"

❋ "ہاں آپ یہ بھی کہہ سکتی ہیں کہ آہستہ آہستہ پتا چلے گا ــــ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے دانت اکھڑ جائیں تب میری صلاحیتوں کا پتا چلے ــــ اور ڈبنگ کی صورت حال یہ ہے کہ دو اسپینش ڈرامے کر چکا ہوں ـ عشق ممنوع کیا "میرا سلطان" کر رہا ہوں "یہ ہے میری کہانی" ایکسپریس ٹی وی پر چل رہا ہے۔ "ٹائم" پہ ایک ڈچ پلے چل رہا ہے اس میں دو کردار کر رہا ہوں۔ عشق ممنوع میں بھی دو کردار کیے تھے۔ پھر جیو میں جو فلمیں آتی ہیں اس کی ڈبنگ کے لیے مجھے بلایا جاتا ہے۔"

★ "ڈبنگ میں مشکل ہوتی ہے؟"

❋ "نہیں مجھے نہیں ہوتی اور میں آپ کو بتاؤں کہ ہمارے شہر کراچی میں ڈبنگ آرٹسٹ بہت کم ہیں اور ریڈیو کے کئی اچھے آر جے ایسے ہیں جن میں یہ صلاحیت ہے مگر کوئی ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا' بس اگر آپ کی سفارش تگڑی ہے تو آپ کو چانس مل جاتا ہے۔ میری شروعات بھی سفارش سے ہی ہوئی تھی ریڈیو کی وجہ سے جان پہچان بڑھی اور جان پہچان والے لوگوں نے میرا ذکر کیا اور یوں مجھے بھی کام ملنا شروع ہو گیا۔"

★ "اس میں تو کوئی شک نہیں کہ پہلی سیڑھی کے لیے کسی کا ہاتھ تھامنا پڑتا ہے پھر انسان اپنی صلاحیت سے آگے بڑھتا ہے۔ میری نظر میں یہ سفارش نہیں ہے ــــ اتنا کچھ آپ نے کیا' کبھی یہاں' کبھی وہاں' کبھی کہیں تو کبھی گھبرائے کہ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ میں سیٹ کیوں نہیں ہو پا رہا؟"

❋ "سچ پوچھیں تو یہ سوال میں اپنے آپ سے روزانہ کرتا ہوں اور یہ گھبراہٹ مجھے روزانہ ہوتی ہے کیونکہ جس طرح کی میں روزی کما رہا ہوں یہ ہوائی روزی ہے یہ کوئی مستقل جاب نہیں ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم اس فیلڈ میں آئیں گے تو ہماری عیاشی ہو جائے گی۔ ہم پروڈیوسر ڈائریکٹر بن جائیں گے تو ایسا نہیں ہے۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہے' بہت خواری کرنی پڑتی ہے۔"

★ "یہ تو ہے ویسے کیا آپ کی فیلڈ آمدنی کا اچھا ذریعہ ہے؟ گھر کا چولہا با آسانی چل سکتا ہے؟"

❋ "ریڈیو کرتا ہوں' وائس اوور کرتا ہوں' ڈبنگ بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہے تو بس اچھا گزارا ہو جاتا ہے اور کمرشلز کے لیے میری ابھی اتنی ڈیمانڈ نہیں ہے کہ میں اپنی پسند کی رقم وصول کر سکوں۔ جن کی ڈیمانڈ ہوتی ہے پھر وہ اپنی پسند کا معاوضہ لیتے ہیں۔ اسی طرح ڈبنگ میں میری ڈیمانڈ ہے مگر معاوضہ بہت کم ہے یہاں گھنٹوں کے حساب سے یا پھر ایک قسط کے حساب سے معاوضہ دیا جاتا ہے۔ چینلز کے ساتھ کام کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے اور تعلقات اچھے بن جاتے ہیں۔ جبکہ پروڈکشن ہاؤسز میں تو جا کر بس آواز کا جادو جگانا ہوتا ہے۔ وہاں اور کوئی نہیں ہوتا۔"

★ "اس فیلڈ کو کیسا پایا؟ لوگوں کے رویوں کو کیسا پایا؟ لوگوں کو کیسا پایا وغیرہ وغیرہ؟"

❋ "اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہیں اور میں آپ کو بتاؤں کہ 2009ء اور 2010ء تک میں بڑا شارٹ ٹیمپر قسم کا انسان تھا۔ بس بیل کو لال کپڑا دکھانے والی بات ہوتی تھی۔ مگر جب سے شادی ہوئی ہے تب سے میرا غصہ کافی کم ہو گیا ہے اور جب سے بیٹا پیدا ہوا ہے غصہ مزید کم ہو گیا ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہو گیا ہے۔"

★ "یہ کس کا کمال ہے۔ شادی کا؟ بیٹے کا یا پھر بیگم کا ویسے شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

❋ "20 جولائی 2011ء کو ہمارا نکاح ہوا تھا۔ بیگم کا نام "روا" ہے اور میری بیگم نے مجھے بہت سپورٹ کیا ہے کیونکہ سچ بتاؤں شادی کے بعد ہم نے ایسا وقت بھی دیکھا ہے کہ ہمارے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا اور ہم نے فاقے کیے ہیں۔ میرے پاس بالکل کام نہیں تھا اور ہم نے کس طرح گزارا کیا میں اور میری بیوی روا ہی جانتی ہے۔"

★ "لائف پارٹنر اچھا یا اچھی ہو تو بہت سے کام آسان ہو جاتے ہیں؟"

❋ "بالکل جی ــــ جب "عشق ممنوع" سیریل شروع ہوا تو پھر اچھے دن شروع ہوئے اور اب اللہ کا کافی کرم ہے اب' بہت اچھی لائف گزر رہی ہے اور اچھا کما لیتا ہوں۔"

★ "لوگ کہتے ہیں کہ اس فیلڈ میں بڑا پیسہ ہے۔ تو کیا لوگ جھوٹی کہانیاں سناتے ہیں؟"

❋ "فرض کریں کہ ٹی وی کے پوائنٹ آف ویو سے اگر میں ایک سیلیبرٹی ہوتا تو سب لوگ مجھے پہچانتے'

میں ڈراموں میں کام کر رہا ہوتا اور ایک قسط کا مجھے آٹھ سے دس ہزار مل رہا ہوتا تو میں اچھا خاصا کما رہا ہوتا۔ لیکن چونکہ ٹی وی سے میرا تعلق نہیں ہے۔ تو اس لیے محدود آمدنی ہے میری۔"

★ "آواز ہی کمائی کا ذریعہ ہے اس کی حفاظت کرنا تو بہت ضروری ہے۔ اب یہ بتائیں کہ شادی آپ کی پسند سے ہوئی؟"

* "جی ہاں اس شادی میں بہت زیادہ حد تک میری پسند شامل تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرا فیصلہ غلط نہیں تھا اور دونوں فیملیز کے تعلقات بہت اچھے ہیں ہماری جوائنٹ فیملی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ ساس اور بہو کا رشتہ بہت خطرناک ہوتا ہے جبکہ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔ سب کی آپس میں بہت محبت ہے اور میری دو چھوٹی بہنیں ہیں ایک بہن شادی شدہ ہے جو کراچی میں ہی رہتی ہے اور دوسری بہن دبئی میں ہوتی ہے اس کے پاس امی رہتی ہیں۔ آج کل پاکستان آئی ہوئی ہیں اور میں اکلوتا بیٹا ہوں اور خاندان کا بڑا بھی میں ہی ہوں۔"

★ "تو پھر جوائنٹ فیملی کیسے ہو گئی۔۔۔ بہنیں بھی دور ہیں اور امی بھی دور ابو بھی دور۔۔۔؟"

* "ہاں جی لیکن جب بھی دونوں آتے ہیں تو ہمارے پاس ہی آتے ہیں اور بہنیں بھی ادھر ہی آتی ہیں۔ بڑا کرم ہے اللہ کا کہ گھر اپنا ہے اور چھت اپنی ہو تو پھر روٹی کی ہی فکر ہوتی ہے۔"

★ "آپ کی آواز ماشاءاللہ ڈراموں میں کمرشلز میں اور ریڈیو پہ گونجتی رہتی ہے۔۔۔ آواز کے ذریعے لوگ عام جگہوں پہ پہچان لیتے ہیں؟"

* "آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ لوگ مجھے میرے نام سے زیادہ پہچانتے ہیں اور میری آواز سے کم پہچانتے ہیں۔"

★ "کھانے پینے کے شوقین ہیں؟"

* "کھانے پینے کا شوقین سے زیادہ موڈی ہوں۔ اگر موڈ ہے تو کھانا ہے اور نہیں ہے موڈ تو نہیں کھانا ہے۔ نہیں کھانا تو کچھ بھی نہیں کھاؤں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

★ "ضدی ہیں اس کا مطلب ہے؟"

* "انتہا سے زیادہ ضدی ہوں اور اس میں سارا قصور میری والدہ کا ہے کہ انہوں نے اتنا لاڈ پیار دیا کہ بچہ بنا دیا مجھے اور میرے والد اس بات سے بہت چڑتے ہیں اور اکثر کہتے ہیں کہ تم نے اپنے بیٹے کو چڑچڑا اور ضدی بنا دیا ہے۔"

★ "اب آپ خیال کیجیے گا کہ اپنے بیٹے کی ایسی تربیت نہ کیجیے گا، کتنا بڑا ہے بیٹا اور کیا نام ہے؟"

* "بیٹا ماشاءاللہ 10 ماہ کا ہے اور "مروان" نام ہے اس کا اور میرے والدین نے میری بہت اچھی تربیت کی ہے اور میری ہر خواہش بھی پوری کی ہے لیکن اگر میرے والدین سے کہیں نہ کہیں کوتاہی ہو گئی ہو کہ جس چیز کی میں نے خواہش کی وہ مجھے نہیں ملی تو میں کوشش کروں گا کہ اپنے بیٹے کی تمام خواہشات کو پورا کروں۔ لیکن میں نوالہ سونے کا کھلاؤں گا اور دیکھوں گا شیر کی نظر سے۔"

★ "اور جناب چلتے چلتے آپ کچھ کہنا چاہیں اپنے سامعین سے (کیونکہ آپ کا تعلق آواز کی دنیا سے ہے) تو کہیے؟"

* "میں سب سے یہ ہی کہوں گا کہ اس وقت ہم جن حالات میں ہیں ان میں آپ سب صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اس آیت پر عمل کریں کہ (ترجمہ) "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" اشفاق احمد صاحب نے بڑی اچھی ایک بات کی تھی کہ یہ قوم جو دعوا کرتی ہے کہ ہم اپنے پیروں پہ کھڑے ہوں گے اور ملک میں انقلاب لے کر آئیں گے تو جو قوم دو منٹ سکون کے ساتھ سگنل پہ کھڑی نہیں ہو سکتی وہ قوم اپنے پیروں پہ کیا کھڑی ہو گی۔ تو میرا بھی یہ پیغام ہے کہ آپ سگنل پہ کھڑا ہونا سیکھ لیں اپنے بزرگوں کا احترام کریں پھر دیکھیں کیسے ساری پریشانیاں دور ہوتی ہیں۔"

☆ ☆

مقابل ہے آئینہ

ثمینہ اکرم

ادارہ

س : آپ کا پورا نام ۔۔۔ گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟

ج : میرا پورا نام ثمینہ بنت قدرت علی ہے گھر والے "ثنا جی" یا مین بھائی "ثمو" کہتے ہیں جبکہ میری فرینڈز "ثمن اور ثمین" کہہ کر پکارتی ہیں۔

س : کبھی آئینے نے آپ سے یا آپ نے آئینے سے کچھ کہا؟

ج : اب تو آئینہ دیکھنا جیسے چھوڑ ہی دیا ہے اپنا خیال رکھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ ویسے جب بھی آئینے کے سامنے کھڑی ہوں۔ معیز بے تحاشا یاد آتا ہے یہ آئینہ اس نے اپنی پسند سے خریدا تھا اور فٹ بھی اپنے ہاتھوں سے کیا تھا۔

س : آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟

ج : میری سب سے قیمتی ملکیت میرے شہید بیٹے کی یادیں ہیں۔ اس کی چھوٹی نشانیاں جیسے ادھ لکھی ڈائری، پرفیوم کی خالی بوتلیں، زیر استعمال ساری اشیاء، پی کیپ، بچپن کے کھلونے سب کچھ جوں کا توں میں نے محفوظ کر لیا ہے۔

س : اپنی زندگی کے دشوار لمحے بیان کریں؟

ج : 11 نومبر 2012ء کی رات جب معیز کے ایکسیڈنٹ کی خبر بذریعہ فون ملی۔ یہ میری زندگی کے دشوار گزار لمحات تھے جب اس کی سیریس حالت کو سب نے مجھ سے چھپایا۔ مگر قدرتی طور پر میری سانسیں رک رہی تھیں اور میرا دل بند ہوتے جا رہا تھا جیسے اللہ کی طرف سے کوئی اشارہ ہو اور جب حقیقت پتا چلی تو میں ہوش و حواس کھو بیٹھی۔

س : آپ کے لیے محبت کیا ہے؟

ج : محبت میرے لیے آکسیجن ہے۔ محبت کا احساس ہی زندگی کو سہل بنائے ہوئے ہے۔ میرے اللہ اور رسول پاک ﷺ کی محبت میرا ایمان ہے۔

س : مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا ہے؟

ج : صبح و شام اٹھتے بیٹھتے ایک ہی بات سوچتی ہوں کہ شہید معیز اکرم کی روح کے ثواب کے لیے کوئی ایسا کام کروں جو اس کے لیے صدقہ جاریہ ہو۔ تاحیات جس کا ثواب اسے ملتا رہے۔

س : پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کیا ہو؟

ج : پچھلے سال کافی کوششوں اور بھاگ دوڑ کے بعد معیز اکرم کو KICT میں جاب ملی تھی۔ میں مسرور بھی تھی اور مطمئن بھی کہ اب اس کا فیوچر بن جائے گا۔ مگر اسے تو اپنے ابدی سفر پر جانے کی جلدی تھی۔ صرف 9 ماہ ہی یہ جاب جاری رہ سکی۔

س : آپ اپنے گزرے کل، آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟

ج : میرا گزرا کل خسارہ، آنے والا کل، قرب الٰہی ملنے کی امید اور میرا آج ۔۔۔ بہت اداس اور تنہا تنہا۔

س : آپ اپنے آپ کو بیان کریں؟

ج : سب کچھ ہونے کا یقین اللہ سے، مخلوق سے کچھ نہ ہونے کا یقین رکھنے والی اپنے بچوں اور شوہر

کے دل کی روشنی۔

س : کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟

ج : کسی کو کھونے کا ڈر.... روڈ پر ایمبولینس دیکھ کر آج بھی دل سوکھے پتے کی مانند لرزتا ہے۔ کسی ٹرالر کو دیکھ لوں تو روڈ پر ہی زار زار رونا شروع کر دیتی ہوں۔

س : آپ کی کمزوری.... آپ کی طاقت کیا ہے؟

ج : میری کمزوری میرے بچے.... میری طاقت محمد اکرم (میرے صاحب)

س : آپ خوشگوار لمحات کس طرح گزارتی ہیں؟

ج : خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر.... شکرانے کے نوافل پڑھ کر.... بعد میں اپنی فیملی کے ساتھ خوش ہو کر....

س : آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟

ج : پیسہ کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ پیسہ اتنا ہو کہ آپ کی ضروریات زندگی با آسانی پوری ہو جائیں۔ آپ کو کسی کے سامنے اپنا دست سوال دراز نہ کرنا پڑے۔ جبکہ آپ کی خواہشات ' ضروریات محدود ہوں۔ بے شک دولت زندگی کے لیے ضروری ہے مگر آپ کی زندگی نہیں۔

س : گھر اپنی نظر میں؟

ج : ایسی جگہ جہاں صرف میری حکمرانی ہے۔ کہیں بھی چلی جاؤں مگر سکون اپنے ہی گھر میں ملتا ہے۔ بھرپور احساس تحفظ ' عزت و محبت سے تعمیر چار دیواری۔

س : کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں۔

ج : ہر روز رات کو میں سب کو معاف کر کے سوتی ہوں۔ اچھا اور برا سلوک یا رویہ ہم بھول تو نہیں سکتے مگر بدلہ لینے کی طاقت بھی نہیں رکھتے۔ اپنا سب انصاف اس قادر مطلق کی ذات پر چھوڑ دینا چاہیے۔

س : کامیابی کیا ہے آپ کے لیے؟

ج : اگر اللہ آپ سے راضی ہے تو اس سے بڑی کامیابی کوئی اور نہیں۔ اللہ کی رضا میں ہی دین و دنیا کی کامیابی ہے۔

س : سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کر دیا ہے یا واقعی یہ ترقی ہے؟

ج : دراصل ہم خود کو مشینوں کا محتاج بناتے جا رہے ہیں۔ محنت سے جی چراتے ہیں جبکہ آج بھی گاؤں دیہات میں محنتی اور جفاکش ہاتھ موجود ہیں۔ جبکہ ہمارے ذہنوں کو بھی زنگ لگتا جا رہا ہے۔

س : کوئی عجیب خواہش یا خواب؟

ج : اے کاش کہ صرف ایک بار "میرا شہزادہ معیذ میرے روبرو آ کر مجھ سے بات کرے۔" میں اسے دل بھر کر دیکھوں۔ ہے نا عجیب خواہش۔

س : برکھا رت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟

ج : بارش میں بھیگنا مجھے ہمیشہ سے ہی ناپسند ہے اور اب تو بارش دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی.... ساون کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ کوئی اپنا بہت اپنا بارش میں بے تحاشا یاد آتا ہے کیونکہ معیذ کو بارش دیوانگی کی حد تک پسند تھی۔ تو اب بارش مجھے اداس کر دیتی ہے۔

س : آپ جو ہیں' وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟

ج : میں تو اپنے رب کی حقیر' عاجز اور گناہ گار بندی ہوں۔ اب بھی تب بھی....

س : آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟

ج : جب میں کسی کی اخلاقی مدد کروں۔ جب میری نصیحت کے نتیجے میں بھٹکے قدم راہ راست پر آجائیں۔

س : آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟

اس ماہ نبیلہ عزیز ناسازی طبع کے باعث "دردل" کی قسط نہیں لکھ سکیں۔ لہٰذا قسط شامل اشاعت نہیں ہے۔ بہنیں ان شاء اللہ اگلے ماہ "دردل" کی قسط پڑھ سکیں گی

ج : بچے کی معصوم مسکراہٹ.... اپنا آپ مٹا کر کسی کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ۔

س : آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوفزدہ ہو جاتی ہیں؟

ج : میں کسی قسم کے بھی مقابلے کی دوڑ میں شامل نہیں ہو سکتی۔ میں اس صلاحیت سے قطعی نابلد ہوں۔ مجھ میں مقابلہ بازی کا رجحان نہیں۔

س : متاثر کن کتاب' مصنف' مووی....؟

ج : شعور حیات (3 جلدیں) مولانا یوسف اصلاحی اور مووی میں دیکھتی نہیں۔

س : آپ کا غرور؟

ج : میرا فخر میرا غرور.... میرا شہید بیٹا معیذ اکرم اور ایک شہید کی ماں کے رتبہ پر فائز ہونے کا یقین۔

س : کوئی ایسی شکست جو آج بھی اداس کر دیتی ہے؟

ج : 11 نومبر کی رات زندگی نے موت سے شکست کھائی۔

س : کیا آپ نے زندگی میں وہ سب پا لیا جو آپ پانا چاہتی تھیں؟

ج : میں نے زندگی میں صرف اور صرف عزت اور محبت پانا چاہی ہے۔ شکر ہے پاک پروردگار کا کہ زندگی میں محبت بھی بے تحاشا ملی اور عزت بھی....

س : اپنی ایک خامی یا خوبی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟

ج : خوبی کبھی کسی کا برا نہیں سوچ سکتی۔ پرایا غم بھی دل پہ بوجھ بن جاتا ہے۔ خامی زیادہ سوشل نہیں ہوں آنے جانے ملنے ملانے کے معاملے میں بہت سست ہوں۔

س : کوئی ایسا واقعہ جو آپ کو شرمندہ کر دیتا ہے؟

ج : جب کبھی میں زرناجی کو تیز آواز میں جواب دوں تو بعد میں بہت شرمندہ ہوتی ہوں۔

س : کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا ہو؟

ج : اپنا ہو یا پرایا کسی کی بھی کامیابی پر دل سے خوش ہوتی ہوں اور ان کے لیے دعا کرتی ہوں۔ شکر ہے کہ حسد کا جذبہ مجھ میں نہیں۔

س : مطالعہ کی اہمیت آپ کی نظر میں؟

ج : مطالعہ کی اہمیت میری زندگی میں' جیسے جسم و روح لازم و ملزوم ہیں ایسے ہی مطالعہ میری روح کی غذا ہے۔ جبکہ اچھا انتخاب مطالعہ آپ کے ذہن کو جلا بخشتا ہے۔ دینی کتب کا مطالعہ سے اچھے مسلمان کی تشکیل ہوتی ہے۔

س : آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی کیا ہے جو آپ اپنے علم' تجربہ' مہارت میں استعمال کرتی ہیں؟

ج : زندگی پانی کا بلبلا ہے۔ یہ آخرت کی تیاری کے لیے دی گئی مدت ہے زندگی عارضی ٹھکانہ پڑاؤ جبکہ موت کو دوام ہے۔

س : آپ کی پسندیدہ شخصیت؟

ج : آقائے دو جہاں رحمت اللعالمین' خلفائے راشدین اور مولانا طارق جمیل

س : ہمارا پورا پاکستان خوب صورت ہے۔ آپ کا خاص پسندیدہ مقام؟

ج : سندھ سے باہر کبھی گئی نہیں' گھومنے پھرنے کا اتنا شوق ہے اور نہ وسائل۔ مگر سمندر سے زیادہ مجھے سبزہ اور ہریالی پسند ہے۔ اس لیے کراچی کے تمام سرسبز و شاداب باغ۔ وہاں چلنے والی ٹھنڈی ہوا اور سبز گھاس مجھے فریش کر دیتی ہے۔

س : اپنی کامیابیوں میں کسے حصہ دار ٹھہراتی ہیں؟

ج : میرے سینکڑوں اسٹوڈینٹس مجھے آئیڈیلائز کرتے ہیں۔ جبکہ مجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں۔ تو یہ سب اللہ پاک کا کرم خاص ہے۔ ہماری حیثیت ذرہ برابر بھی نہیں۔ صرف مولا کریم کی ذات ہی آپ کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے ورنہ انسان کچھ بھی نہیں

سرورق کی شخصیت

ماڈل ــــــ مہوش بتول
میک اپ ــــــ روز بیوٹی پارلر
ٹرانسپیرنسی ــــــ موسیٰ رضا

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ مگر وہ اس سے بات نہیں کرتی۔ مگر زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے حس ہے۔ میں اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو اس کے کالج میں ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے.... رخسار اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے.... اور روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رگو میلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے.... اور ایسی خوشی میں نمل ان دونوں کو پیلس میں لنچ کی دعوت دیتی ہے.... اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے۔ اور انہیں پیلس میں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے.... رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے.... وہ دونوں واپس جانے کے لیے سڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے.... اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کردیتا ہے.... اب آگے پڑھیں۔

۴۰

چالیسویں قسط

"تمہاری شادی سے دو دن پہلے تم صرف تین لوگ بارات لے کر گئے اور رومیلہ کو رخصت کرالائے حالانکہ ہم سب وہیں تھے۔ اچانک جلد بازی میں بھی اگر شادی کرنی پڑگئی تھی تو بھی ہمیں اطلاع دی جاسکتی تھی۔ رومیلہ کا تو پورا خاندان شریک ہوا تھا باقاعدہ اخبار میں تصویریں آئی تھیں۔

تم لوگ چاہتے تو ہمیں بھی چلنے کے لیے بلاسکتے تھے اس قدر رازداری سے یہ قدم ایسے ہی نہیں اٹھایا گیا ہے۔ رومیلہ اگر شگفتہ کو پسند نہیں ہے یا یہ روایتی انداز میں اپنے ارمان نہیں نکال سکی تب بھی ——— رومیلہ سے اتنی نفرت کرنے کا جواز نہیں بنتا۔

براہ مہربانی مجھے مزید جھوٹ بول کر بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کی جائے لہٰذا صاف صاف بتادو تم لوگوں نے یہ زبردستی کا طوق گلے میں کیوں ڈالا ہے۔" نانی اماں کے لہجے سے غم و غصہ بری طرح جھلک رہا تھا۔

شگفتہ غفار دم بخود کھڑی تھیں۔ نانی اماں کو مطمئن کرنے کے لیے اب کوئی بہت بہترین اور معقول بہانہ ڈھونڈنا تھا جو ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آرہا تھا کیونکہ بریرہ مستقل انہیں شاکی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ "آپ کچھ دن بھی اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکتیں۔ آپ کے اتنا تماشا کرنے کی وجہ سے نانی اماں کو شک ہوا ہے۔ اب انہیں کون مطمئن کرے گا۔ آپ اپنی بے وقوفیوں کی وجہ سے میرا گھر برباد کردیں گی۔"

شگفتہ غفار خود شرمندہ تھیں اس لیے بریرہ سے نظریں چرائے کھڑی تھیں۔

رومیلہ اس سارے ماحول میں سب سے بری حالت میں تھی دکھ' بے عزتی' شرمندگی' تاسف اور جانے کون کون سے احساسات سے وہ گزر رہی تھی۔ اس وقت وہ اتنی ذلت محسوس کررہی تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ مگر نانی اماں کے سوالوں نے اس کا سوچوں کی سمت بدل دی۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا وہ جلد سے جلد اس موضوع کو ختم کرنے کے متعلق سوچنے لگی۔

کیونکہ بریرہ جس طرح جذباتی ہو کر رو رہی تھی اسے دیکھتے ہوئے رومیلہ کا وجدان کہہ رہا تھا بریرہ کوئی بھی حماقت سے بھرا جملہ بول کر اس راز کو فاش کردے گی اور واقعی وہ غلط نہیں سوچ رہی تھی بریرہ بھرائی ہوئی آواز میں شگفتہ غفار سے کہنے لگی۔

"لوگ کہتے ہیں اولاد کی خاطر ماں ہر قربانی دے سکتی ہے' مگر آپ صرف کچھ دنوں کے لیے اپنی زبان اور نفرت پر قابو نہیں رکھ سکیں۔ آپ کو مجھ سے اتنی محبت نہیں جتنی رومیلہ سے نفرت ہے آپ میرا گھر برباد کرسکتی ہیں لیکن رومیلہ کو آباد نہیں ہونے دے سکتیں۔" شگفتہ غفار کو لگا کسی نے ان کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو وہ تڑپ کر بریرہ کے قریب گئیں اسے سینے سے لگانے کے لیے' مگر بریرہ نے ان کے ہاتھوں کو بری طرح جھٹک دیا اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے سیڑھیاں پھلانگتی اوپر چڑھ گئی۔

شگفتہ غفار نے ایک نظر نانی اماں اور رومیلہ پر ڈالی اور خود بھی اس کے پیچھے لپکیں۔ نانی اماں بریرہ کا یہ رد عمل دیکھ کر مزید فکرمند ہوگئی تھیں ان کے چہرے پر سوچوں کا ایک جال بچھا تھا۔

وہ نم ناک آنکھوں سے خالی زینے کو دیکھتی رہیں جہاں سے ان کی بیٹی اور نواسی نے جاکر ان کے لیے سوچوں کے ان گنت در کھول دیے تھے۔

رومیلہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی پھر خود پر قابو پاتی ان کے نزدیک چلی آئی۔

"نا۔ نانی اماں۔" رومیلہ کانپتے لہجے میں بولی تو وہ ڈبڈباتی نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"میں آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولنا چاہتی نہ ہی آپ کو بے وقوف بنانے کی کوشش کروں گی۔ الیان اور ان کی فیملی نے یہ شادی واقعی بڑی مجبوری کے عالم میں کی ہے یوں سمجھ لیں' بہت بڑا قرض تھا الیان پر جسے ہر حال میں چکانا تھا اور جس کے بدلے میں' میرے بھائی نے الیان کو مانگ لیا بس اس سے زیادہ میں آپ کو کچھ

نہیں بتاسکتی اس سے زیادہ کچھ نہ ہی جاننا آپ کے اور سب کے حق میں بہتر ہے۔ آپ کو اللہ رسول کا واسطہ آپ یہ سوال آئندہ کبھی نہیں کریں گی۔" رومیلہ نے ان کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

نانی اماں کتنی ہی دیر بے بسی سے رومیلہ کی بھیگی آنکھوں کو دیکھتی رہیں پھر بغیر کچھ کہے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔ ان کے ایک ایک انداز سے ان کے شدید دکھ کی عکاسی ہو رہی تھی۔

اتنے سارے لوگوں کو اپنی وجہ سے تکلیف میں دیکھ کر رومیلہ کا دل بری طرح بھر آیا تو وہ بھی اپنے اندر کا غبار نکالنے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

سارا دن وہ اپنے کمرے میں بند رہی کسی کا سامنا کرنے کی ہمت تھی اور نہ ہی خواہش اور پھر کمرے کے باہر پھیلے سناٹے سے اس نے یہی اندازا لگایا تھا کہ گھر کے باقی مکینوں نے بھی خود کو کمروں میں مقید کرلیا ہے کھانا کھانے یا کسی بھی کام کے لیے کوئی باہر نہیں نکلا ہے۔

شام کے چھ بجے کے قریب اسے گھر میں کچھ چہل پہل محسوس ہوئی جیسے باہر لاؤنج میں سب باتیں کررہے ہوں' لیکن وہ کون لوگ تھے اور کیا باتیں کررہے تھے یہ جاننے کا رومیلہ کو بالکل کوئی تجسس نہیں ہوا وہ ویسے ہی بستر کے ایک کونے میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی' مگر تب ہی دروازے پر کوئی ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوگیا۔ اپنے سامنے بریرہ کو کھڑا دیکھ کر رومیلہ حیرت کے مارے اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

بریرہ کا حلیہ خاصا بہتر تھا اس نے کپڑے وغیرہ بدلے ہوئے تھے بال قرینے سے بنا کر وہ کہیں جانے کے لیے تیار لگ رہی تھی البتہ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پورا دن روتی رہی ہے۔

رومیلہ اسے اچانک سامنے دیکھ کر کچھ پریشان سی ہوگئی جانے اب وہ کیا کہنے والی تھی۔ اب رومیلہ میں مزید کچھ سننے کا یارا نہیں تھا۔ رومیلہ خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی اس کے بھی شاید سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے' لیکن اس کے پاس یہاں کھڑے رہنے کا وقت نہیں تھا لہٰذا گلا کھنکھارتے ہوئے کہنے لگی۔

"مجھے۔ نہیں پتا تھا کہ۔ ممی کا رویہ آپ کے ساتھ۔ اس قسم کا ہے مجھے معلوم تھا وہ آپ کو کبھی قبول نہیں کریں گی۔ لیکن۔ لیکن وہ آپ کے ساتھ اس طرح پیش آتی ہوں گی۔ اس کا علم مجھے بھی یہاں آکر ہوا ہے۔"

بریرہ بڑے شکستہ لہجے میں بول رہی تھی وہ رومیلہ کو دیکھ بھی نہیں رہی تھی اس کی نظریں اپنی انگلیوں پر مرکوز تھیں جن پر وہ اپنے دوپٹے کا پلو کھول اور لپیٹ رہی تھی پھر وہ ایسے خاموش ہوگئی جیسے جو وہ کہنا چاہ رہی ہو اسے کہنے کی ہمت نہ ہو رہی ہو۔ آخر وہ بہت ہکلاتے ہوئے بولی۔

"لگتا ہے۔ آپ ممی کے رویے کے متعلق۔ اپنے گھر والوں کو کچھ نہیں بتاتیں۔" وہ کہہ کر ایک بار پھر چپ ہوگئی رومیلہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کہنا کیا چاہتی ہے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد آخر اس نے وہ کہہ ہی دیا جسے کہنے وہ یہاں آئی تھی۔

"ممی کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ آپ پلیز یہ سب اپنے بھائی کو مت بتایئے گا۔" پہلی بار وہ رومیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی انکساری سے بولی تو رومیلہ پر گھڑوں پانی گر گیا۔

تو گویا وہ اس لیے پریشان تھی کہ رومیلہ اپنے بھائی کو سب بتادے گی اور وہ انتقاماً اس کے سسرال والوں کو اس کے اغوا ہونے کے متعلق بتادے گا۔ اس کے لہجے میں اپنی ماں کے رویے پر شرمندگی نہیں تھی۔ بس ایک ڈر تھا اپنے گھر کے اجڑ جانے کا رومیلہ بے اختیار اس کے قریب آگئی۔

"تمہیں معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ معافی تو مجھے مانگنی چاہیے کہ میری وجہ سے تم سب لوگوں کو اتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں' میں یا میرا بھائی تمہارا گھر کبھی برباد نہیں کریں گے۔ میرے

بھائی نے جو تمہارے ساتھ کیا وہ بالکل غلط تھا ناقابل معافی جرم سرزد ہوا ہے اس سے "مگر اسے جو کرنا تھا وہ' وہ کر چکا ہے' اب مزید تم لوگوں کو دکھ دینے یا پریشان کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں۔" بریرہ بڑے غور سے رومیلہ کو سن رہی تھی۔

"اپنی زندگی کو سکون کے ساتھ جیو بغیر کسی ڈر یا خوف کے' اس یقین کے ساتھ کہ میں تم پر کبھی آنچ نہیں آنے دوں گی۔" رومیلہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ بولی۔

وہ واقعی دل سے چاہتی تھی کہ بریرہ کا ہر وہم دور ہو جائے۔ اس کے لیے اس نے وہ باتیں بھی کہہ دی تھیں۔ جس کے بارے میں اسے پتا ہی نہیں تھا کہ وہ ایسا کر بھی سکے گی یا نہیں۔

بریرہ بڑے غور سے اسے دیکھتی رہی' جیسے اس کے چہرے سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ رومیلہ کو لگا وہ اس سے کچھ پوچھے گی مگر وہ کچھ کہے بغیر ہی واپسی کے لیے مڑ گئی۔ رومیلہ کتنی ہی دیر اپنی جگہ کھڑی رہی کہ تب ہی سرداراں نے آکر اطلاع دی کہ نانی اماں اسے بلا رہی ہیں۔

وہ جس حلیے میں کھڑی تھی ویسے ہی باہر آگئی۔ مگر لاؤنج میں نانی اماں اور بریرہ کا سامان رکھا دیکھ کر اور ایک صوفے پر حامد کو شگفتہ غفار سے محو گفتگو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔

"آپ لوگ جا رہے ہیں۔" رومیلہ بے اختیار نانی اماں کے قریب آگئی۔

"ہاں بیٹا! اب اس عمر میں اپنے گھر کے علاوہ کہیں دل نہیں لگتا۔" نانی اماں حامد کے سامنے ایسے بولیں جیسے کچھ ہوا ہی نا ہو۔ بلکہ خوامخواہ ہی ہنس کر کہنے لگیں۔

"میں نے تو اکیلے جانے کا ارادہ کیا تھا مگر جب بریرہ کو حامد کے آنے کا پتا چلا تو اس نے بھی سامان باندھ لیا۔ میں تو کہہ بھی رہی ہوں کہ تم رک جاؤ۔ مگر اسے بھی اپنے گھر کی عادت ہو گئی ہے اور اچھی ہی بات ہے۔ کچھ دن بعد پھر چکر لگا لے گی۔ میں ریاض اور الیان کا انتظار نہیں کر سکتی۔ ان لوگوں سے بعد میں فون پر بات کر لوں گی شام ہو گئی ہے بس ہم فوراً" نکل رہے ہیں۔" نانی اماں کہتی چلی گئیں۔

"لیکن آپ لوگ رات میں کیوں جا رہے ہیں صبح نکل جائیے گا۔" رومیلہ حیرانی سے بولی۔

"حامد میرے فون کرنے پر اپنے کام چھوڑ کر دن میں ہی نکل کھڑا ہوا تھا۔ اب اگر رات کو رکیں گے تو اس کا ایک دن اور ضائع ہو جائے گا۔ کوئی بات نہیں۔ رات کا سفر ایسا کوئی خطرناک نہیں' صبح تک پہنچ جائیں گے۔" نانی اماں لاپروائی سے بولیں۔

رومیلہ خوب جانتی تھی۔ نانی اماں ریاض غفار اور الیان کے آنے سے پہلے پہلے نکل جانا چاہتی ہیں۔ انہوں نے اسی لیے انہیں فون بھی نہیں کیا تھا کہ پھر وہ انہیں رکنے پر اصرار کریں گے اور ان کے اچانک جانے کا فیصلہ کرنے پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیں گے۔ رومیلہ حیران' پریشان سی کھڑی رہی۔ ایک بار پھر اسے شرمندہ ہونے لگی کہ اس کی وجہ سے کتنے لوگوں کو تکلیف ہو رہی تھی۔ نانی اماں نے اسے ساکت کھڑا دیکھ کر خود سے لگا لیا اور بڑے دھیمے لہجے میں بولیں۔

"پریشان مت ہو۔ وقت ایک سا نہیں رہتا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شگفتہ ضدی ہے اس سے میں نے ابھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔ لیکن بریرہ کو میں نے سمجھایا ہے۔ آہستہ آہستہ سب کے رویے تمہارے ساتھ بہتر ہو جائیں گے۔ بس تم ثابت قدم رہنا۔" رومیلہ کا دل چاہا وہ ان سے پوچھے کہ انہوں نے بریرہ کو کیا سمجھایا۔

کہیں انہوں نے یہ تو نہیں بتا دیا کہ رومیلہ نے ہاتھ جوڑ کر ان سے التجا کی ہے کہ — کسی سے کچھ نہیں پوچھیں گی۔ مگر رومیلہ خاموش ہی کھڑی رہی۔ البتہ اس کی سمجھ میں یہ ضرور آگیا تھا کہ بریرہ صرف اس کے بھائی کے ڈر سے کمرے تک نہیں آئی تھی۔ ضرور نانی اماں نے اس کے ذہن سے غلط فہمی کی دھند صاف کی تھی۔

انہوں نے یقیناً" اس کی بہت تعریف کر دی ہو گی۔ نانی اماں تھیں ہی اتنی محبت کرنے والی کہ انہیں لوگوں میں خوبیاں ہی نظر آتی تھیں۔ نانی اماں اس کا ماتھا چوم کر حامد کی طرف بڑھ گئیں جو جانے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ حامد نے رومیلہ سے رسمی سلام دعا کی۔ تب تک ملازم نے بیگ گاڑی میں رکھ دیے تو وہ سب بھی باہر آگئے۔

ایک چیز جو رومیلہ نے بڑی شدت سے محسوس کی۔ مگر خوش قسمتی سے حامد وہ دیکھنے سے محروم رہ گیا۔ شگفتہ غفار بریرہ کو الوداعی پیار کرنے آگے بڑھیں۔ مگر بریرہ بڑی بے رخی سے گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ نانی اماں نے بھی منظر دیکھ کر صرف گہرا سانس کھینچا۔ آگے بڑھ کر انہوں نے بھی اپنی بیٹی کو کوئی تسلی نہیں دی۔ بلکہ خود بھی دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

شگفتہ غفار کے چہرے پر اس وقت اس قدر شدید دکھ تھا کہ رومیلہ نظریں چرا گئی۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکلی تو وہ اندر کی طرف بھاگ گئیں۔ جبکہ رومیلہ وہیں پورچ میں کھڑی اس عالی شان گھر کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ اب اس کی زندگی اس گھر میں اور بھی مشکل ہو جائے گی۔

☼ ☼ ☼

رات کو الیان اور ریاض غفار معمول سے خاصی تاخیر سے گھر لوٹے۔ ایک جاپانی کمپنی کے ساتھ طویل تھکا دینے والی میٹنگ نے ان دونوں کو ہی الجھائے رکھا تھا۔ وہ دونوں بغیر کپڑے بدلے سیدھا ہاتھ دھو کر کھانے کی میز پر آگئے۔ نانی اماں تو مغرب کے بعد ہی رات کا کھانا کھا لیا کرتی تھیں لہٰذا ریاض غفار نے صرف بریرہ کے متعلق پوچھا۔ انہیں یقین تھا ان کی بیٹی ان کا کھانے پر انتظار کر رہی ہو گی مگر سرداراں کے منہ سے یہ سن کر کہ بریرہ اور نانی اماں کو حامد واپس گاؤں لے گئے۔ وہ دونوں ہی ٹھٹک گئے۔

"اور شگفتہ؟ کیا اس نے کھانا کھا لیا؟" ریاض غفار نے پوچھا۔

"نہیں انہوں نے منع کر دیا ہے انہیں بھوک نہیں ہے۔" ریاض غفار اور الیان ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ پھر دونوں ہی ایک ساتھ ٹیبل پر سے اٹھے اور سیدھا شگفتہ غفار کے سر پر پہنچ گئے۔ پہلے تو وہ بات کرنے کے لیے ہی تیار نہیں تھیں اور سر منہ لپیٹے پڑی رہیں' آخر ریاض غفار کے جھنجلانے پر بستر سے اٹھ بیٹھیں اور باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگیں۔

"ہاں آپ بھی مجھ پر غصہ کر لیں۔ ساری غلطی میری ہے' سارا قصور میرا ہے۔ اماں بھی مجھ سے ناراض ہیں' بریرہ بھی ابرار سے زیادہ مجھ سے خوف زدہ ہے کہ میں ہی اس کا گھر برباد کروں گی۔ ابرار کو تو ضرورت ہی نہیں ہے کچھ کرنے کی۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟" ریاض غفار تپ گئے۔

"ہوا یہ ہے کہ مجھے اپنی اوقات پتا چل گئی ہے۔ گھر کے نوکروں سے مجھے پتا چلتا ہے کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔" شگفتہ غفار بھی ترخ کر بولیں۔

"کیا مطلب؟" ریاض غفار ٹھٹک کر بولے۔

"مجھے اپنی دوستوں کے سامنے ماسی سے یہ پتا چلا ہے کہ الیان' رومیلہ کو شاپنگ پر لے کر گیا تھا۔" ریاض غفار اور الیان دونوں چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ریاض غفار کا انداز تصدیق کرنے والا تھا جبکہ الیان کی نظروں میں شدید حیرت تھی۔

"آپ نے اس بات کو لے کر کہیں اپنی دوستوں کے سامنے تو کوئی ہنگامہ نہیں کر دیا۔" الیان نے بے یقینی سے پوچھا۔

"تمہیں صرف ہنگامے کی پڑی ہے۔ یہ احساس نہیں کہ میرے دل پر کیا بیتی۔" شگفتہ غفار جذباتی انداز میں بولیں۔ الیان نے ایسے لب بھینچے جیسے خود کو بمشکل کچھ کہنے سے روکا ہو' جبکہ ریاض غفار بھنائے ہوئے انداز میں ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولے۔

"ان سب باتوں کا اماں اور بریرہ کے گاؤں جانے سے کیا تعلق ہے۔"

"کوئی تعلق نہیں وہ دونوں بس ایسے ہی ناراض ہو کر چلی گئیں۔ مجھے رومیلہ پر غصہ تھا اور اسی وقت وہ منحوس یونیورسٹی سے گھر بھی آگئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے ہمت کیسے کی میرے بیٹے کے ساتھ بازار جانے کی۔ بس اماں اور بریرہ دونوں کو یہ بات بری لگ گئی۔" شگفتہ غفار غم و غصے سے بے حال ہو رہی تھیں۔

ریاض غفار اور الیان کتنی دیر حیرانی سے انہیں دیکھتے رہے۔ پھر آخر ریاض غفار کی حیرت غصے میں بدلنی شروع ہوئی اور وہ چبا کر بولے۔

"تم نے اماں اور اپنی دوستوں کے سامنے یہ بات کہی کہ رومیلہ نے الیان کے ساتھ بازار جانے کی ہمت کیسے کی۔"

"دوستوں کا مجھے یاد نہیں کہ وہ موجود تھیں یا نہیں البتہ غصہ میں نے ان کے سامنے ہی کرنا شروع کر دیا تھا۔" شگفتہ غفار عجیب نروٹھے پن سے بولیں۔

"تو تمہارے غصے کو دیکھ کر کسی نے پوچھا نہیں کہ اگر تمہاری بہو تمہارے بیٹے کے ساتھ چلی گئی تو ایسا کون سا گناہ ہو گیا جو تمہیں آگ لگ گئی۔" ریاض غفار اس قدر تپے ہوئے تھے کہ شگفتہ غفار شاکی نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں ان کے اس لب و لہجے پر۔

"بریرہ نے ٹھیک ہی کہا تھا ابرار کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ رویہ سب کو مشکوک کر دے گا اور یہ راز خود بخود فاش ہو جائے گا۔" ریاض غفار انہیں خاموش دیکھ کر غرا کر بولے تو الیان سرد سے لہجے میں ان کے جملے کی تصحیح کرنے لگا۔

"یہ راز فاش ہو چکا ہے۔ نانی اماں بہت کچھ سمجھ گئی ہیں تب ہی وہ گاؤں سے حامد کو بلا کر ہم سے ملے بغیر واپس چلی گئیں۔" ریاض غفار کچھ تفکر سے الیان کو دیکھنے لگے جیسے انہیں بھی الیان کی بات سچ لگ رہی ہو۔ البتہ شگفتہ غفار نے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کچھ نہیں سمجھی ہیں۔ صرف پوچھ رہی تھیں کہ میں رومیلہ کو اتنا ناپسند کیوں کرتی ہوں۔ ظاہری سی بات ہے۔ میں سچ تو بتا نہیں سکتی تھی۔ لہٰذا میں خاموش رہی۔ مگر بریرہ نے خاصا اوور ری ایکٹ کیا۔ اس کی باتوں سے اگر اماں کو کچھ اندازا ہو گیا ہو تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" شگفتہ غفار نے بڑی ڈھٹائی سے اپنا دامن بچا لیا تو ریاض غفار کو شدید غصہ آگیا۔

"بریرہ نے کوئی اوور ری ایکٹ نہیں کیا ہے۔ جو کیا ہے تم نے کیا ہے اور مستقل تم ہی سب کر رہی ہو۔"

"مجھ پر چلانے کی بجائے ایک بار الیان سے یہ تو پوچھ لیں کہ وہ اسے شاپنگ پر لے کر کیوں گیا؟" شگفتہ غفار نے ڈھٹائی کی حد کر دی تھی۔ ابھی بھی انہوں نے روہانسی ہوتے ہوئے مظلوم بن کر کہا تو ریاض غفار چیخ پڑے۔

"شگفتہ مجھے ہاتھ اٹھانے پر مجبور مت کرو وہ بھی جوان بیٹے کے سامنے۔" شگفتہ غفار کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا۔

وہ ریاض غفار کے منہ سے ایسی کسی بات کی توقع بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ جب خود کو غلط ہی نہیں مان رہی تھیں۔ تو ریاض غفار کا خود پر چلانا اور غصہ کرنا کیسے صحیح مان لیتیں۔ جبکہ ریاض غفار کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شگفتہ غفار کو اٹھا کر چھت سے نیچے پھینک دیں۔

ان کی بیٹی آج شگفتہ غفار کی وجہ سے ان سے ملے بغیر چلی گئی۔ پتا نہیں وہ نانی اماں کے سامنے کتنی شرمندہ ہوئی ہو گی۔ جانے اس کے دل پر اس وقت کیا بیت رہی ہو گی۔

"ڈیڈی۔ ڈیڈی آپ پلیز ریلیکس ہو جائیں۔" الیان نے گہرا سانس کھینچتے ہوئے انہیں ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"کیسے ریلیکس ہو جاؤں۔ باتیں سنی ہیں تم نے اپنی ماں کی۔" ریاض غفار بھنا کر بولے۔

"ممی سے میں بات کرتا ہوں۔ آپ جائیں یہاں سے۔" الیان نے ایک نظر ماں کے چہرے پر ڈالی' جو ریاض غفار کی بات سن کر صدمے سے سفید پڑ گیا تھا۔ ریاض غفار' الیان کی بات پر فوراً' کچھ نہیں بولے۔ کچھ دیر وہ کھڑے غصے سے انجان بنی بیٹھی۔ شگفتہ غفار کو گھورتے رہے۔ پھر پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

الیان کو بھی غصہ تو بہت آرہا تھا۔ مگر اسے پتا تھا اس معاملے کو غصے سے نہیں بلکہ سمجھ داری سے سلجھانا تھا۔ لہٰذا وہ خود پر ضبط کرتا ان کے نزدیک چلا آیا اور عین ان کے سامنے بستر پر بیٹھ گیا۔

"ہم سب جانتے ہیں آپ رومیلہ سے نفرت کرتی ہیں۔ میں آپ کی نفرت کو غلط نہیں کہوں گا۔ لیکن اس کا اظہار جب آپ دوسروں کے سامنے کرتی ہیں تو لوگ حیران ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ ہم سب کا تماشا بنتا ہے۔ لوگ جتنا مشکوک ہوں گے اتنا ہی کریدیں گے۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ بریرہ کے اغوا کی بات سب کو پتا چل جائے۔" بیٹے کے نرمی سے بات کرنے پر شگفتہ غفار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور ایک بار پھر مظلوم بنتے ہوئے نروٹھے پن سے بولیں۔

"تو تم کیوں ایسی حرکتیں کرتے ہو کہ میں بھڑکنے پر مجبور ہو جاؤں۔ تمہیں نہیں پتا وہ بہت چالاک ہے۔ تم پر ڈورے ڈال رہی ہے اور تم اس کے جال میں پھنستے جا رہے ہو۔"

"وہ مجھے نہیں پھنسا رہی' میں خود اسے شاپنگ پر لے کر گیا تھا۔ اس نے یونیورسٹی جوائن کی تھی اور اس کے پاس کپڑے تک نہیں تھے۔ لوگ نہیں جانتے کہ ہماری شادی کن حالات میں ہوئی ہے۔ دنیا کی نظر میں وہ میری بیوی ہے۔ اس کے اسٹینڈرڈ سے رہنے یا نہ رہنے سے میری عزت پر حرف آتا ہے۔" الیان دل ہی دل میں زچ ہو جانے کے باوجود سانیت سے بولا۔

"اسی بات کا تو وہ فائدہ اٹھا رہی ہے کہ دنیا کی نظر میں وہ تمہاری بیوی ہے اور دیکھ لینا ایک دن وہ سچ مچ تمہاری بیوی بن جائے گی۔" شگفتہ غفار نے دانت پیسے۔

"وہ فائدہ نہیں اٹھا رہی آپ ان سیکیور فیل کر رہی ہیں اور آپ ساری زندگی ایسے ہی ہنگامے کرتی رہیں گی۔ کبھی کسی کے سامنے' تو کبھی کسی کے سامنے۔ ہم نے بریرہ کا گھر تو بسا لیا۔ لیکن اپنے گھر کا سکون ختم کر لیا۔ میں رومیلہ کو اپنا نہیں سکتا۔ کیونکہ اسے اس گھر میں کبھی بہو کا درجہ نہیں ملے گا۔ میں دوسری شادی بھی نہیں کر سکتا کہ جس لڑکی کو آپ برداشت نہیں کر پا رہیں اس کی سوتن کیسے سہیں گی۔ میری زندگی تو اور اجیرن ہو جائے گی۔ آخر میں کروں تو کیا کروں؟" الیان کی بات پر وہ تڑپ اٹھیں۔

"اسی لیے تو مجھے اس لڑکی سے نفرت ہے۔ جس نے میرے دونوں بچوں کی زندگی جہنم بنا دی ہے۔"

"اس نے نہیں' ہم نے خود اپنی زندگی جہنم بنائی ہے۔ ہم نے صرف بدنامی کے ڈر سے اس کے بھائی کی شرط مان لی۔ اگر اس وقت میں نے ذرا سا خود غرض بن کر رومیلہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہوتا تو آج میں اس ذہنی کرب سے نہ گزر رہا ہوتا۔ میں نے ابرار کے بارے میں سب پتا کرایا ہے۔ وہ کوئی جرائم پیشہ آدمی نہیں ہے۔ نہ ہی اس کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ ہے۔ اگر ہم لوگ اس وقت بارات لانے سے انکار کر دیتے تو وہ بریرہ کو ایسے ہی چھوڑ دیتا۔ میں نے بہن کا گھر بچانے کے لیے اپنی زندگی تباہ کر لی۔" الیان بڑی سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ شگفتہ غفار کچھ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"وہ اگر بریرہ کو نہ چھوڑتا تو بھی ہم لوگوں کی زندگی جہنم بنی ہوتی تم نے اس وقت جو فیصلہ کیا۔ بالکل صحیح کیا۔ تم بہن کی زندگی اور عزت بچا کر پچھتا رہے ہو۔" شگفتہ غفار حیرانی سے بولیں۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا ان کا بیٹا یہ سب کہہ رہا ہے۔ وہ بغور اسے دیکھنے لگیں۔ جس کا چہرہ پرسوز نہیں۔ البتہ پرسوچ ضرور تھا۔

"بریرہ کی عزت اور زندگی ابرار کے پاس محفوظ تھیں۔ بس ہم لوگ کچھ زیادہ ہی گھبرا گئے تھے یا شاید ہمارے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔"

"میں تمہاری بات سے بالکل متفق نہیں ہوں۔" شگفتہ غفار ایک دم سختی سے بولیں۔

"تم شاید اس وقت کی شدتوں کو بھول گئے۔ مگر مجھے سب یاد ہے۔ جو لوگ ایک لڑکی کو اغوا کر سکتے ہیں وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ان سے کسی قسم کی انسانیت کی توقع رکھنا بے وقوفی ہے۔ ہم لوگ اس وقت گھبرائے نہیں تھے۔ بلکہ ہم لوگوں نے وہی کیا جو ان حالات میں کوئی بھی کرتا۔ بریرہ ساتھ خیریت کے گھر آگئی۔ ہمارے لیے اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں۔" شگفتہ غفار کی بات پر الیان بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"مگر آپ کے لیے بریرہ کے ساتھ خیریت سے گھر آجانے سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے تو آج آپ ہر وقت شکوہ کناں کیوں رہتی ہیں۔ رومیلہ کو دیکھتے ہی آپ کے اندر نفرت کا ایک سیلاب کیوں امڈنے لگتا ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ اس کے بھائی نے آپ کی بیٹی کو عزت سے گھر پہنچا دیا۔ آپ کیوں ہر وقت یہ سوچ کر انگاروں پر لوٹتی ہیں کہ اس کے بھائی نے آپ کی بیٹی کو اغوا کیا تھا اور آپ کے ایک ہی بیٹے کو ایک زبردستی کی شادی پر مجبور کر دیا۔

ممی جس طرح حادثوں سے زندگی رک نہیں جاتی، ٹھیک اسی طرح کسی ایک کامیابی پر زندگی بھر خوش بھی نہیں ہوا جا سکتا۔ اس وقت بریرہ کو بچانے کے لیے ہمیں جو صحیح لگا وہ ہم نے کیا۔ لیکن اب وہ وقت گزر گیا ہے۔ اب ہمارے سامنے دوسرے مسائل ہیں۔ اب ہمیں ان سے نبٹنا ہے۔ جس میں سرفہرست گھر کا سکون ہے۔ جو بالکل ختم ہو چکا ہے۔" الیان کے عجیب و غریب لہجے پر شگفتہ غفار الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"تم کیا سوچ رہے ہو، الیان تمہارے ارادے کیا ہیں؟" الیان جیسے کسی سوچ سے چونک کر انہیں دیکھنے لگا اور دیکھتا چلا گیا۔ مگر شگفتہ غفار کو بدستور اپنی جانب سوالیہ انداز میں دیکھتا پا کر اسے کہنا پڑا۔

"میں رومیلہ کو طلاق دے رہا ہوں۔" شگفتہ غفار کو لگا جیسے ان کے سر پر کوئی بم پھٹ گیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے الیان کو دیکھنے لگیں۔

"الیان۔۔۔ تم جانتے ہو۔۔۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔" وہ کانپتی آواز میں بولیں۔

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔" الیان ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"فیصلہ!" شگفتہ غفار نے بے یقینی سے دہرایا۔

"جی ممی! میں مشورہ نہیں کر رہا۔ میں فیصلہ سنا رہا ہوں۔ میں نے تو ڈائیورس پیپرز تک بنوا لیے ہیں۔ میں اس روز، روز کی چخ چخ سے تنگ آگیا ہوں۔" الیان کے چہرے پر مذاق کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ پوری سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ پھر یہ وقت کوئی مذاق کا تھا بھی نہیں۔ نہ ہی ایسی باتیں مذاق میں کی جاتی ہیں۔

"الیان۔۔۔" شگفتہ غفار سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ پھر بھی وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"ابرار! حامد کو سب بتا دے گا۔۔۔ بریرہ کا گھر اجڑ جائے گا۔"

"اس طرح خوف پر مبنی رشتہ ویسے بھی زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ حامد اگر بریرہ سے محبت کرتا ہے تو یہ سب جاننے کے بعد بھی اسے نہیں چھوڑے گا۔"

"یہ تم کون سی فلمی باتیں کر رہے ہو۔ مرد خود چاہے جو بھی کرلے، عورت کے کردار پر شک کی پرچھائیں تک برداشت نہیں کر سکتا اور یہاں تو صرف شک نہیں، ایک دھوکے والی بات ہے کہ اتنا کچھ ہوا اور ہم سب چھپا گئے۔ بریرہ تو برباد ہو گی۔ میرا میکا بھی چھٹ جائے گا۔" شگفتہ غفار کی آنکھوں میں خوف ہی خوف تیر رہا تھا۔

"تو آپ کیا چاہتی ہیں، میں ساری زندگی اس لڑکی کو برداشت کرتا رہوں۔ مجھے ایک نارمل بیوی چاہیے، جسے گھر میں گھر کے فرد کی حیثیت حاصل ہو۔ آپ کے اور اس کے بیچ کبھی کبھی ساس، بہو والی روایتی جھڑپ ہو جاتی ہے تو وہ ایک نارمل بات ہے۔ لیکن جس لڑکی سے آپ اتنی نفرت کرتی ہیں کہ اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتیں۔ اس کے ساتھ میں اپنی پوری زندگی کیسے گزار سکتا ہوں۔

ہر آئے گئے کے سامنے روز تماشے ہو رہے ہوں گے۔ میری بیوی اگر ذلیل ہوتی ہے تو بے عزتی میری بھی ہوتی ہے۔ میں اسے نارمل بیوی کی طرح کہیں لے جا نہیں سکتا۔ یعنی اپنی زندگی انجوائے ہی نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے آپ کو ذرا سا بدلنے کے لیے تیار نہیں تو آخر ساری قربانی میں ہی کیوں دوں۔ آج نانی اماں کو شک ہو گیا ہے۔ کل کو دوسروں کو بھی ہو جائے گا۔ نانی اماں مستقل بریرہ کو اتنا کریدیں گی کہ ایک دن کسی کمزور لمحہ کی زد میں آکر بریرہ انہیں سب سچ بتا دے گی۔

اور وہ جو کہتے ہیں نا کہ جس راز کی حفاظت تم خود نہیں کر سکتے۔ اس کی حفاظت کوئی دوسرا بھی نہیں کر سکتا۔ نانی اماں کے ذریعے یہ بات دوسروں کو پتا چل ہی جائے گی۔ ہم بلاوجہ ایک ایسی بات کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جسے ہم خود اچھال رہے ہیں۔" الیان کہتا چلا گیا۔

اس کے منہ سے نکلے ہر لفظ کے ساتھ شگفتہ غفار کی بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔ انہیں کسی کل چین نہیں آرہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کسی بھی طرح طلاق کا خیال الیان کے ذہن سے کھرچ کر پھینک دیں۔ مگر وہ جس طرح بات کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ ہر پہلو پر سوچے بیٹھا ہے۔

"الیان۔۔۔ الیان تم جذباتی ہو رہے ہو۔ تم یقین کرو آئندہ میں کسی کے سامنے کچھ نہیں کہوں گی۔ میں رومیلہ کو بہو کی حیثیت سے قبول نہیں کر سکتی۔ لیکن میں اس کی طرف سے لاتعلق بن جاؤں گی۔ میں اس کے کسی معاملے میں دخل نہیں دوں گی۔" شگفتہ غفار جلدی جلدی لجاجت سے کہنے لگیں۔

"وہ بات مت کہیں، جس کے بارے میں آپ خود بھی جانتی ہیں کہ آپ اسے نہیں نبھا سکیں گی اور پھر میں نے شادی سے پہلے ہی کہہ دیا تھا میں اسے ہمیشہ کے لیے نہیں اپنا رہا۔ ایک دن میں اس سے جان چھڑا لوں گا۔

آپ جانتی ہیں میں جو کہتا ہوں اس پر قائم رہتا ہوں۔ ابرار نے یہی سوچ کر یہ شادی کی تھی کہ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ میں اسے بتانا چاہتا ہوں وہ اور لوگ ہوتے ہیں جو سمجھوتے کرتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے یہی سوچ کر میرا نام استعمال کر کے لڑکی سے دوستی کی تھی کہ میں کچھ دن ناراض رہ کر ٹھیک ہو جاؤں گا۔ لیکن میں نے آج تک اس سے دوبارہ بات نہیں کی۔" الیان اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ اس کے لہجے سے اس کے اندر کے غصے اور اپنی بات پر اڑے رہنے کی ضد صاف محسوس ہو رہی تھی۔ شگفتہ غفار بھی گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ گئیں۔

"لیکن الیان۔۔۔ بریرہ۔۔۔"

"میں کہہ رہا ہوں نا آج نہیں تو کل حامد سب جان ہی جائے گا۔ پھر کیا فائدہ ہے اتنی تکلیف اور ذہنی اذیت سہنے کا۔" الیان نے چڑے ہوئے انداز میں ان کی بات کاٹ دی۔ وہ تو کچھ سننے کے لیے ہی تیار نہیں تھا۔ تو وہ الجھ کر کہنے لگیں۔

"یہ تمہیں اچانک کیا ہو گیا الیان۔۔۔ میں نے تو تمہاری آنکھوں میں رومیلہ کے لیے پسندیدگی دیکھی تھی۔ میری نظریں اتنا بڑا دھوکا تو نہیں کھا سکتیں۔"

"یہی تو خوف ہے آپ کا جو ہم سب کے لیے مصیبت بن گیا ہے۔" الیان تلخی سے بولا۔

"خوف نہیں میرا مشاہدہ ہے اور ایک ماں اپنی اولاد کے متعلق اتنا غلط اندازا نہیں لگا سکتی۔" شگفتہ غفار پورے وثوق سے بولیں تو الیان فوری طور پر کچھ نہ بولا اور خاموشی سے کھڑکی میں کھڑا رہا۔ پھر اچانک گہرا سانس کھینچتے ہوئے ان کی طرف پلٹ گیا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے اس نے پشت کھڑکی کے شیشے سے ٹکالی۔

"رومیلہ اچھی لڑکی ہے مجھے واقعی پسند ہے۔ اگر عام حالات میں میری اس سے شادی ہوئی ہوتی تو میں اس کی رفاقت میں بہت خوش ہوتا۔

لیکن جن حالات میں میں نے اسے اپنایا ہے آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں اسے اتنی آسانی سے قبول کرلوں گا۔ اس طرح تو ابرار جیت جائے گا۔" الیان اب بڑے سکون سے بات کر رہا تھا۔

"لیکن بہن کی زندگی تباہ کرکے اگر تم نے ابرار کو ہرا بھی دیا تو کیا فائدہ۔" اسے اپنے فیصلے پر اٹل دیکھ کر شگفتہ غفار شکست خوردہ لہجے میں بولیں۔

"ٹھیک ہے اگر آپ اسے ویسے ہی اپنا لیں جیسے آپ اپنے چاؤ اور ارمانوں سے بیاہی بہو کو رکھتیں تو میں اپنا فیصلہ بدل دیتا ہوں۔" الیان کی بات پر وہ کچھ روہانسی سی ہو گئیں۔

"الیان... یہ میرے اختیار سے باہر کی چیز ہے۔ میں اس کے ساتھ اپنا رویہ بہتر تو کرسکتی ہوں۔ لیکن اسے خلوص اور محبت نہیں۔"

"آپ اس کے ساتھ رویہ بہتر بھی نہیں کرسکتیں۔ میں جب اس سے باتیں کروں گا۔ اس کے ساتھ کہیں باہر جاؤں گا۔ اسے گھمانے لے جاؤں گا۔ آپ ایسے ہی گھر میں شو ڈاؤن کیا کریں گی۔ جیسے آپ اب تک کرتی آئی ہیں۔ جب آپ کو اس سے اتنی نفرت ہے تو میں اس سے کیسے محبت کرسکتا ہوں۔" الیان بڑی صاف گوئی سے بول رہا تھا۔

شگفتہ غفار نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ لیکن وہ محض دو، تین گہری سانسیں کھینچ کر رہ گئیں۔ جیسے کہنے کے لیے ان کے پاس کچھ ہو ہی نہیں۔ وہ الیان سے متفق تھیں، بس بریرہ کا خیال انہیں بے چین کیے دے رہا تھا۔ الیان کچھ دیر ان کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

اس نے سنا تھا۔ دنیا میں لوگوں کے ساتھ بہت بڑے بڑے دھوکے ہوتے ہیں۔ لیکن اس نے کبھی یہ نہیں سنا تھا کہ والدین نے اپنی اولاد کے ساتھ کوئی دھوکے بازی کی ہو۔

اب یہ زوبیہ کی کم علمی تھی یا اس کا نصیب، یہ تو وہ نہیں جانتی تھی۔ البتہ جب سے خرم اس سے مل کر گیا تھا اور شائستہ خالہ کی کہانی کے متعلق اسے بتایا تھا۔ تب سے وہ بالکل سن ہو گئی تھی۔

اسے لگتا جیسے خرم نے اسے جھوٹ بول کر مطمئن کردیا کہ شائستہ نامی کوئی لڑکی ہے ہی نہیں۔ لیکن پھر اسے وہ وقت یاد آتا۔ جب بلال اختر نے وہ گھر بیچنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس وقت عائشہ اختر کتنی دکھی تھیں۔ یہاں تک کہ زوبیہ نے ان سے پوچھ لیا تھا کہ یہ کوئی ان کا آبائی گھر نہیں ہے۔ بلال اختر تو اس گھر میں بچپن سے رہے ہیں۔ جب انہیں اتنا دکھ نہیں تو آپ کو اس قدر تکلیف کیوں ہو رہی ہے۔

عائشہ اختر نے ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی زوبیہ کی باتوں کو نظر انداز کردیا۔ مگر ان کے چہرے کے تاثرات یاد کرنے پر اسے لگتا خرم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ بات تو اس نے خود اپنے کانوں سے عائشہ اختر کو کہتے سنی تھی کہ اس

گھر کی خاطر انہوں نے بڑی قربانیاں دیں۔ جس گھر کی خاطر انہوں نے سب کچھ کھو دیا۔ بلال اختر اسے ایسے نہیں بیچ سکتے۔

اگر وہ سیدھے سادے طریقے سے شادی ہو کر اس گھر میں آئی تھیں تو بھلا وہ قربانیاں کون سی تھیں جو انہوں نے اس گھر کی خاطر دیں اور پھر سب سے بڑھ کر عائشہ اختر کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ والدین حیات نہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان بالکل تنہا ہو جائے۔ بھائی، بہن نہ سہی، لیکن کوئی کزن، کوئی دور پرے کا رشتے دار تو ہونا چاہیے۔

اگر خرم کی کہانی سچ نہیں بھی تھی تب بھی یہ تو ضرور سچ تھا کہ انہوں نے ایسا کچھ ضرور کیا تھا کہ سارا خاندان چھوٹ گیا یا انہیں چھوڑنا پڑا۔

ورنہ بلال اختر اور عائشہ اختر دونوں اس قدر سوشل تھے کہ ان کا روزنہ سہی، کم از کم عید بقر عید پر تو کسی رشتے دار کے گھر آنا جانا ہونا چاہیے تھا۔ جیسے بلال اختر کے کزنز وغیرہ سے عید وغیرہ پر سال کے سال ملاقات ہو جاتی تھی۔

مگر ان تمام باتوں سے ہٹ کر جب وہ شائستہ خالہ کے بارے میں سوچتی اسے ساری باتیں بکواس لگنے لگتیں۔ حالانکہ اس نے بہت یاد کرنے کی کوشش کی کہ شائستہ خالہ کا نام، ان کے ساتھ ہوا حادثہ، ان کا قتل یا خودکشی اور ان کی لاش کا آج تک نہ ملنا۔ یہ سب باتیں اسے کس نے بتائیں۔ مگر بہت یاد کرنے پر بھی اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ بس اسے یہ پتا تھا کہ وہ یہ سب جانتی ہے۔ اگر یہ سب اسے اس کی دادی نے بتایا تھا تو دادی کی تو وہ شکل تک بھول گئی تھی۔ بس ایک ہیولا سا یاد تھا۔ سر پر سفید دوپٹا اوڑھے خاصی بھاری جسم کی عورت تھیں۔ باقی ناک نقش تو تصور کرنے پر بھی یاد نہیں آتے تھے۔ پھر ان کی بتائی باتیں اسے اب تک کیوں یاد تھیں۔ کیا اس لیے کہ یہ کہانی اس کے ذہن پر سوار ہو چکی تھی اور وہ ہر دوسرے دن ان کے متعلق سوچتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ یہ سب بھی بھول نہیں سکی۔

لیکن وہ یہ سب کیوں سوچتی ہے۔ بچپن سے کیا اس کے پاس سوچنے کے لیے اور کچھ نہیں تھا جو وہ ان خرافات پر غور کرتی رہی۔ نہیں بلکہ بچپن سے وہ بھیانک چہرہ جو اس کے سامنے موجود رہتا تھا۔ اسے کسی اور چیز پر توجہ دینے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا اور یہ چہرہ تو اس کا وہم نہیں تھا۔

حالانکہ کتنے سائیکاٹرسٹ نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ یہ "اس کا وہم ہے" لیکن اپنے سامنے کھڑے خون میں چھپے چہرے کو وہ "وہم" کہہ کر بھی نظر انداز نہ کرسکی۔ پھر اس پر وہ بھیانک اسکیچز....

جس کے لیے ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ زوبیہ خود اپنی بے خبری میں اپنے ہاتھوں سے بناتی ہے اور پھر بھول جاتی ہے کہ یہ اس نے بنائے ہیں۔ ہوش میں آنے یا ایک طرف سے نیند سے جاگنے پر اسے لگتا ہے یہ شائستہ خالہ کی روح بنا کر گئی ہے۔

اگر یہ تصویریں شائستہ خالہ کی روح کے بجائے وہ خود بناتی ہے تو وہ ہمیشہ ایک مخصوص قسم کی کیوں بناتی ہے۔ کبھی کچھ منفرد یا معمول سے مختلف کیوں نہیں ہوتیں۔ کیا اس کا لاشعور بس ایک ہی نکتہ پر مرکوز رہتا ہے۔ یہ وہ سوال تھے جن کا جواب سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہو گیا تھا۔

ڈاکٹرز کو اس نے باتیں کرتے سنا تھا کہ اس کی حالت میں کوئی بہتری نہیں ہو رہی ہے۔ بلکہ اس کا دورہ پڑنے کا دورانیہ بڑھتا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس کی دوائیوں کی خوراک بڑھا دی جائے۔

جبکہ اسے لگتا تھا وہ یہاں شائستہ خالہ کی وجہ سے آئی ہے اور یہاں آکر شائستہ خالہ اس کے اور قریب آگئی ہیں۔ اس کے پاس کمرے میں کہیں کوئی آئینہ نہیں تھا نہ ہی اس کے باتھ روم میں ہی یہ سہولت میسر تھی۔

البتہ ایک دن جب ایک ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے اسے کمرے سے باہر لے کر گئے، تب ایک کھڑکی کے شیشے میں اس نے اپنا عکس دیکھا اور ٹھٹک گئی۔ وہ سفید سیدھا پاجامہ اور ڈھیلی سی سفید قمیص اور دوپٹا میں ملبوس تھی۔ بالوں کی سیدھی سے چوٹی بنائے وہ ہمیشہ سے قطعاً "مختلف کوئی اور ہی لڑکی لگ رہی تھی۔ وہ جیسے خود کو پہچانی ہی نہیں۔ پھر اس کے ذہن میں ایک دم جھماکا ہوا اور وہ ششدر سی کھڑی خود کو دیکھتی رہ گئی۔ اپنا یہ روپ اس نے ایک بار پہلے بھی دیکھا تھا۔ مگر آئینے میں نہیں۔ اپنے کمرے میں اپنے روبرو ٹھیک اسی طرح کا لباس پہنے ایسے ہی بال بنائے۔ ایسا ہی ایک روپ اس کے کمرے میں اس کے بستر پر بیٹھا تھا۔

تب اس لڑکی کی ایک جھلک دیکھ کر وہ یہی سمجھی تھی کہ اس نے خود کو دیکھا تھا۔ لیکن نہیں، اس دن اس نے پہلی بار شائستہ خالہ کا نارمل چہرہ دیکھا تھا۔ زخموں اور خون کے بغیر بالوں کی چلمن سے عاری وہ صاف شفاف چہرہ شائستہ خالہ کا ہوگا۔ تو کیا شائستہ خالہ اور اس میں اتنی مشابہت تھی۔ لیکن شائستہ خالہ نے یہ بیماروں والا لباس کیوں پہن رکھا تھا؟ کیا وہ بھی اس کی طرح کسی اسپتال میں ایڈمٹ ہوئی تھیں۔ یہ وہ سوال تھے جو اسے ہر وقت بے چین رکھتے۔

ایک دن اس سے ملنے ڈاکٹر شکیلہ آئیں تو وہ ان کے سامنے بری طرح رو دی۔

"مجھے یہاں سے نکال لیں۔ پلیز میں پاگل نہیں ہوں۔ مگر یہاں رہتے رہتے پاگل ہو جاؤں گی۔" ڈاکٹر شکیلہ کے چہرے پر تاسف پھیلا تھا۔ ان کی اتنی پرانی پیشنٹ اس حال کو پہنچ گئی تھی۔ انہیں خود بھی دکھ تھا۔ مگر وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

بلال اختر نے حمید کے والد سے بات کی تھی۔ ان کی منت سماجت تک کی تھی۔ منہ مانگی رقم کی پیش کش کی تھی۔ مگر وہ کسی طور نہیں مانے کیس واپس لینے کے لیے تو پھر بھلا ڈاکٹر شکیلہ کیا کر سکتی تھیں۔ وہ اس کا کندھا تھپکتے ہوئے اسے جھوٹی تسلیاں دینے لگیں۔

وہ ماہر نفسیات تھیں۔ حالات بھلے ہی بدل نہ سکیں۔ مگر وقتی طور پر اپنے مریض کی سوچوں کا زاویہ ضرور بدل سکتی تھیں۔ بھلے ہی کچھ دیر بعد مریض واپس اپنے نکتہ نظر پر لوٹ آئے۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے وہ ضرور لوگوں کو بہلا لیا کرتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ اس کا ذہن بٹانے میں کامیاب ہو گئیں تو زوبیہ نے انہیں شائستہ خالہ کے اس حلیے میں ایک بار دیکھے جانے والی بات انہیں بتا دی۔ انہوں نے اسے بغور سننے کے بعد ایک بار پھر سمجھانا شروع کر دیا۔

"تمہیں جو بھی چہرہ نظر آتا ہے تم اسے شائستہ خالہ سے منسلک کر دیتی ہو۔ تم نے ٹی وی پر کسی مریضہ کو دیکھا ہوگا۔ اسپتال کا یونیفارم ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب تم نے خود کو ان کپڑوں میں دیکھا تو تمہیں کسی فلم یا ڈرامے کا کوئی سین یاد آگیا اور بس۔ جب تک تم یہ نہیں مانو گی کہ شائستہ خالہ جیسی کوئی عورت یا لڑکی ہے ہی نہیں۔ تب تک تم یہاں سے نہیں نکل سکتیں۔" ڈاکٹر شکیلہ نے نہایت رسانیت سے ایک بار پھر جھوٹ بولا۔

کیونکہ اب اگر وہ یہ مان بھی لیتی کہ شائستہ خالہ تو ہے ہی نہیں۔ تب بھی وہ یہاں سے نہیں نکل سکتی تھی۔

زوبیہ ان کی بات پر کچھ خاموش ہو گئی۔ پھر بڑبڑانے والے انداز میں کہنے لگی۔

"ہاں خرم نے تو بہت کوشش کی مجھے یقین دلانے کی کہ...." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"خرم؟ کون خرم؟" ڈاکٹر شکیلہ چونکیں تو زوبیہ بھی چونک اٹھی اور بات بدلتے ہوئے بولی۔

"میرا ایک میسج مما کو دے دیجیے گا۔ ان سے کہیے گا زوبیہ نے پوچھا ہے۔ کیا میرے کسی کزن کا نام الیان ہے۔"

"کیوں تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو۔" ڈاکٹر شکیلہ نے پوچھا تو زوبیہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"یہ مت پوچھیں آپ۔ بس میرا یہ میسج مما کو دے دیں۔" ڈاکٹر شکیلہ صرف اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

زوبیہ، عائشہ اختر کا ردعمل دیکھنا چاہتی تھی۔ جس سے خرم کی بات کے سچ جھوٹ ہونے کا خود ہی پتا چل جانا تھا اور واقعی اگلے دن عائشہ اختر کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ سن کھڑی رہ گئی۔

"تو کیا واقعی خرم سچ کہہ رہا ہے۔" زوبیہ سکتے کے عالم میں انہیں دیکھے گئی۔ جن کے چہرے پر الجھن ہی الجھن نمایاں تھی۔

"تم نے یہ کیوں پوچھا کہ تمہارے کسی کزن کا نام الیان ہے؟" ان کے لہجہ میں بے چینی تھی۔ زوبیہ سپاٹ نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

"بولو نا ڈاکٹر شکیلہ سے، تم نے پوچھا ہے کہ کیا میرے کسی کزن کا نام الیان ہے۔ اس۔ اس سوال کا کیا مطلب ہے۔" عائشہ اختر کا چہرہ ہر وقت میک اپ کی دبیز تہ میں چھپا رہتا تھا۔ مگر اس وقت ان کے چہرے کی ساری جھریاں ___ صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

زوبیہ کے پاگل خانے جانے کے بعد سے ان کے چہرے پر وہ شادابی نہیں رہی تھی جو ان کا خاصہ تھی۔ ان کی گردن جو ہر وقت خوب صورتی سے تنی رہتی تھی۔ وہ بھی ان کے کندھے جھک جانے کے باعث ان کی نڈھال شخصیت کی ہی عکاسی کر رہی تھی اور آج تو جیسے وہ ایسے ہی اٹھ کر آگئی تھیں بالکل سادہ۔

"بولو نا زوبیہ میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔" وہ زچ ہو کر بولیں۔

"آپ تو کہتی ہیں صرف ہفتہ میں ایک دفعہ مجھ سے ملنے آسکتی ہیں۔ کورٹ کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔ پھر آج چار دن پہلے اسپتال کے عملے نے آپ کو اندر کیسے آنے دیا۔" زوبیہ بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔

"بے کار کی باتیں مت کرو میرے سوال کا جواب دو۔" وہ تپ گئیں۔

"آپ نے وارڈ بوائے کو پیسے کھلائے ہوں گے اندر آنے کے لیے۔ مجھے پتا ہے یہاں پیسے کھلا کر اندر ہی اندر بہت کام ہو جاتے ہیں۔ لیکن مجھے تو آپ کی بے چینی پر حیرت ہے کہ کل میں نے میسج دیا اور آج آپ میرے سامنے ہیں۔" زوبیہ کے اطمینان سے کہنے پر وہ جھنجلا کر بولیں۔

"ظاہری بات ہے اس چار دیواری میں بیٹھ کر بھی اگر تم ایسے سوال پوچھو گی تو میں تو پریشان ہوں گی نا کہ آخر تمہاری کس سے ملاقات ہوئی ہے۔ جو تم اس طرح کی باتیں پوچھ رہی ہو۔"

"یہ سب چھوڑیں، آپ یہ بتائیں جو گھر ہم نے بیچ دیا وہ آپ کا آبائی گھر تھا۔ آپ اپنی والدہ اور بھائی بھابھی کے ساتھ اس میں رہتی تھیں۔" عائشہ اختر کی رنگت خطرناک حد تک زرد ہو گئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے زوبیہ کو دیکھے گئیں۔ ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ خرم کی کہی باتیں سچ ہیں۔ جب یہ سب سچ تھا تو وہ سب بھی سچ ہوگا جو اس نے شائستہ خالہ کے متعلق بتایا تھا۔

"تم ___ تم کیسے ملی تھیں۔" عائشہ اختر کی آواز لرز رہی تھی۔ زوبیہ کو مزید کسی سوال کے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے دیوار کو دیکھنے لگی۔ ایک عجیب سے ملال نے اس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیا تھا۔

اس کی ماں نے اپنی ماں سے اتنا بڑا دھوکا کیا۔ اس کے باپ نے اپنے والدین سے اتنے جھوٹ بولے اور اس کے ماں، باپ نے اسے ہمیشہ جھڑک کے خاموش کر دیا۔ کبھی سچائی سے آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

عائشہ اختر اسے چپ دیکھ کر اس کے نزدیک چلی آئیں اور اس کے بال سہلانے لگیں۔ انہیں اجازت تھی وہ اس کے کمرے میں آسکتی تھیں اور اس وقت تو وہ اتنی موٹی رقم کھلا کر آئی تھیں کہ انہیں کہیں بھی جانا منع نہ ہوتا۔

"کیا یہاں کوئی تم سے ملنے آیا تھا۔" وہ اب محبت سے پوچھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ زوبیہ گردن گھما کر خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ جب انہوں نے کبھی اسے کچھ نہیں بتایا تو وہ انہیں کیوں بتاتی' اس نے بڑے اعتماد سے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں مجھ سے بھلا کون ملنے آئے گا۔ کسی کو اجازت بھی نہیں ہے۔ یہ سب تو مجھے شائستہ خالہ نے بتایا تھا کہ آپ نے اور پاپا نے کس طرح دادا' دادی سے جھوٹ بول کر ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔" عائشہ اختر بے یقینی سے زوبیہ کو دیکھے گئیں۔ جیسے ان کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ کیا بولیں۔ آخر کافی دیر بعد انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"تمہاری شائستہ خالہ نے کوئی بکواس کی ہے۔ ہم نے تو کوئی جھوٹ نہیں بولا اگر ہم نے جھوٹ بولا ہوتا تو سب سے پہلے تو ان کے وجود کا ہی انکار ہوتا ہے نا۔ جب وہ کبھی تھیں ہی نہیں تو ان کی روح کہاں سے آگئی۔" اپنے طور پر انہوں نے بڑے پتے کی بات کی تھی۔ مگر زوبیہ کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ ابھر آئی۔

"میں نے یہ کب بتایا تھا کہ آپ دونوں نے دادا' دادی سے کیا جھوٹ بولا۔ میں نے تو یہ کہا ہی نہیں کہ وہ کبھی تھیں ہی نہیں۔" عائشہ اختر جیسے سٹپٹا گئیں۔ ان سے کوئی بات نہیں بن رہی تھی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں ذرا تمہارا واش روم یوز کر رہی ہوں۔" وہ یہ کہتی تیزی سے واش روم چلی گئیں۔

زوبیہ اپنی جگہ بیٹھی رہی تب ہی پرس میں رکھا ان کا موبائل بجنا شروع ہو گیا۔ زوبیہ نے اٹھ کر ان کا پرس کھولا۔ ان کی دوست فرح کا فون آرہا تھا۔

زوبیہ نے سوچا تھا اگر پاپا کا فون ہو گا تو وہ بات کرلے گی۔ ان کی دوست کا نام دیکھ کر وہ موبائل واپس پرس میں رکھنے لگی کہ تب ہی اس کی نظر ان کے پرس میں پڑے والٹ پر پڑی۔

ہر وقت کڑک نوٹوں سے بھرا ان کا والٹ پھولا ہی رہتا تھا۔ زوبیہ نے ایک نظر باتھ روم کے بند دروازے پر ڈالی اور پھر والٹ کھول کر اس میں سے ہزار' ہزار کے کئی نوٹ نکال کر پرس ویسے ہی بند کر کے رکھ دیا جیسے عائشہ اختر چھوڑ کر گئی تھیں۔

کچھ دیر بعد عائشہ اختر واش روم سے باہر آئیں تو ان کے چہرے کے تاثرات کافی بہتر ہو چکے تھے۔ انہیں یہ سوچ کر اطمینان ہو گیا تھا کہ زوبیہ کو یہ سب کسی مستند ذرائع سے پتا نہیں چلا ہے۔ لہٰذا وہ اسے آرام سے جھٹلا سکتی ہیں۔

وہ اسے بہت سارا پیار کر کے سمجھانے لگیں کہ فضول باتوں میں خود کو نہ الجھایا کرے۔ اس کے والدین اس سے بہت محبت کرتے ہیں اور اسے یہاں سے نکالنے کی کوششوں میں سرگرداں ہیں۔ وہ ان پر بھروسہ رکھے' وغیرہ وغیرہ۔

اسے پتا تھا کہ وہ اسے نکالنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ مگر وہ اسے کبھی نکال نہیں سکیں گے۔ اسے اب ساری زندگی یہیں رہنا تھا۔ اس بار ان کا واسطہ کوئی رخسار کے والدین سے نہیں پڑا تھا جو پیسہ دیکھ کر بیٹی کا سر پھٹ جانے کے باوجود خاموش ہو گئے۔ حمید کے والدین اسے ساری زندگی اس پاگل خانے میں سڑائیں گے۔ مگر وہ یہاں رہ کر حقیقتاً "پاگل" نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ اتنی بڑی رقم اس نے نکالی ہی اس لیے تھی کہ اسے پل بنا کر وہ یہاں سے آرام سے باہر جا سکتی تھی۔

اتنے دنوں سے وہ یہاں تھی۔ یہاں کے ماحول کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ یہاں وارڈ بوائے اور سسٹرز کو پیسہ کھلا کر بہت کام ہوتے تھے۔ نہ صرف لڑکیاں باہر جاتی تھیں بلکہ باہر سے بھی لوگ آتے تھے۔ اس کے ساتھ کسی نے ایسی کوئی کوشش کرنے کا سوچا ہی نہیں تھا کیونکہ وہ بہت بڑے باپ کی بیٹی تھی اور نئی آئی تھی۔ ورنہ وہ لڑکیاں

جو یہاں کئی سالوں سے تھیں اور کوئی ان سے ملنے تک نہیں آتا تھا۔ یہاں سے باہر کئی لوگوں کے پاس بھیجی جاتی تھیں۔

زوبیہ نے یہ سب عائشہ اختر کو بتانا چاہا تھا۔ مگر پھر یہ سوچ کر خاموش رہی کہ وہ لوگ اسے یہاں سے نکال تو نہیں سکتے۔ مگر یہ سب سن کر ان کا رہا سہا سکون ضرور ختم ہو جائے گا۔ اگر انہوں نے عملے کے خلاف کوئی ایکشن لینے کی کوشش کی تو بھی ایک دن میں وہ سب کچھ ٹھیک نہیں کر سکیں گے۔ جب تک وہ کوئی سدھار لانے کے قابل ہوں گے۔ تب تک یہاں کا عملہ زوبیہ کا دشمن بن جائے گا اور وہ سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں رکھ سکتی تھی۔

خاص طور پر ایسی صورت میں جب اس کے والدین اس کی طرف سے اتنے پریشان تھے۔ عائشہ اختر کے چہرے پر تو سالوں کی بیمار عورت جیسی نقاہت پھیل گئی تھی۔ اپنی ماں کی یہ حالت دیکھ کر اسے بہت دکھ ہوا تھا۔ بلال اختر کی حالت عائشہ اختر سے بہت بہتر تھی۔ مگر ان کے ہر انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اندر سے بالکل ٹوٹ گئے ہیں۔ زوبیہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ ایک بار یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تو پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جائے گی۔

بلال اختر اسے کسی دوسرے شہر تو کیا دوسرے ملک میں بھی آرام سے بھیج سکتے تھے۔ ان دونوں کی زندگی بھی آسان ہو جائے گی۔ ان کا جب دل چاہے گا وہ آکر اس سے مل لیں گے اور دنیا کے سامنے اسے غائب ہی ظاہر کرتے رہیں گے۔

ویسے بھی اس کی موجودگی ان لوگوں کے لیے شرمندگی کا ہی سبب بنی ہے اور اب اس قاتلانہ حملہ کے بعد تو ان کے پاس صفائی میں کچھ کہنے کے لیے بچا ہی نہیں تھا۔ لہٰذا نہ وہ کبھی لوگوں کے سامنے آئے گی اور نہ کبھی انہیں اس کے متعلق جھوٹ بول کر لوگوں کو مطمئن کرنا پڑے گا۔

لیکن وہ یہ سب انہیں بتا کر یا انہیں ساتھ ملا کر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس کے پاگل خانے سے فرار ہو کر زندگی بھر کے لیے روپوش ہونے پر کبھی رضامند نہیں ہوں گے۔ ان کی یہی کوشش ہو گی کہ کورٹ میں اسے بے گناہ ثابت کردیں۔ تاکہ پھر لوگ اس کی ذہنی حالت کی طرف سے مطمئن ہو جائیں اور وہ اس کی کسی اچھی جگہ شادی کردیں۔

لیکن زوبیہ ان دونوں کی طرح خوش فہم نہیں تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ یہاں سے کبھی نہیں نکل سکتی' وہ کبھی نارمل ثابت ہو گی اور نہ ہی نارمل لڑکیوں کی طرح زندگی گزارے گی۔ بلکہ اگر وہ یہاں رہتی رہی تو اس کی ذہنی حالت مزید ابتر ہو جائے گی۔

چنانچہ ان دونوں کو سمجھانے اور قائل کرنے کی بجائے مناسب یہی تھا کہ یہاں سے نکل کر ان سے رابطہ کیا جائے۔ تب وہ اس پر تھوڑا سا غصہ کرنے کے بعد اسے شہر یا ملک سے باہر نکالنے کی ہی کوشش کریں گے۔

عائشہ اختر کے چلے جانے کے بعد اسے گویا ایک مقصد مل گیا۔ وہ ہر وقت اس نرس کے انتظار میں رہنے لگی جس کے بارے میں اسے شک تھا کہ یہ لڑکیوں کو باہر بھیجتی ہے اور تیسرے دن زوبیہ کو اس سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

"مجھے صرف ایک رات کے لیے کسی سے ملنے جانا ہے۔ صبح میں واپس آجاؤں گی۔" زوبیہ نے بغیر کسی تمہید کے اس کے ہاتھ میں پانچ ہزار روپے رکھ کر یہ کہا تھا اور وہ بری طرح گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"اگر تم مجھے آج رات ہی نکال دو تو میں اتنی ہی رقم اور دے سکتی ہوں۔" زوبیہ بڑی دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔ وہ حیرانی سے زوبیہ کو دیکھنے لگی۔ دس ہزار ایک ہی رات میں کمانے کے خیال سے اس کی آنکھیں چندھیانے لگی تھیں۔

ڈھنگ۔ میں ایسے کام نہیں کرتی۔" اس نے اپنی صفائی دینا ضروری سمجھا۔ زوبیہ نے فوراً" اپنی تلخ مسکراہٹ کو روکا اور سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"تمہیں دس ہزار چاہئیں یا نہیں۔" وہ اس پر کوئی طنز نہیں کرنا چاہتی تھی' نہ ہی اس کا کوئی فائدہ تھا۔ وہ تو جلد از جلد اپنی بات منوانا چاہتی تھی۔ کیونکہ زوبیہ کو تو لوٹ کر آنا نہیں تھا۔ بعد میں اس لڑکی کی نوکری خطرے میں پڑ جاتی تھی۔

مگر زوبیہ کو اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ ذہنی طور پر بیمار لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ جو وہ کر رہی تھی اس کے بعد تو اسے دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کجا کہ اس اسپتال میں۔

"لیکن۔۔۔ تم کبھی باہر نہیں گئیں۔۔۔ اگر تم واپس نہ آئیں تو۔۔۔" وہ بہت زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔ زوبیہ مالی طور پر بہت مستحکم تھی۔ اس کا بیک گراؤنڈ بہت مضبوط تھا۔ وہ کوئی ایسی لڑکی نہیں تھی جسے پانچ' چھ سال سے کوئی دیکھنے نہ آیا ہو۔ اس لڑکی کو باہر بھیج کر کہیں وہ مصیبت میں نہ آجائے۔ لہٰذا پہلا خیال اسے یہی آیا تھا کہ اگر وہ باہر نکل کر واپس نہیں آئی تو کیا ہو گا۔

"واپس نہیں آؤں گی تو کہاں جاؤں گی۔ میں صرف پاگل نہیں ہوں' مجرم بھی ہوں۔ میرے پیچھے پولیس لگی ہے۔ میں تو اپنے گھر بھی نہیں جا سکتی۔ مجھے تو ہر حال میں واپس آنا ہی پڑے گا۔ ہاں اگر تمہیں رقم کم لگ رہی ہے تو وہ بات اور ہے۔ میں واپس آ کر بھی تمہیں پانچ ہزار دے سکتی ہوں۔" زوبیہ نپے تلے انداز میں بولی۔ اس کا تو منہ ہی کھل گیا تھا اتنی بڑی پیش کش پر۔

"بولو کیا کہتی ہو۔" زوبیہ نے اسے ہونق بنا دیکھ کر ٹوکا۔

"دراصل میں آج کل حالات تھوڑے خراب ہیں۔ کچھ لوگ میری جاسوسی کرتے ہیں۔ تاکہ ذرا سی مجھ سے چوک ہو اور وہ مجھے نوکری سے ہٹا دیں۔ میں نے آج کل یہ سارے کام بند کر دیے ہیں۔" وہ پریشانی سے کہتی انجانے میں سب قبول کر گئی۔ اس بار زوبیہ نے اپنی تلخ مسکراہٹ کو ابھرنے سے نہیں روکا۔ پھر جب وہ بولی تو اس کا لہجہ خود بخود طنزیہ ہو گیا۔

"تم کون سا صرف نوکری پر جی رہی ہو' پھر بھی اگر ایسا ہوتا ہے تو ہر مہینے تمہاری تنخواہ تمہیں گھر پر مل جائے گی۔" اب تو اس کی حالت غش کھا کر گر پڑنے والی ہو گئی۔

ہر چند کہ وہ نوکری سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتی تھی اور نہ اسے اس وعدہ پر یقین آیا تھا کہ وہ ہر مہینے گھر بیٹھے اسے پیسے دیتی رہے گی۔ مگر وہ یہ ضرور سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ جو لڑکی اتنے پیسے دینے کی بات کر سکتی ہے اس سے بنا کر رکھی جائے تاکہ آگے فائدہ حاصل ہو سکے۔

"کیا تم آج رات ہی جانا چاہتی ہو۔ اگر کل کا انتظام کر دوں تو۔۔۔"

"نہیں کل نہیں آج ہی۔" زوبیہ ایک دم جوش میں آ گئی۔ اس کا تو بس نہیں چل رہا تھا آج کیا ابھی اور اسی وقت نکل جائے۔ وہ نرس کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر جیسے کوئی لائحہ عمل ترتیب دینے کے بعد سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے آج رات ساڑھے بارہ بجے تم تیار رہنا لیکن تمہیں صبح چار بجے سے پہلے پہلے واپس آنا ہو گا۔ اگر تمہیں چار کے بجائے پانچ بھی بجے تو میں آئندہ تمہاری مدد نہیں کروں گی اور دیر ہونے کی صورت میں ایک ہزار تمہیں اوپر سے دینے ہوں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے' مجھے منظور ہے۔" زوبیہ کو لگ رہا تھا کسی نے اسے نئی زندگی دے دی ہو' کتنی مدت کے بعد اس نے خوشی کے احساس کو محسوس کیا تھا۔

ایک پل کے لیے اس کے دل میں خیال بھی آیا کہ کل عائشہ اختر اور بلال اختر کے ملنے آنے کا دن ہے۔ مگر

اگلے ہی پل اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ جب وہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے نکل ہی رہی ہے تو پھر اس ایک گھنٹے کی ملاقات کی بھلا کیا ضرورت ہے۔

زوبیہ کے لیے شام سے رات کرنا مشکل ہو گیا۔ بار بار اس کی نظریں گھڑی کی جانب اٹھ جاتیں' اسے لگ رہا تھا وقت کی سوئیاں جیسے اپنی جگہ منجمد ہو گئی ہوں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ کسی طرح اڑ کر یہاں سے باہر نکل جائے۔ حالانکہ اسے بار بار یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ رات کے ایک بجے وہ تن تنہا یہاں سے نکل بھی جائے گی تو باہر جا کر کیا کرے گی۔

کسی رکشہ یا ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ آدھی رات کو اپنے گھر تو نہیں جا سکتی اور پھر پتا نہیں وہاں سے کوئی سواری ملے یا نہ ملے وہ اس سنسان سڑک پر کھڑی ہو کر کیا کرے گی۔

وہ جب یہاں آئی تھی تو اس نے دیکھا تھا یہ اسپتال شہر کی رونقوں سے دور آفسز کی عمارتوں کے قریب تھا رات کے وقت جب سارے دفاتر بند ہوں گے تب تو سڑک بھی بالکل ویران پڑی ہو گی۔

مگر وہ ان باتوں پر غور کر کے اپنے حوصلے پست نہیں کرنا چاہتی تھی اسے بس یہاں سے نکلنا تھا اور یہاں سے وہ آدھی رات کو بھی نکل سکتی تھی لہٰذا کسی قسم کے ڈر کو دل میں جگہ دے کر وہ اس جہنم سے نکلنے کا نادر موقع نہیں گنوا سکتی تھی۔

آخر خدا خدا کر کے وہ وقت آ گیا جب وہ نرس جس کا نام شاہین تھا اسے لینے آ گئی زوبیہ کو تو خوشی کے مارے نیند ہی نہیں آئی تھی اسے کوئی تیاری بھی نہیں کرنی تھی جیسے بیٹھی تھی ویسے ہی اٹھ کر چلے جانا تھا شاہین کو دیکھتے ہی وہ بستر سے اتر کر زمین پر کھڑی ہو گئی۔

شاہین اسے آنکھ سے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی بغیر کچھ کہے مڑ گئی اپنے کمرے سے اس نے شاہین کے ساتھ عورتوں کو جاتے ہوئے اکثر آدھی رات کو دیکھا تھا مگر تب اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی وہ خود بھی اس طرح باہر نکلے گی اور وہ بھی ۔۔۔ خوشی خوشی۔

حالانکہ اسپتال کا لق و دق کوریڈور بالکل سنسان پڑا تھا نیم تاریکی میں اسپتال کا پرسوز ماحول نہایت ہیبت ناک لگنا چاہیے تھا مگر زندگی میں پہلی بار زوبیہ کو کسی چیز سے خوف نہیں آ رہا تھا وہ خوشی خوشی بغیر آواز کیے شاہین کے پیچھے پیچھے چلتی رہی جو چابیوں کا بڑا سا گچھا لے کر آئی تھی۔

دو جگہ موٹی سلاخوں کے گیٹ اس نے آواز پیدا کیے بغیر بڑی آہستگی سے کھولے تھے مگر ایک جگہ پر ایک چوکیدار نے چھوٹی سی کھڑکی کھول کر اسے دیکھا اور گیٹ کھول دیا۔

وہ اسپتال کی بلڈنگ سے باہر نکلنے کا راستہ تھا مگر صدر دروازہ نہیں تھا باہر اسپتال کا ہی احاطہ تھا اور اسپتال کا جو سامان وغیرہ رکھا تھا اسے دیکھ کر لگ رہا تھا یہ کچرا وغیرہ پھینکنے کی جگہ ہے۔

شاہین نے گیٹ کھلتے ہی اسے ایک بڑی سی چادر دے دی۔

"اسے اوڑھ کر باہر نکلنا تاکہ کسی کو پتا نہ چلے کہ تم مریض ہو۔" زوبیہ نے چادر جلدی سے اپنے اردگرد لپیٹ لی۔ اسپتال کی عمارت سے باہر قدم رکھتے ہی زوبیہ نے ایک سکون بھرا سانس کھینچا۔

"باقی کے پانچ ہزار" شاہین نے بھی چوکیدار سے کافی فاصلے پر دور پہنچ جانے کے بعد اس کے آگے ہتھیلی پھیلاتے ہوئے کہا تو زوبیہ نے بغیر کچھ کہے مٹھی اس کی طرف بڑھانی چاہی تھی کہ وہ ٹھٹک گئی۔

غیر ارادی طور پر اس کی نظر لان کے ایک جانب لگی کیاری پر پڑی اور اس کا پورا جسم سن ہو گیا وہی منظر تھا جو وہ بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی وہی شائستہ خالہ کا پانی پر لہراتا ہوا عکس تھا جو بچپن سے اس کے سامنے تھا۔ مگر آج بھی وہ اتنا ہی وحشت زدہ تھا جتنا روز اول سے تھا۔ وہی ان کے بکھرے بال جو ہوا سے ادھر ادھر اڑ رہے

تھے۔ وہی ان کا ناخنوں سے نوچا ہوا کٹا پھٹا چہرہ جسے دیکھ کر بہادر سے بہادر انسان کی چیخیں نکل جائیں۔ مگر زوبیہ کی تو خوف سے گھگھی بندھ گئی تھی۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑی شائستہ خالہ کو دیکھے گئی۔

"کیا سوچ رہی ہو، تم نے خود کہا تھا تم پیسے دو گی۔ اب اگر مکرنے کی کوشش کی تو میں یہیں سے واپس لے جاؤں گی۔ تم نے دیکھا تھا نا جس چوکیدار نے گیٹ کھولا ہے مجھے اسے بھی حصہ دینا ہے اور آگے مین گیٹ سے تمہیں نکالنے والے گارڈ کو بھی پیسے دوں گی۔ خبردار جو ایک روپیہ بھی کم کرنے کا سوچا۔" شاہین خاصا بگڑ کر بولی تو زوبیہ نے بمشکل اپنی توجہ شاہین پر مرکوز کر دی۔

ہاتھ میں پکڑے نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہی شائستہ خالہ ایک جست میں اس کے برابر میں آکھڑی ہوئیں۔ اس کے اتنے نزدیک کہ زوبیہ بے اختیار چند قدم پیچھے سرک گئی۔

"واپس کہاں جا رہی ہو چلو آگے چلو۔" شاہین نے کہنے کے ساتھ ہی پلٹ کر چلنا شروع کر دیا۔

جبکہ زوبیہ خوف زدہ نظروں سے شائستہ خالہ کے خون آلود چہرے کو دیکھنے لگی۔ اچانک اسے احساس ہوا وہ اس کے راستے میں حائل ہیں۔ وہ نظروں کا زاویہ بدل کر شاہین کو دیکھنے لگی جو گیٹ تک پہنچ کر اب گیٹ کھلوا رہی تھی۔

یہ وہ مین گیٹ نہیں تھا جہاں سے تمام لوگ آتے جاتے تھے یہ صرف اسپتال کا سامان لانے لے جانے والی گاڑیوں کا گیٹ تھا جہاں ایک ہی گارڈ بیٹھا تھا۔

شاہین کے کہنے پر اس نے گیٹ کھول دیا تھا اور اب گیٹ کے باہر بڑی سی ویران شاہراہ صاف نظر آ رہی تھی۔ صرف چند قدم اٹھانے کی دیر تھی اور اس کی دنیا بدل جانی تھی۔

مگر اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کوئی انجانی طاقت اسے آگے بڑھنے سے روک رہی ہو۔ وہ ایک بار پھر شائستہ خالہ کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کا دل چاہا وہ ان سے بات کرے، ان سے پوچھے کہ وہ اسے باہر نکلنے سے کیوں روکنا چاہتی ہیں۔

مگر اس کے حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ تب ہی شاہین اسے بڑی غصیلی آواز میں بلانے لگی تو وہ شائستہ خالہ سے کترا کر تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔

"کیا کھڑی ہو منہ اٹھائے، جلد جاؤ، کوئی گاڑی تو ابھی نہیں آئی ہے۔ ٹائم وغیرہ صحیح طرح سے طے تو کیا تھا نا۔" شاہین ڈپٹ کر بولی تو زوبیہ نے محض اس کے سوالوں سے بچنے کے لیے سر جلدی سے اثبات میں ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے، جاؤ اور یاد سے چار بجے آجانا۔" وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں کہہ کر اندر کی طرف پلٹ گئی، تو وہ گارڈ جو گیٹ پر کھڑا تھا زوبیہ کو طائرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے گیٹ بند کرنے لگا۔

البتہ زوبیہ کی نظریں اپنی جگہ پر بدستور کھڑی شائستہ خالہ پر ٹکی تھیں۔ جیسے جیسے گیٹ بند ہوتا گیا ان کا وجود زوبیہ کی نظروں سے اوجھل ہوتا گیا مگر زندگی میں پہلی بار ان کے منظر سے ہٹ جانے پر زوبیہ نے سکون محسوس نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ کچھ بے چین ہو گئی تھی۔

اس سنسان سڑک کے کنارے اس بڑے سے گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر اسے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ شائستہ خالہ اسے یہاں سے باہر نکلنے سے روک رہی تھیں جیسے اسے باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

☼ ☼

نسرین خالد

اشعر جیسے ہی گھر میں داخل ہوا تو پاکستان سے آیا خط دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ اسے یقین تھا کہ یہ خط بابا کا ہو گا کیونکہ اس ای میلز کے دور ایک وہی تھے جو اسے اتنی فرصت سے یاد کرتے تھے۔

ہسپتال سے آکر وہ اچھا خاصا تھک چکا تھا۔ صدف ہادی کو لے کر اپنی بہن سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ وہ سیدھا کچن میں گیا کھانا کھاتے ہوئے اسے صدف اور ہادی یاد آ رہے تھے۔

"ہادی اور صدف کے بغیر گھر کتنا سونا لگتا ہے۔" اشعر نے ارد گرد دیکھتے ہوئے سوچا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اس نے اپنے لیے کافی بنائی۔ کپ اور خط لیے وہ اپنے بیڈ روم میں آگیا۔

اشعر نے لفافے سے خط نکالا۔

"کیسے ہو ینگ مین؟" اسے بابا کا خط پڑھ کر ہمیشہ اچھا لگتا تھا کیونکہ وہ خط ایسے لکھتے تھے جیسے سامنے بیٹھے بات کر رہے ہوں۔

"یار آج بہت یاد آ رہے ہو، تمہیں تو پتا ہے نا آج کا دن تمہارے بابا کی زندگی کا کتنا اہم دن ہوتا ہے۔"

"آج کا دن۔" اشعر نے ذہن پر زور ڈالا۔

"چھ ستمبر" تاریخ یاد آتے ہی اشعر کو حیرت ہوئی کہ وہ آج کا دن کیسے بھول گیا۔ "اوہ مائی گاڈ۔"

وہ اتنے سالوں سے امریکہ میں مقیم تھا مگر ہر سال چھ ستمبر کو بابا کو ضرور ای میل کرتا تھا۔

"1965ء کے تمام شہدا اور غازیوں کو سلام۔"

اس کے بابا ریٹائرڈ کرنل گوہر علی 1965ء کی جنگ کے غازی تھے انہیں ان کی بہادری پر بہت سے فوجی اعزازات ملے تھے۔

"تمہیں یاد ہے جب تم پاکستان میں تھے تو ہر چھ ستمبر کو کتنی دلچسپی سے میرے پاس بیٹھ کر 1965ء کی جنگ کے قصے سنتے تھے۔

"یار آج پھر دل چاہ رہا ہے کہ تم میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے وہ قصے سنو۔"

"اور میرا پوتا ہادی کیسا ہے؟ کتنا بڑا ہو گیا ہو گا جب میں نے دیکھا تو دو مہینے کا تھا۔ اب تو شاید اس کی

اسکولنگ بھی اسٹارٹ ہو گئی ہو گی؟ اس اکتوبر میں چھ سال کا ہو جائے گا وہ، بہت دل چاہتا ہے اسے دیکھنے کو، دیکھو شاید کچھ عرصے بعد میں بھی امریکہ کا چکر لگا لوں۔"

آنے کا سن کر اشعر خوش ہو گیا۔

"کتنا عرصہ ہو گیا بابا سے ملے ہوئے" اشعر نے حساب لگایا۔

"کتنی بار کہا ہے کہ یہاں آجائیں میرے پاس مگر مانتے ہی نہیں پاکستان چھوڑنے کو ان کا دل نہیں چاہتا، بیٹے سے دور رہ سکتے ہیں مگر ملک سے نہیں وہ صحیح معنوں میں ایک محب وطن انسان ہیں۔" اشعر نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔

"بلکہ وہ ایک فوجی ہیں۔" اشعر نے دیوار پر لگی کرنل گوہر علی کی یونیفارم میں ملبوس تصویر دیکھی۔

"بابا کو کتنا شوق تھا کہ میں بھی ان کی طرح آرمی جوائن کروں۔"

تصویر دیکھتے ہوئے اسے وہ وقت یاد آیا جب اس کا انٹر کا رزلٹ آیا تھا۔ اس نے شاندار نمبر حاصل کیے تھے۔

"ینگ مین! اب کیا ارادے ہیں؟" ناشتے کی ٹیبل پر انہوں نے اشعر سے پوچھا۔

"ایم بی بی ایس۔" اشعر نے جوس پیتے ہوئے بتایا۔

"میرا خیال تھا تم آرمی جوائن کرو گے۔" کرنل گوہر علی نے اخبار اٹھاتے ہوئے کہا "مگر چلو..... ڈاکٹر بن کر آرمی جوائن کر لینا۔"

"سر! میں آرمی میں نہیں جاؤں گا، میں آپ جیسا منظم بندہ نہیں ہوں۔"

اشعر کے ارادے سن کر ان کے چہرے پر ایک پل کو اداسی چھا گئی۔ مگر اگلے ہی پل انہوں نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجا لی۔ وہ ایک اچھے آفیسر ہی نہیں ایک اچھے باپ بھی تھے۔ اپنے بیٹے کی خوشی انہیں بہت عزیز تھی۔

اشعر پھر سے خط پڑھنے لگا۔

"ہاں یاد آیا، کل کرنل رضا کا بیٹا فہد آیا تھا، تمہیں پتا ہے وہ ڈاکٹر بن چکا ہے۔

وہ مجھ سے اس زمین کے متعلق پوچھ رہا تھا جو میں نے تمہیں ایم بی بی ایس میں ٹاپ کرنے پر خرید کر دی تھی، جس پر تم غریبوں کے لیے ہاسپٹل بنانا چاہتے تھے فہد وہ زمین خرید کر وہاں ہسپتال بنانا چاہتا ہے کیونکہ تمہیں تو پتا ہے وہاں دور دور تک کے علاقوں میں ہاسپٹل نہیں ہے۔ وہاں کے لوگوں کو طبی سہولیات کی اشد ضرورت ہے۔ کل تو میں نے فہد کو منع کر دیا مگر میں دو تین بار وہاں گیا ہوں وہاں کے غریب لوگ بہت پریشان ہیں میں جب بھی جاتا ہوں مجھ سے تمہارا پوچھتے ہیں۔ انہیں بہت انتظار ہے اس ہاسپٹل کا جس کا تم نے ان سے وعدہ کیا تھا۔

اگر تم کہو تو میں وہ زمین فہد کو دے دوں؟"

اشعر پھر سے ماضی میں چلا گیا۔ کچھ سال پہلے کی تو بات تھی وہ کتنا پر عزم تھا کہ غریبوں کو مفت طبی سہولیات مہیا کرے گا۔ پھر بابا نے اسے وہی علاقے میں زمین خرید کر دی تھی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں مفت کیمپنگ بھی کرتا تھا۔ اس نے وہاں کے لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ وہاں ہسپتال بنائے گا ان کے خوابوں کو پورا کرے گا مگر..... یہاں آکر وہ وعدہ بھول گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ چہرے گھوم گئے جو اچھے دنوں کی آس دلانے پر چمک اٹھتے تھے اور اسے ڈھیروں دعاؤں سے نوازتے تھے۔

اشعر کو اس پل اپنا آپ بہت چھوٹا محسوس ہوا۔

"میں ان غریب لوگوں کے جذبات سے کھیلا ہوں انہیں جھوٹے خواب دکھائے۔"

"میں نے عید پر تمہارا بہت انتظار کیا تھا۔ کرنل رضا بھی تمہارے نہ آنے کی وجہ پوچھ رہے تھے میں نے انہیں بتایا کہ تم بہت مصروف ہوتے ہو، چھٹیاں نہیں ملی ہوں گی۔" اشعر کو شرمندگی نے آگھیرا وہ کیا بتاتا کہ اس نے چھٹیاں لینے کی کوشش ہی نہیں کی۔

اسے اس پل احساس ہوا کہ وہ ایک اچھا باپ تو ہے مگر اچھا بیٹا نہیں ہے۔

"آج کل دل پر عجیب سا بوجھ رہنے لگا ہے غلطی

سے ڈاکٹر کو دکھا بیٹھا تمہارے رضا انکل کے مشورے پر، اس نے مجھے سی ایم ایچ میں ایڈمٹ ہونے کا مشورہ دیا ہے۔ یار تم سارے ڈاکٹرز پاگل ہی ہوتے ہو اب بھلا تم خود بتاؤ مجھ جیسا ینگ، ہینڈسم فوجی ہاسپٹل میں پڑا کیسا لگے گا۔"

"بابا کو ہارٹ پرابلم ہو گئی ہے....." اشعر کے دل کو کچھ ہوا۔ اس کا دل چاہا اڑ کر بابا کے پاس پہنچ جائے۔

"وہ تو بہت کیئرلیس ہیں ساری دنیا کی فکر کرتے ہیں سوائے اپنی صحت کے، مجھے ان کے پاس ہونا چاہیے انہیں میری ضرورت ہے۔"

جس باپ نے مجھے کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی، میری خاطر دوسری شادی نہیں کی، میری ہر ضرورت بغیر کہے پوری کی۔ انہیں میری ضرورت ہے اور میں یہاں..... "اسے اپنی کوتاہیوں کا احساس ہوا۔

"میں نے اپنے بابا کے ساتھ اچھا نہیں کیا، میں نے ان لوگوں کے ساتھ بھی اچھا نہیں کیا۔"

اشعر کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔ وہ اتنا خود غرض تو کبھی نہیں تھا اس نے جانے انجانے میں کتنے لوگوں کے دل دکھائے۔ وہ تو دلوں کا مسیحا تھا۔ وہ پردیس میں لوگوں کے دلوں کی پیوند کاری کرتا تھا اور اپنوں کے دل دکھائے تھے۔

"بابا ایم سوری..... ایم رئیلی سوری مجھے احساس ہی نہیں ہوا....." اس کی آنکھوں سے آنسو گر کر خط کو بھگو رہے تھے۔

"میں اپنے بیٹے سے تو تین دن دور نہیں رہ سکتا اور میں نے خود کو اتنے سالوں آپ سے دور رکھا ہوا ہے۔ تین دن ہوئے ہیں ہادی کو گئے ہوئے اور مجھے تین سال لگ رہے ہیں اور میں..... میں کتنے سالوں سے یہاں رہ رہا ہوں۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ اس بڑھاپے میں آپ کو میری کتنی ضرورت ہو گی۔"

"سوری یار میں بھول ہی گیا کہ تمہارا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے، بہت مصروف ہوتے ہو اتنا بڑا خط لکھ دیا تمہیں۔ مگر کیا کروں ایک ریٹائرڈ بندے کے پاس ایک چیز بہت وافر مقدار میں ہوتی ہے "فرصت"

اچھا اب اجازت دو
ہادی کو بہت سا پیار دینا
فقط تمہارے بابا
ریٹائرڈ کرنل گوہر علی

وقت، قیمتی..... نہیں بابا آپ سے زیادہ قیمتی ہے تو میرے لیے دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ بس مجھے احساس آج ہو رہا ہے مجھے معاف کر دیں۔ میں اب اپنی تمام کوتاہیوں کا ازالہ کروں گا۔ میں اب آپ کو کبھی تنہا نہیں کروں گا۔ اشعر نے آنکھوں سے آنسو صاف کیے۔

اس نے کچھ ہی دیر میں وہ فیصلہ کر لیا جو وہ شاید کبھی نہ کرتا۔

"میں اب یہاں نہیں رہوں گا میرے بابا کو، میرے لوگوں کو، میرے ملک کو میری ضرورت ہے مجھے واپس جانا ہے۔"

"اگر صدف نہ مانی۔" اس کے ذہن میں خدشہ ابھرا۔

"وہ مان جائے گی میں اسے سمجھاؤں گا۔" اس کی ایک عادت بہت اچھی ہے کہ وہ میری بات بہت جلدی سمجھ جاتی ہے۔" اسی شام صدف اور ہادی کی واپسی ہوئی۔

"مگر کیوں اشعر؟" اشعر کی بات سن کر صدف نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

"کیونکہ ہمارے ملک کو، ہمارے اپنوں کو ہماری ضرورت ہے صدف وہ ہمارا انتظار کر رہے ہیں ایسا نہ ہو کہ جب تک ہم واپس لوٹیں تب ان کی آنکھیں ہمارے انتظار میں پتھر کی ہو جائیں، وہ مٹی کی ڈھیری بن جائیں، ہمیں ابھی لوٹ جانا چاہیے ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے۔" صدف حیرت سے اشعر کو دیکھے گئی۔ وہ اتنا جذباتی تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

"پھر بھی اشعر ہم یہاں سیٹلڈ ہو چکے ہیں ہماری جابز، ہمارے فیوچر کا سوال ہے....."

"فیوچر وہاں بھی بہت برائٹ ہو گا۔"

"مگر پھر بھی....." صدف نے کچھ کہنا چاہا۔

"تم ـــ تم وہ وعدہ بھول گئی کہ اسپیشلائزیشن کر کے اپنے اپنے ملک ضرور جائیں گے اپنے لوگوں کی خدمت کریں گے۔ میں ہسپتال بناؤں گا تو تم میرا ساتھ دو گی۔" اشعر نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا۔

"آج میں تم سے تمہارا وہ وعدہ مانگ رہا ہوں۔" اشعر نے بہت آس سے اسے دیکھا۔

"مجھے تمہارے ساتھ کی ضرورت ہے میں تمہارے اور ہادی کے بغیر نہیں رہ سکتا' پلیز واپس چلو۔ میرے بابا بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتے' وہ تکلیف میں ہیں انہیں میری ضرورت ہے' بولو دو گی نا میرا ساتھ' چلو گی نا پاکستان؟"

"چلیں گے پاکستان' مگر اشعر اتنی بھی کیا جلدی ـــ" صدف نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے ہر صورت اس عید سے پہلے پاکستان جانا ہے وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے میں انہیں اس بار مایوس نہیں کروں گا۔"

☼ ☼ ☼

ایئرپورٹ سے سامان لیے نکلتے اشعر اور صدف کے چہرے پر پرسکون مسکراہٹ تھی اور ان کا ہاتھ پکڑے چلتا ہادی بے چینی سے اپنے گرینڈپا کو دیکھنے کا منتظر تھا۔

ٹیکسی میں سامان رکھتے ہوئے اشعر نے اردگرد کا جائزہ لیا۔

"کتنی تبدیلیاں آگئی ہیں میں بھی تو کتنے سالوں بعد آیا ہوں۔"

"صاحب کہاں جانا ہے؟" ڈرائیور کی آواز پر وہ اپنے خیالات سے نکلا اور اسے ایڈریس سمجھایا۔

"اشعر گھر سے گاڑی منگوا لیتے نا؟" صدف نے گاڑی میں بیٹھتے اشعر کو دیکھ کر کہا۔

"نہیں' میں بابا کو سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔" اشعر نے مسکراتے ہوئے گاڑی نہ منگوانے کی وجہ بتائی۔

"ڈیڈی یہ ہمارا گھر ہے؟" ہادی نے ایک خوب صورت بنگلے کے پاس گاڑی رکتے دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں۔"

"واؤ سو بیوٹی فل" ہادی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اشعر کو اچانک دیکھ کر چوکیدار اور نوکر حیران تھے۔

"سر آپ آگئے۔" گل احمد نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں میں آگیا ہوں' بابا کہاں ہیں؟" اشعر بابا سے ملنے کو بے چین تھا۔

"وہ اپنے کمرے میں ہیں۔"

"اوکے' تم ایسا کرو سامان میرے کمرے میں رکھو۔" اشعر نے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور صدف اور ہادی کو لیے بابا کے کمرے کی طرف بڑھا۔

بابا کے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا دیکھ کر اشعر نے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

اپنی راکنگ چیئر پر کتاب کے مطالعے میں مصروف کرنل گوہر علی کی سانسوں سے خوشبو ٹکرائی تو انہوں نے فوراً "مڑ کر دیکھا۔ دروازے پر اشعر کو دیکھ کر انہیں اپنی بے چینی کی وجہ سمجھ آگئی۔

"بابا۔" اشعر بے تابی سے ان کی طرف بڑھا۔ "آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں آگیا ہوں" بابا کے گلے لگتے ہی اشعر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "ہم دشمنوں کی خوشبو بھی پہچان لیتے ہیں تو تمہارا کیا خیال ہے میں اپنے پیاروں کی خوشبو نہ پہچان سکوں گا۔

میری آنکھیں ہر لمحہ تمہاری راہ تکتی تھیں۔"

وہ اشعر کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے غور سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں اپنے دل میں سکون اترتا محسوس ہو رہا تھا۔

"آپ ـــ آپ بیمار تھے آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔" اشعر نے بچوں کی طرح روتے ان سے شکوہ کیا۔

"میں ٹھیک ہوں' اور اب تمہیں دیکھ کر تو بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔"

"پھر بھی آپ کو بتانا چاہیے تھا۔" ہادی آنکھوں میں حیرت سمائے دونوں کو روتے دیکھ رہا تھا۔

"ممایہ کیوں رو رہے ہیں؟" ہادی نے ساتھ کھڑی صدف کا ہاتھ ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کے ڈیڈی بہت عرصے بعد اپنے بابا سے مل رہے ہیں نا تو اس لیے رو رہے ہیں۔"

صدف کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ہادی کو پچویشن اپنی سمجھ سے باہر لگی۔

"گرینڈپا۔" دروازے میں کھڑے ہادی نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔

گوہر علی نے خوشگوار حیرت سے اشعر کو دیکھا۔

"یہ ـــ یہ مجھے پہچانتا ہے؟"

اشعر نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ کی تصویر میں نے اپنے گھر میں لگائی ہوئی تھی یہ بہت ایکسائیٹڈ تھا آپ سے ملنے کے لیے۔"

"یہ تو بالکل تمہارے جیسا ہے۔" گوہر علی نے ہادی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ ان کی خوشی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

"گرینڈپا میں بھی آپ کی طرح آفیسر بنوں گا۔" ہادی نے اپنا فیوچر پلان بتایا تو گوہر علی مسکرائے۔

"بیٹا تم وہاں کیوں کھڑی ہو اندر آؤ۔" گوہر علی نے دروازے میں کھڑی صدف کو دیکھتے ہوئے کہا۔

صدف اندر آئی تو گوہر علی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"بابا ڈاکٹرز نے جو رپورٹس دی تھی وہ دکھائیں مجھے۔" اشعر نے بابا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یار آتے ہی ڈاکٹر بن گئے پہلے آرام کر لو۔" گوہر علی نے مسکراتے ہوئے اپنے ہارٹ اسپیشلسٹ بیٹے کو دیکھا۔ انہیں وہ وقت یاد آیا جب وہ بیمار ہو جاتے تو خود ان کا علاج کرتا اور ذرا سی بدپرہیزی پر انہیں گھنٹوں لیکچر دیتا اور پھر آخر میں ناراض ہو کر چلا جاتا۔

"تم لوگ پہلے آرام کر لو' پھر کھانے پر ملتے ہیں۔" اشعر کو خاموشی سے اپنی طرف دیکھتا پا کر گوہر علی نے اسے کہا۔

"آپ بھی آرام کر لیں۔" اشعر نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے انہیں ہدایت کی۔

"چلو ہادی۔" صدف نے ہادی کو لے کر جانا چاہا۔

"نہیں میں گرینڈپا کے پاس سوؤں گا۔" ہادی نے اپنا ہاتھ چھڑواتے ہوئے کہا۔

"یہیں چھوڑ جاؤ ـــ اس کو۔" گوہر علی نے مسکراتے ہوئے ہادی کو دیکھا۔

"مگر یہ آپ کو تنگ ـــ"

"نہیں کرے گا۔" گوہر علی نے صدف کی بات کاٹی۔

صدف نے جیسے ہی ہادی کا ہاتھ چھوڑا وہ بھاگتا ہوا گوہر علی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

صدف نے مسکراتے ہوئے دادا' پوتے کی محبت دیکھی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"بابا مجھے ہاسپٹل کا کام شروع کروانا ہے۔" کھانا کھاتے ہوئے اشعر نے کہا۔ گوہر علی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تم کتنے دن کے لیے آئے ہو؟" گوہر علی نے بہت مشکلوں سے سوال کیا۔

"ہمیشہ کے لیے۔" اشعر کے جواب پر گوہر علی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

"میں نے اور صدف نے وہاں ریزائن دے دیا ہے' اب ہم یہاں اپنا ہاسپٹل بنائیں گے اپنے لوگوں کی خدمت کریں گے۔ آپ ہی کہتے ہیں نا کہ پہلا حق اپنوں کا ہوتا ہے تو پہلا حق میرے ملک کے لوگوں کا ہے کیونکہ بہت قرض ہے ہم پر اس مٹی کا۔" اشعر نے وہ الفاظ دہرائے جو اکثر گوہر علی بولتے تھے۔

اشعر کے منہ سے یہ الفاظ سن کر گوہر علی نے فخر سے اپنے بیٹے کو دیکھا انہیں اپنے دل کے اندر سکون اترتا محسوس ہوا کہ آخر کار اشعر کو وہ بات سمجھ آہی گئی جو وہ اسے سمجھانا چاہتے تھے۔

کاش ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے حصے کا قرض چکائے' اپنا فرض ادا کرے' اپنے ملک کے لیے اپنی دھرتی ماں کے لیے' ان لاکھوں شہیدوں کے لیے جنہوں نے قربان کیا اپنا آج ہمارے کل کے لیے۔

☼ ☼

نوشین سرور

"پتا ہے علی! مجھے ڈاکٹرز نے جب یہ نوید دی تھی کہ میرے ہاں چاند سا بیٹا ہوا ہے تو جانتے ہو میں نے خدا سے کیا دعا مانگی تھی۔" سویٹر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ علی کے آگے آگے چل رہی تھیں۔ شام کے سائے ڈھلتے ہی دھند میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ علی حمزہ نے مسکراتے لبوں سے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

"کیا دعا مانگی تھی آپ نے امی۔۔۔" توحید بیگم کے قدم رک گئے انہوں نے مڑ کر اپنے پیارے بیٹے کو محبت لٹاتی نگاہوں سے دیکھا۔

"کہ میں اپنے پیاری سی ناک اور بھوری آنکھوں والے بیٹے کو کیڈٹ بناؤں گی۔" محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ بولیں۔

"حالانکہ آپ کے شوہر نامدار بھی اچھے خاصے کامیاب کیڈٹ ہیں پھر بھی آپ کی یہی خواہش کیوں تھی امی؟" یہ سوال تو کیڈٹ بن جانے کے بعد وہ بارہا ان سے پوچھ چکا تھا۔

"کیوں کہ جب میری تمہارے بابا سے شادی ہوئی تھی تب وہ میجر بھی بن چکے تھے اور وہ تھے بھی بہت گریس فل۔۔۔ اور میں چاہتی تھی کہ اک کیڈٹ ہو جس کا یونیفارم میں پہلا دن بہت یادگار ہو اور ٹریننگ ٹائم کی شرارتیں ہوں بس، میں جب تمہارے مستقبل کے بارے میں سوچتی تو میری آنکھوں کے سامنے تمہارا چھ فٹ کا نمایاں قد یونیفارم میں ملبوس اور بھوری مسکراتی نگاہیں گھوم جاتی تھیں۔" وہ علی کی بہت اچھی دوست بھی تھیں۔

"اور اللہ نے آپ کی سن بھی لی۔۔۔ دیکھ لیں۔" بانہوں میں گھیرتے ہوئے وہ لاڈ سے بولا۔

"ہاں۔۔۔ اس کا بہت کرم ہے اور اگر تم پر انحصار کرتی تو ہاتھ میں گٹار لیے رف سے حلیے میں رنگ برنگی تتلیوں پر اپنے رف اینڈ ٹف حسن کی بجلیاں گراتے ہوتے۔" وہ ناک کو سکیڑتے نخوت سے بولیں۔

"اور اب دیکھو نیٹ اینڈ کلین کتنے ہینڈسم لگ رہے ہو۔" انہوں نے فخر سے اپنے خوبرو بیٹے کو دیکھا۔

"آپ کو ایسا لگتا ہے امی۔ حالانکہ یقین مانیے کہ آپ کا بیٹا انتہائی شریف النفس انسان ہے۔" مسکراہٹ دباتے ہوئے وہ معصومیت کی انتہا کو چھو رہا تھا۔

"ہو ہی نہیں سکتا علی کہ تم جیسے ہینڈسم لڑکے کی لائف میں کوئی لڑکی نہ ہو۔" وہ کسی شکی خاتون کی طرح بولیں تو علی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ کیوں کہ وہ لاکھ کوشش کر چکی تھیں کہ وہ علی کی کے منہ سے کسی لڑکی کا نام نکلوا سکتیں مگر بے سود۔

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے امی۔۔۔ ہے نا میری زندگی میں بہت خوب صورت سی لڑکی جسے میں بہت محبت کرتا ہوں۔" وہ آنکھیں میچے بانہیں فضا میں پھیلائے بہت محبت سے بولا تو توحید بیگم بہت بے صبری سے اس کی طرف مڑیں۔

"کون ہے وہ۔" اشتیاق ان کے چہرے سے
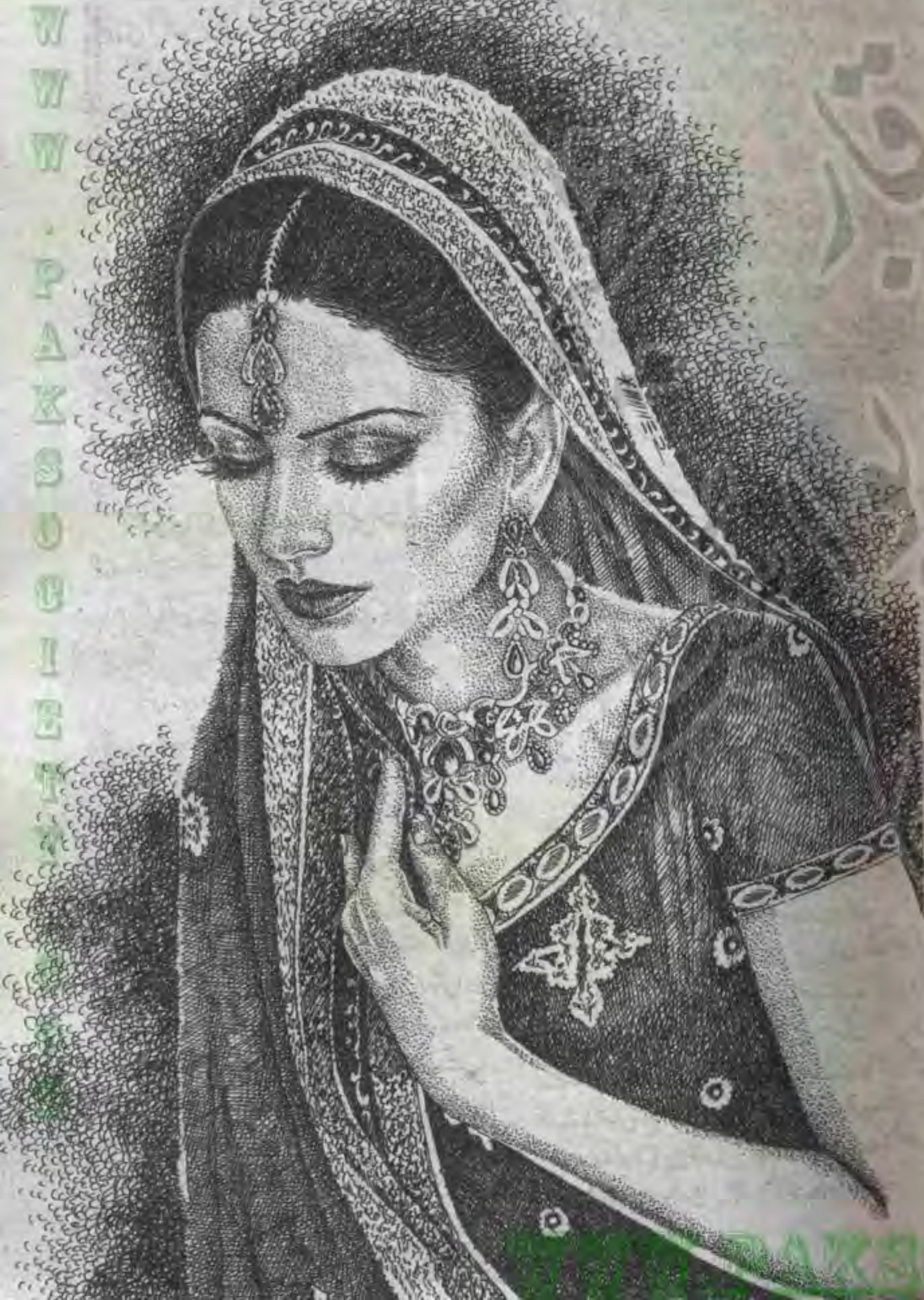
جھلک رہا تھا۔ علی کو جی بھر کر ان پر پیار آیا۔ شرارت سے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبائے اس نے انہیں بانہوں میں لیا۔

"ہے اک معصوم سی، شفیق سی، لمبے بالوں والی اور بھوری آنکھوں والی۔" وہ ان کا تجسس بڑھا رہا تھا۔

"علی بتاؤ نا کون ہے وہ۔ کیا میں جانتی ہوں اسے۔"

"ہاں۔" علی نے اپنے سر کو زور سے اثبات میں ہلایا۔

"کون۔" توحید بیگم نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"مائے ون اینڈ اونلی توحید آپا۔" علی نے اعلانیہ انداز میں بانہیں پھیلا کر کہا۔

"بے شرم اپنی ماں کا نام لیتے ہو۔" وہ اس کے ہاتھوں بے وقوف بن چکی تھیں تو اپنی خفت چھپاتے ہوئے اسے ڈانٹنے لگیں۔ علی حمزہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"میری پیاری توحید آپا۔" وہ انہیں منانے کے لیے ان سے لپٹ گیا۔

"کیا کر رہے ہو علی سڑک ہے گاڑیاں آجا رہی ہیں۔"

"امی آپ کو پتا ہے آپ شرماتی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہیں۔ اف اللہ بابا دیکھیں تو۔" وہ انہیں تنگ کرتے ہوئے دل تھام کر بولا۔

"علی۔" وہ علی کو گھور کر رہ گئیں۔

"آئی لو یو۔ امی۔" وہ لاڈلے بچوں کی طرح بولا۔

مال روڈ پر دونوں اطراف برف کی پتلی سی تہ جمی ہوئی تھی۔ دسمبر کے آخری آخری دن تھے دھلی دھلی صاف سڑک پر وہ علی حمزہ کے ساتھ پیدل چل رہی تھیں کیوں کہ اسے بہت پسند تھا کہ ان کے ساتھ ٹھنڈی ٹھنڈی فضاؤں میں میلوں چلنا۔ کچھ ان سے پیار لینا اور کچھ ان پر پیار جتانا اور اپنی سروس میں وہ پہلی بار چھٹی پر آیا تھا۔

توحید بیگم کے بے پناہ اصرار پر علی نے آرمی جوائن کی تھی۔ کرنل کا بیٹا ہونے کے باوجود وہ آرمی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ سنگر بننا چاہتا تھا۔ اپنے جنون کا گلا گھونٹ کر وہ صرف اور صرف اپنی ماں کے کہنے پر آرمی میں آیا تھا کیوں کہ وہ اپنی پوری زندگی میں جس سے بے پناہ محبت کرتا تھا تو وہ اس کی پیاری سی امی تھیں جنہیں وہ پیار سے کبھی کبھی توحید آپا بھی کہتا تھا۔

وہ دونوں گاڑی کے قریب پہنچ آئے تھے۔ ہاتھوں میں پکڑے شاپرز پچھلی سیٹوں پر پھینکتے ہوئے اس نے ان کے لیے دروازہ کھولا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے ہیٹر آن کر دیا۔ سارا جسم اکڑ گیا تھا سردی سے، علی کی ناک سردی سے شدید سرخ ہو رہی تھی۔

"علی تمہیں نوین پھپھو یاد ہیں وہ تمہارے بابا کی رضاعی بہن۔" گاڑی چلتے ہی انہیں جیسے کچھ یاد آیا۔

"آپ کو آج اچانک وہ کیسے یاد آگئیں۔"

"مطلب تمہیں وہ یاد ہیں۔" وہ چہکیں۔

"کیسے بھول سکتا ہوں بچپن میں انہوں نے میرے کانوں کو اتنی بے دردی سے کھینچا تھا۔ میرے اتنے لمبے کان جو ہیں ان کی وجہ ہیں وہ۔" علی کے بچپن کے زخم تازہ ہو گئے۔

"ہاں تو تم نے بھی تو کوئی چھوٹی حرکت تو نہیں کی تھی نا۔ ان کے شوہر کی مونچھیں کاٹ دی تھیں تم نے۔ اتنی شرمندگی ہوئی تھی مجھے۔"

"تو امی مجھے کیا معلوم تھا کہ ایسا نہیں کرتے۔ نوین پھپھو کو کس نے کہا تھا کہ مجھے ساتھ لے کر وہ آئی برو بنوانے جائیں۔" علی نے سارا الزام نوین پھپھو کے کھاتے میں ڈالتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

"بیوٹیشن کو اتنی مہارت سے آئی برو بناتے دیکھ کر میرے اندر کا بیوٹیشن بھی جاگ اٹھا۔ اب آئی برو تو مجھے کسی کے نظر نہیں آئے سامنے سلمان انکل ہی تھے۔ وہ بھی سوئے ہوئے تو۔ میں نے سوچا میں بھی اپنے ہاتھوں کی مہارت دکھا سکتا ہوں۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ اتنا بڑا نقصان ہو جائے گا میرے ہاتھوں سے۔" وہ دل ہی دل میں ہلکا سا شرمندہ ہو رہا تھا۔

اس کا چہرہ دیکھ کر توحید بیگم کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"اف لڑکے اتنے شرارتی تھے۔ تم۔" وہ بمشکل ہنسی کو دباتے ہوئے بولیں۔

"ویسے آپ آج ان کو کیوں یاد کر رہی ہیں۔" علی نے اچانک ہی ان سے پوچھا۔

"ہاں یاد آیا وہ مجھے پچھلے ہفتے اسلام آباد میں ملی تھیں۔ وہ کراچی سے یہاں شفٹ ہو گئے ہیں نا سارے کے سارے۔"

"سارے کے سارے مطلب۔" علی نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"مطلب وہ۔ سلمان انکل اور ان کی دو عدد بیٹیاں۔" وہ اسے بہت شوق سے بتا رہی تھیں۔

"ان کی بیٹیوں کا نام مت لیجیے گا امی۔ میرے زخم پھر سے تازہ ہو جائیں گے۔ وہ چھوٹی والی۔ ہمم۔ پتا نہیں کیا نام تھا اس کا مجھ سے ایسے لڑتی تھی کہ اللہ کی پناہ۔ میری انگلی پر بھی کاٹا تھا اس نے۔" وہ صدمے سے دوچار اپنی انگشت شہادت دیکھ رہا تھا۔

"تب تم سات سال کے تھے اور وہ تین سال کی۔ تب وہ نا سمجھ تھی علی۔" وہ علی کی دلبرداشتہ داستانوں کو سن سن کر ہنسے جا رہی تھیں۔

"اب تو ماشاء اللہ اتنی اچھی ہو گئی ہے۔" توحید بیگم نے بہت احتیاط سے بات کی۔

"ہو گی۔" اک لاپروا اور مختصر سا جواب ملا۔

"تمہیں پتا ہے علی ان کی بڑی بیٹی ڈاکٹر بن رہی ہے۔" وہ دلچسپی سے اسے بتا رہی تھیں۔ علی حمزہ کی چھٹی حس اک دم سے ہی بیدار ہوئی تھی۔

"علی وہ اس دن اپنی مما کے ساتھ مارکیٹ میں ملی تھی۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ وہ کتنی پیاری بچی ہے۔ ماشاء اللہ یہ لمبا قد، یہ بڑی بڑی آنکھیں، اتنی کیوٹ سی کہ میں نے فوراً سوچ لیا کہ۔"

"ایک منٹ۔ ایک منٹ امی مجھے آپ کے ارادے نیک نہیں لگ رہے گھر چل کر بات کرتے ہیں۔" اس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اس کی شادی نوین پھپھو کی بڑی صاحبزادی سے کروا ہی دیں۔

"علی میرے ارادے نیک ہی ہیں۔ مریم کے لیے میرے ارادے شروع ہی سے نیک ہیں علی۔" وہ بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھیں۔

"کون مریم۔" وہ اک دم ان جان بن گیا۔

"ڈاکٹر مریم۔" توحید بیگم نے اپنی بات زور دے کر کہا۔

"ڈاکٹر۔" وہ چیخ پڑا۔

"ہاں۔" وہ بھی کمال تحمل سے بولیں۔

"امی۔ میں لڑ پڑوں گا۔" وہ مصنوعی خفگی جتاتے ہوئے بولا۔

"تم۔ اور تمہاری لڑائیاں۔ میں اور کرنل صاحب جائیں گے جمعہ کو ان سے ملنے۔" وہ علی کا غصہ خاطر میں لائے بغیر بولیں۔

"میں نہیں کر رہا کسی ڈاکٹر سے شادی۔" وہ بھی اٹل لہجے میں بولا۔

"کیوں۔ ڈاکٹر سے کیا مسئلہ ہے تمہیں۔"

"امی۔ بس نہیں کر سکتا اک ڈاکٹر سے شادی میں۔"

"کیا مطلب ہے علی اک ڈاکٹر سے نہیں تو کتنی

ڈاکٹرز سے شادی کرنے کا ارادہ ہے تمہارا۔" وہ اب سراسر علی کو چھیڑ رہی تھیں۔

"لاحول ولاقوۃ امی۔۔۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ آپ کو پتا ہے کتنی روڈ ہوتی ہیں یہ ڈاکٹرز' نہ خون خرابے سے ڈر لگتا ہے اور نہ ہی اوزاروں کے بے رحم استعمال سے۔۔۔ اور۔۔۔ اور اتنی موٹی موٹی بورنگ اور خشک قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرتی رہتی ہیں ۔۔۔ اس لیے ان کی نیچر ہی بورنگ ہو جاتی ہے۔"

"سب ایسی نہیں ہوتیں علی۔" انہوں نے علی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"غلط۔۔۔ سب ایک جیسی ہی ہوتی ہیں لگالیں مجھ سے شرط۔۔۔ آپ کی وہ ڈاکٹر مریم بھی اس قسم کی خاتون ہوگی۔ سڑی ہوئی اور بے رحم سی اور ظالم۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"سنجیدہ اور باوقار سی لڑکیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ تمہیں کیا معلوم پاگل لڑکے۔" انہوں نے اس کی تصحیح کی۔

"اور تو مجھے کچھ معلوم نہیں پر امی مجھے معصوم سی' نازک اندام لڑکیاں پسند ہیں۔ ہنس مکھ اور زندہ دل سی لڑکیاں پسند ہیں بیوٹی ود لوپلس کیئرپلس ہارمنی۔" وہ ٹوک انداز میں کہتے ہوئے اس نے کھلے دروازے سے گاڑی کو اندر موڑا۔ گھر آچکا تھا اور علی حمزہ نے شکر کا کلمہ پڑھا کہ وہ اب کم از کم اس ٹاپک سے جان چھڑا سکے گا۔

"اور اگر وہ ایسی ہی ہوئی تو۔۔۔" علی گاڑی لاک کر کے سامان اٹھا کر اندر جارہا تھا جب اسے اپنی پشت سے ان کی آواز آئی تو وہ مڑ کر ان کے قریب آیا۔

"نہیں امی یا تو وہ ڈاکٹر ہو سکتی ہے یا میری پسند۔۔۔ دونوں کام اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ نیور۔۔۔" آہستہ سے کہہ کر وہ اندر کی جانب بڑھ گیا۔

وہ جانتی تھیں کہ وہ کرے گا وہی جو وہ کہیں گی اور وہ بھی تو اس کے لیے وہی کرتی تھیں جو وہ چاہتا تھا۔ بچپن کے چند ناخوشگوار واقعات اور چند شرارتوں کو لے کر وہ ذرا بدگمان تھا مگر وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ وہ باتوں کو دل میں نہیں رکھتا تھا۔ وہ مریم سے ملے گا اسے دیکھے گا تو رائے بالکل بدل جائے گی اور مشکل مرحلہ ہی تو یہ تھا کہ وہ مریم سے ملنے کے لیے اسے رضامند کرلیں۔

☼ ☼ ☼

حرم نے مریم کے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھی تو خیال آیا کہ وہ ابھی تک پڑھ رہی ہوگی تو کافی بنانے کی غرض سے اس کا اگلا قدم کچن کی طرف ہی بڑھا اور آج تو اس کے پاس اک چونکا دینے والی خبر بھی تھی اس کے لیے جس کا اس کو یقین تھا کہ مریم کو ابھی کچھ بھی پتا نہیں ہوگا۔ گرم گرم کافی کا مگ لیے وہ اس کے کمرے میں آگئی اور حسب معمول وہ موٹی موٹی کتابوں کے ڈھیر کے پیچھے نظر ہی نہیں آرہی تھی۔ مگ ٹیبل پر رکھ کر وہ مریم کے قریب ہی ۔۔۔ بیٹھ گئی اور بغور اس کے صبیح' باوقار سادہ سے چہرے کو دیکھنے لگی۔

"تھینک یو سسٹر۔" کافی کا مگ دیکھ کر مہربان سی مسکراہٹ حرم کی طرف اچھالتے ہوئے وہ بولی اور پھر سے مصروف ہوگئی۔

"مریم اپنی سوکھی ہوئی گردن دیکھو اور ان کتابوں کو دیکھو۔" حرم نے مریم کے سامنے کھلی میڈیکل کی موٹی موٹی کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔

"میری سوکھی ہوئی گردن کا ان کتابوں سے کیا تعلق۔" وہ ہلکا سا مسکرائی مریم جانتی تھی کہ حرم کی پڑھائی سے جان جاتی ہے۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔ میں تمہیں ایک بات بتانے آئی تھی۔" حرم اصل بات کی طرف آئی۔

"کون سی بات۔" مریم ہنوز کتابوں میں مصروف تھی۔

"توحید آنٹی آرہی ہیں کل۔۔۔ اپنے بیٹے کے لیے۔" اپنے تئیں اس نے مریم کے قریب بم پھوڑا تھا۔

"کیوں بھئی ان کا بیٹا ہمارے پاس تو نہیں جو وہ اپنے بیٹے کے لیے ہمارے گھر آرہی ہیں۔" اس کا تحمل دیدنی تھا۔ حرم نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

"اپنے بیٹے کے لیے آرہی ہیں مطلب کہ اپنے اکلوتے سپوت کا رشتہ لے کر آرہی ہیں۔" حرم نے تفصیل بتائی۔

"کیا؟" وہ پوری کی پوری حرم کی طرف مڑ گئی اور صحیح معنوں میں چونک گئی۔

"کس کے لیے" وہ بے یقینی سے بولی۔

"رشتے کے لیے وہ بھی تمہارے رشتے کے لیے۔ تمہیں یاد ہے کتنا شرارتی تھا وہ جس نے بھا کی مونچھیں۔۔۔" وہ بنا بریک پر پاؤں رکھے بولے گئی اس بات سے بے خبر کہ مریم کا چہرہ دھواں دار قسم کا سرخ ہو گیا ہے۔

"اسٹاپ اٹ حرم۔۔۔ یہ کیا بکواس کر رہی ہو۔" وہ انتہائی غصے سے بولی۔

"بکواس نہیں کر رہی سچ بتا رہی ہوں۔ تمہیں یاد تو ہے نا وہ۔"

"بہت اچھی طرح یاد ہے وہ شیطان کی آنت مجھے۔" مریم نے دانت کچکچائے۔

"خدا کا خوف کرو مریم تب وہ بچہ تھا اور ہر بچہ بچپن میں اتنا ہی شرارتی ہوتا ہے۔" حرم نے مریم کا غصہ کم کرنے کی ناکام سی کوشش کی۔

"میں تو نہیں تھی شرارتی بچپن میں۔۔۔ جیسی اب ہوں ویسی ہی بچپن میں بھی تھی۔ تم بھی اپنے بچپن جیسی ہی ہو کوئی نہیں بدلتا۔ بچپن کی عادات بہت پکی ہوتی ہیں۔"

"وہ کیپٹن بن چکا ہے مریم اور کیڈٹ تو ہوتے ہی اتنے ڈسپلن والے ہیں۔"

"آئی ڈونٹ کیئر۔۔۔ مجھے مما سے بات کرنی ہوگی کہ وہ توحید آنٹی کو منع کردیں۔ مجھے نہیں کرنی شادی ہوا دی وہ بھی اس لاابالی اور غیر سنجیدہ شخص سے۔۔۔ زہر لگتے ہیں مجھے ایسے لڑکے۔" وہ نخوت سے کہتی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

"وہ اس وقت مما سے کوئی بات مت کرنا وہ سو رہی ہیں اور تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ لاابالی اور غیر سنجیدہ ہے کیا پتا ایسا نہ ہو۔" وہ مریم کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

مجھے کوئی بات نہیں کرنی حرم اس کے بارے میں وہ بہت بدتمیز بچہ ہوا کرتا تھا وہ میری شکلیں بنایا کرتا تھا اور مجھے بہت برا لگتا تھا۔" وہ غصے کے عالم میں بیڈ پر جا بیٹھی۔ مریم کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر حرم کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اسے یاد آیا وہ بچپن میں آنکھیں بھینگی کرکے مریم کا منہ چڑایا کرتا تھا اور مریم، علی کی اس حرکت پر بہت کڑھتی رہتی تھی۔ وہ بے حد شرارتی تھا اور جب بھی ان کے گھر آتا پورے کا پورا گھر درہم برہم کرکے رکھ دیتا تھا اور مریم کی تو اس سے ذرا بھی نہیں بنتی تھی۔

"مریم۔۔۔ کیا پتا وہ اب آنکھیں بھینگی کرنا بھول گیا ہو۔" اپنی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے بولی اور مریم کو تاؤ دلا گئی۔

☆ ☆ ☆

"تو آپ نہیں رک رہیں۔" گرے ساڑھی کا پلو پکڑے وہ نک سک سے تیار بہت اچھی لگ رہی تھیں اور علی انہیں بہت بے چینی سے دیکھ رہا تھا۔

"علی۔۔۔ تمہیں یقیناً" میرے فیصلے پر فخر ہو گا۔" ایک آخری نظر خود پر ڈال کر وہ بالکل تیار تھیں۔

"اختلاف والے فیصلے پر فخر نہیں ہوا کرتا۔" وہ اداسی سے بولا۔

"وقتی اختلاف ہے، بہت جلد دور ہو جائے گا۔" وہ اطمینان سے بولیں۔

"آپ میرے ساتھ ہمیشہ زبردستی کرتی ہیں امی۔" علی نے روہنسا ہو کر شکوہ کیا۔

"ماؤں کو کرنی پڑتی ہے زبردستی۔ بچوں کے فیصلے ان کے لیے اچھے نہیں ہوتے کیوں کہ انہیں اپنے اچھے برے کا پتا نہیں ہوتا۔" انہوں نے مسکرا کر اپنے ناراض سے بیٹے کو پیار سے دیکھا۔

"امی یہ تو نہ کہیں اب میں بچہ تو نہیں۔" وہ دبے دبے احتجاج سے بولا۔

"بہت بڑے ہو گئے ہو تب ہی تو کچھ سوچ رہی ہوں۔" وہ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولیں۔

"امی۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولا تو وہ مسکرا دیں، علی کے سلکی بالوں کو ہاتھ سے خراب کرتے ہوئے وہ چلی گئیں۔

"اندر سے بھنگڑے ڈال رہا ہے اور اوپر سے خفگی تو دیکھو لاڈ صاحب کی۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی گاڑی میں آ بیٹھیں۔

بابا کے دبدبے سے وہ خاصا جھجکتا تھا اور اس فیصلے میں ان کی رائے بھی امی سے ملتی تھی۔ اس بغاوت میں وہ اکیلا ہی تھا۔ خفت سے وہ پانی پانی ہو رہا تھا۔ کل کی وہ بچی جسے وہ انتہائی بدتمیزی سے چھیڑا کرتا تھا۔ آج وہ ڈاکٹر بن گئی اور امی اسے اپنی بہو بنانے کا سوچ رہی ہیں۔ یہ سوچ ہی سوہان روح تھی کہ اگر اسے سب کچھ یاد ہوا تو۔

کرنل وقار حمزہ اور سلمان صاحب آج بھی اس کی شرارتیں یاد کرکے ہنس رہے تھے یعنی کے اب انہیں اس سے اختلاف نہیں رہا تھا۔

"تم نے دیکھا پپا کرنل انکل سے کتنے خوشگوار انداز میں بات کر رہے ہیں۔" حرم اس کے کمرے میں آتے ہی جوش سے بولی۔

"تو وہ ہمارے مہمان ہیں کیا ان سے برے لہجے میں بولیں۔" وہ تو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی کھا جانے والے انداز میں بولی۔

"پپا اس کا بچپن یاد کرکے ہنس رہے ہیں۔" حرم نے اک اور تیر چھوڑا۔

"آف۔ اس کا بچپن۔" مریم نے ہنکارا بھرا۔

"تم بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو مریم۔" حرم جھنجلا گئی اس کی باتوں سے اور اس سے پیشتر وہ حرم کو کوئی جواب دیتی مما اندر آ گئیں۔

"مریم باہر آ کر مہمانوں سے ملو۔" خوشی مما کے چہرے سے واضح تھی۔

"مما۔ میں نے آپ سے صبح کیا بات کی تھی۔" حرم کو نظر انداز کرکے وہ براہ راست مما سے بولی۔

"چپ کرو مریم وہ باتیں انتہائی احمقانہ ہیں انہیں سن کر تو صرف ہنسی ہی آتی ہے۔" وہ مریم کو ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

"مگر مما۔" وہ ان کی باتوں سے اختلاف کرنا چاہ رہی تھی مگر بے کار ثابت ہوا۔

"پانچ منٹ میں باہر آؤ۔ میں کوئی ایکسکیوز نہ سنوں مریم۔" وہ دو ٹوک انداز میں کہتی باہر چلی گئیں۔ مریم پاؤں پٹختی رہ گئی سارا غصہ اور جھلاہٹ بمشکل کمرے میں چھوڑ کر خود کو نارمل کرتے ہوئے وہ باہر آ گئی۔

"السلام علیکم!" سب کو اجتماعی سلام کرتے ہوئے وہ سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیسی ہو مریم۔" توحید بیگم نے خوش اخلاقی سے کہا۔

"اچھی ہوں۔" بمشکل مسکراتے ہوئے مریم نے جواب دیا۔

"تمہاری اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں۔ کون سا سمسٹر ہے۔" اب کے کرنل وقار حمزہ بولے۔ انہیں بھی نازک معصوم سی لڑکی بہت بھلی لگی تھی اپنے بیٹے کے لیے۔

"جی انکل 6th سمسٹر ہے۔" وہ دھیمے سے لہجے میں بولی۔ وہ متاثر سے نظر آنے لگے۔

"ویری نائس۔"

"دراصل مریم کو شروع سے ہی ڈاکٹر بننے کا شوق تھا اور ماشاء اللہ ہر سال "بریلینٹ اسٹوڈنٹ آف دی ایر" بھی بنتی رہی ہے۔ تو میں نے کبھی اسے نہیں روکا کہ کیا بنے یا نہ بنے۔" سلمان صاحب نے محبت بھری نظروں سے اپنی پیاری سی بیٹی کو دیکھا۔ حرم کی نسبت وہ اپنے بابا کے زیادہ قریب تھی اس لیے انہیں اپنی سنجیدہ باوقار سی بیٹی قدرے زیادہ عزیز تھی۔ وہ عام بچوں کی طرح ستانے والی اور شریر نہیں تھی۔ ہمیشہ بہت کیئرنگ اور لونگ سی رہی تھی۔ کبھی بابا کی کبھی ماما کی Help اسے بہت پسند تھا۔ رحم دل سی اور ہر اک کا خیال رکھنے والی۔

"تھکن نہیں لگتی میڈیکل کی پڑھائی۔" توحید بیگم نے مریم کے ہاتھوں سے چائے لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو۔ اگر پڑھائی بھی ٹف لگے تو ایزی پھر کیا ہو۔ آئی تھنک پڑھائی دنیا کا سب سے آسان کام ہے۔" بہت اعتماد سے کہتے ہوئے مریم انہیں بہت اچھی لگی۔

"ایسا صرف مریم کو لگتا ہے آنٹی مجھے تو سب سے ٹف پڑھائی لگتی ہے۔" حرم نے گردن کھجاتے ہوئے کاہلوں کی طرح کہا تو سب کے لبوں پر مسکان بکھر گئی۔

سب کے درمیان آئی تو وہ بہت بے دلی سے تھی، مگر کرنل وقار حمزہ کی آرمی لائف کی داستان سن کر وہ تو بھول ہی گئی کہ اسے وہاں زیادہ دیر نہیں بیٹھنا تھا۔ وہ اک بہترین سامع تھی صرف سامع ہی تھی بولنا اسے زیادہ پسند نہیں تھا۔ تب ہی تو ہر باتونی بندہ اس کی کمپنی میں زیادہ خوش رہتا تھا کہ وہ ہر قسم کی گفتگو سن لیتی تھی وہ بھی بغیر بولے خاموشی سے چاہے وہ نا بھی سننے کے قابل ہو وہ کسی کا دل نہیں توڑتی تھی۔

کرنل وقار حمزہ کو وہ جی جان سے پسند آ گئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے پیارے اور اکلوتے بیٹے کے لیے ایسی ہی سلجھی اور سبھاؤ والی لڑکی بہتر تھی۔ واپسی کا سارا راستہ وہ مریم کی عادتوں کی تعریف کرتے کرتے آئے تھے۔

"مریم۔۔۔ علی کے ساتھ بہت اچھی لگے گی۔" اور اس بات کا اظہار بھی انہوں نے فوراً" کیا تھا۔

"ایسا آپ کو لگتا ہے اب آپ کا بیٹا مانے تب نہ۔۔۔"

"کیوں نہیں مانے گا توحید، میں جانتا ہوں علی کو، وہ مریم کو لے کر اختلاف کر ہی نہیں سکتا ہم سے۔" وہ پُراعتماد تھے۔

"چلو دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ کیا پتا ہمارا علی ہی مریم کو پسند نہ آئے۔" توحید بیگم کو اک نئی فکر لاحق ہوئی۔

"ہاں تو مریم کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ علی سے ملے۔ اس سے بات چیت کرے۔ دیکھے پرکھے۔"

"کہوں گی علی سے کہ وہ ان کے گھر جا کر اک بار

مل لے سب سے۔"
"وہ مان جائے تب نا۔" وقار صاحب نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔
"مان جائے گا۔ مجھے منانا آتا ہے اسے۔" ان کے لہجے میں بلا کا مان تھا جیسے کہ ان کا بیٹا کبھی ان کی کوئی بات رد کر ہی نہیں سکتا۔

☆ ☆ ☆

"توحید آنٹی نے ہمیں دعوت دی ہے اپنے گھر آنے کی۔" حرم دھپ سے اس کے بیڈ پر آبیٹھی اور مریم جو بری طرح سے غرق تھی کتابوں میں ایک دم سے چونک گئی۔
"کس لیے؟" منہ پھلائے وہ پھر سے منہمک ہو گئی۔
"ظاہر ہے اس لیے کہ ہم جا کر ان کے لاڈلے کو دیکھ کر آئیں۔" وہ آنکھیں میچے مزے سے بولی۔
"حرم تم بھی جاؤ گی مما بابا کے ساتھ۔" وہ لاچاری سے بولی۔
"ظاہر ہے میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ اب بھی ویسا ہی پیارا سا ہے۔" حرم تصور میں علی کی بہت پرانی صورت لائی۔
"پیارا ہے کہ شرارتی۔" مریم نے کڑھ کر کہا۔
"۔۔ وہ بھی ۔۔" حرم نے اتفاق کیا۔
"حرم تم کر لو اس سے شادی تمہیں ویسے بھی خوب صورت لڑکے پسند ہیں۔" کتاب بند کر کے وہ ایک دم منت بھرے لہجے میں بولی جیسے وہ اسے کافی بنانے کا کہہ رہی ہو۔ حرم اک دم بھڑک اٹھی اس کی بات پر۔
"دفع دور مریم منہ اچھا نہ ہو تو بات اچھی کرنا چاہیے۔" وہ بہت برا منا کر بولی اور منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ مریم نے زبان دانتوں تلے دبالی۔ حرم خطرناک حد تک ناراض ہو گئی تھی۔
"سوری ۔۔" اسے اک دم سے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔
"تمہیں یاد ہے میڈیکل میں ایڈمیشن لینے سے پہلے تم نے بابا سے کیا وعدہ کیا تھا کہ تمہارا ایک ہی ارمان ہے کہ تم ڈاکٹر بن جاؤ اور باقی تمام فیصلوں کا اختیار بابا کو دیا تھا کہ تم جو وہ کہیں گے وہی کرو گی۔ تم ان کے ہر فیصلے ہر حکم کو مانو گی۔" حرم مریم کو یاد کرواتے ہوئے بولی۔
"ہاں ۔۔ تو مانوں گی نا مگر یہ بات۔" وہ دانستہ خاموش ہو گئی۔
"دیکھو مریم خوا مخواہ اس کی بھیگی آنکھوں کو اشو مت بناؤ۔ سب بہتر ہو گا، ہم کو دل میں جگہ مت دو انسان جیسا سوچتا ہے ویسا نہیں ہوتا ہے۔" وہ اسے لاڈ سے سمجھا رہی تھی۔ کہنے کو تو حرم مریم سے پورے اک سال چھوٹی مگر ہمیشہ حرم ہی مریم کو چھوٹوں کی طرح ٹریٹ کرتی تھی۔ اسکول میں بھی حرم ہی بڑی بہنوں کی طرح مریم کا خیال رکھتی تھی اور اب پریکٹیکل لائف میں بھی وہ ہر بات میں حرم سے مشورہ لیتی تھی۔ حرم کے جاتے ہی اس کا اضطراب بڑھ گیا۔ اطمینان کے رخصت ہوتے ہی اس نے کتابیں بند کر دیں دل اک دم ہی سب چیزوں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہارے آئیڈیل پر پوری اترتی ہے مریم"۔ علی گارڈن میں لگے تمام پودوں کو پانی دے رہا تھا اور وہ گھاس کی کٹنگ کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ وقفے سے مریم کی تعریف کرنا نہیں بھولتی تھیں۔ علی حمزہ کے لاکھ بسورنے کا بھی تو خاطر خواہ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تنگ آچکا تھا مریم نامے سے۔ جب سے وہ مریم کے گھر سے ہو کر آئی تھیں۔ ان کے درمیان اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکی تھی۔
"آئیں گے نا وہ اس اتوار کو ہمارے گھر حرم بھی آئے گی تم سے ملنے۔" وہ ہار نا مانتے ہوئے مستقل مزاجی سے بولیں۔ پھر بھی علی نے کوئی جواب نہ دیا۔ جانتا تھا کہ وہ اس کی بات پر سو طرح کی وضاحتیں اور تسلیاں دے کر اسے چپ کروا دیں گی۔ جیسے کسی بچے کو بہلا دیا جاتا ہے۔

"علی تم نے منہ بند ہڑتال کر رکھی ہے۔" وہ اس کے ڈھیلے ڈھیلے انداز اور کوفت بھرے انداز و تاثر سے تنگ آکر بولیں۔ وہ پھر بھی ہنوز چپ رہا۔
"علی ۔۔ میں تم سے بات کر رہی ہوں۔" اب کے وہ علی کے قریب آکر اونچی آواز میں بولیں تو علی نے ذرا کی ذرا انہیں دیکھا بھوری آنکھوں میں شدید قسم کی خفگی تھی اور اس کی ناک بھی پنک ہو رہی تھی۔ یعنی کہ وہ واقعی ان سے خفا تھا۔
"تو تم مجھ سے ناراض ہو۔ ہاں۔"
"امی میری ایک ماہ کی چھٹی تھی سوچا تھا گھر جاؤں گا امی سے خوب باتیں کروں گا۔ امی کے ہاتھ کے بنے طرح طرح کے کھانے کھاؤں گا۔ ان سے اپنے بچپن کی باتیں سن کر لاڈ اٹھواؤں گا۔ شاپنگ کے لیے لے جاؤں گا مگر میں جب سے آیا ہوں آپ کا مریم نامہ ہی بند نہیں ہو رہا۔" وہ نروٹھے پن سے بولا۔
"ٹھیک ہے کر دیں میری شادی اس خشک مزاج، بے رحم، اوزاروں سے لیس ڈاکٹر سے۔ میں بھی پہلے دن ہی اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔" ہاتھ میں پکڑا پائپ نیچے پٹختے ہوئے علی نے دل کا سارا غبار نکال دیا اور توحید بیگم ہکا بکا اسے دیکھ کر رہ گئیں۔
"خشک مزاج، بے رحم، اوزاروں سے لیس۔" وہ تو صدمے سے ان تین لفظوں کو سوچ رہی تھیں کہ اس نے کیسا خاکہ بنا رکھا ہے مریم کا۔ وہ بنا ان کی کچھ سنے انہیں وہیں حیران و پریشان چھوڑ کر باہر چلا گیا اور پھر اتوار بھی آگیا۔ علی حمزہ، کرنل وقار حمزہ کے ڈر سے نارمل ہی رہا۔ منہ بند ہڑتال تو ہنوز جاری تھی۔ کچن میں کھڑے وہ بنا بات کیے توحید بیگم کی مدد کروا رہا تھا پیاز کاٹتے ہوئے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے وہ توحید بیگم کو گھائل کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور وہ اس سے چھپ کر اپنی مسکراہٹ دبا رہی تھیں۔
"ڈرامے باز۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔ باورچی کے ہوتے ہوئے بھی وہ ان کا کام کے اختتام تک ہاتھ بٹاتا رہا اور پھر بنا کلام کیے فریش ہونے چلا گیا۔
"تم تیار ہو گئے۔" وہ آئینے کے سامنے کھڑا اپنے بال بنا رہا تھا۔ جب توحید بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھوں کا اضطراب بتا رہا تھا کہ مہمان آچکے ہیں۔
"امی آپ کا بیٹا منہ پر جمی میل اور پھٹی جلد بھی لے کر جائے تب بھی نوین پھپھو آپ کے بیٹے کو نظر انداز نہیں کر سکتیں۔" وہ کلس کر بولا۔
"فضول مت بولو علی۔ خبردار جو کوئی گڑبڑ کی تو اب بچپن نہیں رہا تمہیں۔" توحید بیگم آہستہ سے ڈپٹتے ہوئے علی کے قریب آکر بولیں ساتھ ہی اس کی قمیص کے بٹن بند کرنے لگیں۔
"کیا میں اندر آسکتی ہوں۔" توحید بیگم دروازہ کھلا چھوڑ آئی تھیں۔ اس لیے حرم نے دستک دینے کے بجائے سیدھا ان سے پوچھ لیا۔
"ہاں۔۔ ہاں حرم آؤ نا۔" وہ خوشدلی سے کہتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں علی کو کچھ سمجھانے لگیں۔
"یہ۔۔" اندر آتے ہوئے حرم نے سوالیہ نظروں سے علی حمزہ کی طرف اشارہ کیا۔ گویا کہ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ ہی کیپٹن علی حمزہ ہے۔
"یہ علی حمزہ ہے۔۔ میرا بیٹا۔" دنیا جہان کی محبت لہجے میں سموئے انہوں نے اپنے بیٹے کا تعارف کروایا۔
"السلام علیکم ۔۔" اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے علی کو دیکھ کر بہت حیرت ہوئی ہے۔
"وعلیکم السلام۔" اس نے بھی دانت پھیلائے۔
"آپ تو بالکل ویسے ہی ہیں۔" حرم اپنی حیرت چھپائے جوش سے بولی۔
"کیسا۔۔"
"جیسے بچپن میں تھے۔" وہ اک دم بولی تو علی کے پیٹھ پیچھے باندھے ہاتھوں کی انگشت شہادت پھڑکنے لگی۔ جسے حرم نے اپنے دانتوں تلے دبایا تھا۔ علی حمزہ کی مسکراہٹ اک دم غائب ہو گئی۔
"آپ کو میرا بچپن یاد ہے۔" علی نے چونک

پوچھا۔

"ہاں۔" حرم نے بہت اعتماد سے جواب دیا تو علی کو شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے بھی خوب زور سے حرم کے بال کھینچے تھے۔

"تم دونوں باتیں کرو میں آتی ہوں۔" توحید بیگم انہیں اکیلا چھوڑ کر وہاں سے نکل گئیں۔

"باہر چلیں۔" وہ بڑے انہماک سے علی کے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب علی نے پوچھا۔

"ہاں۔ ضرور مجھے مری کا موسم بہت پسند ہے۔ لان میں چلتے ہیں۔" وہ بہت اپنائیت سے بولی۔

علی حرم کو لے کر لان میں آگیا اور وہاں بھی مریم نامہ شروع ہوگیا۔ حرم کی یادداشت بھی غضب کی تھی۔ چن چن کر وہ اسے اس کی کارستانیاں سنا رہی تھی اور علی کھسیائے ہوئے انداز میں مسکرائے جارہا تھا۔

کیڈٹ اسکول و کالج میں پڑھائی اور پھر آرمی لائف کے بعد اب وہ خاصا بدل چکا تھا۔ یہ بات الگ تھی کہ اب بھی وہ خاصا ہنس مکھ تھا۔ نوین پھپھو نے بھی کہا تھا کہ وہ اب کافی بدل چکا تھا۔ ملاقات کے پورے دورانیے میں علی نے چپ میں ہی عافیت سمجھی۔ نوین پھپھو اسے بارہا گھر آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ مطلب وہ واقعی قربانی کا بکرا بن چکا تھا۔

جاتے ہوئے حرم اسے مریم کا نمبر دے گئی تھی کہ وہ چاہے تو مریم سے بات کرسکتا ہے۔

"مگر میں کیا بات کروں گا ان سے۔" نمبر ہاتھ میں لیے وہ ناسمجھ انداز میں بولا۔

"کیا مطلب علی۔" حرم نے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ ہڑبڑا گیا۔

"او کے۔ آپ انہیں بتا دیجیے گا کہ آپ نے مجھے ان کا کنٹیکٹ نمبر دیا ہے۔" وہ حد سے زیادہ تمیز کا مظاہرہ کررہا تھا۔

"نہیں کن کو۔" حرم نے شریر نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ سر جھکا گیا۔ ان سب کے جانے کے بعد علی نے نمبر اپنے موبائل میں Save کرلیا Dr-Witch کے نام سے۔

حرم جاتے جاتے علی کے لیے مریم کی کچھ فوٹوگرافس چھوڑ گئی تھی اور مریم کے لیے علی کی فوٹوگرافس لے گئی تھی۔ رات کافی ہوگئی تھی جب وہ اپنے بیڈ پر آکر بیٹھا تھا۔ نظر اک دم سے سامنے ٹیبل پر پڑے خاکی لفافے پر پڑی۔ دل نے اک بیٹ مس کی ہاتھ رک رہے تھے کہ وہ نہیں دیکھے گا اس اوزاروں سے لیس روڈ سی ڈاکٹر کو مگر دل کہیں تجسس سے مجبور ہورہا تھا اور وہ علی ہی کیا جو دل کی نہ مانے۔ لفافے کو اٹھاتے ہوئے اس کے ابرو تن گئے۔ دونوں آنکھوں کو بند کرکے اس نے لفافے میں ہاتھ ڈال کر تصاویر نکالیں۔ تصاویر نکال کر اس نے آہستہ سے اپنی اک آنکھ کھولی تصویر الٹی تھی۔

"اوہو۔" علی نے جھنجلا کر تصویر سیدھی کی اور دونوں آنکھوں کو پورے کا پورا کھول لیا۔

☼ ☼ ☼

ابھی کچھ دیر پہلے حرم علی کی تصاویر چھوڑ گئی تھی اور وہ قطعی اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے سامنے وہی بچپن والا علی حمزہ جس کے بھورے بال اس کے ماتھے پر پڑے رہتے تھے' بھوری شریر سی نگاہیں' لمبی سی ناک جو مغروری سی لگتی تھی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ ایک بات تو آج طے تھی کہ بابا آج اسے پسند کر آئے تھے اور وہ تینوں ہی بار بار یہ جملہ دہرا رہے تھے کہ علی حمزہ کتنا بدل گیا ہے اور بابا کے سامنے نہ کرنے کی ہمت بھی تو اس میں نہ تھی۔ تو طے تھا کہ شادی اسے اسی بندے سے کرنی ہے اک امیچور لڑکے سے۔ مریم نے تھک کر اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا اور اٹھ کر بیڈ کی طرف چلی آئی۔

تصویر پر بنا نظر ڈالے مریم نے بہت بے دلی سے اپنی رضامندی دی تھی اور دعا بھی کی تھی کہ بابا براہ راست علی کی بات اس سے نہ ہی کریں مگر بعض دفعہ وہی کام کرنا پڑتا ہے جس کا دل نہ چاہے۔ بابا نے ڈائریکٹ مریم سے بات کی تھی اس کے فیوچر کی اور اس وقت وہ مریم کو اپنے نہیں بلکہ علی حمزہ کے بابا لگ رہے

تھے۔ بالکل ویسے جیسے آج کل علی حمزہ کو اپنی پیاری توحید آپا مریم کی امی لگ رہی تھیں۔ ان کی سرگرمیاں آئے دن بڑھتی جارہی تھیں اور اک صبح تو مریم کے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ وہ حیران حیران سی چہکتی ہوئی حرم کو دیکھ رہی تھی کہ وہ کس بات کو لے کر اتنا خوش ہے اور ہواؤں میں اڑ رہی ہے اور جب مریم کے گوش گزار ہوا کہ اس کی خوشی کی وجہ کیا ہے تو وہ شاکڈ رہ گئی۔ مریم کے پیپرز کے بعد اس کی شادی طے تھی یعنی اگلے ہفتے اس کی شادی تھی۔

"آپ نے اک بالکل انجان بندے سے میری شادی طے کردی اور مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔" مریم سخت برہم لہجے میں بولی۔

"انجان کون علی۔" وہ الٹا اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"تو اور کس کا کہہ رہی ہوں مما! کل رشتہ ہوا اور آج رخصتی کا بھی سوچ لیا آپ نے یہ کیا مذاق ہے۔" وہ بہت ناراض تھی ان سے۔

"تمہیں کس نے کہا کل رشتہ ہوا ہے۔" مما کا اطمینان دیدنی تھا۔

"ہاں تو کون سا سالوں پہلے ہوا ہے۔"

"تمہیں ایسا لگ رہا ہے کہ یہ رشتہ کل ہوا ہے۔ جبکہ تم یہ نہیں جانتیں کہ یہ رشتہ بچپن سے ہی طے تھا۔ تم لوگوں کو اس لیے نہیں بتایا کہ وقار بھائی نے منع کیا تھا۔ توحید آپا ہر سال فون کرکے مجھے یاد دلاتی تھیں کہ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے؟" وہ کیا بول رہی تھیں مریم کو یقین نہیں آرہا تھا۔

"مما میری اسٹڈیز۔ آپ کو پتا ہے کہ ابھی پورے دو سال پڑے ہیں اور آپ ابھی سے میری شادی کررہی ہیں' یہ زیادتی ہے۔" وہ غصے سے بولی۔

"تو کس نے منع کیا ہے تمہیں پڑھائی سے علی کیپٹن ہے۔ کتنے عرصے بعد گھر آتا ہے زیادہ تر اپنی سروس میں ہوتا ہے تو تم آزاد ہوگی اسٹڈیز کے لیے اور اس بات پر علی کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ میری خود بات ہوئی ہے علی سے اس موضوع پر۔" وہ مریم کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"مگر میرے لیے تو پاسبل نہیں ہے نا۔"

"مریم توحید آپا بہت ارمانوں سے تمہیں مانگ رہی ہیں اور میں اور تمہارے بابا مطمئن ہیں کہ ہم ان کو تمہاری ذمہ داری سونپ کر دوبارہ اپنے گھر چلے جائیں گے"۔ پچھلے سال ہی سلمان صاحب نے اپنا بزنس کینیڈا میں شروع کرنے کا سوچا تھا اور اب تک وہ اپنا تمام بزنس پاکستان سے وائنڈ اپ کرچکے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ وہاں شفٹ ہوجائیں۔ مگر مسئلہ مریم کی اسٹڈیز کا آرہا تھا اور اب تو پچویشن ہی چینج تھی کہ وہ اب مریم کو کسی سے منسوب کرچکے تھے۔

"تو یہ بات ہے چلے جائیں آپ وہاں۔ میری فکر چھوڑیں میں رہ لوں گی آپ کے بغیر۔" وہ بہت اداسی سے بولی۔

"تم سارے معاملے کو غلط لے رہی ہو مریم۔ توحید آپا اور وقار بھائی بہت محبت سے تمہیں مانگ رہے ہیں اور تمہارے بابا بھی اس بات کو لے کر بہت خوش ہیں کہ تم اپنے گھر کی ہوجاؤ گی اور یہ بھی کہ تم اپنی اسٹڈیز آرام سے جاری رکھ سکو گی۔" وہ بہت تحمل اور پیار سے مریم کو سمجھا رہی تھیں۔ وقار صاحب بھی چاہتے تھے کہ وہ باقی کی اسٹڈیز علی کے چلے جانے کے بعد ان کے سونے گھر میں رہ کر پوری کرے اور کینیڈا نہ جائے اور اسٹڈیز کمپلیٹ کرکے آرمی جوائن کرے۔ کیونکہ وہ اور توحید بیگم بھی علی کے چلے جانے کے بعد بالکل اکیلے ہوجاتے تھے۔

مگر مریم نے پوری بات سنی ہی نہیں بہت غصہ تھا اسے سب پر اور سب سے زیادہ علی حمزہ پر کہ وہ ہی منع کردیتا مگر وہ کیوں منع کرتا اک لاابالی' کھلنڈرا مزاج لڑکا اپنی شادی سے کیونکر انکار کرے۔ وہ پاگل تھوڑی ہوگا۔"

پیپرز ختم ہونے کی اسے کوئی خوشی نہیں تھی۔ وہ مما' بابا سے دل ہی دل میں بہت ناراض تھی۔ اک شام وہ اپنے کمرے میں کافی نیند لینے کے بعد اٹھی تھی۔

موبائل پر اک میسیج ریسیو ہوا۔ نامعلوم نمبر سے۔ "السلام علیکم" کے مختصر سے الفاظ تھے۔ وہ ابھی ہی بیڈ سے اتری تھی اور دوسری طرف علی میسیج کے جواب میں پیر جلی بلی کی طرح ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اک تو اتنی ہمت جمع کرکے اس نے بات چیت شروع کرنے کی کوشش کی تھی۔ آخر کار وہ اس کی دلہن بننے جارہی تھی۔

میسیج نظرانداز کرتی وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ چائے کے لیے پانی رکھ کر وہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ حرم اور مما روزانہ کی طرح شاپنگ کرنے نکلی ہوئی تھیں اور مریم کا دل تو بالکل نہیں چاہتا تھا کہ وہ ان کے ساتھ جائے۔ علی حمزہ دوسرے میسیج کا سوچ کر موبائل نکالتا مگر خود کو سرزنش کرکے دوبارہ رکھ دیتا۔ کافی دیر بعد مریم کا موبائل پھر سے جگمگایا۔ اس بار علی نے نام و مقام سمیت میسیج کیا تھا۔ نام پڑھتے ہی مریم کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"اسے میرا نمبر کس نے دیا۔۔۔ اوہ حرم۔۔۔" سوچتے ہوئے اس نے حرم کو کوسا مگر جواب نہیں دیا۔

"بدتمیز۔۔۔" جواب نہ پاکر وہ جی جان سے بدمزا ہوا تھا خود کو کوسنے لگا کہ میسیج ہی کیوں کیا تھا وہ اندر آگیا جہاں امی اک دوپٹے کو پھیلا پھیلا کر دیکھ رہی تھیں۔ جو یقیناً" مریم کے لیے ہی لیا تھا۔ اس وقت اسے مریم پر سخت غصہ تھا۔

"کیا ہوا علی، منہ کیوں پھولا ہوا ہے۔" وہ صوفے پہ بیٹھا ہی تھا کہ امی نے اک نظر اس پہ ڈالی۔

"امی آپ میرے ساتھ ظلم کررہی ہیں۔ آج کل تو لوگ بیٹوں سے پوچھ کر ان کا رشتہ ان کی مرضی سے کرتے ہیں اور اک آپ ہیں اس روڈ سی ڈاکٹر سے میری شادی کررہی ہیں۔"

"یہ خیال پھر سے کیوں آگیا۔ تصویر دیکھ کر تو بڑے مزے سے کہا تھا۔ ناٹ بیڈ" وہ علی کی نقل اتارتے ہوئے بولیں۔

"صرف اچھی شکل ہی ضروری نہیں ہوتی۔" وہ جل کر بولا۔ رہ رہ کر احساس بے عزتی ہو رہا تھا۔

"ساتھ رہو گے تو ایک دوسرے کے مزاج بھی جان جاؤ گے اور مجھے اپنے بیٹے پر پورا بھروسا ہے۔ وہ افریقہ کے آدم خوروں میں بھی جائے تو ان کے ساتھ بھی دوستی کرلے گا۔ یہ تو پھر اک لڑکی ہے اور نکاح کے بعد تو محبت اللہ تعالیٰ خود ہی دلوں میں ڈال دیتا ہے۔" وہ علی کو سمجھاتے ہوئے بہت شفقت سے بولیں۔

"آپ کا تو اپنے بیٹے کو طرح طرح کے محاذوں پر بھیجنے کا شوق ہی بہت ہے۔" وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اتنے چھوٹے چھوٹے محاذوں سے فوجی کب ڈرتے ہیں۔" اب انہوں نے علی کو غیرت دلائی۔

"وہ بہت نائس ہے علی۔۔۔ مجھے یقین ہے میرا بیٹا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں بنائے گا۔" اور تیر نشانے پر لگا تھا۔ اس نے گردن اٹھائی تھی۔

"تم تو بالکل لڑکیوں کی طرح ایکٹ کررہے ہو۔" وہ مزے سے کہتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼
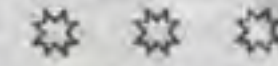
اک طائرانہ نگاہ خود پر ڈالتے ہوئے ایک بار پھر خود پر خوشبو کا چھڑکاؤ کیا تھا۔ آج اس کی مہندی تھی۔ بہرحال اس نے خود کو نئی زندگی کے لیے تیار کرلیا تھا۔ معاذ لاہور سے بطور خاص چھٹی لے کر آیا تھا۔ معاذ اور وہ بچپن کے دوست تھے۔ دونوں نے ساتھ ہی کمیشن لیا تھا۔ اب وہ لاہور تھا اور علی سیالکوٹ، ایک لمبے عرصے بعد وہ علی کی شادی پر آرہا تھا۔ معاذ پر نظر پڑتے ہی وہ بہت خوشی سے اس کے گلے آلگا۔

"بدتمیز آدمی۔۔۔ ہوا بھی نہیں لگنے دی اتنی بڑی خوش خبری کی۔" اب وہ کشن کی برسات کررہا تھا۔

"سب توحید آپا کی کارستانی ہے یار۔ مجھے خود معلوم نہیں سب کیسے ہوا۔" وہ اپنا دفاع کرتے ہوئے بولا۔

"اوہ! اب معصوم بنو گے۔ کہو گے میں نے تو دیکھا بھی نہیں، مجھے تو معلوم ہی نہیں نام کیا ہے۔"

"نہیں نام مجھے معلوم ہے۔" اس کے مارے گئے کشن کو پکڑتے ہوئے اس نے چہک کر کہا۔

" Dr.Witch" اور ناک سکیڑتے ہوئے بتایا۔

"شرم کرو اپنی ہونے والی بیگم کے لیے کیسے القابات استعمال کررہے ہو۔" معاذ نے اسے شرم دلاتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی Capt.Ghost کہہ رہی ہوگی۔"

"نہیں کہے گی وہ ایسا وہ بہت سڑو سی ہے معاذ۔" وہ اک دم سے بیڈ پر دھپ سے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کیوں۔۔۔ وہ سڑو ہے۔" معاذ نا سمجھتے ہوئے بولا۔

"دفع کرو اسے۔۔۔ میری شادی ہے یار۔۔۔ چلو انجوائے کرتے ہیں۔" وہ پوز کرتے ہوئے جلدی سے بولا۔ معاذ الجھا الجھا سا اس کے پیچھے آگیا۔

"تمہیں میجر عمران کی شادی یاد ہے علی۔" سیڑھیاں اترتے ہوئے معاذ نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو علی حمزہ کا قہقہہ بے اختیار ہوگیا۔

"میجر عمران کی شادی یا ان کی دلہن۔"

"وہ مائی گاڈ کیا خاتون تھیں۔"

"اتنی بری بھی نہیں تھیں۔ بس ڈولے ہی تھوڑے زیادہ تھے۔"

"ہاں تھوڑے زیادہ۔" ناک کو سکیڑتے ہوئے اس نے تھوڑے کا اشارہ کیا تو پھر سے ان کی ہنسی نکل گئی۔

"نہیں یار، تم مانو گے وہ واقعی بہت اچھی خاتون تھیں۔ ہر روز میری سفارش کردیتی تھیں میجر عمران سے اور بدلے میں روز اک کلی لیتی تھیں۔ مجھے کہتی تھیں کہ عمران مجھ سے کہتے ہیں کہ علی جیسا بیٹا انہیں بھی دے دے اللہ۔" وہ مزے سے بولا۔ "خوب صورت ہونے کے بھی فائدے ہیں، سب سے پیار ملتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ٹریننگ کے دن یاد دلا دیے تم نے۔ علی پتا نہیں کہاں ہوں گے اب وہ دونوں۔" معاذ انہیں یاد کرتے ہوئے بولا۔ تبھی توحید بیگم بھی اندر آئیں۔ معاذ ان سے خوب لاڈ اٹھواتا تھا۔ ابھی بھی وہ ان دونوں کی نظر اتار رہی تھیں اور ان کی دوستی کو اور بھی مضبوط ہونے کی دعائیں دے رہی تھیں۔ آج توحید بیگم کی زندگی کا سب سے بڑا خوشی کا دن تھا۔ آج ان کا علی حمزہ دولہا بن رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر ہی تو جیتی تھیں۔

حرم کی طرف سے تمام رسومات بہت زور آور تھیں۔ سب سے زیادہ مرچوں والے لڈو تھے۔ جنہیں وہ تو سہہ گیا تھا مگر معاذ کو آگ لگ گئی تھی۔

"اوئے ہوئے۔۔۔ سالی سب پہ بھاری۔۔۔ ظالم عورت نے مرچیں کھلادیں۔" وہ بار بار آتا آنکھوں کے پانی کو صاف کرتے ہوئے بولا۔ علی اس کی حالت پر ہنس رہا تھا۔

"زیادہ دانت نہ نکال۔ مریم بھابھی کے اوزاروں کو یاد کر۔"

"بدتمیز۔۔۔" علی نے معاذ کو ٹھوکا مارا اور ہنستا مسکراتا چھوہارے چھپا کے کھاتے بچوں کو دیکھا۔ میجر عمران کی شادی میں معاذ اور حمزہ نے بھی یہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مریم کو ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ مما، بابا نے اسے رخصت کردیا ہے۔ وہ ان سے جدا ہو کر آگئی ہے وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔ وہ بار بار امڈ آنے والے آنسوؤں کو دھیرے سے صاف کرتی، سہمی سہمی نظروں سے کمرے کو دیکھ رہی تھی۔ بلاشبہ اس کے کمرے کی ہر چیز سے نفاست جھلک رہی تھی۔ کارپٹ سے لے کر دیواروں کے پینٹ تک سب کچھ اتنا اجلا تھا اور چاروں اطراف علی حمزہ کی ہر عمر کی تصاویر لگی تھیں۔ وہ اپنی ہر تصویر میں مسکرا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ وہ دنیا کا واحد شخص ہے جو کبھی بھی نہیں رویا ہوگا اور اپنے بالکل سامنے لگی علی کی تصویر کو دیکھ کر مریم کے آنسو تھم گئے اسے اک دم اپنا آپ عجیب سا لگنے لگا۔ لائٹ فیروزی لہنگے میں سائیڈ مانگ نکالے کھلے بالوں کو دوسری طرف کیے سفید بندیا میں وہ معصوم سی کسی پرستان کی پری لگ رہی تھی۔ جادو کردینے والے حسن کے ساتھ اسے لگا علی حمزہ کی تصویر اسے بہت بے باکی سے گھور رہی ہے۔ وہ مضطرب سی ہوگئی لبوں کو کچلتے وہ

نظروں کو جھکا گئی۔ تب بھی اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کی نظروں کے حصار میں ہے۔ وہ جلدی سے اٹھی تھی اور اس کی تصویر کو الٹ کر رکھ دیا تھا اس سارے دورانیے میں مریم کا سانس کافی پھول گیا اپنی سانس کو بحال کرتے وہ واپسی کے لیے مڑی ہی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ مریم کے قدم وہیں تھم گئے۔

آنے والا اس کی توقع کے مطابق علی ہی تھا۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی تھم گیا۔ گرے سوٹ میں علی کا لمبا قد بے حد پرکشش لگ رہا تھا بھورے بال ویسے ہی تھے۔ فرق بس اتنا تھا کہ بچپن میں وہ آنکھوں تک آتے تھے اور آج بمشکل ماتھے پر گرے ہوئے تھے۔ ویسی ہی آنکھیں، ویسی ہی مغرور ناک کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سوائے اس کے قد کے اور ہونٹوں کو دباتے مسکراتی نگاہوں کے جیسے کوئی بچہ کسی بڑے سے شرما کر ممنوعہ چیز کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہو۔ وہ اندر کی طرف بڑھا تھا۔ اپنے عقب میں دروازہ بند کرتے ہی اس نے دانتوں تلے دبایا لب آزاد کیا۔

مریم اپنی پوزیشن پر سخت شرمندہ تھی اور خفت کے مارے وہ سرخ ہو گئی کہ وہ کیا سوچے گا۔ ابھی چند لمحے پہلے وہ یہاں لا کر بٹھائی گئی تھی اور اب سارے کمرے میں گھوم رہی ہے۔ وہ وہیں سر جھکا کر کھڑی تھی۔ علی حمزہ نے اک بھرپور نظر اس کے حسین سراپے پر ڈالی لمبے بال کمر سے نیچے آرہے تھے۔ لمبے بالوں والی خواتین اس کی کمزوری تھیں۔ بچپن میں وہ امی کے بالوں سے کھیلتے کھیلتے سویا کرتا تھا۔ اپنی پری اسکولنگ میں وہ اپنی ٹیچر کے بالوں کے ساتھ کھیلتا انھیں اپنا ہوم ورک چیک کرواتا تھا۔ اب بھی وہ جب امی کی گود میں سر رکھتا تھا تو ان کی چوٹی سے کھیلتا رہتا اور اب مریم کے بال اس کا پہلا تاثر ہی علی پر اچھا پڑا تھا۔

"السلام علیکم۔" وہ بہت نرم سے لہجے میں بولا مطلب کہ وہ سارے اختلاف بھول بھال کر آیا تھا اور یہ بھی ایسے ہی نہیں ہوا تھا۔ معاذ اور امی نے اسے کتنی ہی قسمیں دی تھیں کہ وہ حتی الامکان اپنا رویہ دوستانہ رکھے۔

"وعلیکم السلام۔" مریم نے نظریں جھکائے مختصر سا جواب دیا تھا۔

"آپ شاید بیٹھنا چاہیں۔" وہ دوستانہ انداز میں کہتا رستہ دیتے ہوئے بولا۔

"شکریہ۔" وہ تشکر بھرے لہجے میں کہتی آہستہ سے چل کر اپنی سابقہ جگہ پر آ بیٹھی۔

"یہ آپ کے لیے... آج آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔" وہ معصومیت سے کہتا مریم کو حیران کر گیا۔ اک خوب صورت سا بکے مریم کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ نرمی سے مسکرایا۔ مریم نے آہستہ سے علی کے ہاتھ سے بکے تھام لیا۔ ساتھ ہی وہ سرخ کیس سے کچھ نکالنے لگا۔ وہ اک ننھا سا لاکٹ تھا۔ جس کا گول رنگ نگینوں سے بھرا تھا۔

"کیا میں اسے آپ کو پہنا سکتا ہوں۔" وہ جھجک کر مریم سے اجازت طلب کر رہا تھا۔ مریم کا سر اثبات میں ہلا تھا۔ علی حمزہ نے بڑھ کر اس کی گردن سے ہی ہاتھوں کو پیچھے کیا تھا۔ اس عمل میں وہ مریم کے انتہائی قریب آیا تھا۔ مریم کی سانس ہی تھم گئی کیونکہ وہ پہلا مرد تھا جو اس کے اتنے قریب آرہا تھا۔ جس نے مریم کو چھوا تھا۔ مریم کا سارا وجود ٹھنڈا یخ ہو گیا۔ جس پر علی کی گرم سانس واضح محسوس ہو رہی تھی۔ علی کے گرم ہاتھوں کا لمس مریم کو پسینے میں شرابور کر گیا تھا۔ وہ اس سب کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ علی حمزہ سے شادی کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھی اور اب اسے کیا کرنا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"بہت اچھا لگ رہا ہے۔" محبت سے کہتے ہوئے وہ پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔

"سنا ہے میں آپ کو اچھا نہیں لگتا۔" اس کی بات پر مریم نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اسے کس نے جتایا ہے اور اگر وہ جانتا تھا تو یہ شادی کس لیے کی کوئی انتقام شاید... مریم کو خوف سا محسوس ہوا۔

"مجھے بھی آپ اچھی نہیں لگیں۔" وہ کیا کہنا چاہتا تھا مریم نا سمجھے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ "مگر ہماری

شادی ہو گئی۔" وہ مزید بولا۔

"بہت جلد آپ کو تو مجھ سے محبت ہو ہی جائے گی۔" وہ لاپرواہی سے کہتا مریم کو جلا گیا۔

"خوش فہمی۔" دل ہی دل میں مریم نے ہنکارا بھرا اور نظروں کا زاویہ موڑ لیا وہ اپنی جون میں آگیا تھا۔ علی نے دھیرے سے مریم کا ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھ میں دبایا۔ وہ اس کی جرات پر حیران ہو کر مڑی۔

"اور جب تک کہ میں اپنے پیاری سی بیوی کے ساتھ دوستی کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتا تب تک صرف ان ہاتھوں کو پکڑنے کا مجاز ہوں کیا میں آپ کے ہاتھ پکڑ سکتا ہوں؟" وہ بچوں کی طرح مسکراہٹ دبا کر بولا۔ مریم نے اس کے ہاتھوں میں پکڑے اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور پھر اس کے چہرے کو بے یقینی سے جہاں پر مہربان سا تاثر تھا۔ اک دوستانہ انداز وہاں نہ کوئی انتقام کا جذبہ تھا اور نہ زور زبردستی کے تاثرات۔ اتنا عام سا دوستانہ انداز و لہجہ تھا کہ وہ مریم کو جی بھر کر چونکا گیا۔ ہاتھ پکڑنے کی بھی اس نے اجازت مانگی تھی وہ ویسا بالکل نہیں تھا جیسا مریم سوچ کر آئی تھی۔ مریم نے اثبات میں سر کو ہلاتے ہوئے اک اطمینان بھرا سانس خارج کیا۔ وہ سوچ کر رہ گئی کہ کون ایسے اجازت لیتا ہے اس نے سارے فاضل خیالات کو ذہن سے جھٹک کر اپنی شادی اور علی حمزہ کو قبول کرنا تھا۔ علی اس کی سوچ سے بہت منفرد نکلا تھا۔

"اتنے دن کی شدید ٹینشن کے بعد میں کافی تھک چکا ہوں اور یقیناً" آپ بھی تھک گئی ہوں گی' طرح طرح کے خیالات نے اک رات بھی سکون سے سونے نہ دیا ہو گا کہ پتا نہیں میں کیسا ہوں گا، میری عادات کیسی ہوں گی آپ مجھے قبول کر پائیں گی کہ نہیں... بلا بلا..." وہ مسلسل بولے جا رہا تھا اور مریم اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"آپ بالکل ریلیکس ہو جائیں ڈاکٹر میں بالکل بھی ویسا نہیں ہوں جیسا آپ نے سوچ رکھا ہے۔"

"میں نے کچھ ایسا ویسا نہیں سوچا بس یہ سب کچھ ہوا اتنا اچانک ہے کہ میں قبول نہیں کر پا رہی تھی۔"

اب کے مریم نے اپنی پوزیشن کلیئر کرنا چاہی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں آپ کے لیے یہ سب کچھ کافی مشکل ہے' مگر ان شاء اللہ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اسے یقین دلاتے ہوئے بولا کیوں کہ وہ اتنی سی ملاقات میں سمجھ گیا تھا کہ اس کی بیوی کم از کم سٹو نہیں ہے ہاں تھوڑی بور ہے وہ تو کوئی بھی پہلی ملاقات میں ہوتا ہے۔

"کیپٹن علی اگر آپ برا نہ منائیں تو میں کچھ وقت مانگ سکتی ہوں ان سارے حالات کو قبول کرنے کے لیے۔" مریم نے بہت جھجکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی اور علی کو تو اس کا طرز تخاطب حیران کر گیا۔

"آپ جتنا چاہیں وقت لے سکتی ہیں ڈاکٹر مریم..." جواب بہت ہی بشاش لہجے میں ملا تھا۔

"شکریہ۔" مریم کا اعتماد بحال ہوا تھا۔ تشکر بھری نظروں سے مریم نے علی کو دیکھا اور پھر علی نے اسے واقعی چونکا دیا تھا۔ رات ساری چیزیں سمیٹنے میں علی نے مریم کی بھرپور مدد کی تھی۔ جتنی نرمی سے علی نے مریم کے بال دوپٹے اور پنوں سے چھڑائے تھے مریم حیران رہ گئی اس قدر تعاون پر مریم اس کی دل و جان سے مشکور تھی۔ ساری رات باتیں کرتے کرتے گزری تھی۔ جانے کب مریم کی آنکھ لگی اسے خبر ہی نہ ہوئی صبح وہ اسی حالت میں اٹھی تھی۔ جتنی وہ ڈپریسڈ تھی اتنا ہی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ باتھ لینے کے بعد وہ ٹاول سے اپنے بال خشک کر رہی تھی جب اس کی نظر بیڈ پر لیٹے علی حمزہ پر پڑی اس کا چہرہ بہت پر سکون سا لگ رہا تھا وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھا۔ مغرور سی ناک سوتے ہوئے اور بھی مغرور لگ رہی تھی۔ شفاف سا چہرہ اور بھی پیارا لگ رہا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے سوچوں میں غرق تھی کہ اچانک وہ بولا۔

"کیا آپ کو مجھ پر پیار آرہا ہے۔" آنکھیں ہنوز بند کیے اس کے لب ہلے۔ مریم بری طرح ہڑبڑائی تھی کیوں کہ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی مگر علی کی آنکھیں تو بند تھیں تو پھر اسے کیسے پتا چلا... وہ

کھسیا گئی۔

وہ جاگ چکا تھا بیڈ سے اترتے ہوئے علی کی مسکراہٹ بہت گہری تھی۔ مریم بلاوجہ ہی کچھ ڈھونڈنے لگی علی حمزہ رات اسے دیے گئے بوکے میں سے اک کلی نکال کر اس کی طرف آگیا۔

"دوستی کی کوشش کا پہلا دن۔۔۔" جھک کر کلی اسے تھماتے ہوئے وہ باتھ لینے چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"ڈاکٹر آپ کو کینڈل لائٹ ڈنر کیسا لگتا ہے۔" مریم کے برش کرتے ہاتھ تھم گئے وہ بیڈ پر نیم دراز اپنے موبائل پر گیم کھیل رہا تھا۔ آج ان کی شادی کا ساتواں دن تھا اور مریم کو ان سات دنوں میں اتنی محبت ملی تھی علی کی فیملی سے۔ توحید آنٹی بالکل مما کی طرح تھیں۔ اس کے کھانے' پینے' آرام اور گھمانے پھرانے کا اتنا خیال رکھتی تھیں اور وقار انکل وہ تو بابا سے بڑھ کر مریم کا خیال رکھتے تھے ہر روز وہ علی کو ڈانٹ دیتے تھے کہ وہ مریم کے حوالے سے لاپروانہ ہو اسے گھمانے لے جائے اور مریم جی بھر کر شرمندہ ہو جاتی کہ اس کی وجہ سے علی کو ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔

اور خود علی اس نے مریم کو بے حد حیران کیا تھا۔ وہ اتنا کیئرنگ تھا کہ اک پل کو بھی مریم کو لوں نہ لگا کہ وہ بیاہ کر نئے گھر آئی ہے۔ مریم اس قدر خوش تھی جس کا وہ اندازا بھی نہیں لگا سکتی تھی۔ اب اسے کافی حد تک مما بابا کا فیصلہ ٹھیک لگ رہا تھا۔ سارا دن مسکراتے محبتیں بانٹتے ہلکی ہلکی نوک جھوک کرتے ان تینوں ماں' بیٹے اور باپ کے درمیان گزر جاتا کہ پتا ہی نہیں چلتا۔

"میں نے کبھی کیا نہیں۔" مریم نے معصومیت سے کہا۔

"تو کیا خیال ہے آج کریں۔" وہ مریم کی طرف دیکھ کر بولا۔

"جیسا آپ چاہیں۔" اب کے وہ ذرا مسکرائی۔

"آپ مسکرائی رہا کریں ڈاکٹر آپ مسکراتی بہت اچھی لگتی ہیں۔" وہ معصومیت سے کہتا اس کے قریب آیا۔ مریم کی مسکراہٹ نجانے کیوں تھم گئی وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ علی نے اسے کندھوں سے تھام کر اپنی طرف موڑا وہ معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مریم بہت حد تک علی سے گھل مل گئی تھی مگر پھر بھی جب وہ اسے محبت لٹاتی نظروں سے دیکھتا تو اسے مضطرب کر دیتا تھا ہاتھ بڑھا کر علی نے ڈریسنگ ٹیبل سے ننھا سا کیچر اٹھا کر مریم کے بال اپنے ہاتھوں سے سمیٹ کر کیچر میں مقید کر دیے۔

"چلیں میں آپ کی مدد کرواتا ہوں ڈنر میں ڈاکٹر کیا یاد کریں گی۔" وہ مزے سے بولا اسے مریم کی مضطرب حالت پر رحم آگیا اور مریم وہیں کھڑی اس کی جادوئی باتوں میں محصور ہو گئی۔ وہ اس سے اپنی پسند کا لباس پہننے کی فرمائش کرتا مریم پر کیا اچھا لگتا ہے کیا نہیں دھڑلے سے کہتا تھا۔ روز صبح صبح واک پر لے جاتا اور اتنا کھاتا کہ اللہ کی پناہ۔

کینڈل لائٹ ڈنر ایسا ہوتا ہے مریم کو معلوم نہ تھا۔ آنٹی انکل گھر پر نہیں تھے اور سارے گھر میں صرف کینڈلز کی مدھم لو تھی۔ ڈنر بھی کینڈلز کی روشنی میں بن رہا تھا اور یہ حرکت علی حمزہ کی تھی۔ مریم کو علی کی یہ چھوٹی چھوٹی شرارتیں نجانے کیوں اچھی لگنے لگی تھیں۔ وہ دونوں بہت دوستانہ انداز میں لڑتے جھگڑتے ڈنر تیار کر چکے تھے۔ مریم کو پتا ہی نہ چلا تھا کہ وہ کیسے علی کو پسند کرنے لگی ہے۔

"کیپٹن آپ یہاں میرا انتظار کریں' میں تیار ہو کر آتی ہوں۔" وہ کھانے کی میز پر اسے بٹھا کر مسکراتی ہوئی کمرے میں آگئی۔

سفید فراک زیب تن کیے بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی کندھے سے آگے کیے دوپٹہ قرینے سے کندھے پر ڈالے وہ کمرے سے باہر نکلی ہلکے ہلکے میک اپ اور سنگھار کے بعد وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں کیپٹن۔۔۔" مریم کی آواز پر اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور حیران سا دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ شادی والے دن سے بھی پیاری لگ رہی تھی۔

"اہم۔۔۔ ناٹ بیڈ۔۔۔" مصنوعی غرور سے کہتے ہوئے وہ ہنس دیا۔

علی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور کرسی پر بٹھایا اور پھر خود بھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"بہت اچھا لگ رہا ہے سب کچھ۔" وہ چہک کر بولی مریم کی آنکھوں میں ننھے ننھے جگنو چمک رہے تھے۔ اس لمحے علی کو مریم پر جی بھر کر پیار آیا۔

"سب کچھ۔" علی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ ڈنر۔۔۔ کینڈلز۔۔۔ اور۔۔۔" وہ آگے نہ بولی۔

"اور۔۔۔" علی شاید کچھ اور سننا چاہتا تھا۔

"اور۔۔۔ میں خود۔۔۔" مریم علی کی نیت بھانپ کر اپنی مسکراہٹ دبا کر بولی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ کھانا ختم کر کے برتن سمیٹتے ہوئے علی نے مریم کا ہاتھ تھام لیا۔

"ان کو بعد میں اٹھا لیں گے ڈاکٹر۔ پہلے مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" وہ مریم کے ہاتھوں سے برتن لیتے ہوئے بولا۔ وہ اسے لے کر گلاس وال کی طرف آگیا۔ بٹن پش کرتے ہوئے اک مسرور سی دھن فضا میں گونج گئی۔ "یہ میرا پسندیدہ گانا ہے۔" وہ خوشگوار حیرت سے بولی۔

"My heart willgoon" کی دھن بجتے ہی وہ مسکرائی۔

"مگر آپ کو کیسے پتا چلا۔" وہ متعجب سی علی کو دیکھنے لگی۔

"آپ اکثر اسے گنگناتی ہیں ڈاکٹر۔"

"آپ نے نوٹ بھی کر لیا۔" وہ حیران ہو کر بولی۔

"ہاں۔۔۔ مجھے تو آپ کی تمام پسند و ناپسند کا پتا چل گیا ہے۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔

"اک بات پوچھوں آپ سے کیپٹن۔۔۔" وہ اب سنجیدہ نظر آنے لگی۔

"جی پوچھیں۔"

"آپ مجھ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے تھے؟" یہ سوال بہت عرصے سے مریم کے دماغ میں کھٹک رہا تھا اور وہ وجہ جاننا چاہتی تھی۔ دل میں اک وسوسہ تھا کہ کہیں وہ علی کی زندگی میں زبردستی شامل کر دی گئی ہے۔ کیا پتا وہ کسی اور کو پسند کرتا ہو۔ اس کے سوال پر علی بہت حیران ہوا تھا۔

"کیا آپ کسی اور کو پسند کرتے تھے؟" گانے کی مدھم سی دھن فضا میں گونج رہی تھی اور مریم آج ہی سب جاننا چاہتی تھی۔ علی اس کی بات پر دھیرے سے مسکرا رہا تھا۔

"اگر میں کسی اور کو پسند کرتا تو آپ میری بیوی نہ ہوتیں ڈاکٹر۔"

"مگر آپ مجھ سے بھی تو شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آپ سے اختلاف نہیں تھا' میں ڈاکٹر سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"مگر یہ کیا بات ہوئی۔"

"مجھے ڈاکٹرز بور' خشک مزاج اور سڑو قسم کی لگتی ہیں۔" علی کے خیالات سن کر مریم کا منہ کھل گیا۔

"میں بھی۔۔۔" مریم نے بے یقینی سے علی سے پوچھا۔

"پہلے لگتی تھیں۔۔۔ اور یہی وجہ اختلاف کا سبب بن رہی تھی۔"

"پہلے۔۔۔ مطلب اب کیسی لگتی ہوں۔"

"اب ایسا نہیں لگتا الحمد للہ میں اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن ہوں۔" نرم سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ مسکرایا۔

"ازدواجی زندگی۔۔۔" مریم نے دل ہی دل میں علی کے سادگی سے کہے ہوئے الفاظ دہرائے۔ ان کے درمیان صرف کاغذی رشتہ تھا۔ جسے وہ محبت سے ازدواجی رشتہ کہہ رہا تھا۔

"آپ مجھ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی تھیں ڈاکٹر۔" اسے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر وہ بولا تو مریم چونک گئی۔

"میں اپنی پڑھائی کی وجہ سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔" وہ کافی سہولت سے جھوٹ بول گئی۔

کیوں کہ وہ بچپن کی باتیں دہرا کر اپنا مذاق نہیں بنوانا چاہتی تھی۔

"مطلب میری ذات سے اختلاف نہیں تھا۔" علی کے سوال پر مریم نے اسے دیکھا وہ اس کا مان نہیں توڑنا چاہتی تھی تو مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ گانا ختم ہوچکا تھا۔ علی نے اک مطمئن سانس خارج کیا' محبت کی ننھی سی کونپل ان کے دل میں پھوٹی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دوبارہ سے وہی گانا پلے کردیا اور بڑھ کر مریم کا ہاتھ تھام کر اسے بھی اپنے سامنے کھڑا کردیا۔ اس لمحے مریم کو اپنے اور اس کے درمیان بندھا رشتہ بہت پیارا لگ رہا تھا۔ علی نے ایک ہاتھ مریم کا اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھا اور اپنا ہاتھ اٹھا کر مریم کی کمر کے گرد رکھا اور دھیرے دھیرے سے جھومنے لگا۔ مریم کو لگا وہ اسے منع نہیں کرسکتی۔ مریم کو اپنے ساتھ جھومتے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ ہاتھوں کو اونچا کرتے ہی مریم نے اک گول چکر کھایا اور پھر سے علی کے بازوؤں کے حصار میں آگئی۔ علی کو یہ لمحے خواب سے لگے۔ پھر مریم نے دھیرے سے اپنا سر علی کے کندھے پر رکھا۔ علی کا دوسرا ہاتھ بھی آزاد ہوچکا تھا' پھر علی نے محسوس کیا کہ مریم کی نرم بانہوں نے علی کے گرد حصار کرلیا ہے۔ وہ حیران تھا۔ ڈاکٹر وچ کا دل کیسے نرم پڑا تھا۔ علی نے حیرت سے اپنے کندھے پر رکھے مریم کے سر کو دیکھا۔ آنکھیں موندے اس نے بے حد مسرور انداز میں اس کی قربت کو محسوس کیا اور اپنے دوسرے ہاتھ کو بھی اٹھا کر مریم کے گرد حمائل کرلیا۔ اب وہ مکمل علی کی بانہوں میں تھی۔ دور پول میں پڑتا چاند کا عکس بھی شرما گیا تھا۔ دونوں نے جذب سے آنکھیں موندی ہوئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کیپٹن آپ نے میرا موبائل دیکھا ہے کہیں۔" وہ کام سے فارغ ہو کر ابھی ابھی کمرے میں حرم اور ماما کو فون کرنے کی غرض سے آئی تھی اور وہ جو سونے کی غرض سے کمبل میں دبکا ہوا تھا جھنجلا گیا۔

"بھئی ڈاکٹر مجھے کیا پتا' میرے موبائل سے رنگ کر کے دیکھ لیں۔"

وہ کاہلوں کی طرح کمبل میں منہ دیے بولا۔ مریم کو علی کی اس حرکت پر ہمیشہ ہنسی آتی تھی۔ نیند کے وقت وہ سب کو بھول جاتا تھا اور مریم نے ایسا ہی کیا علی کی سائیڈ ٹیبل سے اس کا موبائل اٹھا کر اپنا نمبر ملایا۔ فون کان سے لگاتے مریم کے ہاتھ رک گئے۔

" Dr- Witch " زیر لب بڑبڑاتے ہوئے صدمے سے مریم کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ غصے سے ادھر ادھر دیکھتے اسے کچھ بھی ایسا نہ ملا جس سے وہ علی کو مارتی۔ انتقاماً" بے دردی سے علی کے اوپر سے کمبل اٹھا لیا اور وہ جو ابھی ابھی نیند میں گیا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس سے پہلے وہ اس سے کچھ پوچھتا وہ کمرے سے نکل چکی تھی۔ موبائل پر نظر پڑتے ہی علی نے اٹھا کر دیکھا ابھی تک " Dr- Witch " کے لفظ چمک رہے تھے۔ علی کے لب خود بخود مسکرا اٹھے دوبارہ سے کمبل اوڑھتے وہ دبک گیا۔

☼ ☼ ☼

علی کی صرف دو دن کی چھٹی رہ گئی تھی اور وقار صاحب اسے اک ہفتہ اور چھٹی لینے کا کہہ رہے تھے' مگر علی نے انکار کردیا' جانتا تھا کہ اس چھٹی کے بعد سب جو اس کے ساتھ کریں گے اس سے جانا ہی بہتر ہے۔

"آپ مجھ سے خفا ہیں ڈاکٹر۔" وہ لان میں بیٹھی دھوپ سینک رہی تھی جب علی اس کے پاس آکر بیٹھا۔ مریم نے آنکھوں کو کھول کر اسے دیکھا اور نظر موڑ لیں مطلب وہ ناراض تھی۔

"او کے معاف کردیں آئندہ نہیں لکھوں گا۔" وہ شرارتی بچوں کی طرح ہاتھوں کی انگلیاں پھنسائے منت کرنے لگا۔

"کیپٹن آپ کو اچھا لگتا ہے نا مجھے تنگ کرکے۔"

"قطعی نہیں۔" وہ شریف بنتے ہوئے بولا۔

"غلطی ہوگئی جو دوستی کرلی۔" وہ اک دم بگڑ کر بولی۔

"تو میں نے دوستی سے ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھایا نا جو آپ یوں کہہ رہی ہیں۔" اب کہ وہ اپنے دفاع میں بولا۔

"آپ کو میں Witch لگتی ہوں نا۔" وہ خفگی سے بولی۔

"قسم سے ایسا کچھ نہیں وہ تب لکھا تھا جب میں آپ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اب تو میں آپ کو پسند کرتا ہوں نا۔" وہ شریر لہجے میں بولا۔

"ڈاکٹر میں آپ کو بہت مس کروں گا۔" مریم کے مسکراتے ہی وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"آپ میرے فون کا انتظار کریں گی نا۔"

"کوئی زبردستی ہے۔" وہ لاپرواہی سے بولی۔

"ہاں ہے زبردستی۔" استحقاق سے کہتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر مریم کے بالوں کی چوٹی ہاتھ میں لے لی۔

"کیا میں آپ سے کچھ کہہ سکتا ہوں۔"

"نہیں۔" اپنے بالوں کی لٹ کو انگلی پر لپیٹتے مریم نے علی کو پیار سے دیکھا۔

"میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔" علی حمزہ کی حدت دیتی نگاہوں سے محبت ٹپک رہی تھی۔ مریم نے اپنا سر جھکا لیا۔

"آپ شرما رہی ہیں ڈاکٹر۔" اس کے ہاتھ کو کھینچتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا۔ تو مریم کے گال سرخ پڑ گئے۔ علی حمزہ کا اتنا واضح اقرار اس کی رگ و پے میں سرائیت کر گیا تھا اور مریم بہت شرمندہ تھی کہ وہ اسے اس کا حق نہیں دے سکی تھی اور وہ جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیپٹن علی حمزہ شادی کے بعد صحت کافی اچھی ہوگئی ہے ماشاء اللہ۔" بریگیڈیر جاوید نے ابھی ابھی اسے کمرے میں بلایا تھا ان کی بات پر علی مسکرایا۔

"تھینکس سر۔" روایتی انداز میں کہتے وہ ہاتھ باندھے مودب کھڑا تھا۔

"تو مٹھائی وٹھائی کا انتظام بھی کیا ہے کہ نہیں۔" وہ خوشگوار انداز میں بولے۔

"جی سر۔ میں آپ کے گھر میڈم کو دے آیا تھا۔" وہ جانتا تھا جب تک C.O صاحب سے لے کر سپاہی مراد تک اس کا خرچہ نہ کروالیں چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

"او کے مبارک بادیں وصول کرلو۔ بہت جلدی میرے ساتھ ڈیوٹی آرہی ہے۔ امید کرتا ہوں تمہارے ساتھ تجربہ بہت اچھا رہے گا۔" وہ اک دم ہی کام والی جون میں بولے۔

"جی سر ان شاءاللہ"

"ایک بار پھر نئی زندگی مبارک ہو یو کین گو ناؤ۔"

"تھینک سر۔" وہ سیلوٹ کرتا ان کے آفس سے نکل آیا۔ جہاں کیپٹن دانش اس کا منتظر تھا۔

"جاوید صاحب کے ساتھ ڈیوٹی آرہی ہے میری۔" اپنی طرف سے علی نے دانش کو انفارم کیا۔

"جاوید صاحب کی بیگم سے بنالو ٹائم اچھا گزرے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے انہیں مہنگی مہنگی ساڑھیاں گفٹ کروں توبہ کرو۔ جاوید صاحب کو پتا چلا تو جام شہادت نوش کروادیں گے۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔

"اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔" وہ چھیڑتے ہوئے بولا۔

"آگے ہی سارے کیمپ نے مٹھائیاں کھا کھا کر طبیعت خراب کردی ہے میری۔" وہ والٹ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"ظاہر ہے پلاٹون کے لاڈلے کیپٹن' کیپٹن علی حمزہ کی شادی ہوئی ہے۔" وہ اس کا کندھا تھپک کر بولا۔

"اوہ ہاں۔ یاد آیا وہاں محفل جمی ہے۔ عجب گٹار لایا ہوا ہے۔ تیری شادی کی سلیبریشن کے لیے۔ سب تمہیں بلا رہے ہیں۔" اک دم سے یاد آتے ہی وہ اسے لے کر مڑا۔ دانش کے ہمراہ وہ پی ٹی گراؤنڈ میں آیا تھا جہاں تقریباً" پوری پلاٹون براجمان تھی۔

اس کے لاڈلے سپاہی جو ـــــ غریب دیکھی

علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ہنستے مسکراتے چہرے اسے بہت پسند تھے۔ ابھی بھی وہ اشتیاق سے بیٹھے اپنے لاڈلے کیپٹن کا انتظار کر رہے تھے اور اس کے آتے ہی ایک نعرہ لگاتے ہی کچھ جوان اٹھے تھے اور لوہے کے کین پر بجتی تھاپ پر محو رقص ہوگئے سب اٹھ اٹھ کر اسے مبارک دے رہے تھے اور پھر زبردستی علی کو بھی رقص میں گھسیٹا گیا۔ علی رقص کرنا بالکل نہیں جانتا تھا' مگر ان سب کی خوشی کے لیے وہ ان کے ساتھ جھوم رہا تھا۔ دور دور تک ان کے نعروں اور تالیوں کی آواز گونج رہی تھی یہ ان کی آرمی والے خاندان کی خوشی تھی جو ان کی اجتماعی خوشی ہوتی ہے جس میں وطن کے ہر کونے سے تعلق رکھنے والا بندہ خوش ہوتا ہے۔ جہاں نہ ذاتی اختلاف ہوتا ہے اور نہ معاشرتی اونچ نیچ۔ سب کی بھرپور فرمائش پر علی حمزہ نے آج کتنے سالوں بعد گٹار اٹھایا تھا۔ مدھم سی دھن بجاتے آنکھیں موندے وہ مریم کو شدت سے یاد کر رہا تھا اور باقی سب اک ساتھ دائیں بائیں جھوم رہے تھے۔ رات قطرہ قطرہ بیت رہی تھی وہ یادگار رات یاروں کے ساتھ آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تمہارا آج آف ہے؟" دانش نے اسے سول لباس میں دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں دوپہر تک پھر جانا ہے C.O صاحب کی طرف۔" وہ جاگرز کے تسمے بند کر رہا تھا مصروف انداز میں بولا۔

"ابھی کہاں جا رہے ہو۔"

"سپاہی شبیر سے ملنے C.M.H جا رہا ہوں وہ بہت بیمار ہے تو۔" وہ اسے تفصیل سے بتاتا موبائل اور چابیاں اٹھانے لگا۔

"چلو میری طرف سے بھی پوچھنا۔" وہ دانش کی بات پر سر ہلاتا باہر نکل گیا۔ C.M.H کی بلڈنگ کے سامنے گاڑی پارک کرتے ہوئے اس نے پھولوں کا ایک بکے بھی بنوالیا تھا۔ بکے ہاتھ میں پکڑے وہ شعبہ امراض جگر' معدہ و پھیپھڑہ کی طرف مڑ گیا۔ غریب اور لاچار سے سپاہی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا بیڈ پر بے سدھ لیٹے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ ہمیشہ بہت دکھ محسوس کیا کرتا تھا۔ سپاہی شبیر اسے دیکھ کر اپنی بیماری اور نقاہت بھول بھال کر اٹھ بیٹھا۔

"ارے لیٹے رہو تم ٹھیک نہیں ہو۔" اٹھنے سے روکتے ہوئے علی نے ہاتھ میں پکڑا بکے اسے دیا۔

"شکریہ صاحب۔" کچھ شرماتے ہوئے اس نے پھول لیے۔

"تمہارے ساتھ کون ہے۔" اس نے اردگرد نظر گھمائی۔

"میرے ساتھ۔۔۔ سر میرے ساتھ تو کوئی نہیں۔"

"کیوں تمہارے گھر سے کوئی نہیں آیا۔" اس نے ابرو سکیڑے۔

"کون آتا کیپٹن صاحب۔۔۔ میری اماں نابینا ہیں ابا جی بہت سادہ ہیں وہ خود کہاں شہر آ جا سکتے ہیں اور بہنیں ہیں وہ میرے پاس آ کر نہیں رہ سکتیں۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ علی کو اس کی بات پر بہت دکھ ہوا۔

"تم اکیلے بیٹے ہو اپنے اماں' ابا کے۔" علی نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"جی۔" اس نے بہت مختصراً جواب دیا۔

"آمدنی کا ذریعہ کیا ہے شبیر۔"

"میری تنخواہ جی۔" "بس یہ چند ہزار" علی نے سوچ کر کہا۔

چند ہزار اور اس کے گھر کے سو مسائل وہ سوچ رہا تھا کہ یقیناً" اس کے کندھوں پر کس قدر بوجھ ہوگا ماں باپ کے علاج کے اخراجات' بہنوں کی شادیاں اور جہیز کے اخراجات اور بس یہ چند ہزار۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اپنا والٹ نکالا۔

"شبیر یار۔۔۔ یہ خرچ ماں جی کو بھجوا دینا۔" وہ اس کے لیے اور کیا کر سکتا تھا۔ والٹ سے کتنے نوٹ نکال کر علی نے اسے دیے اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

"کیپٹن صاحب اس کی کیا ضرورت ہے۔" وہ اک دم سے شرمندہ لگنے لگا۔

"بڑے بھائی پر بھی کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں شبیر۔ ماں جی کو کہنا بڑے بیٹے کے لیے دعا کریں۔" مسکراتے ہوئے اس کی گال تھپک کر اس نے اجازت چاہی۔ بوجھل دل اور قدموں کے ساتھ وہ وہاں سے نکلا۔

"یا نہیں خدا غریبوں پر ہی اتنی آزمائش کیوں ڈالتا ہے۔" افسردگی سے سوچتے وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ہم ہی غلط سوچتے ہیں کہ کوئی اک شخص سہارا ہوتا ہے شخص تو وسیلہ ہوتا ہے سہارا تو اللہ خود ہے۔ وہ جس کو چاہے وسیلہ بنا دے اگر تمام در بند ہو جائیں پھر بھی وہ رب اپنے بندے کے لیے اک در ضرور کھلا رکھتا ہے۔ رزق کا ذمہ تو اس نے خود لے رکھا ہے۔ تو وہی دے گا کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ ہاں فرق تو محبتوں کو پڑتا ہے کسی کے نہ ہونے سے جو دکھ رہ جاتا ہے اس کا وسیلہ کوئی نہیں بن سکتا۔

علی حمزہ کو اس کی توحید آپا شدت سے یاد آنے لگیں۔ اسے اپنے اردگرد سب فوجی علی حمزہ لگنے لگے اور ان پر جان چھڑکتی توحید آپا۔

☆ ☆ ☆

"تم کیا بنا رہے ہو دانش۔" آف کی وجہ سے علی حمزہ کی آنکھ لیٹ کھلی تھی۔ دانش کو کچن میں مصروف عمل دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"کچھ کوشش کر رہا ہوں یار۔۔۔ دیکھو کیا بنتا ہے۔"

وہ دھوئیں اور طرح طرح کی خوشبو سے جھنجلایا ہوا تھا۔ یہ ان کا مشترکہ اپارٹمنٹ تھا۔ جہاں وہ اپنے بستر زمین پر ڈالے لیٹے تھے۔ اک چھوٹا سا روم فریج کے علاوہ ادھر بس اک میوزک سسٹم کی ہی گنجائش بچتی تھی۔ کمرے کے ساتھ ہی منسلک چھوٹا سا کچن تھا۔ جہاں وہ عموماً" اپنی کوکنگ کے جوہر دکھاتے و آزماتے تھے۔ دانش کی بات پر وہ مسکرایا تھا۔

"چھوڑ دے رانجھے بھینس چرانا تیرے بس کا کام نہیں۔" علی نے بڑھ کر شیلف سے گلاس اٹھایا۔ دانش نے گھورا۔

"دیکھنا کتنا اچھا بنے گا۔"

"نہ بھی بنا پھر بھی صبر کرنا پڑے گا۔" وہ مظلومیت طاری کرتے ہوئے بولا۔

"نہ کھانے کے قابل ہوا تو C.O صاحب کی بلیوں کے سامنے ڈال دیں گے۔" دانش نے بہت سہولت سے جواب دیا تو علی حمزہ نے چونک کر گردن اٹھائی اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"اوئے پہلی بات تو یہ کہ وہ بلیاں نہیں کتے ہیں وہ بھی امریکن۔" وہ مشکوک سے انداز میں کہتا اس کے قریب آیا۔ دانش کیوں بڑبڑایا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا۔

"اچھا۔۔۔ ایک تو آج کل بلیوں اور کتوں میں فرق ہی نہیں لگتا۔" وہ نظریں چرا کر بولا۔

"دانش تم ان معصوم بے زبانوں کو یہ کھانا کھلاتے رہے ہو نا۔" علی نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"نہیں تو۔۔۔" گردن موڑ کر جس انداز میں اس نے کہا تھا۔ علی سب سمجھ گیا تھا۔

"او ظالم انسان۔۔۔ تب ہی آئے دن اس میں سے کوئی نہ کوئی مرگی کا مریض ہو جاتا ہے۔ میں ابھی جا کر C.O صاحب کو بتاتا ہوں۔" وہ دھمکی دیتا کچن سے نکلا ہی تھا کہ دانش چیل کی طرح اس پر جھپٹا۔

"نہیں علی۔۔۔ خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔ C.O صاحب میرے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کتوں کی خوراک بنا دیں گے۔" وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

"پہلے مجھ سے وعدہ کر آئندہ کسی مظلوم بے زبان جانور پر ایسا ظلم نہیں کرے گا۔" علی حمزہ نے اپنا ہاتھ آگے کر کے وعدہ چاہا۔

"کیسا ظلم۔۔۔"

"اپنے ہاتھ کا بنا کھانا تو کسی انسان تو کیا کسی جانور کو بھی نہیں کھلائے گا۔" علی نے چولہے کی طرف اشارہ کیا جہاں اس کی ہانڈی پکنے کے قریب تھی۔

"وعدہ کرتا ہوں آئندہ کبھی کوکنگ ہی نہیں کروں

گا۔" وہ علی کے پاؤں پڑ گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ سراسر ڈراما کر رہا ہے۔ ورنہ C.O صاحب کے کتوں سے وہ خود تنگ تھا۔ یہ سب تو وہ اس کے ہاتھوں بنے کھانے سے بچنے کے لیے کر رہا تھا۔

"کیا یاد کرو گے نہیں بتاتا۔" اس نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے کہا۔

"چلو باہر جا کر ناشتا کرتے ہیں۔" دانش نے چولہا بند کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں چلو مجھے آج اک کام سے جاوید صاحب کی طرف بھی جانا ہے۔" کچھ یاد آنے پر علی نے کہا۔

"چھٹی کی بات کرنی ہے تو میری مان اک فریش بکے لے جا آنٹی کے لیے۔"

"خدا کا خوف کر دانش وہ مجھے منہ بھر کر علی بھائی کہتی ہیں۔۔۔ آنٹی۔" وہ خاصی ایج کانشس خاتون تھیں۔

"ہائے میرے علی بھائی۔" دانش نے ان کی نقل اتاری۔

"ویسے آئیڈیا اچھا ہے دو ہفتے کی تو مل ہی جائے گی۔" جاگرز پہنتے ہوئے علی نے پر امید لہجے میں کہا۔

"ہاں' ایبٹ آباد جانے سے پہلے ایک بار گھر کا چکر لگ ہی جائے۔ تمہاری یونٹ بھی جائے گی۔" دانش نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں گرمیوں تک متوقع ہے کہ اٹیچمنٹ آجائے۔ C.O صاحب بتا رہے تھے میرا نام بھی دے دیا ہے انہوں نے۔۔۔" علی نے باہر نکلتے ہوئے دروازہ بند کیا۔

"تو تم نہیں جانا چاہتے کیا؟"

"ایسا نہیں ہے مجھے تو خوشی ہو گی جہاں بھی بھیجا گیا۔" علی نے اعتماد سے کہا۔

"ویسے کیا ارادہ ہے کہاں جانا زیادہ بہتر لگ رہا ہے تمہیں۔"

"مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا جہاں بھی جاؤں' مگر C.O صاحب نے مجھے سیاچن کا اشارہ دیا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ آئی سی ابھی تو سات آٹھ ماہ ہیں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے پہلے تو ٹریننگ آگئی ہے۔ ایبٹ آباد کے مزے لے آئیں۔" اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے دانش نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

☼ ☼ ☼

آج کی ڈیوٹی کے بعد وہ خاصا تھک چکا تھا۔ رات بھی خاصی گہری ہو گئی تھی۔ جب وہ اپنا آفس ورک ختم کر کے نکلا۔ آج ہی اس کی چھٹی منظور ہوئی تھی اسے صبح گھر کے لیے نکلنا تھا۔ پورے چھ ماہ بعد وہ گھر لوٹ کر جا رہا تھا مریم نے اسے بتایا تھا کہ اس کے سمسٹر ایگزام بھی اسٹارٹ ہونے والے ہیں۔ وہ مریم کے ایگزام میں گھر جانا نہیں چاہتا تھا' مگر آئندہ دنوں کی مصروفیات میں چھٹی کے کوئی چانسز بھی نہیں تھے۔ تب ہی وہ انہیں بنا انفارم کیے گھر آگیا تھا۔ اسے دیکھ کر توحید بیگم اور مریم دونوں بہت حیران اور خوش ہوئیں۔ مریم اس کی آمد پر بہت خوش تھی۔

"ڈاکٹر تیاری کیسی ہے آپ کی۔" امی اس کے لیے چائے بنانے اٹھی تھیں جب اس نے چپ سی بیٹھی مریم سے پوچھا۔

"بہت اچھی۔۔۔ اس مرتبہ محنت بھی بہت کی ہے میں نے۔" وہ اسے بتانے لگی۔

"ویری گڈ میں تو سمجھا کہ مجھ پر الزام لگا ہو گا کہ میری یادوں نے آپ کو پڑھنے ہی نہیں دیا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"میرا اپنی سوچوں پہ خاصا ہولڈ ہے۔ میں سوچوں کو زیادہ سر پر نہیں چڑھنے دیتی۔" وہ بھی کافی اعتماد سے بولی۔ علی نے متاثر ہوتے ہوئے ہونٹوں کو سکیڑا۔

"ہاں اب لگ رہا ہے تھوڑی مشکل ہو گی کیوں کہ آپ کے ساتھ رہ کر پڑھائی مشکل ہے۔"

"ایسا کیوں لگتا ہے آپ کو ڈاکٹر۔"

"کیوں کہ آپ بولتے بہت ہیں کیپٹن۔" مریم اس کو چھیڑتے ہوئے بولی۔

"دیکھا لگا دیا نا الزام باتیں خود کر رہی ہیں اور الزام مجھ غریب پر۔" وہ الزام پر تڑپا تھا۔ تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"میری اٹیچمنٹ آ رہی ہے۔" امی کو آتے دیکھ کر وہ بولا۔

"اچھا یہ تو اچھی بات ہے کہاں؟" وہ کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں۔

"شاید سیاچن۔۔۔" کپ اٹھاتے ہوئے وہ عام سے لہجے میں بولا۔

"سیاچن۔۔۔" مریم نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" علی حمزہ کو اس کے صبیح چہرے پر اداسی کی اک لہر سی نظر آئی تھی۔

"لگتا ہے ڈاکٹر ڈر گئی ہیں۔" علی حمزہ نے مریم کو ہنسانے کے لیے عام سے لہجے میں کہا تو توحید بیگم نے بھی مریم کی طرف دیکھا۔

"ایسا ہے مریم۔۔۔؟" اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے انہوں نے محبت سے کہا۔

"نہیں تو۔" مریم نے اپنے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے گردن جھکالی۔

"میں کھانے کا بندوبست کرتی ہوں آپ لوگ باتیں کریں۔" اک دم ہی وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے کسی بھی تاثر سے علی کا یا توحید آنٹی کا دل چھوٹا ہو۔ تھوڑی دیر بعد توحید بیگم بھی نماز کی غرض سے اٹھ کر چلی گئیں علی اٹھ کر کچن میں آگیا۔ مریم سبزیاں کاٹنے میں مصروف تھی اس کی آمد سے بے خبر۔ علی دھیرے سے چلتے ہوئے اس کے قریب آگیا۔ اس کی پشت پر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے مریم کے بالوں کی چوٹی کو اٹھا کر ہاتھ میں لیا مریم اک دم سے مڑی تھی۔ شلف سے ٹیک لگا کر وہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے کیوں لگتا ہے ڈاکٹر آپ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔"

"خوش فہمی ہے آپ کی۔" اپنے بالوں کو چھڑاتے ہوئے اس نے جتاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"خوش فہمی ہے تو مجھے خوش فہم ہی رہنے دیں۔" وہ سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے مسکرایا۔

"خوش فہم رہنا اچھی بات نہیں۔" وہ دوبارہ سے کام میں مصروف ہو گئی۔

"تو آپ نے مجھے مس بھی نہیں کیا۔"

"نہیں۔۔۔" وہ پیاز گھی میں ڈالتے ہوئے مختصراً" بولی۔

"سچ کہہ رہی ہیں ڈاکٹر۔" وہ بے یقینی سے بولا۔

"کیپٹن۔۔۔ آپ کو لگتا ہے کہ میں نے آپ کو یاد نہیں کیا ہو گا۔" سینے پر ہاتھ باندھے وہ علی کے سامنے کھڑی ہو کر بولی تو اک دلفریب سی مسکان نے علی کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔

"یقین مانیے جب جب سکون سے سوئی تو میں نے آپ کو یاد کیا۔" اب کے مریم نے سراسر چھیڑتے ہوئے کہا۔

"یہ بات ہے تو اب جب جب بے چین ہو کر سوئیں گی تو یاد کریں گی۔" محبت سے اس کے ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے علی نے جوابی کارروائی کی۔ معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے علی نے اس کے ہاتھوں کی پشت پر بوسہ دیا اور باہر چلا گیا۔ مریم دیر تک اپنے ہاتھوں کی پشت پر اس کا لمس محسوس کرتی رہی۔

رات کے دو بج رہے تھے جب مریم نے کتابوں کو بند کیا۔ اسٹڈی ٹیبل سے اٹھتے ہی اس نے اک بھرپور انگڑائی لی۔ پڑھ پڑھ کر دماغ چکرا رہا تھا۔ علی دس بجے ہی باتیں کرتے کرتے سو گیا تھا اسے ہمیشہ ہی علی کی نیند پر ہنسی آتی تھی۔ باتیں کرتے کرتے اس کی گردن بچوں کی طرح جھومنے لگتی تھی۔ علی پر کمبل ٹھیک کرتے ہوئے مریم نے بہت محبت سے اسے دیکھا۔ وہ بے حد کیئرنگ تھا مریم نے اب تک اس سے سوری بھی نہیں کی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کتنا غلط کہتی رہی تھی۔ لاابالی' امیچور اور کھلنڈرا مزاج جب کہ وہ مریم کے معاملے میں بے حد کیئرنگ اور لونگ تھا۔ اک ڈسپلن لائف میں وہ ہر اک کو ٹائم دیتا تھا۔ جاب نے اس سے عام لڑکوں والی شوخی نکال دی تھی بگڑے ہوئے مزاج اور عادات نہیں تھیں اس کی۔

مریم کو اب واقعی ہی علی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ علی کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ اپنی پیاری سی بیوی کے ساتھ دوستی کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اپنے لبوں کو آہستہ سے علی کے ماتھے پر رکھے کہ وہ جاگ نہ جائے مریم نے اپنے چار سو بہار محسوس کی۔ صرف اک شخص کی آمد سے اس کی زندگی کتنی بدل گئی تھی۔ آپ جناب کرتا شرافت دکھاتا ایک معصوم سا شخص جس سے اسے محبت ہونے لگی تھی۔

"رات کو مجھے اک بات کا احساس ہوا کیپٹن۔" پیپر دینے کے بعد وہ گھر جا رہے تھے جب مریم اچانک بولی۔

"کیا؟" علی حمزہ نے مختصراً" پوچھا۔

"کہ آپ اتنے برے بھی نہیں ہیں۔" وہ اس کی بات پر بلا اختیار مسکرایا۔

"مطلب تو وہی ہوا نا۔" وہ شریر سے لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب۔" مریم نے الجھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"کھل کر کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ میں آپ کو اچھا لگنے لگا ہوں۔ انا آڑے آ رہی ہے۔ اور بس۔" وہ مزے سے کہتا مسکرایا۔

"جی نہیں اب ایسا بھی کچھ نہیں۔" وہ تلملا گئی۔

"آپ اک اچھے انسان ہیں۔ جن حالات میں ہماری شادی ہوئی آپ نے میرا بہت ساتھ دیا اور بہت تحفظ دیا مجھے۔" اب کے وہ بہت سنجیدہ ہو کر بولی۔

"شادی سے پہلے آپ میرے لیے بالکل انجان تھے۔ انڈر اسٹینڈنگ کا ڈر تھا مجھے ان دیکھا خوف جو سب آپ کی وجہ سے بہت آسان ہوا میرے لیے چھ ماہ کا عرصہ میرے لیے کافی تھا کہ میں اس رشتے کو دل سے قبول کرتی اس دوران آپ کا دوستانہ رویہ ان سب نے مجھے بہت سپورٹ کیا۔" وہ گود میں رکھے ہاتھوں کے ناخنوں سے کھیلتی دھیرے دھیرے بول رہی تھی اور علی اسے بہت سنجیدگی سے سن رہا تھا۔

"اور اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اگر اللہ نے آپ کو میرے لیے چنا ہے تو مجھے اس کے انتخاب پر فخر ہے۔" مریم نے سر اٹھا کر علی کو دیکھا۔ علی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے وہ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کو چپ دیکھ کر مریم کو حیرت ہوئی۔

"اور سب سے بڑی اور اہم بات کہ اب آپ میری طرف آنکھیں جھنگی کر کے نہیں دیکھتے۔" مسکراہٹ دباتے اس نے سنجیدہ ماحول کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا تو علی بھی مسکرا دیا۔

"سوری فارویٹ اوکے۔" علی نے اک دم ہی اپنی سابقہ حرکت پر معافی مانگی۔

"مجھے بھی اپنے لیے آپ کے انتخاب پر فخر ہے ڈاکٹر۔" جذب سے کہتے علی نے ہاتھ اس کی گود میں رکھے اس کے ہاتھ کے اوپر رکھ لیا۔

☼ ☼ ☼

"دنیا کا سب سے مشکل محاذ ہے سیاچن۔" وہ علی کے برابر میں لیٹی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی کہ اچانک سے بولی اور علی جو اس کے لمبے بالوں کی چوٹی سے کھیل رہا تھا چونکا۔

"ہاں ہے تو آپ کیوں پوچھ رہی ہیں ڈاکٹر۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ علی کے بہت قریب لیٹی ہوئی تھی کتاب بند کر کے مریم نے اپنا منہ علی کی طرف موڑا۔ مریم کو اس لمحے علی کی آنکھیں دنیا کی سب سے خوب صورت آنکھیں لگیں۔

"آپ وہاں چلے جائیں گے کیپٹن۔" اداسی کی اک لہر پھر سے اس کے صاف شفاف چہرے پر پھیل گئی۔

"تو نہ جاؤں کیا۔" علی نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"کبھی نہیں۔" مریم نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"کیوں؟"

"کیوں کہ میں اب آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں کیپٹن۔" نگاہیں جھکاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی تو علی کو اندر تک اطمینان محسوس ہوا۔ وہ اس کی ہو گئی تھی بنا کسی زور زبردستی کے اپنی مرضی سے۔

"آپ تو ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی ڈاکٹر چاہے وہ سیاچن ہو یا کوئی اور محاذ۔" مریم کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے علی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"مگر سیاچن۔" اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"مسز ان ڈاکٹر بہادری کی روایت کو قائم رکھیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ بزدلی کا مظاہرہ کریں۔" ابرو کو سکیڑے علی نے بہت پیار سے اسے سمجھایا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں تو آپ کو بہت بے رحم سی ڈاکٹر سمجھتا تھا آپ کا دل تو بہت چھوٹا نکلا۔" وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ڈاکٹرز بے رحم نہیں ہوتے سمجھے آپ کیپٹن۔" مریم نے خفگی سے علی کو دیکھا۔

"سمجھ گیا ڈاکٹر۔ بس آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ سیاچن سے نہ ڈریں ہر سال ہمارے اتنے جوان وہاں جاتے ہیں اور زندہ سلامت واپس آتے ہیں۔ ہر فوجی فخر سمجھتا ہے سیاچن پر جانا۔ سینہ ٹھونک کر جاتے ہیں جوان وہاں اور وہ بہادر جوان ضرور اک بہادر فیملی رکھتے ہیں۔ ان کی فیملیز ان سے بھی زیادہ بہادر ہوتی ہیں۔" بہت پیار سے سمجھاتا وہ اسے کافی ڈھارس دے چکا تھا۔ ان کے رشتے کی شروعات تھی' مگر پھر بھی وہ اک دوسرے کو بہت سمجھنے لگے تھے۔

"میں تھوڑا پڑھ لوں اب۔" علی کی باتوں سے وہ بہت ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

"ہاں ضرور صبح پیپر ہے اور ابھی تک ہماری باتیں ختم نہیں ہوئیں۔" وہ جلدی سے اٹھا تھا اور خود کو ڈپٹا کہ اس نے باتوں میں لگا لیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

مریم کا دل پڑھنے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ علی نے ٹھیک کہا تھا وہ اس کی بے چینیوں کا سبب بننے والا ہے۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر سو جانا چاہتی تھی گہری نیند جب علی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کافی کے کپ تھے اس کا کپ اس کی ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ اپنا کپ لے کر بیڈ پر آ گیا۔

"شکریہ کیپٹن۔" مریم نے مشکور سے انداز میں اسے دیکھا۔

"کیا آپ آج کی رات کتابوں سے رخصت لے سکتی ہیں؟" علی کے کہنے پر مریم نے اسے حیرت سے دیکھا۔ وہ کیسے سمجھ جاتا تھا اس کی کیفیت کو۔

"زبردستی پڑھنا اچھا نہیں ہوتا۔" وہ مسکراتے ہوئے کافی کے گھونٹ لے رہا تھا۔

"مگر میرا پیپر۔" مریم نے الجھ کر کتابوں کو دیکھا۔

"بہت یادگار ہو گا آپ کی زندگی کا یہ پیپر۔" معنی خیزی سے کہتا وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی طرف آ گیا۔ مریم نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

"پھر پتا نہیں ڈاکٹر وچ اتنی مہربان ہو بھی یا نہیں۔" مریم کے چہرے سے بالوں کی لٹ کو ہٹاتے ہوئے وہ شریر سے انداز میں بولا تو مریم نے حیا سے نظریں جھکا لیں۔

☼ ☼ ☼

چھٹی گزار کر وہ چلا گیا تھا۔ بہت سی محبتیں مریم کی جھولی میں ڈال کر بہت سی اچھی یادیں اس کے سپرد کر کے اپنی پیاری سی توحید آپا سے ڈھیروں دعائیں لے کر اور مسٹر موڈی کرنل وقار حمزہ کا بھرپور مان لے کر۔

سیالکوٹ آئے اسے دوسرا دن تھا جب سپاہی مراد نے اسے بتایا کہ شبیر بھن کی شادی کا دعوت نامہ اس کے لیے دے کر گیا ہے۔

"سر اس نے کہا تھا کہ بڑا بھائی آیا تو بہنوں کو بہت خوشی ہو گی۔" مراد اس کے پیچھے چلتا اسے بتا رہا تھا۔

"آہم۔ یار! موقع تو بہت خاص ہے' مگر اب تو چھٹی کا مسئلہ ہے۔" اسے افسوس سا ہوا۔

"آپ فکر نہ کریں سر میں اسے فون کر کے آپ کی مجبوری بتا دوں گا۔"

"نہیں تم رہنے دو میں کوئی پروگرام ترتیب دیتا ہوں۔" وہ مراد کو منع کر کے آگے بڑھ گیا۔ ہاتھ میں کارڈ کو پکڑے سوچتے ہوئے اس نے مریم کا نمبر نکالا دوسری ہی بیل پر اس نے اٹھا لیا۔

"ہیلو کیپٹن۔" وہ بہت خوشی سے بولی۔

"ڈاکٹر۔ آپ سے اک کام تھا کریں گی؟" دعا

سلام سے چھوٹتے ہی اس نے پوچھا۔

"ہاں کروں گی کیپٹن کہیں۔"

"آپ کو اک شادی پر جانا ہے توحید آپا کے ساتھ۔"

"کس شادی پر۔"

"میری سسٹر کی' میں آپ کی طرف ایڈریس بھیج دوں گا۔"

"ٹھیک ہے جانا کب ہے۔"

"اس اتوار تک آپ کے پیپر ختم ہو جائیں گے اس کے بعد۔"

"ٹھیک ہے آپ ایڈریس بھیج دیجیے گا۔"

"چلیں ٹھیک ہے اپنا بہت خیال رکھیے گا۔" فون بند کرتے ہوئے علی میجر جواد کی طرف چلا گیا۔ آج جوانوں کے ساتھ ٹریننگ تھی اور اسے میجر جواد کے ساتھ ان کی ایک کلاس بھی لینی تھی اور ٹریننگ والے دن ایک منٹ کی تاخیر بھی بہت مہنگی پڑجاتی تھی۔

بہت جلد ہی ان کی ٹیم کا اعلان بھی ہو گیا تھا اور ان کی یونٹ کو سیاچن کے لیے چن لیا گیا تھا۔ اس مہینے کے آخر تک ان کی ٹریننگ شروع ہو رہی تھی۔ مطلب کہ ان کے شب و روز مصروف ہو گئے تھے۔ اس کا سارا سارا دن اپنے جونیئرز اور سینئرز کے ساتھ ٹریننگ میں گزرتا تھا۔ کبھی لیٹ ہوتے تو کھانے سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا۔ صبح صبح اٹھ کر آٹھ آٹھ میل بھاگنا تو کبھی رسیوں سے لٹک کر اک طویل مسافت طے کرنا۔ اس بھاگم بھاگ میں وہ چکرا کر رہ جاتا۔ کبھی کبھی وہ رات گئے تھک کر جب سب کھلے میدان میں گرتے تو اپنے آئندہ دنوں پر تبصرہ کرنے لگتے۔

"میری مانو تو سب اپنے اپنے ارمان پورے کر کے سیاچن جاؤ۔" صوبیدار عبدالحئی نے سب سے کہا۔

"ہر فوجی جوان کا شہادت کے بعد بڑا ارمان ہوتا ہے شادی۔ تو جو کنوارے ہیں تیاری باندھ لو۔ دعا کرنے والے ہاتھوں میں اضافہ کر لو۔" نائیک منہاس کی بات پر دور بیٹھا علی حمزہ ہنس پڑا۔

"یہ ارمان کنوارے فوجیوں کو ہی ہے۔ شادی شدہ فوجی تو جی اپنی شادی والے دن کو یوم سیاہ کے طور پر ہی مناتے ہیں۔" مراد کی بات پر سب شادی شدہ فوجی کھل کر ہنسے تھے۔

"تو شادی شدہ فوجیوں کا ارمان کیا ہوگا تمہارے خیال میں۔" علی ان کے درمیان آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"جن کے بچے نہیں ہیں وہ تو ضرور بچوں کا ارمان پورا کر کے جائیں اور بال بچوں والے فوجی تو سب ارمان پورے کر چکے۔ وہ صرف دعائیں ہی لے کر جائیں۔" صوبیدار عبدالحئی نے بات ہی ختم کی۔

"چلو کبیر سے پوچھتے ہیں کہ اس کا کیا ارمان ہے جسے وہ پورا کرنا چاہے گا۔" علی نے اپنی یونٹ کے سب سے نوعمر سپاہی جوان کے ساتھ سیاچن جا رہا تھا سے پوچھا۔

"صاحب اس کا ارمان یہی ہوگا کہ آمنہ بھابھی کو اپنے ابا کی بہو بنا دے۔" جواب جہانگیر کی طرف سے آیا تھا۔ علی نے حیران ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔

"آمنہ بھابھی۔" علی نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کبیر کو دیکھا۔ وہ اپنی پوری یونٹ میں سے کبیر سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتا تھا۔

"جی۔ وہ اس کی منگیتر ہے' مگر اس کا ابا اس کی شادی نہیں کرواتا۔"

"کیوں؟" علی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"جی یہ ابھی چھوٹا ہے نہ اس لیے۔ ابھی تو اس سے بڑے چار بھائی اور ہیں۔" جہانگیر کو اس کی پوری داستان پتا تھی شاید۔

"وہ تو ابا مجھ پر غصہ بہت ہے نا۔" وہ نروٹھے پن سے بولا۔

"وہ کیوں؟" علی نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ سر جی ابا مجھے پڑھا لکھا کر افسر بنانا چاہتا تھا۔ میں نے میٹرک سے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا تو ابا نے غصے میں آکر مجھے سپاہی ہی بھرتی کروا دیا۔" وہ بڑے مزے سے اپنے کرتوت بتا رہا تھا۔

"پھر تو اچھا ہوا ہے تمہارے ساتھ پڑھ لیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔" علی نے اس کے جواب میں کہا۔

"او سر جی آمنہ بھابھی تو اتنی پڑھی لکھی ہیں اور بہت سارا پڑھنا بھی چاہتی۔ پتا نہیں اس میں کیا نظر آگیا بے چاری کو۔" جہانگیر کی بات پر علی کی ہنسی چھوٹ گئی اب کبیر اسے مار رہا تھا۔

"او جناب وہ تو سنا ہوگا آپ نے کہ دل آجائے کھوتی پہ تو شہزادی کیا چیز ہے۔" صوبیدار صاحب پھر بولے تھے۔

"آپ کا مطلب ہے کبیر گدھا ہے۔" علی نے صوبیدار صاحب کی طرف آنکھ دبائی تو وہ کھسیا گیا۔

"آپ بتائیں سر آپ اپنا کون سا ارمان پورا کرنا چاہیں گے۔" سر نے اب علی سے پوچھا۔

"مجھے یاد آیا مجھے جواد صاحب کی طرف جانا تھا۔" وہ جھٹ سے موضوع بدلتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"بڑے چالاک ہیں کیپٹن صاحب آپ۔" جہانگیر سمجھ گیا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

سیاچن جانے سے پہلے وہ ایک بار گھر جانا چاہتا تھا۔ ان کی ساری یونٹ کو دو دن کا پاس ملا تھا ان کے لیے وہ بھی بہت تھا۔ سوموار کی صبح انہوں نے اسکردو کے لیے روانہ ہونا تھا۔

علی نے میسج پر اپنی آمد کی خبر دے دی تھی۔ اس کے آتے ہی توحید بیگم نے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ وہ اپنے بیٹے سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتی تھیں' جب سے وہ آیا تھا وہ اس کی چھوٹی چھوٹی شرارتوں کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتیں تو وہ انہیں چپ کرواتا ان سے لاڈ کرتا انہیں سمجھا رہا تھا۔

"امی جب بابا کی سروس اسکردو میں تھی تب بھی آپ کا دل اتنا ہی چھوٹا ہو جاتا تھا۔"

"ان کی پوسٹنگ اسکردو میں تھی وہ سیاچن نہیں گئے۔" انہوں نے آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ مریم ان کے لیے چائے لے آئی کرنل وقار صاحب بھی وہیں تھے۔

"جب میں اسکردو میں تھا تو آپ کی توحید آپا بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ ہمارے سنگ یہ بھی بہت بہادر تھیں جیسے اب مریم ہے۔ دیکھو وہ کتنی بہادر ہے۔ ذرا سی اداس بھی نہیں ہے۔" انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کہا حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اداس تھی۔ علی نے ان کے بات پر مسکرا کر مریم کو دیکھا۔

"بچی کا دل چھوٹا مت کریں وہ واقعی بہت بہادر ہے۔" توحید بیگم نے بھی اس کا دفاع کیا۔

"اچھا علی تمہارے لیے اک اچھی خبر ہے طاہر ماموں کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے۔" وقار صاحب نے موضوع بدلا۔

"ویسے امی شادی کب ہے ان کی۔"

"اس ماہ کے آخر میں۔" انہوں نے بتایا۔

"مطلب میں شامل نہیں ہو سکتا۔" وہ بجھ سا گیا۔

"تو تم چھٹی لے لو یونٹ کے بعد چلے جانا۔" کرنل وقار نے تجویز دی۔

"چھٹی نہیں مل سکتی بابا۔ آپ تو جانتے ہیں نا

آرمی والوں کو چلو کوئی بات نہیں جب میں واپس آیا تو دوبارہ سیلبو یشن کرلوں گا۔"

"ان شاءاللہ" توحید بیگم نے جلدی سے کہا۔

"اچھا بہت باتیں ہوئیں تم جلدی سے چائے ختم کرو اور مریم بیٹی کو کہیں باہر لے کر جاؤ۔" وقار صاحب نے چپ سی بیٹھی مریم کو دیکھا۔

"آئیڈیا اچھا ہے بابا۔۔۔ آپ لوگ بھی چلیں نا کھانا باہر ہی کھائیں گے۔" علی کپ میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

"بالکل نہیں۔۔۔ تم تھوڑا سا وقت اسے بھی دو اور مجھے بھی تھوڑی تنہائی کے لمحے دو۔" انہوں نے ماحول کو خوشگوار کرنے کی خاطر کہا۔ علی جانتا تھا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ مریم کے اصرار پر بھی انہوں نے معذرت کرلی۔ چائے ختم کرکے وہ علی کے ساتھ گھومنے چلی گئی۔

"آپ خوش تو ہیں نا کیپٹن۔" آج مال روڈ پر بڑھتی دھند میں وہ توحید آپا کے بجائے مریم کا ہاتھ تھامے چل رہا تھا۔ اس کے سنگ، بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ بہت ڈاکٹر میرے ساتھ میرے اتنے اچھے اچھے سپاہی جا رہے ہیں سب ہی خوش ہیں۔"

"میں آپ کی بہن کی شادی پر گئی تھی۔ وہ چھوٹی سی لڑکی بہت پیاری ہے۔" وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کررہی تھی۔

"ہاں شبیر بہت اچھا لڑکا ہے۔ پر غریب بہت ہے میرا بہت دل تھا کہ آپ دونوں وہاں جائیں۔"

"آنٹی نے جو آپ نے کہا تھا ان کی اماں کو دے دیا تھا۔" وہ خود نہیں جاسکا تھا' مگر شادی کے سارے اخراجات اس نے کیے تھے اس نے توحید بیگم کے ہاتھ سب کچھ بھجوایا تھا۔

"بہت اچھا کیا۔"

"آئی ایم پراوڈ آف یو کیپٹن (مجھے آپ پر فخر ہے)۔" وہ محبت سے بولی۔

"وہاں میرے پاس آپ کے لیے اک بہت بڑی خبر ہے۔" کچھ یاد آنے پر وہ اک دم چہک کر بولی۔

"اچھا کیسی خبر۔" وہ تجسس بھرے لہجے میں بولا۔

"میری رپورٹ پوزیٹو آئی ہے۔" خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"او رئیلی۔۔۔" علی نے خوش گوار حیرت سے اس کو دیکھا۔

"ہاں۔" اثبات میں سر کو ہلاتے وہ مسکرا رہی تھی۔

"تین ماہ میں اتنا بڑا چینج۔" وہ واقعی بہت حیران اور خوش بھی۔

"وہ تو آہی جاتا ہے۔"

"ہاں یہ بھی ہے۔ او ڈاکٹر آئی ایم سو ہیپی (میں بہت خوش ہوں)۔" وہ پھولے نہیں سما رہا تھا۔

"جب تک آپ سیاچن سے واپس آئیں گے آپ کا بے بی آپ کو بابا کہنے لائق بھی ہوجائے گا۔" علی کا ہاتھ تھام کر دوبارہ سے چلنے لگی۔

"پہلے طاہر ماموں کی شادی اور اب اتنی بڑی خوش خبری۔" وہ بے تابی سے بولا۔

"اب آپ بھی بہادر بنیے کیپٹن۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"بننا تو پڑے گا ہی ڈاکٹر۔۔۔ فوجی تو نام ہی قربانیوں کا ہے۔ ہم کیڈٹس کو اپنی فیملیز کی بہت کم خوشیاں نصیب ہوتی ہیں۔" وہ اداسی سے بولا۔

"اللہ آپ کو اجر بھی تو دیتا ہے نا اپنی خوشیوں کو قربان کرکے آپ لوگ وطن کی خاطر محاذوں پر ہوتے ہو۔" وہ اس کے ہاتھ پر تھپکی دے کر بولی۔

"کیسے مینیج کرو گی ڈاکٹر۔۔۔ فائنل ایئر ہے اسٹڈی اور یہ کنڈیشن۔" اب اسے فکر لاحق ہوگئی تھی۔

"ان شاءاللہ میں کرلوں گی مینیج۔۔۔ بس آپ اپنا خیال رکھنا اور میرے لیے بھی دعا کرتے رہنا۔ آپ تو خدا سے زیادہ قریب ہوجائیں گے۔" قریب پر زور دیتے اس کا اشارہ سیاچن کی بلند و بالا پہاڑیوں کی طرف تھا۔ علی دھیرے سے مسکرادیا۔

"میں آپ کو بہت مس کروں گی علی۔" اس کی بھوری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ اداس سے لہجے میں بولی۔

"میں بھی آپ کو مس کروں گا ڈاکٹر۔" اسے کندھوں سے تھامتے ہوئے علی نے مریم کو خود سے قریب کرلیا۔

☼ ☼ ☼

پیر کی اس روشن صبح میں انہوں نے سیالکوٹ سے رخصت لی تھی اور اسکردو کی طرف رواں دواں تھے۔ جاتے ہوئے علی نے مریم کی طرف الوداعی میسج بھی send کیا تھا۔ پہلا مہینہ انہوں نے اسکردو بیس کیمپ میں ہی گزارنا تھا۔ کرنل صاحب بابا کے بہت اچھے دوست تھے۔ انہوں نے علی کا پرجوش استقبال کیا تھا۔ بیس کیمپ کے احاطے میں کھڑے اس کا رخ دور اونچی اونچی پہاڑیوں کی طرف تھا۔ جب کرنل صاحب اس کے قریب آئے۔

"کیا دیکھ رہے ہو علی۔" وہ اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے بولے۔ علی نے مڑ کر انہیں دیکھا اور مسکرادیا۔

"سوچ رہا ہوں کہ مشکل ہوتا ہوگا نا ان میلوں پھیلے خوف ناک پہاڑوں میں رہنا۔" ٹراؤزر کے جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ آنکھیں سکیڑ کر پہاڑوں کو دیکھ کر بولا۔

"مشکل تو ہے۔ دور' دور تک کوئی ذی روح نہیں ہوتا۔ آپ کی ٹیم ہی آپ کی فیملی ہوتی ہے وہاں اور ان بڑے بڑے پہاڑوں میں صرف ایک ہی فیملی رہتی ہے۔ تو ظاہر ہے مشکل تو ہوتی ہے۔" وہ اسے آگاہ کررہے تھے۔

"ویسے اچھا ٹائم گزرتا ہے وہاں۔۔۔ ناقابل فراموش۔" وہ علی کے ساتھ کھڑے دور پہاڑوں کو دیکھنے لگے۔

"بالکل مجھے انتظار رہے گا وہاں جانے کا۔" وہ بہادری سے سینہ تان کر بولا گرم گرم کپڑوں میں اس کی سرخ ہوتی ناک بہت پیارا لگ رہا تھا۔

"شاباش علی۔۔۔ مجھے تمہاری یہ بہادری پسند آئی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے جوانوں میں بھی یہ جذبہ پیدا کرو۔ کیا پتا وہ تمہاری ہی سربراہی میں آگے جائیں۔"

"ان شاءاللہ سر۔۔۔" مسکراتے ہوئے وہ انہیں سیلیوٹ کرکے وہاں سے ہٹ گیا۔

☼ ☼ ☼
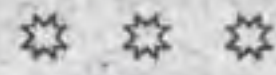
رات کے اندھیرے چھائے تھے اور اسکردو کی چھاؤنی جوانوں کی زندہ دل آوازوں سے جھاگ اٹھی تھی۔ فون کے انتظار میں لگی لائن میں اک دو دھکوں کے بعد لڑائی ہو جاتی تھی اور جو بے چارہ بات کررہا ہو سب اس کی گفتگو کو ایسا محال کرتے کہ اللہ کی پناہ مگر پھر بھی وہاں کسی کو کسی کی بات بری نہیں لگتی تھی۔ یہی تو محاذوں پر اپنا پن ہوتا ہے۔

"تم کیوں اتنے چپ ہو بھئی۔" علی ابھی ابھی وہاں داخل ہوا تھا۔ سپاہی فیروز کو دیکھ کر وہ اس کی طرف آیا۔

"سر۔۔۔" علی پر نظر پڑتے ہی فیروز نے سیلیوٹ جھاڑا۔

"او بیٹھ یار۔۔۔ سب اتنا ہلا گلا کررہے ہیں۔ تم کیوں اتنے چپ بیٹھے ہو۔" اس کے کندھے پر ہاتھ دھرے علی نے اپنائیت سے پوچھا۔

"گھر یاد آرہا ہے سر۔" فیروز کے لہجے میں بے حد اداسی تھی۔

"اوہو۔۔۔ ابھی سے گھر یاد آگیا۔" وہ اسے نارمل کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ اس کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔

"سر اگر آپ کی شادی کو فقط پندرہ دن ہوئے ہوتے تو آپ کی کیفیت ایسی ہوتی۔"

"اوئے ہوئے ظالم انسان۔۔۔ تمہیں کس نے کہا تھا سیاچن آنے سے پندرہ دن پہلے بیاہ رچالو۔" علی حمزہ کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

"صوبیدار عبدالحئی نے۔" انتہائی معصومیت سے جواب موصول ہوا تھا۔ علی سر تھام کر رہ گیا۔

"صوبیدار عبدالحئی صاحب کا تو کوئی کام سیدھا نہیں۔ اچھے بھلے معصوم آدمی کی زندگی اداس

کردی۔" وہ مسکراہٹ کو دباتے ہوئے بولا۔
"کیپٹن صاحب آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔" وہ نروٹھے پن سے بولا۔
"نہیں۔۔۔ نہیں میرے لال، کیپٹن صاحب خود بہت اداس ہیں۔ چلو کوئی کونا دیکھ کر غم بانٹتے ہیں" اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے وہ اسے اپنے ساتھ باہر لے گیا۔ نہانے کا ٹائم بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا تھا فوجیوں کے لیے، سب لائن میں لگے ہوئے تھے۔ صوبیدار صاحب مراد کو پھٹکار رہے تھے۔ علی حمزہ ابھی باتھ لے کر آیا تھا۔ اتنا کچھ پہننے کے بعد بھی سردی کا احساس بڑھ رہا تھا۔
"آج دوسرا ہفتہ ہے ہمارا اسکردو میں سر۔ اور بے شرم آدمی نہا نہیں رہا۔" کتنے ہی جوان ان کی لڑائی پہ مسکرا رہے تھے۔ صد شکر کہ کوئی سینئر آفیسر نہیں تھا۔
علی نے حیرت سے مراد کو دیکھا۔
"ایسے ہی شہادت آگئی تو فرشتے میل سے ڈر کر قریب نہیں آئیں گے۔" علی حمزہ بھی صوبیدار صاحب کے ساتھ ہو گیا۔
"سر اتنی ٹھنڈ ہے مجھے پانی سے خوف آتا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔
"شرم کرو، پانی سے ڈرتے ہو، سیاچن کے گلیشیرز پر کیسے جاؤ گے۔" صوبیدار صاحب بھی چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ علی کا ہنس ہنس کر برا حال ہو رہا تھا۔
"صوبیدار میری جان بخش دو۔ وعدہ کرتا ہوں سیاچن کے گلیشیرز پر تمہاری جگہ رات کی ڈیوٹی کروں گا۔" اسے نہانے سے بہتر سیاہ رات کی ڈیوٹی لگی تھی۔
"میں تجھ جیسے گندے انسان کو کبھی بھی اس مقدس جگہ نہیں لے کر جاؤں گا۔" وہ اک انچ پیچھے نہیں ہٹے۔
"مراد تیمم بھی مٹی سے ہوتا ہے برف سے نہیں۔ صوبیدار صاحب کی بات مان لو۔ یا ایسا کریں سب مل کر مراد کی مشکل آسان کر دیں۔" آنکھ کو دباتے ہوئے علی نے جہانگیر کو اشارہ کیا تو اس نے نیم گرم پانی کی بالٹی مراد پر الٹ دی اور پھر مراد تھا اور اس کی دلخراش چیخیں۔ دور، دور تک ان کے قہقہوں کی آواز فضا میں خوشگواریت پھیلا رہی تھی۔ رات کو مراد کو سخت ٹمپریچر تھا۔ وہ بیڈ پر پڑا ہوا تھا۔
"کہا بھی تھا آپ کو نا کریں۔ کیپٹن صاحب مجھے نہانا راس ہی نہیں آتا۔"
"کیا بنے گا تمہارا مراد۔" تاسف سے کہتا وہ اس کے قریب آبیٹھا۔
"صوبیدار صاحب تو میرے حق میں کبھی نہیں بخشے جائیں گے۔ اللہ پوچھے گا ان کو۔"
"اچھا کوسنا چھوڑو شر انگیز عورتوں کی طرح اور جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ آئندہ تمہیں نہلانے کی غلطی نہیں کریں گے۔" وہ اس کا کندھا تھپکتا اٹھ کر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

اسکردو میں ان کا تیسرا مہینہ تھا۔ اس دورانیے میں وہ دو، تین بار سیاچن کے پہلے کیمپ تک گیا تھا۔ مگر قیام نہیں کیا تھا۔ ہیلی پر ریسکیو اور دیگر چیزوں کے سپلائی تک ہی محدود رہا تھا۔
آج بڑے عرصے بعد علی کی گھر بات ہوئی تھی۔ امی اسے بہت یاد کر رہی تھیں۔
"تم سیاچن کب تک جاؤ گے علی۔" وہ فکرمندی سے پوچھ رہی تھیں۔
"بہت جلد۔۔۔ اک ماہ کے لیے جا رہا ہوں۔ کرنل صاحب میری قیادت میں ٹیم بھیج رہے ہیں۔" اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
"اپنا بہت خیال رکھنا علی۔ مجھے تمہاری بہت فکر رہتی ہے بیٹا۔" وہ شاید رو رہی تھیں۔ وہ محبت بھی تو بہت کرتی تھیں اس سے۔
"جی امی! بس آپ دعا کیجیے گا۔" نہیں کیا وہ تسلی دیتا وہ ماں تھیں دکھ اور فکر تو فطری سا تھا۔
"کیسے ہیں کیپٹن۔" امی کے جانے کے بعد مریم نے فون لیا تھا۔

"بہت پیارا۔۔۔ آپ کیسی ہیں ڈاکٹر۔" مریم کی آواز سن کر اسے بہت اچھا لگا تھا۔
"اچھی ہوں۔۔۔ میں یہ کہنا تو نہیں چاہتی۔ مگر میں آپ کو بہت مس کر رہی ہوں۔" مریم کی انا پرستی پر علی کے لب مسکرا اٹھے۔
"تھینکس ڈاکٹر وچ۔۔۔ اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں؟"
"بہت اچھی۔۔۔ طبیعت تھوڑی خراب رہتی ہے باقی سب ٹھیک ہے۔"
"اوہ سن کر افسوس ہوا، خیال رکھا کریں اپنا۔" علی، مریم کے لیے بہت فکرمند تھا۔
"آپ کا کہنا اچھا لگتا ہے آپ بھی اپنا خیال رکھنا کیپٹن۔"
"مس یو مائی وچ۔" محبت سے کہتے ہوئے علی نے فون پہ مریم سے الوداع لیا اور بابا ہمیشہ کی طرح اسے سیاچن کے بہادروں کے قصہ سنانے لگے اور واحد بابا ہی تھے جن کی باتوں کو سن کر اسے سیاچن جانا بالکل بھی مشکل نہیں لگتا تھا۔ علی کی ٹیم تیار تھی سیاچن جانے کے لیے۔ انہیں کل ہیلی پر روانہ ہونا تھا اور آج وہ ٹریننگ میں مصروف تھے۔ میڈیکل بھی تقریباً سب کے ہو چکے تھے۔ سب فٹ تھے سوائے جہانگیر کے اسے چیسٹ انفیکشن ہو گیا تھا۔ وہ شدید بیمار تھا قریب ہی تھا کہ اسے پنڈی شفٹ کر دیا جاتا۔
رسیوں پر لٹکے بھی صوبیدار صاحب اور مراد کی نوک جھوک جاری تھی۔ وہ نیچے کھڑا انہیں انسٹرکشن دے رہا تھا۔
"کیپٹن صاحب بہت مزا آرہا ہے۔ آپ بھی آجائیں۔" علی کے عین سر پر پہنچ کر مراد بولا۔
"صبح سے لٹک لٹک کر بازو جواب دے گئے ہیں۔ تم ہی مزے کرو۔" اسے کہتے ہوئے علی نے ہاتھ میں پکڑی اسٹاپ واچ کو دیکھا اور سب کو واپس آنے کا اشارہ کیا۔ انہیں صبح کی تیاری بھی کرنی تھی۔
اگلی صبح ان کی سیاچن کے بلند و بانگ گلیشیرز پر طلوع ہوئی تھی۔ وہاں موجود پچیس جوانوں پر مشتمل ٹکڑی واپسی کے لیے تیار تھی۔ جو پچھلے اک ماہ سے یہاں تھی۔ جو کیمپ فور سے ہو کر بھی آچکی تھی۔ جلد بے حد پھٹی ہوئی اور رنگ خوف ناک حد تک کالے ہو چکے تھے۔
"ہمارا بھی یہی حال ہونے والا ہے۔" پاس جاتے کبیر نے سب سے کہا۔
"مزا آئے گا اتنے حسین ہو کے۔" فیروز ہنسنے لگا۔
جانے والوں کے گلے ملتے ہی انہوں نے بہت سی نصیحتیں لی تھیں۔
"صاحب بھوک اور نیند کو الوداع کہہ دیں۔" جانے والی ٹکڑی میں سے اک جوان بلند آواز میں بولا۔
"یہ بات ہے۔" چمکیلی برف پر قدم جماتے ہوئے اس نے گلاس آنکھوں پر چڑھا لیے۔
"آپ کی قسمت صاحب سیاچن کا موسم خطرناک ہے۔"
"اب تم ہمیں ڈرا رہے ہو۔" وہ مصنوعی انداز میں ڈرتے ہوئے سب کو آگے بڑھنے کا اشارہ کرنے لگا۔
"چلو دیکھتے ہیں موسم کتنا مسئلہ کرتا ہے۔" علی حمزہ نے حتمی انداز میں کہتے سب کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔
"فی امان اللہ۔۔۔" جانے والوں نے یک زبان کہا۔
"فی امان اللہ۔۔۔" جواباً انہوں نے بھی اجتماعی کہا۔
وہ شب و روز بہت مشکل تھے۔ ٹھیک کہا تھا اس جوان نے بھوک اور نیند رخصت ہو گئے تھے۔ اللہ کا کرم ہوا تھا کہ اس پورے ماہ میں کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا تھا۔ ہاں انفیکشن کے بہت سے کیس ہوئے تھے۔ جنہیں وہ سہولت سے "آرام کے بہانے" کہہ دیتے اور جانے والے چھیڑتے تھے۔ چوتھے مہینے کا اختتام تھا جب علی حمزہ کا سر درد بھی شدید ہو گیا تھا۔ اب تو تھے بھی واپس جانے کے دن وہ دو دن صبر کرنا چاہتا تھا۔ مگر سر درد کے ساتھ بخار نے بھی گھیر لیا تھا۔ ناچار اسے واپس آنا پڑا۔ وہ اپنی ٹیم کے ساتھ واپس آنا چاہتا تھا۔ مگر بخار شدید ہو گیا تھا۔ اسکردو پہنچتے ہی اس کی ٹریٹمنٹ شروع ہو گئی تھی اور وہ بہت جلدی ٹھیک بھی ہو رہا تھا۔
"تم چاہو تو تمہیں پنڈی بھیج دیں علی۔"

"نہیں سر۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں، میں ٹھیک ہوں اب۔"

"تم اپنا چیک اپ کروالو علی۔۔۔ تاکہ نیکسٹ ٹائم کے لیے کوئی پرابلم نہ ہو۔" کرنل صاحب بضد تھے۔

"میں ٹھیک ہوں سر میرے لیے یہ وقفہ کافی ہے کور کرنے کے لیے۔" وہ اعتماد سے بولا۔

"تمہارے گھر انفارم کردوں۔" وہ جاتے جاتے بولے۔

"نہیں بالکل بھی نہیں سر۔۔۔ بلاوجہ کی پریشانی ہوگی۔ میں رات کو ان سے فون پر خود بات کرنا چاہوں گا۔"

"جیسا آپ چاہیں۔۔۔ گیٹ ویل سون۔" مسکرا کر کہتے وہ چلے گئے۔

☼ ☼ ☼
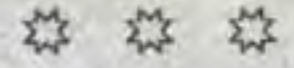
وہ چاہتا تو پنڈی جاکر آرام کرسکتا تھا اور مریم سے بھی مل سکتا تھا۔ مگر اس نے اپنی یونٹ کو چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ ان چار ماہ میں وہ انہیں اپنی فیملی کی طرح چاہنے لگا تھا۔ ان دنوں میں اس نے اپنا خوب خیال رکھا اور اب وہ بالکل فٹ محسوس کررہا تھا۔ دوبارہ سیاچن جانے کے قابل مگر اب میجر شیر جان کی ٹیم کی باری تھی۔ ان کی واپسی پر ہی کیپٹن علی حمزہ کی باری تھی اور یہ ماہ علی کے لیے بہت اہم تھا۔ اس مہینے میں مریم کی علی کو بہت فکر تھی۔ کیونکہ اس کی ڈلیوری ڈیٹ علی کے سیاچن دوبارہ جانے پر آرہی تھی۔ وہ ہر ہفتے اسے فون کرتا تھا اور دن تھے کہ گزرتے جارہے تھے۔ یہاں تک کہ پانچواں مہینہ بھی ختم ہوگیا۔ میجر شیر جان کی ٹیم وقفے وقفے سے واپس آرہی تھی۔ جانے سے اک رات پہلے اس نے مریم سے بات کی تھی۔ اسے مریم کی آواز سن کر خاصا اطمینان ہوا تھا۔

"بی بریو ڈاکٹر۔۔۔ سب بہت اچھا ہوگا۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا یا خود کو وہ ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا۔

"ان شاء اللہ۔۔۔ تو پھر آپ جارہے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ مگر اب میں ڈر نہیں رہا۔۔۔ دل بہت پرسکون ہے۔"

"اللہ پرسکون ہی رکھے۔۔۔ جب آپ چلے جا[تے] ہیں نا کیپٹن تو آپ کی بہت فکر رہتی ہے۔"

"اتنی فکر نہ کیا کریں میں لاڈلا بن جاؤں گا۔" شریر سے لہجے میں بولا تو وہ دھیرے سے مسکرادی۔

"میں سیاچن میں ہوں گا اور اک اچھی خبر کا [منتظر] رہوں گا۔ اور اللہ سے دعا کروں گا کہ اس خبر تک [مجھے] ٹھیک رکھے۔"

"ایسا تو نہیں کہیں کیپٹن۔۔۔ سب بہتر ہوگا۔" اک دم خفگی سی بولی۔

"ان شاء اللہ۔۔۔" صدق دل سے کہتے ہو[ئے] اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔ اسے [کرنل] صاحب بلارہے تھے۔

"یس سر۔" سیلوٹ کرتے وہ ان کے پاس آکر [کھڑا] ہوگیا۔

"کیسے ہو علی۔۔۔"

"الحمد للہ سر۔۔۔ بالکل فٹ۔"

"شیور۔۔۔"

"یس سر۔۔۔"

"ایک بار پھر تمہاری قیادت میں ٹیم جارہی ہے [تیار] ہو۔"

"آل دی تھینکس ٹو اللہ سر۔۔۔"

"اس بار لاسٹ کیمپ میں بھی جانا ہے۔ سیاچن کے حالات اچھے نہیں ہیں، رپورٹ اچھی نہیں آرہی۔"

"سیاچن کے حالات ایسے ہی رہتے ہیں ہمیشہ [سر]۔ تنہائی اور سناٹے کی آگ بہت بری ہوتی ہے اور [اس] آگ سے بچ جائیں تو سیاچن کا موسم گھیر لیتا ہے۔" سنجیدگی سے کہتا آخر میں ذرا سا مسکرادیا۔

"ان پہاڑوں کی حفاظت بھی تو کرنی ہے۔ یہ صرف برف سے ڈھکے گلیشیر نہیں۔ بلکہ ہمارے گھر پاکستان کا وہ دروازہ ہیں جہاں سے دشمن کا خطرہ [بھی] زیادہ ہے مشکل سہی مگر ان کی حفاظت ہر حال میں کر[نی] ہے۔"

"یس سر۔" جواباً علی نے بھی ان کی بات کی تائید کی۔

"وش یو آل دی بیسٹ کیپٹن علی۔"

"تھینکس سر۔" وہ سیلوٹ کرتا ہوا وہاں سے نکل گیا اور پھر صبح کی نماز پڑھتے ہی سب سیاچن کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہمیشہ کی طرح اپنے واپس نہ آنے کی صورت میں اپنے پیاروں کے نام پیغام چھوڑ کر۔ کیپٹن علی حمزہ نے بھی ایک لفافہ میجر شیر جان کو دیا تھا۔

"سر اگر میں شہید ہوگیا اور واپس نہ آسکا تو آپ یہ میرے گھر دے دیجیے گا۔" وہ دھیرے سے کہتا لب کچلنے لگا۔ میجر شیر جان نے وہ لفافہ لیتے ہوئے اسے گلے لگالیا۔

"وش یو آل دی بیسٹ کیپٹن علی۔" اس کی پشت کو تھپکتے ہوئے انہوں نے دعا دی۔

"تھینکس سر۔" وہ چلا گیا تھا۔ اک بار پھر برف سے ڈھکے گلیشیر زیر اپنی ٹیم کے ہمراہ۔ سب نے اپنے اپنے پیغامات پیچھے رہ جانے والے ساتھیوں کو دے دیے تھے۔ کیونکہ اس بار انہیں بہت آگے جانا تھا۔ کیمپ فور لاسٹ کیمپ تک 'ڈیتھ زون' میں۔۔۔ اللہ تعالیٰ سے دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر۔ جدائی موڑ کی تختی پڑھتے ہی علی نے دل میں توحید آباد کو اللہ حافظ کہا۔

☼ ☼ ☼

کیمپ تھری پر وحشت اور خاموشی اور بھی بڑھ گئی تھی اور برف کا حال تو ناقابل بیان تھا۔ اس بار علی اپنے ٹریننگ ٹائم کے فوٹو گراف بھی ساتھ لایا تھا اس کا سیکنڈ لیفٹیننٹ سے کیپٹن تک کا سفر علی اک اونچے ٹیلے پر کھڑا دور گرتے ایوالانچ کو دیکھ رہا تھا۔ دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔ اس کے گرنے سے کتنی ہی دیر تک فضا میں سفید دھند چھائی رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہیں کیپٹن صاحب۔" مراد اس کے قریب آیا۔

"سوچ رہا ہوں کہ اگر ہم یہاں نہیں وہاں ہوتے تو۔" علی حمزہ نے سفید دھند کی طرف اشارہ کیا۔

سیاچن گلیشیرز خوفناک حد تک خطرناک ہوچکے تھے۔ اتنے بڑے بڑے گلیشیرز زیر وہ صرف بارہ آدمی بھی ایک دوسرے کی تنہائی کم نہیں کرسکتے تھے۔

"ٹھیک کہا آپ نے اب بھی کیا پتا وہاں دشمن ہی نہ ہوں۔" اس لمحے ان دونوں کو بھارتیوں پر بھی ترس آیا تھا۔ دشمنوں سے بھی ہمدردی ہورہی تھی۔

"یہ مقام ٹھیک نہیں ہے سر۔۔۔ وہاں سے ہٹ جائیں۔" اگلو سے صوبیدار صاحب نے آواز لگائی تھی۔ وہ سب اندر آگ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

"آتے ہیں۔۔۔" علی نے وہیں سے ہانک لگائی۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے اگلو میں آگئے جہاں سب جوان بیٹھے کسی نہ کسی عمل میں مصروف تھے۔

"اس قدر خاموشی کیوں ہے بھئی۔" علی نے بھی اپنے لیے جگہ بنائی۔ کبیر کی باہر ڈیوٹی تھی اس کے علاوہ باقی سب وہاں دبکے بیٹھے تھے۔

"کیپٹن صاحب آج میچ ہے پاکستان، انڈیا کا بہت فکر ہورہی ہے۔" عبدالحئی نے اداسی سے کہا۔

"او جی فکر نہ کرو سب بہتر ہوگا ان شاء اللہ پاکستان جیتے گا۔" علی نے انہیں تسلی دی۔

"سر پورے پاکستان کو چاہے فکر نہ ہو مگر محاذوں پر بیٹھے جوانوں کی زندگی موت کا مسئلہ ہوتا ہے۔" صوبیدار صاحب غیرت سے پرجوش آواز میں بولے۔

"ہاں ٹھیک کہا ہار کر بے عزتی کا احساس جتنا ہمیں ہوتا ہے اتنا تو خود ان کو بھی نہیں ہوتا ہوگا۔" ان کی تائید کرتے ہوئے علی نے لانس نائیک امتیاز جو عمر میں ان سے بڑے تھے دیکھا۔ وہ اکثر ہی خاموش رہتے تھے۔

"میری بے بے بھی میچ بہت دلچسپی سے دیکھتی تھیں یہاں تک کہ سمجھ اک چیز کی بھی نہیں آتی تھی بس سادگی سے پوچھتی ہیں کافر جیت رہا ہے کہ مسلمان۔" مراد نے بڑے پیار سے اپنی ماں کا ذکر کیا۔

"وہ یہ جو بے بے ہوتی ہے نہ یہ ہوتی ہی بڑی کمال چیز ہے۔ میرے منتھے بھی مجھ سے دس سال بڑی عورت لگا دی۔" صوبیدار صاحب برف پگھلانے

اٹھے تھے کچھ دیر بعد کھانا بنانے کی کوشش بھی انہیں ہی کرنی تھی۔

"دس سال۔" علی حمزہ سمیت سب نے حیرت سے کہا۔

"آہو جی۔۔۔ بختاور بی بی۔۔۔ جس دن یتیم ہوئی تھی۔ میری بے بے گاؤں میں سب سے زیادہ جذباتی ہو گئی تھی اور جوش میں آ کے۔۔۔ نیکی کرنے کی غرض سے اٹھا کر میرا ویاہ۔۔۔ بختاور بی بی سے کرا دیا۔ جسے میں اتنا منہ بھر کر بختو آپا کہتا تھا۔" وہ اپنے ازلی شرارتی لہجے میں اپنی داستان الم سنا رہے تھے اور باقی سب کا ہنس ہنس کر برا حال تھا۔

"برا ہوا صوبیدار صاحب۔" مراد نے مسالا لگایا۔ وہ اب سب کے لیے پیکٹ میں بند کھانا نکال کر گرم کر رہے تھے۔

"مجھے بھی بے بے سے اک بات یاد آئی۔" امتیاز صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تو سب غور سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"او جی یہ سن 2005ء کی بات ہے میں پنڈی میں تھا کہ آرڈر آ گیا کہ بالا کوٹ میں ریسکیو کے لیے جانا ہے۔ ہم اسی دن شام کو پہنچ گئے جی۔ ملبہ ہٹانے کا کام جاری تھا' میں اور میرے کچھ ساتھی اک بڑی بے بے کو نکالنے لگے ملبے میں سے جی۔۔۔" وہ بڑے مزے لے لے کر داستان سنا رہے تھے۔ ہزاروں میل کی بلندی پر بیٹھے وہ قہقہے اس قدر خوب صورت لگ رہے تھے کہ جن کا مقابلہ وارث شاہ کی ہیر اور میاں محمد بخش کی سیف الملوک بھی نہیں کر سکتی تھی۔ شام کے دھند لکے بڑھ رہے تھے اور اب کبیر بھی اندر آ گیا تھا کھانا کھانے کے لیے۔

"تو سجنوں کیا بتاؤں۔۔۔ جیسے ہی ہم نے اس بڈھی بے بے سے ملبہ اٹھایا اور ہاتھ آگے کر کے بے بے کو سہارا دے کر باہر نکالا ۔۔۔ بے بے نے فوجیوں کو دیکھتے ہی جی یہ دوڑ لگا دی۔۔۔ پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاتی وہ بے بے سب فوجیوں میں سے بھاگ نکلی۔" امتیاز صاحب کے انداز بیاں پر سب کے ہنس ہنس کر چہرے سرخ ہو گئے تھے۔

"او جی وہ سمجھی کہ بھارتیوں نے ان کے علاقے بم گرا دیے ہیں۔ ایسا جوش اور بلند حوصلہ تھا اس کا فوجیوں کے پکڑنے تک وہ نعرہ تکبیر اللہ اکبر کے نعرے لگاتی رہی تھی۔" علی حمزہ کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا تھا۔

"یہ رقابت کی آگ بھی بہت بری ہوتی ہے صاب کوئی مکھی بھی مر جائے تو کارستانی رقیبوں کی لگتی ہے۔" علی حمزہ نے گرم پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"بس جی دعا کریں۔۔۔ اللہ جی آج کا میچ جتا دے۔" مراد کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"ان شاء اللہ" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ رات کی ڈیوٹی علی کی تھی تو وہ کھانا ختم کر کے اگلو سے نکل گیا۔

اگلی صبح انہیں لاسٹ کیمپ پر جانا تھا۔ صبح کی نماز باجماعت پڑھ کر علی نے سب رسیاں باندھی تھیں اور سب سے آگے وہی تھا۔

ایک بار پھر سب کی رسیاں چیک کر کے انہوں نے اپنے کیمپ کو الوداع کہا تھا۔ دھند آج بھی خاصی تھی اور موسم بھی قدرے خراب تھا۔ وہ کچھ دیر رکے تھے' مگر خبر یہی آئی تھی کہ وہاں پہ موجود ایک جوان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے اور اسے ہر حال میں بیس کیمپ تک پہنچانا ہے۔ آگے پیچھے سفید چاندی جیسی برف پر چلتے سفید ہی کپڑوں میں ملبوس وہ برف ہی حصہ لگ رہے تھے۔ اوپر سے آنے والے جوان انہیں راستے میں ہی ملے تھے ان پر نظر پڑتے ہی علی حمزہ کی ساری ٹیم نے سیلوٹ کیا تھا۔ جواباً انہوں نے بھی سیلوٹ کیا تھا۔

"مبارک ہو یار وپاکستان کل کا میچ جیت گیا ہے۔" جتنی اونچائی پر وہ تھے وہاں پر علی کی ٹیم ان لوگوں کو ایک بڑی خوشخبری سنا سکتی تھی۔

"او جی۔۔۔ یہ تو بہت چنگا ہو گیا جی۔۔۔ اب تو دشمن اور بھی تپ جائیں گے۔" سپاہی گلزار نے اسے زور سے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"ہار تو برداشت ہی نہیں ہے انہیں۔۔۔ چلو ہم بھی اپنی جان اللہ کی امان میں دیتے ہیں۔ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" بہادری سے کہتے وہ سب گلے مل کر آگے نکل گئے۔

کیمپ کے قریب ہی سابقہ ٹیم کے کمنٹس لکھے ہوئے تھے۔ ساری ٹیم آگے بڑھ چکی تھی جبکہ وہ وہیں کھڑا رہا۔

"سدرۃ المنتہیٰ۔۔۔" کے جملے پڑھ کر علی کے لب مسکرا دیے۔

"اللہ جی۔۔۔ جب تک میں اپنے کاکے کو نہیں دیکھ لیتا مجھے شہادت نہ دینا۔" اسے اپنے عقب میں فیروز کی آواز آئی وہ آنکھیں بند کیے ہاتھ دعا کی طرح اٹھائے با آواز بولا۔

"آمین۔۔۔" علی نے با آواز بلند کہا یہی دعا اس کے دل نے بھی کی تھی۔

"سر اتنی اونچائی پر فرشتوں کو ٹھنڈ نہیں لگتی۔" مراد کی بات پر صوبیدار صاحب جل کر مڑے۔

"تیرے جیسے بندے کے منہ سے اتنی ہی چنگی بات نکل سکتی تھی۔ فرشتے تو اس سے بھی اونچائی پر رہتے ہیں۔" صوبیدار صاحب کی بات پر اس کا قہقہہ بلا اختیار ہو گیا تھا۔ وہ سمجھا کہ صوبیدار صاحب فرشتوں کے نفس سے پاک ہونے کی بات کریں گے۔ اسے مریم کی بات یاد آنے لگی کہ یہاں وہ اللہ سے زیادہ قریب ہے۔ وہ مریم کو یہ نہیں بتا سکا تھا کہ اللہ کی قربت پانے کے لیے فاصلوں کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ انسان کے دل میں بستا ہے۔ ہر بندے کی دعا سننے کے لیے خود اس کے دل تک آتا ہے اور آج کا دن تو تھا ہی بہت اہم۔ اس نے اک نظر آسمان کو دیکھا۔ دل سے بہت بے تاب سی دعا نکلی تھی کہ اللہ مریم اور ان کے بچے کو سلامت رکھے۔

"کیوں چپ ہیں سر۔" فیروز اس کے قریب آ کر بیٹھا تھا۔ برف میں دھنسے بیٹھے وہ کیمپ والوں کو نظر نہیں آ رہے تھے۔

"گھر یاد آ رہا ہے۔" آج اس نے فیروز کی طرح کہا۔

"کیوں سر جی آپ کی شادی کو بھی پندرہ دن گزرے تھے۔" وہ سادگی سے بولا تو علی مسکرا دیا اور نفی میں سر ہلایا۔

"تم جا کر آرام کر لو۔۔۔ رات کی ڈیوٹی کرنی ہے تم نے۔" علی نے فکر مندی سے کہا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"سر جی اللہ بہت بہتر کرے گا۔۔۔ جب ہم بیس کیمپ میں جائیں گے تو ان شاء اللہ ایک اچھی خبر آپ کی منتظر ہو گی۔" وہ اس کا درد سمجھ گیا تھا علی نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا۔

"اور بھابھی کا خط تمہارے لیے۔"

"خط تو میرا بھی آنا ہے سر۔" کبیر جوان کی باتیں سن رہا تھا بولا تو وہ دونوں مسکرا دیے۔

"ہاں۔۔۔ ہاں ضرور آمنہ بھابھی کے خط کا انتظار کر رہا ہو گا تو۔" ان دونوں نے اسے چھیڑا۔ اپنے پیاروں کے پیغام کا انتظار بہت کٹھن تھا۔ وہ پانچ دن وہاں رہے تھے۔ چھٹا دن اس خوشی میں کہ وہ اتوار کو واپس جائیں گے بیس کیمپ میں کیسے گزارا پتا ہی نہیں چلا۔ ان کی اس کیمپ میں آخری رات تھی اور صبح تک کی ڈیوٹی علی کی تھی۔

"اچھا جی جوانوں سدرۃ المنتہیٰ کی آخری ڈیوٹی میرے ذمے۔ اگر میں واپس نہ آ سکا تو تم سب میرے لیے اس کلمے کے گواہ رہنا۔" اس نے با آواز کلمہ شہادت پڑھا تھا اور سب سے ملا تھا۔

"اور ہم میں سے جو بھی بچ گیا وہ میری اماں کے لیے پیغام لازمی لے جائے کہ اماں تمہارے بیٹے کو بہت بڑا مرتبہ ملا ہے۔ رونا نہیں اور مسکرا کر بیٹے کو اس مٹی کے سپرد کرنا جس کی حفاظت میں اپنی جان دی۔" علی نے سب کو اپنا آخری پیغام جو ہر رات کی ڈیوٹی پر جانا جوان باقی سب کو دے جاتا تھا دے دیا۔ سب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ چلا گیا تھا گہرے سناٹے اور پراسرار خاموشی میں ان سب کی آج آخری رات تھی۔ رات کے اس پہر بھی دور ایولانچ گرنے کی دھماکہ دار آواز دل میں خوف پیدا کرتی تھی۔ قدرے گہرائی

میں بیٹھے رات بتانے کے لیے اسے سب سے اچھا راستہ سوچوں کا لگا۔ آنکھیں موندے اس نے اپنی امی کو سوچا اور پھر ایک ایک کر کے یادیں اس کا ساتھ دینے لگیں۔ بچپن کی شرارتیں، لڑکپن کی دوستیاں، ٹریننگ لائف اور پھر اس کی شادی اور پھر زندگی میں مریم سے منسوب ہونے کے بعد جو بہار آئی تھی۔ ہر یاد ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر رہی تھی اور پھر اک اور خیال ایک ننھا منا سا نرم سا وجود۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی آنکھ لگ گئی ہے۔

وہ کبھی ڈیوٹی کے دوران نہیں سویا تھا، مگر آج "آج کیا ہوا تھا کہ وہ سو گیا تھا۔ نیند اس پر اس قدر غالب آگئی تھی۔ حالانکہ وہ دوپہر میں بھی تھوڑی دیر سویا تھا اور پھر اس بلندی پر نیند کا یوں آجانا اور تب اس نے ایک خواب دیکھا کہ وہ ایک سفید مخملی بچھونے پر سویا ہوا ہے کہ اس کی آنکھ کھلتی ہے۔ چار سو سفیدی ہی سفیدی جیسے سیاچن کی برف دھند ہی دھند ہے اور پھر اس دھند سے مریم نمودار ہوتی ہے۔ مریم کو دیکھتے ہی وہ مسکرا اٹھتا ہے۔ مریم بھی سفید پوشاک زیب تن کیے ہوئے ہے اور اس کے سر پر سفید موتیوں کا تاج ہے۔ وہ پری کی طرح لگ رہی ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں سفید موتیے کے پھول پکڑے ہوئے ہیں۔ وہ علی کی جانب بڑھ رہی ہے وہ اپنی جگہ سے اٹھتا بھی نہیں بس وہیں سے لیٹے لیٹے اپنی بھوری آنکھوں سے مریم کو بہت محبت سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ مریم بڑھ کر پھول اسے دیتی ہے۔ وہ اس پر پھولوں کی برسات کرتی ہے وہ جلدی سے اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے اٹھتا ہے اور علی کے چھونے سے پہلے ہی وہ جلدی سے مڑ جاتی ہے دور جا کر مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتی ہے جیسے اسے تنگ کر رہی ہو اس کی بے تابی کا مزا لے رہی ہو۔ وہ حیرت سے اس کے لمبے بالوں والی پشت کو دیکھتا رہتا ہے کہ وہ چلتے چلتے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ وہ حیران حیران سا اس دھند کو دیکھتا رہ جاتا ہے اور پھر ہر طرف سفیدی ہی سفیدی ہوتی ہے۔

"سر۔۔۔" صوبیدار صاحب کی آواز پر ہڑبڑا کر علی نے آنکھ کھولی۔ حیرت سے اس نے اپنی ساری ٹیم کو دیکھا جو واپس جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

"صبح ہو گئی۔" حیرت سے ادھر ادھر دیکھتے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"جی سر۔۔۔ اللہ کے کرم سے اب ہم اپنی ڈیوٹی پوری کر کے واپس جا رہے ہیں۔" فیروز کے چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی۔

"جلدی کریں سر خوش خبری منتظر ہے آپ کی۔" فیروز کی بات پر وہ مسکرا اٹھا تھا۔ وہ سب زندہ سلامت واپس جا رہے تھے اور اس بار تو واپس آنے کی خوشی بھی زیادہ تھی کہ وہ گھر سے کسی خبر کے لیے بے تاب تھا۔

بیس کیمپ کی رونق بھرپور تھی۔ دو دن کی مسافت کے بعد وہ یہاں پہنچے تھے۔ یونٹ سو بندوں پر مشتمل تھی۔ علی کی ٹیم دیکھ کر سب نے بھرپور استقبال کیا تھا۔ وہ باری باری سب سے گلے مل رہے تھے۔

"گھروں سے کوئی پیغام آیا ہے ہمارا۔۔۔" صوبیدار صاحب نے جوانوں میں سے ایک سے پوچھا۔

"ابھی نہیں آیا صوبیدار صاحب مگر شام تک اسکردو سے آنے والی ٹیم پیغام لے آئے گی۔" ان میں سے ایک اور جوان نے جواب دیا۔

"اوہو۔۔۔ اب شام تک انتظار کرنا پڑے گا۔" علی نے دل ہی دل میں افسوس کیا اور پھر وہ شام بھی اللہ اللہ کر کے آہی گئی۔ اسکردو والی ٹیم کو چھوڑ کر ہیلی کاپٹر واپس روانہ ہو گیا اور اب ان میں سے اک جوان ان سب کو ان کے گھروں سے آئے خط دے رہا تھا۔ سب جوانوں کی خوشی دیدنی تھی۔ فیروز اپنا خط لے کر دور چلا گیا۔ آمنہ بھابھی کا بھی خط آیا تھا جسے جہانگیر نے اچک لیا تھا۔ وہ اور مراد مل کر کبیر کو ستا رہے تھے۔ صوبیدار صاحب کی بختاور آپا کا خط بھی آیا تھا اور امتیاز صاحب کے بچوں کا رزلٹ بھی تھا جسے پڑھ کر وہ پھولے نہ سما رہے تھے ان کے بچوں نے پوزیشن لی تھی۔ اس کے لیے کوئی خط کوئی پیغام نہیں تھا۔ کیا ہوا ہو گا گھر میں۔۔۔ مریم کیسی ہو گی؟ وہ اداسی سے دور بیٹھا سوچ رہا تھا۔

"ہو جی۔۔۔ اب ایک منٹ کی خاموشی اور توجہ چاہوں گا۔" اک جوان کے نعرہ لگاتے ہی سارے متوجہ ہو گئے۔

"کیپٹن علی حمزہ کے لیے بھی اک پیغام۔ میجر شیر جان نے بھجوایا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تو علی حمزہ کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کو بند ہو گئی۔ سب منتظر سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"اللہ رب العزت نے کیپٹن علی حمزہ کو چاند سا بیٹا دیا ہے۔" خوشی سے جگر جگر کرتے چہرے سے اس جوان نے بتایا تو علی حیرت اور خوشی سے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ پھر کیا تھا سب اپنے اپنے خط بھول بھال کر علی کی طرف بھاگے تھے۔ خوشی کے نعرے اور مبارک بادوں کی گونج چار سو پھیل گئی۔ علی تو پھولے نہیں سما رہا تھا۔ سب نے مل کر اسے اٹھا رکھا تھا اور محو رقص تھے۔

"چلیں۔۔۔ کیپٹن صاحب مٹھائی کھلائیں۔" سب نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

"سیاچن میں کہاں سے لاؤں میں مٹھائی۔" وہ مجبور سا بولا۔

"دھت تیری۔۔۔" صوبیدار صاحب نے ٹھوکر ماری۔

"اچھا دل چھوٹا نہ کریں۔۔۔ میٹھا ہی کھانا ہے نا میں چائے بنا دیتا ہوں خود اپنے ہاتھوں سے۔" علی کی چہک دیکھنے لائق تھی۔

"سیاچن میں سب سے بڑی مٹھائی تو ہوتی ہی چائے ہے۔" سپاہی فیروز مسکرا کر بولا۔

"کیپٹن صاحب زندہ باد۔۔۔" سب جوانوں کے نعرے پر وہ مسکرا اٹھا تھا۔ اپنے اپنے خطوط جیبوں میں ڈالے سب اک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ دو سپاہی لوہے کا کین لے کر بیٹھ گئے اور خوشی کی تھاپ بجانے لگے اور سروں کو بکھیرتے جوانوں کی آواز پر محو رقص چار جوانوں کو دیکھ کر دور بیٹھے علی کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ سب اپنی خوشیاں بھول بھال کر علی کی خوشی میں مست تھے۔ چائے کے آتے ہی سب نے اپنے اپنے کپ

اٹھائے۔ لانس نائیک امتیاز نے سب کو روک کر باجماعت نفل پڑھنے کا کہا تھا۔ بیس کیمپ میں چار سو زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی کہ اچانک اک زوردار دھماکہ ہوا۔ علی حمزہ نے گھبرا کر اوپر دیکھا سفید آسمان ٹوٹ کر ان پر گرا تھا۔ چند سیکنڈ۔۔۔ بس چند سیکنڈ کا عمل تھا اور پھر گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ زندگی کی لہر جو سیاچن گلیشیر میں دور دور تک پھیل چکی تھی اک دم سے تھم گئی۔

خوشی سے جھومتے جوان۔۔۔ ایک دوسرے کو تنگ کرتے ایک دوسرے کے پیچھے اپنے خطوط کو چھینتے جھپٹتے۔ کیپٹن علی حمزہ کے بیٹے کی خوشی مناتے جوان سب کے سب گہرے ملبے میں چلے گئے۔ تاحد نگاہ دھند ہی دھند میلوں پھیلا برف کا طوفان تھا اور گہرا سناٹا تھا۔ سیاچن گلیشیر پر اب کوئی ذی روح نہیں تھا۔ سو بندوں پر مشتمل یونٹ ایک خوفناک ایولانچ کی نذر ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

منوں برف تلے دبے اس کا دم شدید گھٹ رہا تھا۔ سانس لینا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ وہ کسی کو آواز دینا چاہتا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پہ کھڑے صوبیدار صاحب کو جو اسے "میٹھا" زیادہ رکھنے کا کہہ رہے تھے۔

"وہ کہاں ہوں گے۔" درد کی ایک شدید لہر پورے بدن میں اٹھی تھی وہ اپنا سر تک نہیں گھما سکتا تھا برف بہت وزنی تھی۔

"کبیر۔۔۔" اس کا دل پوری قوت سے چلایا تھا۔

"پتا نہیں مراد نے اسے اس کی آمنہ کا خط دیا تھا کہ نہیں۔" بے بسی سے سوچتے اس نے پوری قوت لگائی اور اٹھنا چاہا۔ تب اسے اندازا ہوا کہ اسے اپنا جسم محسوس ہی نہیں ہو رہا۔ سوائے سوچنے کے اور کوئی حس ساتھ نہیں تھی۔

"اوہ میرے خدا۔" بے بسی سے اپنے وجود کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے اس نے ایک دکھی سی آہ بھری۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ایولانچ نے ان کی ساری یونٹ کو دبا دیا ہے۔ تو کیا وہ سب کے سب یہاں دب گئے ہیں؟

"اے میرے خدا۔۔۔ کیا وہ اب یہاں سے نکل سکیں گے؟"

"اوہ میرے خدا۔۔۔ یہ پل بھر میں کیا ہو گیا تھا وہ اب کبھی یہاں سے نہیں نکل سکتے۔" یہ سوچ کر اس کی وحشت اور بھی بڑھ گئی۔ کبیر، صوبیدار صاحب ابھی تو پل بھر پہلے خوشی سے مسکرا رہے تھے۔ اپنے خطوط کا انتظار کیا تھا انہوں نے اتنے انتظار کے بعد ان کے پیاروں کے پیغام ملے تھے۔ ابھی تو فیروز نے اپنی بیوی کا پیغام اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ صوبیدار صاحب کی بھولی بھالی سی بے بے کی دعائیں آئی تھیں۔ امتیاز صاحب اپنے بچوں کو دعائیں دے رہے تھے اور ابھی ہی تو۔۔۔ ابھی ہی تو اسے ایک اور پیغام ملا تھا۔ اس کے بیٹے نے دنیا میں آنکھ کھولی تھی اور وہ سب تو ننھے مہمان کی آمد پر خوش تھے خوشی منا رہے تھے۔ سب اس سے مٹھائی مانگ رہے تھے۔ اس نے تو ابھی سب کا منہ میٹھا کروانا تھا۔ اک پل میں ایک پل میں یہ کیا ہو گیا۔ سانس بہت مشکل سے آ رہی تھی۔ وہ اور اس کے ساتھی مر رہے تھے۔ سیاچن گلیشیر میں دبے وہ سو نفوس دھیرے دھیرے اپنا دم توڑ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ زندگی سے دور جا رہے تھے اپنے پیاروں کو بتائے بنا۔ کیا کوئی ان کی مدد کو آئے گا؟ کیا کوئی زندہ ہو گا؟ کیا کوئی بچے گا سب میں سے؟

"امی۔۔۔" شہادت کا رتبہ سینہ تانے بانہیں کھولے سامنے کھڑا تھا اور درد تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے بے اختیار بڑی شدت سے اپنی ماں کو آواز دی۔ اس کی پیاری توحید آپا اسے لگا اب وہ اپنی توحید آپا سے دور جا رہا ہے ہمیشہ کے لیے۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کا ہاتھ کسی نے تھاما ہے۔ بمشکل اس نے آنکھیں کھول کر گھپ اندھیرے میں دیکھا۔ ایک جھلک تھی کسی کی وہ کون تھا کیسے اس بوجھ تلے آیا تھا اس کا ہاتھ تھامتے کس کو اس کی تکلیف کا اندازا ہوا تھا، وہ گرم لمس کس کا تھا؟

علی دیکھنا چاہتا تھا وہ آنکھیں پوری قوت سے کھولنا چاہتا تھا۔

"ماں۔۔۔" اک دبی سی آواز اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ وہ مہربان ہستی اس کی ماں تھی اس کی پیاری توحید آپا۔ گنتی کی چند سانسیں رہ گئی تھیں اس کی، نئے مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ وہ اسے لینے آئے تھے اور علی کو اب ان کے ساتھ جانا تھا۔ مریم کے پھول اسے اپنے اردگرد خوشبو بکھیرتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ خواب حقیقت ہونے جا رہا تھا۔

توحید آپا، مریم، بابا جان سب کھڑے مسکرا رہے تھے اور علی انہیں الوداع کہہ کر جا رہا تھا۔ ان سفید پوشاک والے مہمانوں کے ساتھ جو منتظر کھڑے تھے۔ کیا بابا جان کبھی اس سے مل سکیں گے؟ ان کا بیٹا ان کا فخر کیا وہ اس برف کے ڈھیر تلے اپنے بیٹے کو لینے آئیں گے؟ اس نے مڑ کر سب کی طرف ہاتھ ہلایا۔ مریم کے پاس ایک ننھا فرشتہ تھا جس کے صرف پنکھ ہی وہ دیکھ سکا تھا وہ اس کا بیٹا تھا۔ کیپٹن علی حمزہ کا بیٹا اک ارمان ہر شہادت پانے والے کی طرح اس کے دل میں ہی رہ گیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو نہ دیکھ سکا تھا۔ پھر وہ سب دھند میں غائب ہو گئے تھے۔ وہی خواب سا منظر تھا سفید دھند میں وہ اب اکیلا رہ گیا تھا۔ نئی دنیا تھی اور وہ سفید لباس والے ساتھی جو اللہ کا نام لیے جا رہے تھے یہ ساتھی ابھی کچھ دیر پہلے آرمی لباس میں تھے اور اب اس کے ساتھ سفید کفن پہنے چل رہے تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ اونچی اونچی آواز میں اللہ کا نام لیتا انجان رستوں کی طرف بڑھ گیا۔ لبیک اللھم، لبیک کی صدائیں بلند کر کے آسمان کی طرف سفر کرتے زمین پر رہ جانے والوں سے بہت دور چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

سرچ آپریشن جاری تھا۔ پوری قوم دعاگو تھی کہ کوئی ایسا معجزہ ہو جائے کوئی ایسی کرامت ہو جائے کہ ان کے ملک کے بہادر جوانوں میں سے کوئی تو زندہ ہو۔ ہر گزرتا دن امیدوں کا دم توڑ رہا تھا۔

توحید بیگم اک بلند چیخ لگا کر جاگیں مریم ان کے سرہانے بیٹھی تھی۔ پانچ راتیں گزر چکی تھیں۔ ان میں سے کوئی سو نہیں سکا تھا۔

"میرا بیٹا۔۔۔ میرا علی مجھے بلا رہا ہے۔۔۔ مریم۔۔۔ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ مریم میرا بیٹا مجھے بلا رہا ہے۔۔۔ میرا علی حمزہ۔۔۔" وہ دیوانوں کی طرح اسے جھنجھوڑ رہی تھیں۔ مریم کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بہت صبر سے کام لے رہی تھی۔ پانچ راتیں اس نے جائے نماز پر دعا کرتے گزاری تھیں کہ "اے اللہ اس کا سہاگ سلامت ہو۔ اس کا علی زندہ ہو۔"

"پلیز آنٹی صبر کریں۔۔۔ وہ زندہ ہے۔۔۔ وہ سلامت ہے۔۔۔ آپ کا بیٹا زندہ ہے۔۔۔" دکھ سے ٹوٹتے لہجے میں کہتے اسے اپنی آواز بہت کمزور لگی۔

سرچ آپریشن جاری تھا۔ آئے دن جتنی باڈیز کور ہو رہی تھیں تمام کسی نہ کسی شناخت کے بعد لواحقین کے حوالے کی جارہی تھیں۔ پندرہ دن، سولہ دن اور پھر کرتے کرتے چوبیس دن کے بعد کیمپ سے دو کلو میٹر دور برف ہٹانے پر ایک باڈی ری کور ہوئی تھی۔ کوٹ پر لگے بیج پر "کیپٹن علی حمزہ" کے حروف چمک رہے تھے۔ وہ ہنستی آنکھیں، بند لب، بھوری آنکھیں، بھورے بال، مغرور ناک سب کچھ غائب تھا۔ ایک اکڑی ہوئی برف سے سیاہ ہوئی لاش تھی۔ کرنل وقار کے کندھے دکھ سے جھکے نہیں تھے۔ وہ ان کا اکلوتا وارث تھا۔ انہیں اس بات کا غم نہیں تھا ان کے کندھے فخر سے بلند ہوگئے تھے کہ وہ ایک شہید کے والد تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ اپنے بیٹے کو محاذوں پر شہید ہونے کی دعا دی تھی۔ دل کو مضبوط کرتے وہ اپنے جوان بیٹے کا جسد خاکی لے کر واپس آئے۔ وہ پریشان تھے کہ کیسے توحید بیگم کو ان کا بیٹا دیں گے۔ وہ کیسے بتائیں گے کہ وہ اکڑا ہوا سیاہ چہرہ ان کے علی حمزہ کا ہے۔ میجر سیر جان نے اس کی باڈی سے پہلے اس کا آخری پیغام اس کی توحید آپا کو دیا تھا۔ مریم نے وہ خط لے کر کھولا اور توحید بیگم کے سامنے رکھ دیا۔

"ماں۔۔۔ تمہارے بیٹے کو بہت بڑا رتبہ ملا ہے۔ ذرا بھی مت رونا مسکرا کر اپنے بیٹے کو اس ـــ زمین کے حوالے کرنا۔ بہادر بننا میری ماں۔۔۔ آپ نے تو اتنے بہادر بیٹے کو جنم دیا ہے۔ ذرا دکھ نہ کرنا کہ آپ کا پیارا آپ سے جدا ہوگیا۔ بلکہ یہ دعا کرنا کہ آپ کی نسل میں جتنے بیٹے بھی آئیں سب کے سب اللہ کی راہ میں شہید ہوں۔۔۔ اگر میرا بیٹا ہوا تو اسے بھی اللہ کی راہ میں بھیجنا۔۔۔"

آپ کا بیٹا کیپٹن علی حمزہ۔

دو ننھے ننھے موتی ان کی آنکھوں سے نکل کر اس نیلی روشنائی پر گرے تھے۔ انہوں نے ان لفظوں کو چوما تھا۔ انہیں ان سے اپنے بیٹے کی خوشبو آرہی تھی، ان کے علی حمزہ کی خوشبو۔ اک نظر اٹھا کر انہوں نے حسن علی کو دیکھا تھا۔ وہ علی کا بیٹا تھا، وہ ایک شہید کا بیٹا تھا۔ وہ کیوں دکھی ہوتیں ان کا بیٹا تو زندہ تھا۔ ان کا علی تو شہید تھا۔ انہوں نے بانہیں پھیلا کر مریم کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا تو وہ ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ مریم کے وجود میں ان کا بیٹا ہمیشہ ان کے پاس رہے گا۔ اس کے ماتھے کو چومتے وہ اسے حوصلہ دے رہی تھیں۔ علی کا جسد خاکی دیکھ کر مریم کا دل بہت رویا تھا۔ بہت کم رفاقت رہی تھی ان کی مگر وہ دل و جان میں بس گیا تھا۔ مریم کو ان لمحوں پر ناز تھا جن لمحوں میں وہ اس کے ساتھ رہا تھا۔ کرنل وقار حمزہ نے ننھے حسن علی کو اٹھا رکھا تھا جسے دیکھ دیکھ کر ان کا غم ہلکا ہو رہا تھا کیوں کہ ننھی جان ان سب سے زیادہ بہادر تھا۔ حسن نے اتنی چھوٹی عمر میں یتیمی کا دکھ سہا تھا۔ انہیں لگا علی ان کے اردگرد ہی کہیں کھڑا انہیں ڈھارس دے رہا ہے وہ ایک بہادر باپ کا بہادر بیٹا تھا۔ جو بیٹے کا جسد خاکی دیکھ کر فخر سے مسکرا رہے تھے۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا وہ ان کی جان تھا۔ وہ انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ شہادت کا بلند رتبہ لے کر ان کا سر فخر سے بلند کرکے وہ چلا گیا تھا۔

اور ایک ان کا بیٹا کیا۔ انہیں ان سو کے سو جوانوں پر فخر تھا جو وطن کی خاطر شہید ہوئے تھے۔ ان عورتوں پر فخر تھا جن کے وہ سہاگ تھے۔ ان بچوں پر ناز تھا جن کے وہ باپ تھے۔ ان ماؤں پر فخر تھا جن کا وہ سہارا تھے۔ وہ امر تھے وہ شہید تھے اور شہید تو زندہ ہوتا ہے وہ مرتا نہیں وہ سب خوش قسمت جوان تھے جن کے ساتھ پورے ملک کی دعائیں تھیں اور ان پر جتنا فخر کیا جاتا کم تھا کہ ان کا ذکر ہمیشہ دعاؤں میں کیا جائے گا۔

توحید بیگم اور کرنل وقار حمزہ کو کوئی غم نہیں تھا۔ کرنل وقار صاحب اب بھی ایک فوجی کا باپ بننا چاہتے تھے۔ وہ اب بھی ڈاکٹر مریم علی اور کیپٹن حسن علی کے باپ تھے جیسے وہ اپنے علی حمزہ کے باپ تھے۔

☆☆

کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں جو ہم جاگتی آنکھوں سے دیکھتے ہیں یعنی ہم ان خوابوں کے پیچھے بھاگتے ہیں اور کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں جو "وہ ہمیں" جاگتی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور وہ ہمارے پیچھے بھاگتے ہیں' ان کو اپنے پیچھے بھگانے میں بہت لطف آتا ہے۔ یہ خوابوں کو اپنے پیچھے بھگانے کا فلسفہ بھی میرا اپنا ہی تھا' آپا کہتی تھیں کہ ہم خوابوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں' خواب ہمارے پیچھے کبھی نہیں بھاگتے "انہیں پاگل اور سودائی آنکھوں والے بہت مل جاتے ہیں۔

میں' زویا الیاس' بی اے سیکنڈ ڈویژن' عمر چوبیس برس' گندمی رنگت' قد پانچ فٹ دو انچ اور ہاں میری شکل و صورت بس واجبی سی ہے مجھے انگریزی سے ناواقف ہونے کے جرم میں کسی بھی اچھے پرائیویٹ اسکول میں نوکری نہیں ملی' اماں ایک کوٹھی میں کپڑے استری کرنے جاتی تھیں' ابا مزدوری کرتے تھے' آپا ایک گارمنٹس فیکٹری کے لیے گھر بیٹھے ہی چلڈرن گارمنٹس پر بٹن لگاتی تھی' یہ میری اصلیت تھی جسے میں چھپانا چاہتی تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ خواب میرے تعاقب میں بھاگیں گے۔

چھوٹے سے بھی چھوٹا صحن' باورچی خانہ نہیں تھا' اماں نے صحن میں ہی چھوٹا سا باورچی خانہ بنا رکھا تھا' جہاں لکڑیوں کا دھواں اور پھونکنی کی آواز سے رونق رہتی تھی' صحن کے ایک طرف پیپل کا درخت تھا جس کی ساری چھاؤں باہر گلی میں تھی' کبھی کبھی مجھے لگتا کہ میں اس درخت پر بیٹھی ایک کوئی ہوں جسے ایک دن اس درخت سے اڑ جانا ہے' مور کے پر لگا کر۔

☼ ☼ ☼

بہت لمبی گاڑی تھی' رنگ بالکل سیاہ مگر لشکارے مارتا' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری آنکھیں جھپکنا بھول گئی ہوں' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص اتنا ہی شاندار' گوری رنگت تھی اس کی۔ میں ایک اسکول میں انٹرویو دینے گئی تھی امید تھی کہ یہاں کام ہو جائے گا کیونکہ یہ ایک اردو میڈیم اسکول تھا اور انہیں ٹیچر کی ضرورت بھی تھی۔ یہ گاڑی میرے پیچھے تھی' میں نے ہارن کی آواز سن کر پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن ڈرائیو کرنے والے شخص کا دھیان نہیں اور تھا' مجھے ایک گونا خوشی ہوئی کہ "اس" نے مجھے اس حلیے میں نہیں دیکھا۔ پہلی بار مجھے اپنی کہی بات سچ محسوس ہوئی مجھے احساس ہوا جیسے میرے خواب میرے پیچھے آرہے ہوں' میرے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

☼ ☼ ☼

اماں گھر آئیں تو ان کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے شاپر تھے۔

"یہ کیا ہے اماں؟" وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ آپا چائے بنا رہی تھی' اس نے بھی ترچھی نظروں سے ان شاپروں کو دیکھا۔

"آج باجی سے تنخواہ ملی تھی' یہ تھوڑی چیزیں لے کر آئی ہوں' چینی' چائے کی پتی' دال چنا' چاول۔۔۔ ایک تو مہنگائی اتنی ہے کہ بس۔" اماں چپل اتار کر چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئیں۔

"اور یہ دوسرے شاپر میں کیا ہے؟" میری نظریں اس رنگ برنگے شیڈ مارتے شاپر پر تھیں۔

"یہ؟؟؟؟" اماں کو جیسے کچھ یاد آیا۔

"ارے ہاں باجی کے کچھ پرانے کپڑے تھے' ان کے نئے کپڑے درزی سے آئے تو یہ پرانے مجھے دے دیئے' اب تم دونوں دیکھ لو جسے پورے آئیں رکھ لو۔" اماں نے شاپر میری طرف بڑھا دیا۔ فیشن کے مطابق بنے لمبی شرٹ والے دیدہ زیب ڈیزائنز کے پانچ سوٹ تھے' آپا نے اشارے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ ایسے کپڑے نہیں پہنتی تھی۔

"ارے یہ کیا ہے؟" کپڑوں کے نیچے ایک چمڑے کا ہینڈ بیگ تھا۔

"ارے ہاں یہ اس میں کچھ پرانا میک اپ کا سامان اور ہار چوڑیاں ہیں باجی کہہ رہی تھیں کہ بیٹیوں کو دے دینا۔" اماں اپنے ہاتھ پاؤں دبانے لگیں' تھکن ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

"ارے۔۔۔ اتنا کچھ۔۔۔ سن گلاسز۔" میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں۔" اماں کی آنکھیں بند تھیں۔

"مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا' یہ ساری فیشن ایبل چیزیں میرے پاس ہیں۔" میں کپڑوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ پیپل کے درخت پر کوئی بیٹھی تھی' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے مور کے پر مل گئے ہوں۔

☼ ☼ ☼

مجھے نوکری مل گئی تھی' وہ اسکول ایک پرائیویٹ اردو میڈیم اسکول تھا' تنخواہ بھی اتنی تھی کہ میں ہر مہینے اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات پوری کر سکتی تھی۔

سیاہ اور سرخ رنگ کے خوبصورت پرنٹڈ سوٹ میں' ہلکا ہلکا میک اپ کیے' آنکھوں پہ سن گلاسز لگائے میں اپنے ہی دھیان میں چلی آرہی تھی جب عقب سے گاڑی کے ہارن کی آواز آئی' میں نے مڑ کر دیکھا' وہی شاندار سا شخص پوری محویت سے مجھے دیکھ رہا تھا' اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری تھی۔

"آیئے میں آپ کو چھوڑ دوں۔" پہلی ملاقات' انجان شخص اور میں اتنی خوش تھی کہ مجھے اسی جملے کا تو انتظار تھا۔

"جی نہیں شکریہ' آج ڈرائیور نہیں آیا تو میں نے سوچا دس منٹ کی واک ہی تو ہے' تھینک یو" میں نے سہولت سے انکار کر دیا حالانکہ دل چاہ رہا تھا فوراً "اس" چمچماتی کار میں بیٹھ کر حسرت پوری کر لوں۔

"آپ تکلف کر رہی ہیں۔ پلیز بیٹھیے" اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور میں بیٹھ گئی۔

"آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا یہاں۔" وہ اس طرح بات کر رہا تھا جیسے صدیوں سے جانتا ہو۔

"جی ہاں دراصل گھر میں فارغ بیٹھ کر بور ہو گئی سوچا وقت گزاری کے لیے جاب کر لوں' بس اسی لیے۔" میں نے وضاحت پیش کی' وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"میں بھی اسی روٹ سے آفس جاتا ہوں' یہ میرا لنچ بریک کے بعد کا ٹائم ہے۔" وہ مسکرانے لگا۔

"جاب کرتے ہیں آپ؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"جاب دیتا ہوں' آئی مین میری اپنی فیکٹری ہے' سدیر شاہ نام ہے میرا شاہ انڈسٹریز کا مالک۔" اس نے اپنا تعارف کروایا میں تو جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی۔

"آپ برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں؟" وہ سنجیدہ تھا "جی کہیے؟"

"آپ کی پرسنالٹی بہت زبردست ہے' ڈریسنگ اسٹائل جسٹ اوری تھنگ۔۔۔ مجھے آپ کو دیکھ کر یوں لگا جیسے آپ کی ہی تلاش تھی۔ اسی لیے لفٹ دی۔ مجھ سے دوستی کریں گی۔" وہ واقعی سنجیدہ تھا اور میں یک دم کوئی سے مورنی بن گئی۔

"دوستی تو ہو گئی۔" میں ہنس دی اور سدیر شاہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

ایک' دو' تین۔۔۔ پورے پانچ سوٹ تھے' اور آج پانچواں دن تھا' پانچ دنوں میں سدیر شاہ روز مجھے لفٹ دیتا تھا اور میں اماں کی باجی کے بنگلے کے باہر اتر جاتی تھی' پھر جوں ہی وہ کالونی کا موڑ مڑتا' میں بھی اپنی گلی کی طرف بڑھ جاتی۔

میرے لیے یہ پانچ سوٹ' یہ سن گلاسز اور یہ میک اپ کا سامان مور کے پر تھے جنہیں اپنے سیاہ پروں میں لگا کر میں مورنی بننے جا رہی تھی۔

اپنے چھوٹے سے گھر کی چارپائی پر لیٹی میں آسمان میں اپنی قسمت کا ستارہ تلاش کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ بس چمکنے والا تھا۔

"خواب میرے تعاقب میں ہی تو ہیں' سدیر شاہ میرا تعاقب کرتا ہے' مجھے لفٹ دیتا ہے' مجھ سے دوستی کرتا ہے۔۔۔ یہ خواب ہی تو ہیں جو میرا پیچھا کرنا چاہتے ہیں۔" میں خوش تھی۔ سدیر شاہ کو دھوکہ دے کر' یہ دھوکہ میری قسمت بنانے جا رہا تھا۔

"انجام کیا ہو گا زویا الیاس؟" دل خوفزدہ ہوا۔

"وہی جو میں نے سوچا ہے' وہ جب میری محبت میں گرفتار ہو جائے گا تو میں "کچھ بھی" ہوں' اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا' کوئی بھی بہانہ بنالوں گی۔" میں ایک منصوبہ بنانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"نہیں سدیر' میرے گھر والے کبھی نہیں مانیں گے' آؤٹ آف فیملی شادی کا تو تصور ہی نہیں ہے۔۔۔ اتنے براڈ مائنڈڈ ہونے کے باوجود اس معاملے میں میرے ڈیڈ بہت پرانے خیالات کے ہیں' مام بھی نہیں مانیں گی کیونکہ وہ تو میرے لیے اپنے امریکہ پلٹ بھانجے کا سوچے بیٹھی ہیں تو امپاسبل۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟" وہ جیسے گہری سوچ میں گم تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت تھی اور چہرے پر اپنی محبت کو کھو دینے کا تفکر۔ میری آنکھوں میں خوشی تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ میں ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

"ہم کورٹ میرج کرلیں گے۔" اس کے منہ سے میں یہ ہی تو سننا چاہتی تھی۔

"کورٹ میرج؟؟؟؟" میں نے حیران ہونے کی ایکٹنگ کی۔ سدیر کے چہرے پر طنزیہ سی ہنسی ابھری۔ مجھے حیرت ہوئی۔ شاید وہ مجھے میرے اسٹیٹس کے مطابق بولڈ سمجھ رہا تھا اور میرے اس طرح ری ایکٹ کرنے پر اسے شک ہو سکتا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا۔

"ہاں ہو تو سکتا ہے۔" میں نے سن گلاس زبالوں پر چڑھا لیے۔

"تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔" اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔ میں نے بڑی خوبصورتی سے آنکھوں کا میک اپ کیا تھا۔

"سدیر۔۔۔ یہ کوئی وقت ہے' اس طرح کی باتیں کرنے کا' فی الحال یہ سوچو کہ کرنا کیا ہے؟" میں پریشان تھی مجھے کورٹ میرج کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ جب میں اتنے امیر کبیر شوہر کے ساتھ گھر جاؤں گی تو اماں ابا کا سارا غصہ ہوا ہو جائے گا۔ مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔

"کرنا کیا ہے زویا۔۔۔ کل رات نو بجے تم میری فیکٹری کے گیٹ پر آجانا۔"

"رات نو بجے!" ایک بار پھر میں حیرت سے بولی۔

"ٹو لیٹ؟؟؟؟" وہی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھری۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ اٹس او کے۔۔۔ لیکن رات کو تو کوئی کورٹ نہیں کھلا ہوگا" میں مسکرائی۔

"گڈ۔۔۔ انٹیلی جنٹ۔۔۔ پرسوں صبح تو کھلے گا نا جان'" سدیر شوخ ہوا۔ "کل رات کا کچھ اور پلان کرلیں گے۔" وہ ہنسا تو ہنستا ہی چلا گیا جواباً مجھے بھی مسکرانا پڑا۔

"نہیں سدیر' پرسوں صبح آٹھ بجے۔۔۔ میں بولڈ ضرور ہوں لیکن۔۔۔ تم سمجھ سکتے ہو۔" میں نے دیکھا وہ اثبات میں سر ہلا رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر کچھ اور ہی تاثرات تھے۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تم۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میری غربت زدہ زندگی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔

"کیا لگتا ہے تمہیں؟" میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھرے۔

"یہ ہی کہ تم تھوڑے پرانے خیالات کی ہو' عام سے اسکول میں جاب کرنا' واک کرتے ہوئے گھر جانا اور شادی سے پہلے اور بعد کے خیالات۔۔۔ خیر۔۔۔ ٹھیک ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے' ٹھیک ہے میں کل رات نو بجے آجاؤں گی۔" میں نے اس کا ہر اندازہ غلط ثابت کرنے کی ٹھان لی۔

"اور جب شادی کے بعد میں اماں ابا سے معافی مانگنے آؤں گی تو۔۔۔ سدیر کو میری اصلیت کا علم ہو جائے گا۔" میرے اندر سے آواز آئی۔

"بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی' تب تک شادی ہو چکی ہوگی اور میں بہت سی دولت کی مالکن بن جاؤں گی۔" ایک کمینی سی سوچ نے میرے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

رات کے نو بجے میں کس طرح اس کی فیکٹری کے گیٹ پر پہنچی یہ صرف میں ہی جانتی ہوں' وہاں کوئی نہیں تھا' وہاں کوئی نہیں آیا۔ گیٹ کے چوکیدار نے مجھے ایک خط لا کر دیا تھا' میں نے لرزتے ہاتھوں سے وہ خط کھولا۔

"زویا! میں نہیں آسکوں گا کیونکہ مجھے آنا ہی نہیں ہے' میرا تم سے کورٹ میرج کا کوئی ارادہ ہی نہیں ہے' میں جس کلاس سے تعلق رکھتا ہوں' وہاں کا معیار بہت بلند ہے' شادی بھی میں کسی ایسی ہی لڑکی سے کروں گا۔ تم حیرت سے مت پڑھو۔۔۔ میں سب جانتا ہوں' تمہارے قیمتی کپڑے' جوتے' جیولری' میک اپ یہ سب تمہیں ایک امیرزادی ہی ظاہر کرتے ہیں لیکن یہ سب جس کی اترن ہیں وہ میری بہن ہے اور اپنی بہن کی پسند کو اور کپڑوں کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں' جس گھر کے باہر تم اترتی رہی ہو' وہ میری اسی بہن کا گھر ہے۔ میں چاہتا تو آج تم پر یہ سب ظاہر کیے بغیر "کچھ بھی" کرسکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کی زندگی برباد ہو زویا! عزت ایک سیکنڈ میں مٹی میں مل سکتی ہے لیکن اسے بنانا اور قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔"

"مور کے پر لگا لینے سے کبھی کوئی کوا مور نہیں بن سکتا۔۔۔" میں نے خط کو مٹھی میں دبوچ لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ مارا ہو' بے عزتی اور تذلیل کا احساس مجھے مارے دے رہا تھا' لیکن میں اس کی مشکور تھی' اس نے وقت گزاری کے لیے مجھ سے دوستی تو کی لیکن وہ اس سے آگے نہیں بڑھا بلکہ مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا' میں واپس ہوگئی۔

صبح کی پہلی کرن میرے چہرے سے ٹکرائی تو پیپل کے درخت پر بیٹھے کوے نے بھی شور مچانا شروع کردیا۔ میں نے اس سے نظریں چرالیں۔

"زویا۔۔۔ آج اسکول نہیں جانا کیا' جلدی کر۔" اماں کی آواز باورچی خانے سے سنائی دی۔

"نہیں اماں' آج چھٹی کروں گی' کل جاؤں گی۔" میں نے چپل پاؤں میں اڑسی اور اندر کی طرف بڑھ گئی۔

"چل اچھا ہے' ویسے بھی آج تم دونوں بہنوں کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں' دونوں بھائی چمڑے کی فیکٹری میں کام کرتے ہیں' دس پندرہ ہزار مہینے کا کما لیتے ہیں' اچھا ہے نا ایک ہی گھر میں رہو گی تو سکھ رہے گا ایک دوسرے کا خیال رکھو گی۔" اماں کے لہجے میں خوشی تھی۔

"جی اماں۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"خواب ہمارے پیچھے بھاگتے ہیں یا ہم خوابوں کے پیچھے۔۔۔" میں پھر الجھ رہی ہوں لیکن یہ سمجھ گئی ہوں کہ مور کے پر لگا لینے سے میں مورنی بن نہیں سکتی۔۔۔ میں زویا الیاس ہوں' پیپل کے درخت کی کوی۔۔۔" میں نے سر جھکا دیا۔ یہ ہی سچ تھا' ہاں۔

☼ ☼

ناولٹ

"دادو یہ کیا! آپ پھر رونے لگیں۔ اس لیے میں آپ کو نہیں سنا رہی تھی آج کا اخبار" ایمل کی دادو کو مطالعے کی بہت پرانی عادت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے گھر دنیا بھر کے میگزین' رسالے اور اخبار بکثرت پائے جاتے' لیکن اکثر اخبارات میں لکھی دردناک خبریں پڑھ کر ان کا دل بھر آتا۔ اخباروں میں بڑھا چڑھا کے بیان کی گئی خبریں اور رسالوں میں لکھاری بہنوں کے تلخ تجربے ان کا دل مسوس کر رکھ دیتے۔

آج کل ان کی آنکھوں میں تکلیف تھی۔ سو انہوں نے ایمل سے آج کا اخبار سنانے کا کہہ دیا تھا اور حسب معمول صرف دو تین شہہ سرخیاں سن کر ہی ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ ایمل فوراً" اخبار پھینک کے ان کے پاس جا بیٹھی۔

"میں نہیں پڑھ رہی آگے۔" وہ دادی سے لپٹ گئی۔

"نہ پتر اس میں تیرا کیا قصور بس سوہنے وطن کے یہ حالات مجھ سے برداشت نہیں ہوتے تو موئے ہنجو راہ پا جاتے ہیں۔" نم لہجے میں کہتی دادو ایمل کو بھی اداس کر گئیں۔

"مگر ہم رونے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں دادو۔ مجھے تو اب ہر وقت ڈر سا لگا رہتا ہے کہ کہیں ہمارا ملک ختم نہ ہو جائے اور ہمیں پھر سے غلامی کی بیڑیاں پہننی پڑیں۔" نہ صرف اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ بلکہ اس کی چمکدار کالی آنکھوں میں بھی اداسیاں گھلی تھیں۔

"نہ ایمی بچے اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہوتے' اللہ ہمارے دیس کی حفاظت کرے گا۔ پھر یہ ملک تو بنا ہی قائم رہنے کے لیے ہے پتر۔ معجزہ ہے میرے سوہنے رب کا یہ پیارا پاکستان" انہوں نے ہاتھ باندھ کے جیسے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور دوبارہ بولنے لگیں۔

"میں تو ان دنوں کو یاد کر کے ہی کانپ جاتی ہوں۔ بہت چھوٹی تھی میں پر پھر بھی بہت کچھ یاد ہے مجھے۔" وہ ذرا دیر کے لیے رکیں پھر بولیں۔

"ایک طرف مسلح انگریز' امیر کبیر بنیے اور انتہا پسند ہندو' تو دوسری طرف تن' من' دھن سب قربان کر دینے کے جذبے سے سرشار اور صرف اللہ کی ذات پہ ایمان رکھے ہوئے نہتے مسلمان بھلا کون سوچ سکتا تھا کہ پاکستان بنے گا؟ مگر پاکستان بنا اور پوری شان سے دنیا کے نقشے پہ جگہ پا گیا لاکھوں مسلمانوں کو گھر بار چھوڑنا پڑے' کتنے ہی جانوں سے گئے۔ عزتاں تار تار ہوئیاں مگر پاکستان بنا۔ اسے معجزہ نہیں تو کیا ہے؟" انہوں نے شفقت سے اس کے کالے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک جذب سے کہا۔

"پھر بھی دادو' پتا نہیں کیوں میں اب مایوس ہونے لگی ہوں اور پھر دیکھیں نا' کرپشن' تعلیم اور صاف پانی جیسے مسائل کے ساتھ اب دہشت گردی سے بھی نبرد آزما ہے پاکستان اور پاک آرمی۔ پہلے تو پڑوسی کے حملوں سے ڈرے رہتے تھے ہم۔ مگر اب تو گھر کے اندر ہی حملے کا ڈر لگا رہتا ہے۔" وہ بے دلی سے بولی۔

"پھر بھی ایمی' مایوس نہیں ہوتے۔ مایوسی تو کفر ہے۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے اور پھر ہمارے سپاہی۔" دادو کی آنکھوں میں چمک اور لہجے میں فخر سا بھر گیا۔ ایمل کو بے اختیار یونیفارم میں مسکراتا سراپا یاد آیا۔

"ہمارے سپاہیوں کے دل اللہ اور اس کے رسول کے ایمان کی روشنی اور جرات سے لبریز ہیں۔ وہ کبھی اپنے وطن کی حفاظت میں نہیں چوکتے۔ میں اس بات کی گواہ ہوں پتر۔ مجھے فخر ہے تیرے دادا کی بیوہ ہونے پر اور اللہ لمبی حیاتی دے علی کو۔ جب تک ایسے جیالے فرزند ہیں میرے وطن کے پاس کوئی اس کی طرف بری نگاہ بھی نہیں ڈال سکتا ہاں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو ایمل بھی مسکرا دی۔

"چل اب ذرا مجھے وہ گانا سنا دے۔ بڑے دن ہوئے تجھے گنگنائے ہوئے۔" دادو نے فرمائش کی تو ایمل لہک لہک کے گانے لگی۔

"میرے ڈھول سپاہیا' تینوں رب دیاں رکھاں
تینوں رب دیا رکھاں"

دادو بھی مسکراتے ہوئے سر دھننے لگیں۔
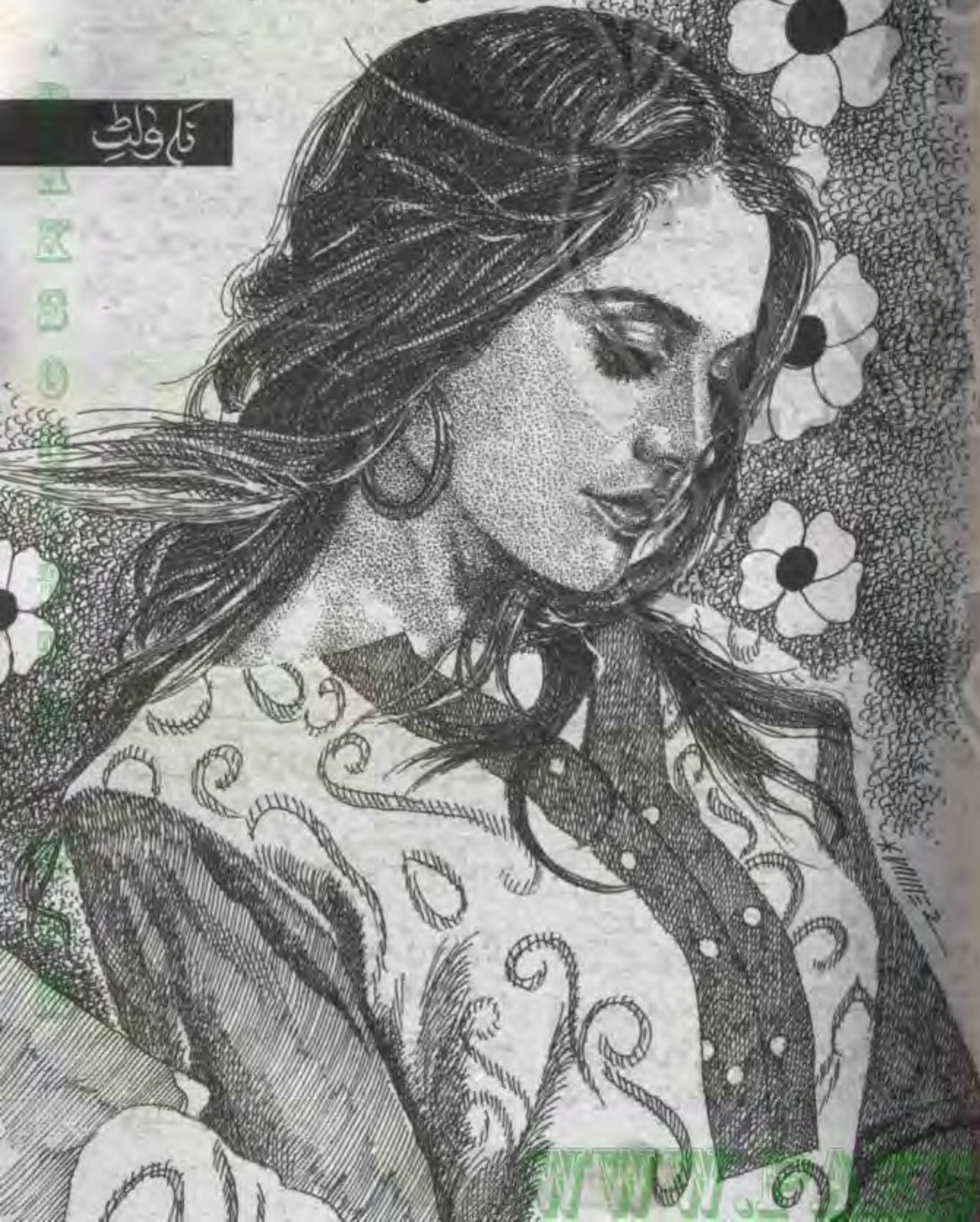
دو گھنٹے لگاتار برسنے کے بعد بالآخر بارش تھم ہی گئی کچی مٹی کی سوندھی خوشبو دل کو بے پایاں سکون بخش رہی تھی۔ چرند پرند بارش رکتے ہی غول در غول چرنے چگنے نکل پڑے۔ ان کی خوب صورت بولیاں فضا میں بہت ہی پیارے سر بکھیر دیتیں۔

ایمل گھر کے چھوٹے سے صحن کی ڈیوڑھی کے ساتھ لگے آم کے درخت پہ اپنے من پسند رسالے میں سر دیے جھولا جھول رہی تھی۔ سامنے ہی اینٹوں کے بنے 'چولہے پہ اماں اس کی فرمائش پہ پیاز کے پکوڑے تل رہی تھیں۔ برآمدے میں تخت پہ بیٹھی دادو تسبیح کے دانے گراتی مسلسل اس پہ کچھ پھونک رہی تھیں۔

معاً" گھر کا بیرونی دروازہ کھلا اور ابا اندر آئے۔ ایمل انہیں دیکھتے ہی رسالہ جھولے پہ ڈال کر ان کی طرف بھاگی۔

"ابا آگئے۔" وہ ان کے کاندھے سے جھول گئی۔

"جیتی رہ میری بچی۔" انہوں نے بھی اس کے گرد بازو پھیلا دیے۔

"ابھی بڑی ہو گئی ہے اب تو۔ یوں بندر کی طرح نہ لٹک جایا کر باپ سے 'جا پانی پلا بابا کو۔" اماں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"نہ نعیمہ میری بچی کو کچھ مت کہنا۔ پورے دو دن بعد تو اس کی شکل دیکھی ہے میں نے۔" وہ زمینوں کے کام سے پورے دو دن شہر میں گزار کے آئے تھے۔

"ابا میری کتابیں لائے؟" میں نے پوچھا۔

"اسے لے بھول سکتا تھا بھلا۔ سارا سامان لے آیا ہوں اپنے بچے کا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ بھاگ کے ان کے لیے پانی لے آئی۔

"اور ہاں کرم دین نے باغ والے گھر کی صفائی بھی کروا دی ہے۔ آج تختہ سیاہ وغیرہ بھی لگا دے گا۔ تو جب چاہے بچوں کو پڑھانا شروع کر سکتی ہے۔" انہوں نے مزید بتایا۔

"سچ بابا۔" وہ جھوم اٹھی۔

"ہاں بیٹا باقی جو کام رہ گیا ہے علی آجائے تو دیکھ لے گا۔ تو فی الحال اپنے تئیں شروع کر لے۔ باقی اللہ مالک ہے۔ رجسٹریشن وغیرہ بھی ہو جائے گی۔"

"نہ اب اس ڈرامے کی کیا تک ہے۔ آپ بھی بچی کو سمجھانے کی بجائے الٹا اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ ایف اے کر چکی۔ اب بی اے کا داخلہ۔ اوپر سے اسکول کی ذمہ داری۔ صحت تو دیکھیں اس کی۔" اماں کو نرم و نازک سی ایمل کی فکر ہوئی۔

"اماں کچھ نہیں ہوتا مجھے پھر اس میں غلط بات کیا ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایک ہی اسکول ہے۔ لڑکیوں کا جہاں سارا سال استانیاں نہیں آتیں بلکہ مال مویشی بندھے رہتے ہیں۔ جو کچھ پیسے والے ہیں وہ تو شہر سے پڑھا لیتے ہیں بچیوں کو۔ مگر دوسرے۔۔۔ میرا اسکول ان ہی غریب بچوں کے لیے ہو گا اماں۔ کل کچھ بن جائیں گے تو دعا کریں گے تیری بیٹی کے لیے۔"

"ہاں 'تو تو جیسے وزیر اعظم بن گئی ہے پڑھ لکھ کر۔" اماں نے پکوڑے ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ تو ایمل کے ساتھ ماسٹر امیر علی بھی مسکرا دیے۔

"ہاں تو وزیر اعظم سے تو بڑا ہی کام کر رہی ہوں نا' اپنے وطن کے لیے کیوں ابا؟" اس نے ابا سے تائید چاہی۔

"ہاں پتر' بے شک۔ تعلیم پھیلانا تو میرے پیارے نبیؐ کا شیوہ تھا۔ اس سے عظیم کام بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ تو اپنی ماں کی بات کو دل پہ نہ لے۔ بس بسم اللہ کر جلدی سے۔" ابا کی جگہ دادو نے اس کی ہمت بندھائی۔ ایمل جھٹ سے ان سے لپٹ گئی۔ اس کی حرکت پہ ابا کے ساتھ اس بار اماں بھی مسکرائے بنا نہ رہ پائیں۔

☼ ☼ ☼

گرمیوں کا موسم اپنے عروج پر تھا آج کل۔ گیارہ بجے کے بعد سے ہی گاؤں کی گلیاں ویران ہو جاتیں۔ چرند پرند بھی دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لیے پیڑوں میں جا چھپتے۔ ایسی دوپہریں ہمیشہ ایمل کے لیے قیامت بن جایا کرتیں۔ دادو اور اماں دونوں ہی دوپہر کو قیلولہ کرتیں۔ اور ابا زمینوں سے شام تک ہی لوٹ پاتے سو وہ اکیلی جھولا جھولتی اپنے پسندیدہ رسالے پڑھتی رہتی اس کے ابا ریٹائرڈ ماسٹر تھے۔ گردوں کی بیماری نے ان کو جلد ہی پنشن لینے پہ مجبور کر دیا اور پنشن کے بعد وہ مزارعوں کے ساتھ زمینوں کی دیکھ بھال کرتے۔ وہ تھی بھی اکلوتی۔ تبھی رسالے پڑھ پڑھ کر بور ہو جاتی۔ اوپر سے مشکل یہ تھی کہ رسالے اس کے گاؤں میں نہیں ملتے تھے۔ بلکہ اس کا خالہ زاد علی سید جو اس کا منگیتر بھی تھا۔ ہمیشہ لاہور سے اس کے لیے لے کر آتا تھا۔ اس بار وہ رسالے نہ بھیج سکا تھا۔ سو آج دوپہر کاٹنا اسے محال ہو رہا تھا۔

وہ زور زور سے جھولا جھلاتی اپنے بے بسی پہ تلملا رہی تھی کہ اسے بائیک کا شور سنائی دیا۔ وہ ایک ہی جست میں جھولے سے نیچے اتری تو توازن برقرار نہ رکھ پائی اور منہ کے بل گر پڑی۔ اس کی چھوٹی سی ناک سرخ ہو گئی اور پیشانی سے ہلکا ہلکا خون رسنے لگا۔ مگر وہ اپنی پروا کیے بغیر دوپٹے سے منہ رگڑتی تیزی سے ڈیوڑھی کی طرف بھاگی۔ بائیک رک چکی تھی۔ اس نے کواڑ گرائے اور ایک دروازہ کھول کے تقریباً" لٹکتی ہوئی باہر جھانکنے لگی۔ وہ اس کے خیال کے عین مطابق علی سید ہی تھا۔

"اب کیا بندر کی طرح دروازے سے لٹک کر مجھے دیکھتی رہو گی یا یہاں بھی آؤ گی۔" اس نے بائیک پہ لٹکا شاپر اٹھا کے اپنے سامنے رکھتے ہوئے کہا وہ ابھی بھی بالکل ویسے ہی بیٹھا تھا۔ جیسے بائیک اسٹارٹ کر کے فورا" چلا جائے گا۔ ایمل کچھ حیران ہوتی باہر چلی آئی۔

"مجھے یوں اچانک دیکھ کر حیران ہو؟" اسے محویت سے تکتے اپنے قریب آتا دیکھ کر علی سید نے شریر لہجے میں پوچھا۔

"نہیں 'بہت خوش ہوں۔" ایمل کے لہجے کی سچائی اس کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔ علی سید کو اس کا یہی اعتماد تو پسند تھا۔

"حیران اس لیے ہوں کہ کیا اندر نہیں آؤ گے؟" ایمل نے تصحیح کی تو وہ مسکرا دیا۔

"ہاں شہر سے سیدھا گاؤں پہنچا تو اڈے سے یہ بائیک کرائے پہ لے لی تاکہ پہلے تمہارے پاس آ سکوں۔ تمہارے رسالے نہیں بھجوا سکا تھا نا۔" معذرت خواہانہ لہجے میں ۔۔۔ کہہ کے اس نے شاپر ایمل کی طرف بڑھا دیا۔

"تم آگئے علی بس یہی کافی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے شاپر تھام لیا۔

"کچھ دیر تو رکتے۔" ایمل کے شرگیں لہجے پہ وہ دل و جاں سے نثار ہوا۔

"کیوں پیسے دینے ہیں کیا؟" وہ شریر ہوا۔

"تم نے کب لینے ہیں؟" وہ بھی اس کے انداز میں بولی تو وہ قہقہہ مار کے ہنس دیا۔

"نہیں ابھی تم اندر جاؤ۔ شام کو چکر لگاؤں گا۔" اس نے بائیک اسٹارٹ کی۔

"ٹھیک ہے۔" ایمل افسردہ ہوئی اور واپس مڑنے لگی۔

"سنو۔" علی کے پکارنے پہ اس نے یونہی سر گھما دیا۔

"اپنا خیال رکھنا۔" نرمی سے کہتا وہ زن سے بائیک اڑا لے گیا تھا۔ گلی میں کھلنے والی چھوٹی سی کھڑکی سے جھانکتی دو بھوری آنکھوں نے موتی گرائے تھے۔ کتنے ہی منظر ان آنکھوں کے پردے پر واضح ہونے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

موسم بے حد خوشگوار تھا بہار کی آمد آمد تھی۔ پودے جیسے اک نئی زندگی سے آشنائی حاصل کر رہے تھے۔ چند دن پہلے تک سوکھی جھاڑ جھنکار کا منظر پیش کرنے والے چھوٹے بڑے پودے اب سرسبز و شاداب ہو کے جیسے دل و نظر تسخیر کرنے پہ آمادہ تھے۔

نہر کنارے لگے آم کے گھنے پیڑ کی ایک موٹی سی جڑ جو زمین سے قدرے اوپر ابھری ہوئی تھی' پہ ڈیرہ جمائے وہ مزے سے نہر کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں چلا رہی تھی اور نہر کے اس پار لگے مالٹے کے باغ پہ جمی اس کی

خوب صورت بھوری آنکھیں حسرت و یاس کا نمونہ بنی ہوئی تھیں۔
"ہاؤ۔" اچانک اور تیز پکار پہ وہ ڈری اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی۔ تبھی غڑاپ سے نہر کے اندر جا گری۔ کنارے پہ کھڑا مہر علی ہنس ہنس کے دہرا ہو گیا۔ نہر کے کنارے پانی کی سطح بے حد کم تھی۔ وہ غصے سے پھنکارتی باہر نکل آئی۔ اور جلدی سے دوپٹہ جو کسی شاخ سے اٹک کے وہیں رہ گیا تھا۔ کھول کے اپنے گرد پھیلا دیا۔
"تجھے شرم نہیں آتی مہیا۔ اب میں گھر کیسے جاؤں گی؟" اسے اپنے کپڑے گیلے ہونے کا کس قدر افسوس تھا۔ یہ اس کے لہجے سے ظاہر تھا۔ مہر علی نے فوراً دونوں کان پکڑ لیے۔ اس کی اس ادا پہ تراشیدہ گلابی ہونٹوں پہ بہت ہی دلکش مسکان آ ٹھہری۔
"کان نہ پکڑتا نا تو آج تیری بے بے سے شکایت کردینی تھی مجھے۔" مہر النساء نے اسے دھمکی دی۔
"شوق سے کردے۔ میں کوئی تیری طرح ڈرپوک تھوڑی ہوں۔" مہر علی شریر ہوا۔ وہ چپ رہی۔
"پتا نہیں میری بے بے کو تجھ میں کیا نظر آیا۔ جو مجھ جیسے کڑیل جوان کے لیے تجھے چن لیا۔" اسے خاموش دیکھ کر مہر علی نے اسے مزید چڑایا۔
"تو تو خود چن لے نا کوئی بہادر و ہٹی اپنے جیسی یا حکم کر میں خود تیرا ویاہ کرادوں۔" وہ واقعی چڑ گئی۔
"اچھا ایسا کر سکتی ہے تو۔" مہر علی کی کالی چمکدار آنکھوں میں کیا تھا۔ وہ نہ سمجھ سکی۔ تبھی نظر جھکائے ہوئے بولی۔ "ہاں کر سکتی ہوں۔" اس کی آواز کمزور تھی۔
"پھر تو کیا کرے گی میرے بغیر؟ اس پنڈ میں کوئی اور تو ہے نہیں میرے جیسا۔" وہ مغرور ہوا۔
"کتنا فخر ہے تجھے" مہر النساء نے مٹی کے کچھ چھوٹے ٹکڑے اٹھا کر پانی میں پھینکتے ہوئے کہا۔
"تو کیا تجھے مجھ پہ مان نہیں ہے مہو۔" مہر علی نے سوال کیا۔
"مان کا تو پتا نہیں مگر۔۔۔" بولتے بولتے وہ ایک دم خاموش ہوئی۔ مہر علی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"مگر تیرے بغیر میں رہ نہیں سکتی مہیا۔" تیزی سے اعتراف کرتی مہر النساء نے اسے نہر میں دھکا دے کر بدلہ چکایا اور چھلاوے کی طرح یہ جا وہ جا۔
پانی میں گرا وہ دیر تک خیالوں ہی خیالوں مہو کے اعتراف سے سکون پاتا رہا۔

☼ ☼ ☼

ایمل کا اسکول رجسٹرڈ ہو گیا تھا اور علی نے اس معاملے میں اس کی بے حد مدد کی تھی۔ وہ دل سے اس کی مشکور تھی۔
"تھینک یو سو مچ علی اگر تم نہ ہوتے تو شاید میرا خواب کبھی تعبیر نہ پا سکتا۔" علی واپس جا رہا تھا کل سو شام کے وقت اس سے ملنے چلا گیا۔ ایمل نے اس کا شکریہ ادا کرنے میں ذرا دیر نہ لگائی تھی۔
"یار منگیتر ہو میری، تمہارے لیے اب اتنا تو میں کر ہی سکتا ہوں۔" بلکہ ابھی تو اسٹارٹ ہے۔ تمہارے سارے کام پھر میں نے ہی کرنے ہیں۔ کب تک تھینک یو، سوری کرتی رہو گی۔" شرارت سے کہتا علی اسے اپنے بے حد قریب محسوس ہوا۔
"اچھا مثلاً" کون سے کام؟" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔
"مثلاً" شادی کے بعد بائیک پہ بٹھا کے پورے گاؤں کی سیر کراؤں گا۔" ایمل ہنس پڑی۔
"اور اسی طرح تمہارے رسالے بھی لاتا رہوں گا۔" علی کے لہجے میں سعادت مندی تھی۔ ایمل ہنستی رہی۔
"اور آم کے درخت سے تازہ آم بھی میں ہی توڑ کے دوں گا۔"
"بس بس، تھک جاؤ گے اتنے کام بہت ہیں۔" ایمل نے اسے روکا۔
"نہیں یار میں نہیں تھکتا بس تم حکم کرو میں تعمیل کروں گا۔" اس نے دایاں ہاتھ دل پہ رکھ کر جیسے قسم کھائی۔
"اچھا چلو تو پھر ایسا کرو تم یہیں رک جاؤ۔ مجھ سے نہیں کٹتے یہ چار چار، چھ چھ ماہ تمہارے بغیر۔۔۔ میرے ساتھ میرا اسکول چلا لینا مگر یہ آرمی کی جاب چھوڑ دو۔" علی یکدم ہی سنجیدہ ہوا۔
"اٹ از ناٹ پاسبل ۔۔۔" مضبوط لہجے میں کہتا علی ایمل کو بے حد اچھا لگا۔
"بس ہو گئے ختم۔ میری اتنی سی بات نہیں مان سکتے اور کہتے ہو حکم کرو۔" ایمل نے اسے مزید چڑایا۔
"تمہارے لیے سب کچھ ایمی مگر تم سے پہلے وطن عزیز۔ تم جانتی ہو آرمی میرا عشق ہے۔ وطن کے لیے جان چلی جائے تب بھی مجھے افسوس نہ ہو گا۔ تم سے دوری بھی سہہ لوں گا مگر اپنے عشق کو کیسے چھوڑ دوں ایمی۔" وہ جذباتی ہو گیا۔
"اچھا بابا نہ چھوڑو۔ میں تو مذاق کر رہی تھی، تم سیریس ہو گئے۔" ایمل نے ہنستے ہوئے کہا۔ تو وہ بھی پُرسکون ہو گیا۔
"چلو ذرا آم توڑو۔ دیکھو تو کتنے رسیلے ہو رہے ہیں۔" ایمل نے زبان باہر نکالتے ہوئے کہا۔ تو علی ہنس دیا۔

☼ ☼ ☼

"پر ایمی پتر۔ تو خود سوچ یہ نماڑی (کمزوری) دھی ذات پڑھ لکھ کر کیا کرلے گی۔ کرنی تو اس کو گھر داری ہی ہے اول آخر۔ تے فیر کیوں دماغ کھپاوے۔" آمنہ مائی نے لسی کا گلاس ایمل کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ایمل نے سوچا تھا کہ اسکول شروع ہوتے ہی گاؤں کے لوگ دھڑا دھڑ اپنی بچیوں کو لے کر آئیں گے۔ مگر سب کچھ الٹا ہو گیا۔ اسے اب اندازا ہوا اصل حقیقت تو یہ تھی کہ والدین ہی بچیوں کی تعلیم کی اہمیت سے نابلد تھے۔ وہ بس گھریلو کام کاج تک ہی محدود رکھنا چاہتے تھے بچیوں کو۔ سو اب اس نے صبح سے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی برین واشنگ کا مشن شروع کر رکھا تھا اور مائی کے گھر تک آتے آتے تقریباً" پندرہ گھروں کو وہ راضی کر آئی تھی بچیوں کی تعلیم کے لیے مگر مائی آمنہ نے تو نئے نئے نقطے نکال کر اس کے سر میں درد کر دیا تھا۔
"مائی آمنہ یہ تو بس ہماری سوچ ہے۔ ورنہ ہمارا خدا اور ہمارا رسولؐ تو یہی حکم فرماتے ہیں کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پہ فرض ہے چاہے اس کے لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔" اس نے وہی دلیل دہرائی جو دیگر گھرانوں میں اس کی مددگار ثابت ہوئی تھی۔
"اب خود سوچیں اس زمانے میں عرب سے علم کی تلاش میں چین آنا بھلا کہاں ممکن تھا۔ مگر ہمیں صرف یہ بات سمجھانے کے لیے اتنی بڑی مثال دی گئی کہ علم کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا سادہ سا مطلب تو یہی نکلتا ہے نا کہ علم کے لیے ہر حد سے گزر جاؤ۔ پھر خدا اور رسولؐ کا کہا ماننے میں ہمیں ہی عار کیوں، ہم تو ان کی امت ہیں۔ ہمیں تو اس معاملے میں دوسری قوموں سے آگے ہونا چاہیے تھا۔ مگر ہمارے زوال کا سبب ہی یہی ہے کہ ہم اسلام کے اصولوں سے روگردانی کرتے ہیں۔ اور اس پہ فخر بھی کرتے ہیں۔" مائی آمنہ نے سر دوپٹے سے ڈھانپ لیا۔ آنکھوں سے نمکین پانی بہنے لگا۔ ایمل بولتی رہی۔
"پھر یہ بھی تو دیکھیں مائی آمنہ کہ آپ کی بچیوں کو تو چین بھی نہیں جانا صرف یہاں قریب ہی ہمارے باغ تک آنا ہے۔ کتابوں کا سارا خرچہ بھی میں اٹھاؤں گی تو پھر ایسی کاہلی کیوں خدا کا حکم ماننے میں۔" مائی آمنہ کے ساتھ بیٹھی گاؤں کی دو تین اور عورتوں نے بہت محبت سے اس کی خوب صورت چہرے کو دیکھا۔
"اللہ تجھے اجر دے ایمی پتر۔ میں خود کل سے اپنی تینوں بچیوں کو اسکول چھوڑنے آؤں گی۔" مائی آمنہ نے آنسو پونچھتے ہوئے دل گیر لہجے میں کہا تو ساتھ بیٹھی عورتوں نے بھی اسے مژدہ سنا دیا۔
آج روشنی کے اس سفر نے اسے واقعی تھکا دیا تھا مگر گھر لوٹتے وقت بے پایاں خوشی کا احساس اس کے دامن گیر تھا۔ اس کے لیے یہی خوشی بہت تھی کہ وہ

اپنے وطن کے کسی کام آرہی تھی۔ اس کی زندگی فضول نہیں تھی۔ بلکہ اپنے وطن اپنے گاؤں کے لیے بہت ہی کار آمد ہونے جارہی تھی۔ آج وہ خلاف معمول دوپہر کے وقت بھی سوگئی تھی پورے سکون کے ساتھ۔

☼ ☼ ☼

نیند مہرالنساء کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ جتنا ماضی کو ذہن سے جھٹکتی اتنا ہی وہ اس کی نگاہوں کے سامنے اپنے اوراق کھولنے پہ مصر ہوتا۔ یادیں کسی خوب صورت بیل کی طرح اس کی روح اور جسم کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے بے چین رہتیں۔ وہ کچھ دیر یادوں سے جنگ کرتی رہی بالآخر اس نے خود کو یادوں کے بہتے دھاروں کے حوالے کردیا تھا۔ اس کی خوب صورت براؤن آنکھیں جن کی چمک ماند پڑچکی تھی۔ نم ہونے لگیں۔ رات آہستہ آہستہ اپنے اختتام کی جانب رواں تھی اور مہرالنساء اپنے جیون کی حسین ترین یادوں کے سفر پہ۔

"مبارک ہو مہرا بیٹا دیا ہے تجھے سوہنے رب نے۔" مصلے پہ بیٹھا خشوع و خضوع سے اپنے رب کے سامنے نہ جانے وہ کب سے گڑگڑا رہا تھا۔ جب دائی زلیخا نے باہر آکے اسے خوشخبری سنائی۔ مہرعلی فوراً سجدے میں گر گیا اللہ نے اس کی دعائیں قبول کیں۔ کچھ ہی دیر میں اس کی بے بے سفید کپڑے میں ننھا سا وجود اٹھا کے اس کے پاس لے آئیں ــــ وہ ہو بہو مہرعلی کی تصویر تھا۔ وہی کالی سیاہ آنکھیں، کھڑی ناک اور لبوں کے عین نیچے خوب صورت سیاہ تل، بچہ جو پہلے رو رہا تھا۔ مہرعلی کے پاس آتے ہی چپ ہوگیا اور پوری آنکھیں کھول کے جیسے باپ کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ مہرعلی نے بیٹے کی پیشانی پہ بوسہ دیا۔ اور پھر خود ہی اس کے کان میں اذان دی۔ بیٹے کو ماں کے حوالے کرکے وہ اندر مہرالنساء کے پاس چلا آیا۔

"مبارک ہو مہو۔" اس نے دھیرے سے اس کا خوب صورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔ مہو کے پیلاہٹ لیے چہرے پہ ایک دم ہی حیا کی سرخی پھیلنے لگی تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

"آج تو میری زندگی مکمل ہوگئی مہو۔ سچ میں تم نے تو مجھے میری متاع حیات بخش دی۔" اس کے ہاتھ پہ لب رکھتے ہوئے وہ بولا تو مہو پلکیں جھکا گئی۔

"میں نے کل چلے جانا ہے مہو۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہاری طرف سے بے فکر ہوکے جارہا ہوں۔ اب تو میرا شیر آگیا ہے تیرا خیال کرنے۔" وہ شرارت سے بولا تو مہو ہنس دی۔

"ابھی تو میں رکھوں گی اس کا خیال۔ ہاں جب تیرے جیسا تنڈ ہوجائے گا۔ فیر دیکھیں گے۔" مہو نے بھی اس کے ہاتھ پہ اپنی گرفت مضبوط کرلی۔

"تو اداس تو نہیں ہے نا۔" مہرعلی نے پوچھا۔

"کس لیے؟" وہ حیران ہوئی۔

"میرے یوں اچانک جانے پہ۔" وہ فکرمند تھا۔ مہو کو اچھا لگا۔

"نہیں مہرا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں۔ تیری ضرورت مجھ سے زیادہ کسی اور کو ہے۔ اللہ تینوں اپنی امان میں رکھے پر میرے وطن پہ آنچ نہ آنے دینا مہرا" وہ کتنی سمجھدار تھی۔ مہرعلی کو خود پہ رشک سا ہوا۔

"کبھی نہیں مہو، جان بے شک چلی جائے پر وطن کسی کو بری نظر بھی نہ ڈالنے دوں گا۔" مہو کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

شاید کمزوری کی وجہ سے اسے نیند آرہی تھی۔ وہ دھیرے سے اس کی پیشانی چھوتا کمرے سے باہر چلا گیا۔

رات ڈھل چکی تھی، شاید دور کہیں کسی مرغے نے بانگ دی تھی۔ مہرالنساء کو واقعی نیند آنے لگی۔ اس نے بھیگی پلکیں موند لیں اور اس بار اسے یادوں نے بالکل بھی چھیڑنا گوارا نہ کیا۔

☼ ☼ ☼

"علی کے ابی ابو آئے تو آج کہہ رہے تھے کہ اگلے سال گندم کی کٹائی کے بعد بچوں کی شادی کردیں تو کیسا رہے گا؟" نعیمہ! امیر علی کے لیے چائے لائی تو انہیں فارغ پاکے بات چھیڑ دی۔ ورنہ تو وہ ہمیشہ زمینوں کے حساب کتاب میں ہی مصروف رہتے تھے۔

"خیال تو اچھا ہے۔ ویسے بھی اس سال فصل کافی اچھی ہوئی ہے۔ کچھ رقم تو اسکول کے اخراجات میں چلی گئی مگر کچھ پیسے میں نے ابھی بچے کی شادی کے لیے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ اگلی دفعہ بھی کرم کرے گا دھوم دھام سے کروں گا میں اپنی بچی کی شادی۔" ان کے لہجے سے خوشی عیاں تھی۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے پر میں تو جیسے ہی سوچتی ہوں اس بارے میں، میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔ اللہ نے ایک ہی اولاد دی وہ بھی اب اپنے گھر کی ہوجائے گی۔ ہمارا تو گھر خالی ہوجائے گا۔ اللہ نے ہمیں بھی بیٹا دیا ہوتا تو میں بھی بہو لے آتی۔ مگر ـــ"

"نہ نیک بختے ایسے نہیں کہتے۔ اللہ کا شکر ادا کر کہ اس نے تجھے دھی (بیٹی) جیسی رحمت سے نوازا۔ پھر کتنی پیاری بچی ہے ہماری۔ سارا گاؤں تعریف کرتا ہے اس کی۔ تو دل چھوٹا نہ کر بس اللہ سے اپنی بچی کی خوشیوں کی دعا کر۔" امیر علی نے ــــ آرام سے سمجھایا تو وہ بھی اثبات میں سرہلانے لگی۔

"اچھا میں ذرا دیکھوں اماں نے نماز پڑھ لی کہ نہیں۔" وہ اٹھ گئی تو امیر علی اہمل کی شادی اور ان پہ آنے والے اخراجات کے متعلق سوچنے لگے۔

☼ ☼ ☼
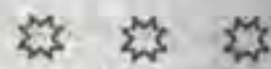
اہمل کا اسکول بہت کامیابی سے چل پڑا تھا اور اب آس پاس کے قریبی دیہاتوں سے بھی بچے آنا شروع ہوگئے تھے۔ علاقے کے چند بااثر لوگ اہمل کے جذبے سے متاثر ہوکے فنڈز اور کتابوں کی صورت میں ان کی مدد کرنے لگے تھے جس سے اہمل کی کافی مدد ہوئی اور اس نے اپنی طرح کچھ پڑھی لکھی لڑکیوں کو بھی مناسب پیسوں میں استانی کے طور پہ رکھ لیا تھا۔ اپنے اسکول میں اس نے اردو اور انگریزی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا بھی باقاعدہ انتظام کررکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں کے ماحول کے سادہ لوگوں نے بہت جلد اس کے خلوص سے بھرے جذبے کو پہچان لیا تھا۔ بلکہ دوسرے دیہاتوں سے اپنے رشتہ داروں کو بھی آمادہ کرلیا تھا لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اور یہی اہمل کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔

ابھی بھی وہ اسکول کے لیے کچھ فرنیچر کی فہرست بنا رہی تھی کہ سویرا چلی آئی۔ وہ ابھی شہر کے کالج میں ایف اے کررہی تھی۔

"کیسی ہو ٹیچر صاحبہ۔"

"ارے سویرا تم کب آئیں یار۔" وہ اٹھ کر اس کے گلے لگی۔

"میں بھی آیا ہوں۔" شرارت سے کہتا علی بھی اس کے سامنے آٹھہرا۔

"ارے علی۔ تم کیوں آئے یار۔" اب کی بار کیوں پہ زور دیتے ہوئے شرارت اہمل نے کی تھی۔ علی اور سویرا دونوں نے قہقہہ لگایا۔

"تم دونوں نے بتایا ہی نہیں آنے کا ورنہ میں اس وقت تمہارے گھر ہوتی۔" اہمل نے ان کے پاس ہی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اس لیے تو کہتا ہوں موبائل رکھ لو۔" علی نے اپنا پرانا مشورہ دہرایا۔

"کیوں رکھوں موبائل۔ ایک ایک ری چارج پہ کتنے پیسے مار لیتے ہیں یہ غیر ملکی کمپنیوں کی سم والے۔ ہمارے لیے تو پی ٹی سی ایل کافی ہے بس اور پھر مجھے خود بھی موبائل کا شوق نہیں ہے۔ ہر وقت بجتا رہتا ہے خوامخواہ وقت کا ضیاع۔" اہمل نے بالکل صاف جواب دے دیا۔

"مگر اہمی، آج کل کے دور میں یہ ضروری بھی بہت ہے۔" سویرا نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں نے کب کہا غیر ضروری ہے مگر یقین مانو مجھے یہ موبائل، ای میلز بالکل پسند نہیں۔ مجھے تو وہی روایتی خط لکھنے والا رابطہ ہی اچھا لگتا ہے۔" اہمی کہاں ہار ماننے والی تھی۔ علی نے بے بسی سے اسے دیکھا

تھا۔

"تم ہمارے لیے لے لونا ہم سے نہیں لکھے جاتے یہ لمبے لمبے خطوط۔" سویرا نے بھائی کی طرف اشارہ کرتے آنکھ دبائی تو ایمل مسکرادی۔

"اچھا دعوے تو بہت کرتے ہو آپ لوگ اور اب میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔" ایمل نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا چھوڑو اس بات کو اگر لسٹ بنالی ہے تو دے دو۔ میں کچھ بندوبست کرلوں۔" علی نے اداس لہجے میں کہتے ہوئے بات بدل دی۔

ایمل نے فہرست کے کاغذ پہ ایک نظر ڈالی اور پھر پین سے کچھ لکھ کر علی کی طرف بڑھادی۔ علی وہ لسٹ لیتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلتے ہو۔" ایمل حیران ہوئی۔

"ہاں اماں کو بھی کچھ سامان کی ضرورت ہے وہ بھی لانا ہے۔" علی سادہ لہجے میں کہتا باہر نکل گیا۔

"تم نے میرے بھائی کو اداس کردیا۔" سویرا نے اس کے گلے لگتے ہوئے گلہ کیا۔

"ڈونٹ وری وہ اداس ہونے والی چیز نہیں ہے۔" ایمل نے مسکرا کر اسے مطمئن کیا وہ بھی مسکرادی اور باہر آکر بھائی کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر وہ واقعی حیران رہ گئی۔ نا سمجھی سے بھائی کو تکتے اس کے ساتھ بائیک پہ جا بیٹھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ایمل نے اس فہرست میں ایک اور چیز کا بھی اضافہ کردیا تھا۔ اس نے علی کی بات مان لی تھی۔

☼ ☼ ☼

ملک میں اچانک زور پکڑنے والی دہشت گردی نے تمام پاکستانیوں کی طرح ایمل کو بھی بے طرح پریشان کر دیا تھا۔ کل کا دن خصوصاً اس کا بے حد کرب اور تکلیف میں گزرا تھا۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ہاسپٹل کی ایمرجنسی میں بہت خوفناک خودکش حملہ ہوا تھا۔ وہ لوگ بھکر میں رہتے تھے مگر ان کے ہمسایوں کے کچھ رشتہ دار اس خوفناک حملے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان کی چیخ و پکار نے سارے گاؤں کی فضا کو اشکبار کردیا تھا۔ اس نے ٹی وی پہ جو مناظر دیکھے وہ اس کی روح تک کو لرزا گئے۔

دھماکہ اتنا شدید تھا کہ لوگوں کے وجود کے پرخچے اڑ گئے۔ بے گناہ لوگ کسی زخمی کو خون دینے اکٹھے ہوئے تھے مگر خود ہی لقمہ اجل بن گئے۔ ایمل کا اپنا سارا دن روتے گزر گیا۔ ابھی بھی وہ غمزدہ سی بیٹھی چاول چن رہی تھی کہ اس کے موبائل پہ پیغام آیا۔ پیغام سویرا نے بھیجا تھا۔

"بھائی کی پوسٹنگ سوات ہوگئی ہے شاید آج شام تک نکل جائیں۔"

اس کا دل عجیب انداز سے دھڑکا۔ اسے حیرت ہوئی خود پہ۔ وہ خوفزدہ ہوئی تھی۔ مگر کیوں؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس نے موبائل سائیڈ پہ رکھ دیا۔ اور ایک مرتبہ پھر بے دلی سے چاول چننے لگی۔

دروازے پہ ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے چونکا دیا تھا۔

"کون ہے؟" اس نے وہیں سے ہانک لگائی۔

"علی!" فوراً ہی جواب موصول ہوا۔

"آجاؤ۔" وہ وہیں بیٹھی رہی۔ علی اندر چلا آیا۔

"خالہ کہاں ہیں؟" متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا علی اس کے پاس چلا آیا۔ ایمل نے ایک گہری نظر اس کے مضبوط سراپے پہ ڈالی۔ سفید کاٹن کے شلوار قمیص میں اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔ سفید رنگت گرمی کی وجہ سے سرخ پڑ رہی تھی۔ کالے گھنے بال بار بار ماتھے پہ گرتے اور وہ انگلیوں کی مدد سے انہیں پھر سے پیچھے دھکیل دیتا۔

"امی میں نے کچھ پوچھا ہے؟" ایمل کو یوں محو پا کے علی سید نے اس کا کندھا ہلایا۔

"ہاں۔" وہ چونکی۔

"خالہ کہاں ہیں یار؟" علی نے سوال دہرایا۔

"ناہید درزن کے ہاں گئی ہیں۔ کپڑے سلوانے تھے۔" ایمل نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں جواب دیا۔

"اور دادو۔" علی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

"سو رہی ہیں۔ تمہیں طبیعت خراب ہے صبح سے اب پتا نہیں۔" وہی گم سم سا انداز۔

"تم ٹھیک ہو امی۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟" علی پریشان ہوا۔

"کچھ نہیں آئی ایم فائن۔" امی نے نفی میں سر ہلایا۔

"کچھ تو ہے، مجھے نہیں بتاؤ گی۔" وہ ایمل کے پاس ہی کرسی کھینچ کے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"علی میری ایک بات مانو گے۔" وہ تخت سے اتر کر اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔

"پاگل تیری بات بھلا ٹال سکتا ہوں میں۔" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں جیسے نمکین پانی سے جھلملانے لگیں۔ علی مزید پریشان ہوا۔

"کیا ہوا ہے امی جلدی بتاؤ۔" علی اسے شانوں سے تھام کر واپس تخت پہ بٹھاتے ہوئے بولا اور خود بھی دوبارہ کرسی سنبھال لی۔

"تم... تم سوات مت جاؤ علی۔" وہ بولی تو علی کو حیران کرگئی۔

"کہیں اور ٹرانسفر کروالو یا... یا پھر یہ نوکری ہی چھوڑ دو پلیز۔" ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھتی ایمل نے کہا تو علی قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔ امی نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔

"سوری، سوری۔" اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"مگر کیوں چھوڑ دوں اب کیا ہو گیا؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں نہیں پتا کیا۔ ملک کے حالات کتنے خراب ہیں اور پھر جہاں تم جارہے ہو۔ وہاں تو ہر وقت زندگی اور موت کی جنگ چھڑی رہتی ہے آج کل۔" وہ پریشان تھی۔

"ملک کے حالات خراب ہیں یہ سب ہی جانتے ہیں امی مگر کیا حالات خراب ہونے کی وجہ سے ہم یہ ملک ہی چھوڑ دیں۔" وہ خفا ہوا۔

"میں نے ایسا تو نہیں کہا۔" وہ تڑپی۔

"تو اور کیا کہا۔ جب ملک کو میری ضرورت ہے۔ میں اس کے قرض چکانے کے قابل ہوا ہوں تو تم مجھے بھاگنے کا مشورہ دے رہی ہو۔ مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی امی۔" ناراض لہجے میں کہتا وہ ایمل کو مزید اداس کر گیا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا علی۔ بس مجھے ڈر لگ رہا ہے اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو۔" وہ واقعی پریشان تھی۔ علی ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔

"یہ صرف تمہارا وہم ہے اور بس۔" اس نے ایمل کو سمجھانا چاہا۔

"جو بھی ہے تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتے۔" وہ تلخ ہوئی۔

"نہیں۔" اس کا لہجہ اٹل تھا۔

"ٹھیک ہے تو میں بھی تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔" اس نے رخ پھیر لیا۔ علی لب کاٹنے لگا۔

"تمہارے لیے کچھ بھی امی مگر پیارے وطن کے لیے سب کچھ آگے تمہاری مرضی۔" سختی سے کہتا وہ جانے لگا۔

"تم میری بات ٹالو گے علی۔" وہ پورے مان سے اس کے راستے میں آگئی۔

"کہا نا۔ وطن کے لیے کچھ بھی امی۔" اس نے مدھم لہجے میں کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے باہر نکل گیا۔

دو نم آنکھوں نے اس کی لمبی زندگی کی دعا کی تھی۔

☼ ☼ ☼
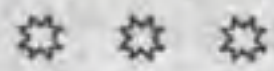
آج گرمی بہت زیادہ تھی۔ جون جولائی ویسے بھی پنجاب کے گرم ترین مہینے شمار ہوتے تھے۔ درجہ حرارت اڑتالیس ڈگری سے بھی اوپر چلا جاتا تھا۔ ایسے میں چرند پرند بھی اپنا آشیانہ چھوڑنے سے گریز کرتے تھے۔

مگر وہ دونوں تو جیسے کسی اور ہی مٹی کے بنے تھے۔ ان کی شادی کو دس سال ہونے کو آئے تھے۔ مگر اتنی شدید گرمی میں بھی وہ اسی طرح نہر کنارے آنا نہیں بھولتے تھے جیسے شادی سے پہلے۔ ابھی بھی مہرالنساء اپنے پسندیدہ آم کے پیڑ کے نیچے ڈیرہ جمائے بیٹھی تھی۔ آم کی وہ ابھری جڑ پانی زیادہ ہونے کی وجہ سے اب غائب ہو چکی تھی۔ نہر کے بالکل اوپر تنی ایک موٹی سی شاخ پہ مہر علی براجمان تھا۔ اس نے ایک آم توڑ کے مہو کی طرف اچھالا اور دوسرا توڑ کے خود کھانے لگا۔ مہو نے بے دلی سے آم پکڑ کے ایک طرف گرے پتوں کے ڈھیر پہ رکھ دیا۔

"کیا ہوا کھالے نہ رکھ کیوں دیا؟" مہر علی بد مزا ہوا۔

"من نہیں کر رہا۔" مہرالنساء نے اداس سے لہجے میں جواب دیا۔

وہ چھلانگ لگا کے نیچے اتر آیا اور اس کے پاس ہی کنارے پہ بیٹھتے ہوئے نہر کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈبو دیے۔

"ہوا کیا ہے تجھے صبح سے بوتھا لٹکایا ہوا ہے۔" مہر علی نے اسے کندھا مارا۔

"کچھ نہیں ہوا تو میرا مغز نہ کھا۔" وہ چڑتے ہوئے بولی۔

"اوہ اچھا۔ میں سمجھ گیا۔ تو میرے جانے کے خیال سے اداس ہے۔" مہر علی شریر ہوا اور بہت کوشش کے باوجود بھی وہ نمکین پانیوں پہ بند باندھنے میں ناکام رہی تھی۔ آنسو لڑیوں کی صورت اس کی خوب صورت براؤن آنکھوں سے بہنے لگے۔

"پگلی نہ ہو۔ میں کوئی ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہا ہوں۔" اس نے مہرالنساء کے گرد مضبوط بازوؤں کا حصار باندھتے ہوئے کہا۔

"پر اتنی جلدی بھی تو کبھی نہیں گیا۔ ابھی تو تیری چھٹی شروع ہوئی تھی کہ تو پھر..." وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔

"تجھے تو پتا ہے سارے حالات کا سرحدوں پہ کشیدگی کتنی بڑھ گئی ہے۔ اسی لیے سب جوانوں کی چھٹیاں منسوخ کر دی گئی ہیں۔ صرف مجھ اکیلے کو تھوڑی واپس بلایا ہے۔" مہر علی نے اسے تسلی دی۔ "بس تو اپنا، میرے بچے اور بے بے کا خیال رکھنا۔ اس دفعہ جب میں واپس آؤں گا تو لمبی چھٹی لے کر آؤں گا۔ بس خوش۔" مہو نے نم آنکھوں سے اس پہ نظر ڈالی۔

"اور ہاں میرے لیے دعا بھی کرنا کہ اللہ نہ کرے ہمارے وطن پہ کوئی میلی نظر ڈالے۔ اگر کوئی یہ جرات کر بھی لے تو اللہ مجھے اور ہم سب کو دشمن پہ ایسی فتح دے کہ فیر کوئی سوچے وی نا۔" جوش سے بولتے مہر علی پہ اس کے دل میں سکون سا بھر گیا۔

"آمین۔" اس نے صدق دل سے دعا کی۔

"اچھا چل اب گھر چلیں مجھے پھر نکلنا بھی ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا اور ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا جو مہو نے بلا تامل تھام لیا۔

"اور ہاں میرے بعد اب اکیلی ادھر نہ آیا کر۔ حالات بہت خراب ہیں۔ بہت دل کرے تو بابا کے ساتھ آجایا کر۔" مہر علی کی ہدایت پہ مہرالنساء سر ہلا گئی۔ وہ اس کے آگے چل پڑا۔ اور اس کی چوڑی پشت کو تکتے ہوئے مہرالنساء نے دل سے اپنے رب کو پکارا تھا۔

"اے میرے مالک۔ میرے سپاہی مہر علی کو کامیاب کر۔" کچی مٹی پہ بنے مہر علی کے قدموں کے نشان پہ قدم رکھتی وہ اس کے پیچھے چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

"اہمل کب سے کتابوں میں سر دیے بیٹھی ہے۔ اٹھ جا اب کچھ کھا پی لے دیکھ تو کتنی دبلی ہو رہی ہے۔" نعیمہ نے کوئی چوتھا چکر لگایا تھا اس کے کمرے کا اور وہ ہنوز کتابوں میں گم تھی۔

اس نے ایک مرتبہ پھر "بس اماں پانچ منٹ اور" کی ہانک لگائی اور کتابوں میں منہ چھپا گئی۔ تبھی دادو اندر آئیں۔ انہوں نے اشارے سے نعیمہ کو باہر بھیج دیا۔

"کیا بات ہے پتر پریشان ہے۔" دادو اس کے پاس آ کے بیٹھ گئیں۔

اہمل نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور پھر فوراً ہی دادی سے لپٹ کے رو دی تھی۔

"دادو وہ مجھ سے خفا ہو کے چلا گیا۔" ابھی بلکتے ہوئے بولی۔ تو دادی نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

"تو منا لے بچے، وہ بھلا کیسے تجھ سے ناراض رہ سکتا ہے۔" دادو نے اس کے ریشمی سیاہ بالوں میں ہاتھ پھیرے۔

"پر اس نے میری بات کیوں نہیں مانی۔" وہ بھی تو ضدی تھی۔ دادو مسکرا دیں۔

"وہ تیری بات تب مانے نا۔ جب ماننے کے لائق ہو۔" اس نے حیرت سے دادو کو دیکھا۔

"اچھا ایک بات بتا تو نے یہ اسکول کیوں کھولا؟" دادو کے سوال نے اسے مزید حیران کر دیا۔

"ظاہر ہے اپنے وطن کے کام آنے کے لیے۔ میں چاہتی تھی کہ پاکستان کی لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کریں۔ تاکہ نہ صرف ملک کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ بلکہ بہتر طور پر ہماری آنے والی نسل کی بھی تربیت کر سکیں۔ کیونکہ ایک ماں سے ہی تو معاشرے کی خوشحالی اور ترقی کی بنیاد بنتی ہے۔" سبھاؤ سے کہتی اہمل دادو کو خوش کر گئی۔

"مگر اس کام کے لیے تجھے کتنی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔" دادو بولیں۔

"ہاں، یہاں کے وڈیروں نے تو میرا راستہ روکا وہ الگ بات تھی۔ مگر خود بچیوں کے والدین نے میرے لیے کافی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ بڑی مایوس ہونے لگی تھی میں۔" وہ اداس ہوئی۔

"تو کیا تم نے اپنا مشن ترک کر دیا۔" دادو نے ایک اور سوال داغا۔

"مر کر بھی میں ایسا نہیں کر سکتی دادو۔ میں نے ہمت کہاں ہاری۔ دیکھا نہیں آپ نے کیسے گھر گھر جا کر اپنا مشن مکمل کیا میں نے کہ وہی والدین جو بچیوں کی تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ خود لے کر آئے ان کو اسکول اور اب تو میرے اسکول کی فنڈنگ وڈیرے کرتے ہیں۔ جو اس کام کے سرے سے ہی مخالف تھے۔" اہمل کے لہجے میں جوش تھا۔

"تو علی نے اس مشن میں تمہارا ساتھ نہیں دیا۔" وہ چونکی۔

"علی نہ ہوتا تو شاید میں اتنا بڑا کام کر ہی نہ پاتی۔" اس نے صدق دل سے علی کی تعریف کی۔

"تو پھر تو اسے اس کے مشن سے منع کیوں کر رہی ہے پتر۔" اور اہمل کو لگا جیسے اس کا دل بند ہونے لگا ہو۔

"تو تو اس کا ساتھ دیتی پتر اس کی ہمت بندھاتی اور تو الٹا اس سے خفا ہو کر اسے پریشان کر بیٹھی۔" دادو کا لہجہ نرم تھا۔ مگر نہ جانے کیوں اہمل کو لگا جیسے وہ اس کا کوئی گناہ سر عام سنا رہی تھیں۔

"دادو۔" وہ ان سے لپٹ کر دوبارہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

"چل علی کو فون کر کے منا لے فیر باہر آ تیری ماں نے بہت دل نال پلاؤ پکایا اے تیرے لیے۔ اتنی اچھی خوشبو آ رہی ہے کہ کیا بتاؤں۔ چل جلدی کر۔" دادو اس کے سر پر تھپکی دے کر باہر چلی گئیں اس نے فوراً آنسو صاف کر کے موبائل اٹھا لیا۔ علی کو منانے میں اب اسے مزید دیر نہیں کرنی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے پسندیدہ رسالے میں گم تھی۔ جب دروازے پہ ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے چونکا دیا۔

"کون ہے؟ اندر آجاؤ۔" اہمل نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

گول مٹول معصوم سے چہرے والی سویرا نے اندر جھانکا تھا۔

"ارے سویرا۔" اسے دیکھتے ہی اہمل اچھل پڑی

"آؤ نا، تمہیں دستک کی ضرورت کب سے پڑنے لگی؟" وہ اسے بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لائی۔

"میں نے سوچا شاید خالہ بھی اندر ہوں۔ کہاں ہیں پورا گھر دیکھ کے آرہی ہوں۔" وہ اس کے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"پھر بھی دستک دینے کی کیا تک تھی۔ اماں بھلا کیا تجھے شوٹ کر دیتیں۔" ایمل ہنسی۔

"خیر وہ ابا کے ساتھ شہر گئی ہوئی ہیں کچھ سامان لینا تھا۔ مگر بات کیا ہے۔ یہ تم تھانیدارنی کی طرح اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہی ہو۔" وہ سویرا کو یہاں وہاں دیکھتے بولی تو سویرا مسکرا دی۔

"اصل میں علی بھیا کا خط آیا تھا میرے کالج کے پتے پر۔" سویرا گاؤں سے دور شہر کے کالج میں پڑھتی تھی۔ ایمل سے دو سال چھوٹی تھی مگر دونوں کی دوستی کمال کی تھی۔

"ہاں تو۔" ایمل نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

"تو اس بار انہوں نے تمہارے لیے بھی خط لکھ کر بھیجا۔ علی بھیا کا خط دیکھ کر پہلے تو میں حیران رہ گئی کہ علی بھیا اور خط لکھیں۔ لیکن پھر لفافے کے اندر تمہارے لیے خط دیکھ کر میں ان کی چالاکی سمجھ گئی۔" اس نے شرارت سے ایمل کو چٹکی کاٹی وہ سی کر کے رہ گئی۔

"اچھا اِدھر دے۔" اس نے بازو مسلتے ہوئے اس سے کہا۔

"ارے ایسے ہی دے دوں کیا؟" سویرا شریر ہوئی۔

"کیا مطلب؟" ایمل حیران ہوئی۔

"مجھے بدلے میں کیا ملے گا؟" سویرا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کے پسندیدہ رسالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سارے لے لو مرو نہیں۔" ایمل نے جلدی سے بستر پہ پڑے تینوں رسالے اس کی گود میں ڈال دیے۔ اس کی بے قراری پہ سویرا مسکرا دی۔

"اب دے نا۔" ایمل اس کی خاموشی پہ تڑپی۔

"ہاں دیتی ہوں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے چھوٹے سے بیگ میں سے ایک خوب صورت کارڈ نما لفافہ اور چھوٹی سی پڑیا اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"کھول تو ذرا۔" اب کی بار سویرا بے تاب ہوئی۔

"چل ہٹ تم سے مطلب۔ رات کو ہی پڑھوں گی تب کھولوں گی۔" ایمل نے فوراً ہاتھ پیچھے کیے۔

"یہ تو بے ایمانی ہے ایمی۔" سویرا نے منہ بسورا۔

"بے ایمانی کیسی تم نے اپنا معاوضہ لے لیا۔ بات ختم۔" ایمل نے انگوٹھا دکھایا۔

"اچھا بابا نہ دکھا مگر کچھ کھلا پلا تو دے قسم سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔" اس نے پیٹ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں چلو کچن میں۔" وہ جلدی سے خط تکیے کے نیچے دے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور سویرا کو ساتھ لے کچن کی طرف چل دی۔

☼ ☼ ☼

14 اگست 1965ء

از دواہگہ بارڈر

عزیز از جان مہو!

جب سے تمہیں چھوڑ کے یہاں آیا ہوں، ہر وقت تمہاری معصوم صورت نگاہوں کے سامنے رہتی ہے اور تمہارا وہ معصوم سا شکوہ دل کو بے چین کر دیتا ہے کہ اس بار تمہارے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ہی نہ مل پایا۔ سوچ بھی نہیں سکتی تو تجھے کس قدر یاد کرتا ہوں۔

یہاں دن بہ دن حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ خود میں ایک عجیب سی کیفیت میں گھرا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے اللہ کو میرا جذبہ شہادت پسند آگیا ہے۔ تبھی میرے وطن نے مجھے بلا لیا۔ مجھ سمیت ہر نوجوان اپنے گھر اور پیاروں کو یاد کر کے دکھی ضرور ہوتا ہے۔ پر یقین جان کہ ایک قدم پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ وطن عزیز کی جس پکار کے لیے میں نے یہ وردی پہنی۔ میرا دل کہتا ہے کہ بس وہ پکار آئی ہی آئی۔ تو میرے لیے دعا کرنا کہ اللہ میرے لیے آسانی فرمائے اور مجھے ہمیشہ ثابت قدم رہنے والوں میں رکھے آمین۔

مجھے پتا ہے کہ تو میری دوری سے بے حد پریشان ہے مگر یہ بات بھی جانتا ہوں میں کہ تو کتنی محبت کرتی ہے پاکستان سے۔ اسی لیے مطمئن ہوں کہ تو مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتی۔ اپنا، میرو اور بے بے کا خیال رکھنا مہو۔ میں نے تم سب کو اپنے رب کے حوالے کیا۔

تیرے لیے دل کے جذبات کو اوراق کی نذر کرنے سے قاصر ہوں۔ مگر وعدہ رہا اگر زندگی نے ساتھ دیا اور تجھ سے پھر ملا تو ان پر کوئی حد بندی نہ لگاؤں گا۔ بلکہ پوری نیک نیتی سے تیرے روبرو اپنا دل کھول کے رکھ دوں گا۔

جانتا ہوں کہ یہ خط پڑھتے وقت تیرے چہرے پہ کتنے خوب صورت رنگ سجے ہوں گے۔ مگر اے کاش کہ میں یہ رنگ دیکھ بھی سکتا۔ یہ اور بات کہ تخیل کی نظر سے تو کبھی اوجھل ہی نہیں ہوتی۔

"اللہ تم سب کا نگہبان ہو۔

صرف تمہارا مہر علی۔"

بوسیدہ سے خط کو لبوں سے لگاتے ہوئے سنہری بھوری آنکھوں میں جل تھل سی مچی۔ کاغذ خواہ کتنا ہی بوسیدہ ہی مگر مہو جانتی تھی کہ اس کے لفظوں کی تاثیر آج بھی اس کے لیے ویسی ہی تازہ اور زندگی سے بھرپور تھی۔ جیسے آج سے پینتالیس سال پہلے اس وقت تھی جب مہر علی کا خط اسے ملا۔ اس خط کے ایک ایک حرف میں وہ مہر علی کی خوشبو محسوس کر سکتی تھی۔ یہ خط مہر علی کا آخری خط تھا۔ مگر مہر النساء کی روح بسی تھی اس میں۔

★ ★ ★

آج چاند کی چودھویں تھی۔ اس نے کھڑکی کھلی چھوڑ دی۔ تاکہ چاند کی مدھم روشنی سے لطف اندوز ہو سکے۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا چھوٹا سا ٹیبل لیمپ آن کیا اور تکیے کے نیچے سے علی کا خط نکال کے پڑھنے لگی۔

"میرا خط دیکھ کر حیران ہوئی نا۔ یاد ہے تم نے بھی ایک مرتبہ موبائل سے متعلق میری بات مان کر مجھے حیران کر دیا۔ تو میں نے سوچا تمہیں بھی خط بھیج کر خوش کر ہی دوں آج۔ ارے ارے خط شروع کرتے ہی ایسی مسکراہٹ۔ پاگل کرو گی کیا؟"

پہلی لائن پڑھتے وہ ہنسنے لگی تھی۔

"خیر خط لکھنے کا طریقہ اسکول کے زمانے میں ہی بھلا بیٹھا ہوں۔ تو جیسا ہے اچھا ہے کے مصداق یہی قبول کر لو۔ پھر لکھ بھی اس قدر بے تابی سے رہا ہوں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔

میں تو سمجھتا تھا کہ پاکستان بس پنجاب تک ہی محدود ہے۔ ساری عمر میں پنجاب میں جو رہا۔ مگر سوات آ کے تو ایسا لگا جیسے پوری کائنات کا حسن پاکستان میں رکھ دیا ہے۔ اللہ پاک نے قدرت کی فیاضیوں سے بھرپور یہ منظر، سچ تم میرے ساتھ ہوتیں تو ان سبزہ زاروں میں ناچتی پھرتیں۔

ایک ایک نظارہ حیرت سے پاگل کر دینے پہ مصر ہے۔ سرسبز پہاڑوں پہ قطعوں کی صورت کھیت، میووں سے لدے درخت، پہاڑوں سے بہتے عجیب ہی سر بکھیرتے جھرنے اور صاف شفاف آئینے کی مانند دریا، سچ جہاں دل بے اختیار اللہ کی صناعی پہ سبحان تیری قدرت کرنے لگتا ہے۔ وہیں دل سے اک آہ سی نکلتی ہے کہ کاش اس جنت میں تم بھی میرے ساتھ ہوتیں۔

اچھا خط کافی طویل ہو گیا۔ خط کے ساتھ ایک چھوٹی سی پڑیا ہے۔ جسے پتا ہے مجھے تم نے ابھی تک نہیں کھولا ہو گا۔ اس میں سونے کے چھوٹے چھوٹے بندے ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے چند دن پشاور رکے تھے۔ دوستوں کے ساتھ بازار گیا تو پسند آ گئے۔ بس پھر تمہارے لیے لے لیے امید ہے تمہیں پسند آئیں گے۔

اچھا اذان ہو رہی ہے۔ سب نماز کے لیے اٹھ رہے ہیں۔ سو میں بھی چلوں گا بارگاہ الٰہی میں حاضری دینے۔

تم میری ہو۔ مگر دل کی تسلی کے لیے ہمیشہ کی طرح آج بھی تمہیں اپنے رب سے مانگوں گا ضرور، تب تک جب تک تم میرے پاس نہیں آجاتیں۔

تمہارا علی سید۔"

ابصل نے خط تہ کر کے اپنی ڈائری میں رکھ دیا اور آہستہ سے وہ چھوٹا لفافہ اٹھا لیا۔ کھولنے پہ بہت ہی خوب صورت سونے کے بندے نکلے۔ جن میں ہرے رنگ کے ننھے ننھے نگ جگمگا رہے تھے۔

"علی واپس آئے گا تو تبھی پہنوں گی۔" اس نے خود سے سرگوشی کی اور بندے واپس ڈال کر پیکٹ دراز میں رکھ دیا۔

"میرے ڈھول سپاہیا تینوں رب دیاں رکھاں۔" دھیرے سے گنگناتی وہ کھڑکی کے پاس چلی آئی۔ ٹھنڈی میٹھی چاندنی بھی اس کے ساتھ گنگناتی تھی۔

☼ ☼ ☼

بوجھل دل کے ساتھ وہ خود کو کب سے کمرے میں بند کیے پڑی تھی۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ روتے روتے اس کی آنکھوں کے ساتھ چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔ باہر اماں کی تیز آواز جیسے اس کے کانوں کے پردے پھاڑنے کے درپے تھی۔

"میں نے تمہیں کرنی کسی لوتے لنگڑے سے اپنی بیٹی کی شادی۔ ارے غضب خدا کا کتنے فخر سے بتا کر گئی ہے علی کی ماں کہ ٹانگیں ضائع ہو گئیں تو کیا ہوا۔ زندگی تو بچ گئی میرے غازی بیٹے کی۔ ہوں۔" نخوت سے کہتی وہ ابصل کا دل چیر گئیں۔

چند دن پہلے ہی اطلاع آئی تھی کہ دہشت گردوں کے ساتھ ایک معرکے میں علی شدید زخمی ہو گیا۔ دہشت گردوں کا مورچہ پہاڑوں کے اوپر تھا۔ علی اور اس کے ساتھیوں کو وہ مورچہ خالی کرانے کا ٹارگٹ ملا تھا۔ علی اور اس کے ساتھیوں نے ہمت دکھاتے ہوئے چڑھائی کر دی تھی۔ دہشت گردوں کی اندھا دھند فائرنگ سے علی اور اس کے دو ساتھی شدید زخمی ہو گئے۔ مگر علی کی جوابی فائرنگ سے دشمنوں کا بھی ٹھیک ٹھاک نقصان ہوا۔ اللہ نے انہیں کامیاب کیا اور پاک فوج کے جوان اس مورچے پہ قابض ہو گئے۔

علی پورے پندرہ دن تک زندگی اور موت کی کشمکش میں رہا۔ بالآخر وہ زندہ تو بچ گیا مگر گولیاں زیادہ لگنے کی وجہ سے اس کی ایک ٹانگ ضائع ہو گئی۔ علی کی سلا[متی] اس کی زندگی بچ جانے کی خوشی میں گھر گھر جا کر مٹھائی تقسیم کی تھی، مگر نعیمہ نے نہ صرف مٹھائی [لینے] سے انکار کر دیا بلکہ ابصل اور علی کے رشتے کو اب [مزید] قائم نہ رکھنے کی بھی بات کر دی۔ جمیلہ روتے ہو[ئے] گئیں۔ دادو بے چاری تو بس چپ چاپ بہو کو د[یکھتی رہ] گئیں۔ ابصل تو خود علی کے حادثے کا سن کر کمرے [میں] بند ہو گئی تھی۔

"نعیمہ تجھے ہو کیا گیا ہے۔ کیوں دکھی دل کو مزید د[کھی] کر دیا تو نے۔" ابا البتہ بے حد ناراض ہوئے۔

"تیری سوچ کو ہو کیا گیا ہے۔ وہ کسی برے کام میں زخمی نہیں ہوا۔ غازی ہے اپنا علی پر تجھے شاید [شعور] نہیں ہے۔"

"غازی ہے یا کچھ بھی۔ پر مجھے نہیں کرنی اپنی [بیٹی] کی شادی اس علی سے۔" نعیمہ نے صاف جواب دیا۔

"وہ تمہارا سگا بھانجا ہے۔ پھر زبان بھی کوئی چیز ہو[تی] ہے یا نہیں۔" ابا سخت لہجے میں بولے۔

"اپنی اولاد سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا شاہ جی۔" اماں نے تیز لہجے میں کہا۔

"میرے خیال اچ اے فیصلہ امی بچے تے چھوڑ [دیو]۔ اوہی اے فیصلہ کرے تے بہتر اے۔" دادو نے بہترین حل پیش کیا۔

"امی بھی یہی فیصلہ کرے گی اماں۔ دیکھ لینا۔ ایک ماں سے زیادہ اپنی اولاد کو بھلا کون سمجھ سکتا ہے۔" ا[با] نے ایک تاسف بھری نگاہ نعیمہ پہ ڈالی۔ ان دونوں کے وجود سے غافل تیرا وجود تو کسی اور ہی دنیا کا باسی ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

سارے گاؤں میں کہرام مچ گیا تھا۔ وہ تھا ہی ایسا سارے گاؤں کا پیارا چہیتا بیٹا۔ سب کو اپنا سمجھنے والا سارے لوگوں کے کام آنے والا۔ سارے گاؤں کی جان تھا وہ سارے پنڈ کو فخر تھا اس جیالے پر وہ آتا تو ہمیشہ گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑ جایا کرتی مگر اس بار

اس بار تو اس نے ہر آنکھ اشک بار کر دی تھی، ہر دل مغموم کر دیا تھا۔ جسے دیکھ کر سب چہک اٹھتے تھے آج اسے ہی دیکھ کر ہر کوئی بس آنسوؤں اور آہ و بکا کی صورت میں بات کر رہا تھا۔

★ ★ ★

مہر علی نے اپنا وعدہ ایفا کیا۔ اس نے نہ صرف مہو بلکہ پورے گاؤں کا سر فخر سے بلند کر دیا تھا۔ پیارے وطن کی خاطر اس نے جام شہادت نوش کر لیا۔ مگر دشمنوں کے ناپاک ارادے مٹی میں ملا دیے۔ سبز پرچم میں لپٹے تابوت کے پاس بیٹھی مہرو اور اس کے دس سالہ بیٹے میو نے بڑی جرات سے اسے الوداع کہا۔ آنسو بے شک مہرالنساء کی آنکھوں سے سیلاب کی مانند امڈے چلے آ رہے تھے۔ مگر اس کا دل جذبے سے لبریز تھا۔ اسے اپنے مہیا پہ فخر تھا۔ اسے ناز تھا کہ وہ شہید سپاہی مہر علی کی بیوہ تھی۔

"پتر میری مان ہاں کر دے۔" بے بے نے کوئی تیسری مرتبہ آ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ جو تھک تھک کے میو کو سلانے میں مصروف تھی۔ [و]ہ کراہ کی طرف دیکھنے لگی۔

مہر علی کو گزرے چھ ماہ ہو گئے۔ وہ جوان تھی اور خوب صورت بھی۔ تبھی گاؤں کے کئی جوان اس سے شادی کے خواہاں تھے۔ کل بھی کسی گھر سے اس کے لیے رشتے والے آ رہے تھے۔ بے بے اسے سمجھا سمجھا کے تھک گئی مگر مہرالنساء اپنی ضد پہ قائم رہی۔

"نہ بے بے تو سمجھ کیوں نہیں جاتی۔ میری دنیا اب تو میرا امیر علی اور مہیا کی یادیں ہیں اور کچھ نہیں چاہیے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کیسے کاٹے گی یہ لمبی حیاتی۔ لوکاں دی نظر اای کچا کھا جاناای۔" بے بے فکر مند تھی۔

"کوئی نئیں کھا سکتا۔ بس تو میرے نال ہو مجھے دعا دیا کر بس۔" میو سو چکا تھا۔ وہ بے بے کے پاس بیٹھ کر ان کے پیر دبانے لگی۔

"مہو ضد نہ کر بچے۔" بے بے نے اصرار کرنا چاہا۔

"بس بے بے اے گل ادھر ہی ختم کر دے۔" اس نے انہیں آرام سے روک دیا۔

"مہیا شہید ہے تے میں ایک شہید کی بیوہ اور بے بے شہید کبھی نہیں مرتا۔ اللہ پاک نے خود فرمایا اے کہ شہید زندہ ہوتا ہے۔ بس ایس زندگی دا شعور اساں لوکاں نوں نئیں ہوندا۔" اس نے خالص پنجابی میں ساس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ نیند میں ہی سر ہلانے لگیں۔

"میرا مہر! زندہ ہے بے بے بڑی لمبی حیاتی پالی ہے اس نے۔" خود سے سرگوشی کرتے ہوئے وہ بے آواز رو دی تھی۔

☼ ☼ ☼
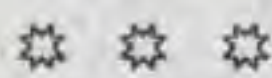
"مہر علی، مجھے آج تک وہ دن یاد ہے جب سبز ہلالی پرچم میں لپٹا تیرا وجود میرے سامنے پڑا تھا۔ کتنا سکون تھا تیرے چہرے پر کتنی پیاری مسکان سجی تھی تیرے ہونٹوں پہ۔ ایسے جیسے کوئی دکھیارا ساری عمر دریا دریا، صحرا صحرا، جنگل جنگل کسی خزانے کی تلاش میں پھرتا رہے اور وہ خزانہ اسے بالآخر مل ہی جائے۔ بالکل ایسی ہی خوشی تیرے چہرے پہ محسوس کی تھی میں نے۔ کسی غم، کسی افسوس، کسی حسرت کا شائبہ تک نہ تھا تیرے چہرے پہ، نہ بے بے کی فکر، نہ ہی میری اور میو کی چنتا۔

بس تجھے دیکھنے کے بعد مجھے بھی ویسا ہی سکون مل گیا۔ میں سمجھ گئی کہ تو کامران ہو کے آیا ہے۔ تبھی تو اتنا سکون تھا تیرے چہرے پر۔ اللہ پہ تیرا بھروسہ اور یقین اس قدر مضبوط تھا کہ تجھے ہماری فکر نہیں بلکہ اللہ کی رضا کی خوشی منہ پہ سجالی تھی۔

تیرے بعد بھلے ہی کئی عرصے تک میں سوچتی رہی کہ تیرے بعد اب میرا کیا ہو گا؟ میو کا کیا بنے گا؟ اور بے بے کیسے جیے گی۔ لوگوں نے میری حیاتی تنگ کر دی تھی۔ روز ایک نئی منزل، نئی راہ کھول دیتے میرے سامنے۔ مگر میں نے تیری راہ پہ ہی قدم مضبوطی سے جما لیے۔ مہیا تیرے علاوہ اور کوئی منزل مجھے اچھی ہی نہ لگی۔ کسی اور کی بیوی کہلانے سے زیادہ مجھے سپاہی

مہر علی کی بیوہ ہونا زیادہ اچھا لگا۔ میرے لیے تو رستہ آسان تھا مہر یا مگر۔۔۔"

مہر علی کی تصویر سے باتیں کرتے ہوئے وہ ذرا دیر رکی۔

"مگر اب تیری پوتی کی آزمائش ہے۔ میری دعا تو علی کے ساتھ ہے۔ تو بھی دعا کرنا کہ اپنی امی علی جیسے سوہنے بندے کی وطن کے لیے اس قربانی کو علی کے لیے سزا نہ بنا دے۔ دعا کرنا مہر علی دعا کرنا۔۔۔"

دادو مہر النساء نے اپنی بھوری آنکھوں کو سختی سے رگڑ ڈالا۔ اور مہر علی کی یادگار تصویر پہ اپنے لب دھر دیے۔

☼ ☼ ☼

"امی! میں جمعرات کو واپس آ رہا ہوں۔ تمہیں پہلے اس لیے بتا رہا ہوں۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں اس بار بھی میں جب آؤں تو میرے آنے کا سن کر تم سب سے پہلے دوڑتی چلی آؤ۔ اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اس بار جب تم آؤ تو میرا ایک چھوٹا سا کام کرتی آنا۔

جو بندے میں نے تمہیں بھیجے تھے۔ وہ تب ہی پہن کر آنا اگر تم آج بھی مجھے اپنے قابل سمجھتی ہو تو ورنہ تمہیں مجھے رد کر دینے کا مکمل اختیار ہے۔ مجھے تمہارے ہر فیصلے سے کم از کم اتنی خوشی تو ہو گی کہ تم اپنے فیصلے خود کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس طرح شاید تمہیں بھی ہر قسم کا فیصلہ کرنے میں آسانی ہو اور میرا بھی بھرم رہ جائے گا۔

مرتے دم تک صرف تمہارا۔۔۔ علی سید۔"

سویرا نے کوئی چار روز پہلے اسے یہ خط لا کر دیا تھا اور وہ مسلسل جانے کتنی بار خود بھی اسے پڑھتی رہی تھی اور دادو کو بھی سنا چکی تھی۔ دادو نے اسے پوری طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

آج جمعرات تھی ٹھیک چار بجے علی نے واپس آنا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی دو بج چکے تھے۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ گلابی رنگ کے سوٹ میں اس کی سفید رنگت دمک رہی تھی۔ اسے اپنا آپ نامکمل سا لگا۔

"امی! کیا سوچ رہی ہے پتر۔" دادو نہ جانے کب اس کے پیچھے آ ٹھہریں۔

"نہیں دادو۔ بس علی کو ایسی حالت میں دیکھنے کی تاب نہیں ہے مجھ میں۔" وہ نم لہجے میں بولی۔

"اس بے چارے میں کہاں تاب ہو گی یہ سب سہنے کی۔ مجھے تو ڈر ہے ایسے حالات میں وہ ہمت نہ ہار بیٹھے۔" دادو بھی فکر مند تھیں۔

"میں بنوں گی اس کا حوصلہ دادو۔" اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

"آپ بھی تو ساری عمر فخر کرتی رہی ہیں نا دادو کہ دادا ایک شہید تھے اور آپ شہید کی بیوہ۔ جب بھی پاکستان پہ جان دینے والوں کا ذکر ہو گا ۔ کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں سپاہی مہر علی کا بھی ذکر ہو گا۔" ایمل جذب سے بولی۔

"امی تیری دادی تو آج بھی ابا جی پہ فخر کرتی ہے۔" امی بھی وہیں چلی آئیں۔ آج نہ جانے کیوں امی کو ان کا لہجہ تھکا تھکا سا لگا امی کی خوب صورت کالی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔

"تو پھر مجھے عار کیوں ہو امی۔ مجھے بھی اپنے علی پر فخر ہے ایک غازی کا ساتھ مجھے بھی دل و جان سے قبول ہے۔ پھر اس نے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ اپنے وطن کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ تو اپنے قول کا پکا نکلا میں پھر اسے کیوں چھوڑوں امی، بنا کسی قصور کے بغیر کسی گناہ کے۔" وہ رونے لگی تھی۔

"تو جو بھی فیصلہ کر۔ ہمیں منظور ہو گا امی۔" دادو نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور نعیمہ کو ساتھ لگا کر باہر لے گئیں ایمل بے آواز روتی رہی۔

☼ ☼ ☼

چار بج چکے تھے۔ "وہ گھر آ گیا ہو گا۔" سوچتے ہوئے اس نے آئینے پہ ایک نظر ڈالی اور پھر تیزی سے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز سے علی کے بھیجے ہوئے بندے نکال کر پہن لیے۔ وہ آئینے کے سامنے آ ٹھہری

اسے لگی۔ وہ مکمل ہو گئی۔ ایک بہت ہی خوب صورت مسکان اس کے لبوں پر آ جمی۔ سفید شال اٹھا کر وہ باہر نکل آئی۔

"کہیں جا رہی ہے امی بیٹا۔" ابا نے اس کے ہاتھ میں شال دیکھی تو پوچھ بیٹھے۔ وہ تلکے پہ وضو کر رہے تھے۔

"جی علی سے ملنے ابا۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"ذرا صبر کر لے تو میں ساتھ چلتا ہوں۔" ابا تولیے سے منہ خشک کرتے ہوئے بولے۔

"نہیں امی تو جا ہم سب بھی آتے ہیں ابھی۔" وہ ابا کی بات سن کر پریشان کھڑی تھی۔ اماں نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

ایمل تیزی سے شال اوڑھنے لگی۔ چائے پکاتی اماں تخت پہ بیٹھی تسبیح کے دانے گراتی دادو مہر النساء کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف رواں سورج، نیلے آسمان اور پاک وطن کی سوہنی دھرتی نے بھی اس کے کانوں میں لش لش کرتے سونے کے بندے دیکھے تھے۔

اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اماں نے دل ہی دل میں اس کی خوشی کی دعا کی تھی۔ دادو نے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے امیر علی کو مبارک باد دی اور سورج، افق اور دھرتی اس کی اپنے وطن سے اور اپنے علی سے محبت کے گواہ بنے تھے۔

وہ تیزی سے دروازے کی چوکھٹ پار کر گئی کہ علی سید پوری محبت، پوری امید اور پورے یقین سے اس کی راہ تک رہا تھا۔

وہ آ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہمیشہ کی طرح اچھلتی کودتی نہ سہی، خاموش ہی سہی مگر آ گئی تھی۔ خالہ اسے دیکھ کر بے حد شاد ہوئی۔ سویرا تو پھولی نہ سمائی۔ وہ آہستہ سے چلتے ہوئے وہیل چیئر پہ بیٹھے علی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ وہ کافی کمزور ہو گیا تھا۔

وہ اس کے پاس ہی زمین پہ بیٹھ گئی۔ علی کچھ بول ہی نہ سکا اسے ہی تکتا رہا نم آنکھوں سے۔

ایمل نے چپ چاپ آنسو بہاتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ دھر دیا۔ معاً ریشمی چادر ذرا سا اس کے سر سے ڈھلکی تھی اور اس کے کانوں میں جھلملاتے بندے علی کی نس نس میں زندگی سی بھر گئے۔

"امی۔۔۔ تم؟" فرط مسرت سے وہ بول ہی نہ پایا۔

ایمل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پر تو جانتی ہے نا کہ اب میں بائیک پہ بٹھا کے تجھے پورے گاؤں کی سیر نہیں کرا پاؤں گا۔" وہ خاموش رہی صرف سر ہلانے پہ اکتفا کیا۔

"اور یہ بھی کہ اب میں شاید تیرے لیے آم بھی نہ اتار سکوں۔"

"ہاں۔" وہ اداسی سے مسکائی۔

"اور یہ بھی کہ تیری پیاری کتابیں بھی نہ لا کے دے سکوں گا۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ حیران ہوا۔

"تم یہ سب برداشت کر لو گی؟" اسے شاید اب تک یقین نہ آیا تھا۔

"وطن کے لیے کچھ بھی علی۔" اس نے کتنے خوب صورت انداز میں علی کے الفاظ اسے لوٹائے تھے۔ علی کو لگا اس کی دنیا مکمل ہو گئی وہ ہنسنے لگا نم سی ہنسی۔

"بس یونہی ہنستے رہنا علی مجھے تم سے اور کچھ نہیں چاہیے۔" ایمل نے مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔ علی اور کھل کے مسکرا اٹھا۔

خالہ ان دونوں کے پسندیدہ رس گلے لے آئی تھیں۔ امی ابا اور دادو بھی آ چکے تھے۔ علی کا گھر خوشیوں اور مسکراہٹوں سے سج سا گیا تھا۔

ایمل کو خوشی تھی، اطمینان تھا کہ اس نے ایک صحیح فیصلہ کیا تھا۔ جس کی وجہ سے کتنی ہی زندگیاں مسکرا اٹھی تھیں۔ اس کی زندگی مسکرا دی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے وطن کی سلامتی اور اپنوں کی خوشیوں کی لمبی زندگی کی دعا کی تھی۔

☼ ☼

رفاقت جاوید

مکمل ناول
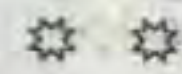
آئی ایم سیریس، کہہ تو رہا ہوں۔" ارسلان نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"سوچ لو جس دن رنگے ہاتھوں پکڑے گئے اور یہ بھی ممکنات میں سے ہے کہ اگر اس کے پیرنٹس کی طرف سے بیس کمانڈر کے حضور تمہارے خلاف عرضداشت پہنچ گئی تو اس کا انجام تو بخوبی جانتے ہو نا۔" جواد نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"کورٹ مارشل! آئی ایم ریڈی فار ویٹ۔" ارسلان نے گلو خلاصی کے لیے بے فکری سے کہا اور نظریں کتاب پر جم گئیں۔ جبکہ ذہن اور ہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔

"یعنی یہاں محبت، عشق اور دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگی ہے۔ یہ عارضہ ہمیں قطعاً" سوٹ نہیں کرتا۔ تم جانتے ہو کہ پاکستان ایئر فورس کی پالیسی چھبیس سال کی عمر میں بالغ قرار دیتی ہے۔ اس سے پہلے چوری چھپے محبتوں کے جال تو بنے جاسکتے ہیں مگر ان کو ذی روح سے آباد نہیں کرسکتے۔" جواد نے اسے یاس انگیز نظروں سے گھورا۔

"میں اپنے کولیگز کی طرح کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ بس وہ دل کو بھا گئی تو شادی کا فیصلہ کرلیا۔ حتمی اور آخری مجھے یہ حرکات و سکنات سراسر مردانگی اور غیرت کے خلاف لگتی ہیں کہ کبھی اسکول کے باہر ٹیچرز کا انتظار کرنا تو کبھی ہسپتال میں سسٹرز سے گپ شپ کے بہانے ڈھونڈنا۔ ایسی گھٹیا حرکتیں ہماری شان کے منافی ہیں۔" ارسلان نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ تمہیں زندگی میں پہلی لڑکی نظر آئی تو اسے تم نے کوہ قاف کی پری جان کر دل نذر کردیا۔ یار زندگی میں بے حساب پریاں نظر آئیں گی اتنی بے صبری کاہے کی۔" وہ ذرا قاً ہنسا۔

"جانتا ہوں تمہیں اور اپنے سمیت تمام افسران کو بے چارے مسکین گیارہ بارہ سال کی عمر میں پبلک اسکول میں قید ہوگئے۔ وہاں سے رہائی ملی تو رسالپور اکیڈمی کے سنگلاخ قید خانے کے باسی بن گئے۔ لڑکی دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ اگر اس جیل خانے سے باہر خوش قسمتی سے کسی سے ٹکراؤ ہو بھی گیا تو حلق خشک، ٹانگیں لرزیدہ اور جسم پر کپکپی کی کیفیت اس گولڈن چانس پر حاوی ہوجاتی ہے۔"

"یہ بتاؤ کہ تمہیں فون پر گفتگو کرنے اور ایک بار کی سینما ہال میں ملاقات سے اس میں کون سی خصوصیات نظر آگئیں کہ شادی کرنے چل نکلے۔ بے سروسامانی کے عالم میں جیب میں پیسہ نہ گھر والوں کی رضامندی نہ ہی اپنے یار کو اس حسینہ کا دیدار کرایا۔"

"جسے اپنی زندگی کا ساتھی مان لیا جائے اسے اپنے دوستوں سے انٹرڈیوس نہیں کراتے تم بھی یاد رکھنا۔ جو ساتھی پیار اور فقط پیار کرتا ہو اسے جیب کے بھرنے کا انتظار نہیں ہوتا۔ زندگی پر میرا حق ہے میرے گھر والوں کا نہیں۔ اس لیے میں کسی کی باز پرس سے ڈرنے والا نہیں۔" وہ مستحکم لہجے میں بولا۔

"یہ اپسرا تمہیں ملی کہاں سے؟ جس نے تمہیں مستحکم بنادیا۔" وہ حیران کن لہجے میں بولا۔

"آج سے چند مہینے پہلے میں ADA کے وقت کو خوشگوار بنانے کے لیے بیس کے نمبر ڈائل کررہا تھا کہ آخر اس سے بات ہوگئی۔ گفتگو اتنی طویل ہوتی چلی گئی کہ اک نا آشنا مجھے اپنی لگنے لگی۔ اور پھر ہر فرصت میں اس سے بات ہونے لگی۔ وہ پی اے ایف اسکول میں ٹیچر ہے۔ اس کی باتوں میں جادو ہے جواد۔ انٹلکچوئل پریکٹیکل اور دلکش گفتگو نے مجھے گرویدہ بنادیا۔ اور آخر ایک دوپہر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک دوسرے سے ملوادیا اسے دیکھ کر میں اپنی قسمت پر نازاں ہوگیا۔" وہ جھومتے ہوئے بولا۔

"تمہارے بارے میں اس کا کیا خیال ہے؟"

"ہماری یونیفارم اس پر سجے ہوئے میڈلز اور رینکس ہماری فلائننگ اور ہماری دلیری پر لڑکیاں مرتی ہیں۔ انہیں شکل و صورت کی قطعاً" پروا نہیں ہوتی۔ تم نے نوٹ کیا ہوگا کہ ہمارے سینئرز میں ہر لنگور کی بغل میں حور ہے۔" وہ شگفتہ قہقہہ لگاتے

ہوئے بولا۔ "مابدولت تو ہزاروں میں ایک ہیں۔ اپنی خوش نصیبی پر اس نے بھی تو ناز کیا ہوگا۔"

"اف کس بے باکی سے اس نے تمہیں ہتھیا لیا ہے۔ اب تمہیں سمجھانا بے کار ہے۔ سوچ لو کہ ایئر فورس کی نگاہ تمہیں بہت کمسن اور نادان سمجھتی ہے۔"

"ہاں ہاں میں دودھ پیتا' چوسنی لیتا اور ماں کی گود میں سونے والا بچہ ہوں۔ میری ذاتی زندگی پر بھی ایئر فورس کا حق ہے۔ سانس بھی پرمیشن کے بغیر لینا جرم ہے یہاں۔" وہ تلخی سے بولا۔

"وہ تو ہے۔ جوائن کرنے سے ریٹائرمنٹ تک۔ مانو یا نہ مانو تمہاری مرضی' یہ سب کرنے سے تمہیں شادی کی اجازت تو ملنے سے رہی۔"

جواد نے برجستہ جواب دیا تو ارسلان نے اپنی کتاب بند کی اور ٹیبل لیمپ آف کرکے بستر پر لیٹ کر گہری سوچ میں چلا گیا۔

"نادان اور احمق زندگی انجوائے کرو۔ اسے تم نے خوامخواہ دل و ذہن پر آسیب کی طرح مسلط کرلیا ہے کم از کم مجھے تم سے ایسی توقع نہیں تھی۔ ابھی بھی عقل و شعور سے کام لو۔ اس عمر کی محبت کی گرمی' تپش اور حدت سراسر سراب ہے۔" وہ تنبیہہ کررہا تھا۔

"میں اسے کھونا نہیں چاہتا آگی لو ہر سوچ۔ میں اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ کہ آج اس کی قربت میں ہر لمحہ انجوائے کروں۔ اسے زمانے بھر میں بدنام کروں۔ اپنا کورٹ مارشل کراکر فیوچر کو داغدار کروں۔ یہ بے غیرتی ہے مردانگی پر بہت گہری ضرب ہے۔" ارسلان نے اندھیرے میں ہی سختی سے کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

ارسلان جواد کا جگری یار تھا۔ لوئر ٹوپہ پبلک اسکول سے لے کر رسالپور اکیڈمی تک اور پھر ہر بیس پر شب و روز کا ساتھ رہا تھا۔ وہ اس کا روم میٹ بھی تھا اور کورس میٹ بھی۔ ان کی تمام شرارتیں' باتیں' لطیفے اور من گھڑت کہانیاں کامن ہوا کرتی تھیں۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میرٹ پر آنے والے لڑکے PAF رسالپور اکیڈمی میں ٹریننگ کے لیے منتخب ہوگئے جن میں ارسلان کا نام سرفہرست اور جواد کا سب سے آخر میں تھا۔ اپنی جان لیوا روٹین میں ان کی عاشقانہ سوچیں کافور ہوگئیں۔ اور تمام پیار' عشق' جنوں اور دیوانگی فلائنگ کی جانب مبذول ہوگئی۔ حب الوطنی کے جذبے میں سرشار سب نے ٹریننگ کی شروعات کی۔

لوئر ٹوپہ میں گزرا ہوا وقت ایک سہانے سپنے کی طرح انہیں اپنی یاد دلاتا رہا اور وہ کولیگز جو رسالپور اکیڈمی کو جوائن کرنے میں ناکام رہے۔ ہمیشہ سب کو ان کی کمی محسوس ہوتی رہی۔

رسالپور میں ان کی صبح نہایت کسلمندی میں طلوع ہوتی۔ بستر چھوڑ کر ڈرل کے لیے تیار ہونا خاصا محال کام لگا کرتا تھا۔ مگر انکار تو ان کی ٹریننگ میں تھا ہی نہیں اس لیے آنکھیں ملتے' جمائیاں لیتے بستر سے نکل پڑتے۔ فلائنگ کے دوران روزہ رکھنے پر پابندی تھی جبکہ ارسلان اس حد کو کراس کرنے میں پیش پیش ہوتا تھا۔

فزیکل فٹنس کے لیے ایک گھنٹے کی ڈرل اور مارچ کے بعد تیار ہوکر سب ڈائننگ ہال میں ناشتا کرتے ہوئے بھی خفیہ شرارتوں سے باز نہیں آتے تھے۔ ایک سال کی گراؤنڈ ٹریننگ جس میں ایرو انجن' میٹرولوجی' لا' ایئر فورس اور جنرل سروس کے رولز کے علاوہ لیڈر شپ ٹریننگ میں ارسلان سب سے بہت آگے تھا اور پھر اس کے بعد ایک سال کی فلائنگ ٹریننگ تو اس کے لیے کھیل تماشا تھی مگر جواد اس کے برعکس تھا۔

جب پہلی دفعہ جواد ہارورڈ ٹی-6 جی امریکن طیارے میں فلائنگ سیکھنے کے لیے انسٹرکٹر کے ساتھ بیٹھا تو اس پر خوف طاری ہوگیا۔ جہاز نے جونہی ٹیک آف کیا وہ ڈر کے مارے لرزنے لگا تھا۔ جبکہ ارسلان میں ڈر اور خوف کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جواد کا ہر وقت ارسلان سے مقابلہ رہتا۔ آخر وقت گزرنے کے ساتھ اس میں بھی پائلٹ جیسی خصوصیات ابھرنے لگیں۔ پرائمری ٹریننگ انہوں نے اسی جہاز پر ستر گھنٹوں میں مکمل کی۔ تو وہ سمجھے کہ ہم ایک فائٹر پائلٹ بن گئے ہیں۔ مگر یہ ان کی خوش فہمی ہی نکلی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ بیسک ٹریننگ جٹ T37 پر ایک سو گھنٹے فلائی کرنے سے مکمل ہوگی۔ تو ان کا رنگ فق ہوگیا۔ جبکہ ارسلان نے بلند آواز میں نعرہ لگا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

ستر لڑکوں میں سے کچھ جواد کے مزاج کے تھے اور کچھ ارسلان جیسے نڈر اور بے باک تھے۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی وہ چھ مہینوں کے بعد ایڈوانس ٹریننگ میں آگئے۔ ہر اسٹیپ میں ناکام ہونے والے لڑکوں کی تعداد جواد کو دہلا دیا کرتی تھی۔ کہ ہوسکتا ہے کہ اگلی دفعہ اس کی باری ہو۔ مگر ارسلان کے چہرے پر ہمیشہ طمانیت دیکھ کر اس کا حوصلہ اور ہمت بڑھ جایا کرتی تھی۔ ارسلان کا ساتھ اس کے لیے ایسا ٹانک تھا جو اس کی روح کی گہرائیوں سے ڈر اور خوف کو دور کرنے کے کام آتا رہا۔ جس جذبہ شوق سے ستر لڑکوں نے پاکستان ایئر فورس کو جوائن کیا تھا۔ وہ قابل تحسین تھا۔ جب گریجویشن کا وقت آیا تو ان کے کئی پیارے ساتھی آدھے راستے سے ہی واپس پلٹ گئے تھے دو سال کی ٹریننگ کے بعد صرف بیس لڑکے گریجویٹ ہونے میں کامیاب ہوئے تھے۔

پریڈ سے قبل پائلٹ آفیسر کا رینک چیف گیسٹ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ان کی یونیفارم پر لگا کر انہیں عزت بخشی تھی۔ ارسلان نے بیسٹ پائلٹ ٹرافی اور اکیڈیمک ٹرافی حاصل کرنے کے بعد سورڈ آف آنر (جو کہ ہر پائلٹ کا حسین و دلنشین خواب ہوتا ہے) کا اعزاز حاصل کیا۔

گریجویشن پریڈ کے موقع پر کیڈٹس کے والدین اس فنکشن کی اہمیت اور اپنی خوشی کو دوبالا کرنے کی خاطر دور دراز علاقوں سے تشریف لائے تھے۔ مگر ارسلان آج بھی تنہا تھا اس کی کامیابی کی خوشی میں اس کا کوئی رشتہ دار وہاں موجود نہ تھا۔ ارسلان کے چہرے پر اداسی یا مایوسی کی ہلکی سی رمق بھی نہیں تھی۔ شاید اسے اپنوں سے توقع نہ تھی یا اسے ان کی طرف سے اس بے پروائی کی عادت ہوچکی تھی۔ کیونکہ پبلک اسکول سے لے کر اکیڈمی تک کا سفر اس نے اکیلے ہی کاٹا تھا۔ اس سے کوئی ملنے آتا تھا نہ ہی اس نے کبھی کسی کو ٹیلیفون کرنے کی تکلیف گوارا کی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا گھر والوں سے رابطہ خط و کتابت تک ہی محدود ہو۔ کوئی بھی اس کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کی باتوں سے محض اتنا سا اندازا ہوا تھا کہ وہ کسی ریموٹ ایریا کا باشندہ ہے۔ جہاں بجلی پانی کی آسائشات کا تصور ہی نہیں کیا جاتا اس کے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟ کسی نے کبھی سوال کیا نہ اس نے بتانا ضروری سمجھا۔ کیونکہ بعض اوقات بے نیازی اور لاپروائی انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحفے کی صورت میں بخشی جاتی ہے۔ جس سے صنف نازک پہلے دن سے ہی محروم ہوتی ہیں۔ بات سے بات نکال کر کریدنا اور دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی کرنا اور ان کے لیے جذباتی ہوجانا عورت کا ہی شیوہ ہے۔ مرد اس احساس سے نابلد ہوتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ جواد ارسلان کی قربت میں بھی اس کے خاندان سے واقف نہ ہوسکا گریجویشن پریڈ کے بعد جب سب مع والدین کے چائے کے لیے ڈائننگ ہال کی طرف جارہے تھے اس وقت ارسلان جوان حسیناؤں کے جھرمٹ میں کسی روشن ستارے کی طرح چمکتا دمکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ یہ کمال اس کی جوانی اور مردانہ وجاہت کا ہرگز نہ تھا۔ اس کے پس پشت اس کی اعلا کارکردگی کے بدلے میں سورڈ آف آنر اور میڈلز کی عزت و تکریم اور وقار پوشیدہ تھا۔

چائے کے دوران بھی وہ اپنوں کی عدم موجودگی کے باوجود تنہا نہیں تھا۔ وہ قابل ستائش کامیابی پر مسرت و انبساط میں سرشار جھوم رہا تھا۔ چہرہ اندرونی کیفیات کی غمازی کررہا تھا۔ کیڈٹس کی بہنیں اور کزنز اس سے ایڈریس لینے کے لیے بے قرار تھیں۔ اس سے آٹو

گراف لینے کی چاہ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں تھیں۔ آخر تمام کارروائی ختم ہونے کے بعد سب اپنے پیرنٹس کے ہمراہ ایک مہینے کی چھٹی پر اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔

تعطیلات کے بعد ان کی فرسٹ پوسٹنگ کراچی ماری پور ایئربیس مسرور ہو گئی۔ وہ اسی گمان میں تھے کہ اب ہم فائٹر پائلٹ بن چکے ہیں اور مسرور بیس پر ہماری آمد کی خوشی میں ہمیں زور و شور سے خوش آمدید کہا جائے گا۔ مگر افسوس کہ ایسا ناقابل فراموش کوئی دھماکہ نہ ہوا۔ جاتے ہی انہیں ایڈوانس جیٹ ٹریننگ سے آگاہ کیا گیا۔ T33 ایک امریکن جہاز تھا۔ جو جسامت کے لحاظ سے کافی بارعب اور فلائنگ کے لیے خاصا مشکل لگا تھا۔ اب انہیں محسوس ہوا کہ رسالپور کے دو سال کا عرصہ تو جیسے عیش و عشرت کے سوا اور کچھ نہ تھا جیسے نوشتہ تقدیر نے تمام مصیبتیں اور اذیتیں تو اس پوسٹنگ میں درج کر ڈالی ہیں۔ پھر سے فلائنگ چیلنج بن کر سامنے ابھری چھ مہینے کی اس ٹریننگ کے بعد افسران میں سے پانچ لوگ اس ٹریننگ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور وہ اپنی حسرتوں کو سینے سے لگائے اشکبار آنکھوں سے فائٹر جہاز کو الوداع کہہ کر ٹرانسپورٹ جہاز C-130 اور ہیلی کاپٹر کے لیے منتخب ہو گئے۔ جبکہ جواد بھی فائٹر فلائنگ سے نکلتے نکلتے ہی بچا تھا گو کہ اس کا گریڈ بہت لو تھا۔

جبکہ ارسلان ہمیشہ کی طرح آج بھی کامیاب و کامران تھا۔

کامیاب ہونے والے پندرہ پائلٹس کو F86 لیبر امریکن جہاز پر فلائنگ کے لیے متعین کر دیا گیا۔ سب نے سمجھا کہ اب پراپر طریقے سے ہم فلائنگ کرتے ہوئے اپنے جذبہ شوق کو تقویت پہنچا سکیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ وقت بے وقت ADA اور فلائنگ کی ٹریننگ جاری رہی۔ اس کے مکمل ہونے کے بعد ایئربیس مسرور سے سب کی پوسٹنگ مختلف ایئربیسز پر کی گئی تھی۔ خوش قسمتی سے جواد اور ارسلان کی پوسٹنگ سرگودھا ہو گئی۔ اور وہ دونوں B.O.Q.S یعنی بیچلر آفیسر کوارٹرز میں وہ ایک کمرے میں شفٹ ہو گئے۔ بیٹ مین نے نہایت اپنائیت اور خلوص سے ان کی پیکنگ کھولی اور ان کے تمام یونیفارمز کو وارڈ روب میں لٹکا دیا۔ اور صبح اسکواڈرن کمانڈر سے ملنے کے لیے یونیفارم تیار کیا اور فلائنگ کے لیے کوورآل تیار کرکے ہینگر پر لٹکا دیا اور بوٹ پالش کرکے ان کے آرام کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈنر کمرے میں ہی لے آیا۔ حالانکہ دلی مسرت اور ذہنی سکون کی وجہ سے تھکن کا احساس ہوا نہ ہی نیند نے ان پر غلبہ پایا۔ دونوں اپنے بستر پر لیٹے دیر تک فلائنگ کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ نجانے ان کی آنکھ کب لگی۔ خوشی میں اس کی خبر ہی نہ ہوئی۔ صبح بیٹ مین بیڈ ٹی لے کر ایک جن کی صورت میں حاضر ہوا تو وہ چونک کر جاگے اور وال کلاک کی طرف دیکھ کر چائے پینے لگے۔

غسل سے فارغ ہو کر وہ سرعت سے تیار ہوئے اور ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال کی جانب چلے گئے۔ ان کی چال میں آج بے پناہ خود اعتمادی تھی گردن فخر سے تنی ہوئی تھی اور بھنویں چڑھی ہوئی تھیں۔ جیسے انہوں نے کوہ ہمالیہ گھنٹے بھر میں سر کر لیا ہو۔

اسکواڈرن کمانڈر سے ملاقات کافی تسلی بخش رہی۔ دوسری صبح سات بجے وہ ونگ بریفنگ روم میں تمام نئے اور پرانے، سینئرز اینڈ جونیئرز پائلٹس کے ساتھ سینہ تان کر بیٹھے تھے اور بریفنگ انہماک سے سن رہے تھے۔ سب سے پہلے میٹرولوجی (موسمیات) کا آفیسر پاکستان کے تمام علاقوں کے موسم سے روشناس کرانے لگا۔ اور خاص کر وہ جگہیں جہاں پائلٹس نے فلائنگ کے لیے جانا تھا۔ اس کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔

A.T.C (ایئر ٹریفک کنٹرول) جو ٹاور سے ہی تمام فلائنگ کو کنٹرول کرتے ہیں فلائنگ کتنی بلندی پر ہونی چاہیے اور اس کا دورانیہ کیا ہو گا جہاز اسٹارٹ اور لینڈنگ کا وقت اور فلائی کرتے ہوئے تمام رستوں کا کلیرنس دینے کے کام آتا ہے۔

دوران تمام اسکواڈرن کے پائلٹس میں نئے ضرور تھے۔ مگر انہیں بھی اچھی طرح جانتے تھے وہ خود انتہائی سے اسکواڈرن پائلٹ کا چارمنٹ کا لیکچر سننے میں مگن تھے۔ یہ لیکچر سننا بہت ضروری تھا کیونکہ پائلٹ کو ذہنی طور پر ٹیون کرنے اور میموری فریش کرنے کی بہت ضرورت تھی اس کی اہمیت کو بھولنا گویا حادثے کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

اس کے بعد ایمرجنسی سیشن چل نکلا کہ اگر جہاز کسی بھی فنی خرابی کا شکار ہو جاتا ہے تو اس سچویشن کو ہینڈل کیسے کیا جائے گا۔ ارسلان نے سب سے پہلے ہی اس کا جواب نہایت تفصیل سے دے ڈالا کیونکہ اس نے C-130 میں اپنے سفر کے دوران ایمرجنسی پروسیجر کا خوب رٹا لگایا تھا۔

تمام وقت ٹیکنیکل بک اور پائلٹ بک اس کی ہم سفر رہی تھی۔ جو سیبر F-86 کے ہر پرزے کے نالج میں اضافہ کرنے کے کام آتی تھی۔ جواد نے بھی چیک لسٹ میں تمام پروسیجر کو سرسری طور پر دیکھا اور مطمئن ہو گیا تھا۔

ارسلان کے بعد جواد کی باری تھی۔ اس نے بھی بھرپور خود اعتمادی کا اظہار کیا۔ اسکواڈرن پائلٹ نے جن پائلٹس میں ہلکی سی کمزوری اور لاپروائی کو محسوس کیا۔ انہیں ڈانٹ ڈپٹ سے خوب نوازا گیا۔ کیونکہ فلائنگ مذاق تو تھی نہیں۔ ذرا سی غلطی اور معمولی سی پروسیجر میں تبدیلی موت کا سبب بن سکتی تھی۔

پچھلی سیٹ پر فلائیٹ سرجن سب کے بی ہیویر کا جائزہ لے رہا تھا۔ کیونکہ تمام چیک اپ کے علاوہ اس کا کام سائیکالوجسٹ کا بھی تھا۔ اس نے بہت جلد ہی دونوں کو فلائنگ کے لیے کلیئر کر دیا۔ ارسلان کی آنکھوں میں تجسس تھا کیونکہ اسے خود پر مکمل بھروسا اور اعتماد تھا۔ وہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ اور جواد کو خود پر اتنا مستحکم یقین نہ تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی حسب عادت وہ خود کو اندر اسٹیبٹ کر رہا تھا۔ اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر سب فلائنگ کے لیے نکل پڑے۔ کوکر میں فقط ایک ہی سیٹ تھی جو پائلٹ کی تھی۔ وہ دوسرے جہاز میں انسٹرکٹر ریڈیو (جو ہیلمٹ میں فٹ تھا) پر ان سے رابطے میں تھا۔ پہلی مرتبہ سب جہاز میں اکیلے تھے اور جواد کی ٹانگیں موت کے ڈر سے کانپ رہی تھیں۔ اس کی آواز میں بھی لرزش تھی جسے انسٹرکٹر نے محسوس کرکے اسے بے تحاشا تسلی و تشفی دی تھی۔ اور پھر وہ جوں جوں آسمان کی وسعتوں کو چھو رہا تھا اس کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔ اس فائٹر کنورین میں ناکام ہونا سب کے لیے باعث ندامت تھا۔ اس لیے سبھی چیک لسٹ کے مطابق نہایت احتیاط سے فلائنگ کر رہے تھے۔ جبکہ ارسلان بلا خوف و خطر اپنی جان کی پروا کیے بغیر فلائنگ کر رہا تھا۔ اس دن جواد کو محسوس ہوا کہ فائٹر فلائنگ بہادری بے باکی اور سچے جذبے کا نام ہے۔ اس دن کے بعد اس کے شوق میں بے خوفی اور دلیری بھی شامل ہو گئی اور وہ اپنے آئیڈیل ارسلان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پر سکون ہو گیا۔

گریجویٹ ہونے کے بعد انہیں جس خواب کے پورے ہونے کا انتظار تھا۔ اس کی خوش آئند تعبیر میں دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ اور اب وہ خود کو فخر سے فائٹر پائیلٹ کہنے کے قابل ہو گئے۔ جو افسران یہاں مار کھا گئے وہ چکلالہ بھیج دیئے گئے۔ یہ کیسی زندگی تھی کہ ہر لمحے اپنی قابلیت کو امتحان میں ڈال کر دوسروں کے سامنے سرخرو ہونے میں کامیابی اور ترقی کا راز پوشیدہ تھا۔ اب سب محاذ جنگ پر جانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

انہیں ایک سو پچاس گھنٹے کی فلائنگ کے بعد پیئر لیڈر بنا دیا گیا تھا۔ اب سب جونیئرز کی ٹریننگ کرنے میں پیش پیش تھے۔ یہاں کی فلائنگ سے سسپینڈ ہونے والا افسر بمبار طیارے B52 پر بھیج دیا جاتا تھا۔ جو ایک افسر کے لیے سزا سے کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ فلائنگ کے دوران ریڈیو پر نام لینے کے بجائے ہر پائیلٹ کو کال سائن دیا جاتا تھا۔ پہلے غیر مذہبی نام سائن کیے جاتے تھے بعد میں اسلامی ہیروز کے نام

دیے گئے۔

کچھ عرصے بعد جواد اور ارسلان کی پوسٹنگ کراچی ہوگئی۔ کراچی جسے روشنیوں کا شہر کہا جاتا ہے گو کہ وہاں فلائنگ کرنے میں بہت رسک تھا۔ پھر بھی دونوں شاداں و فرحاں تھے۔ جواد نے موٹر بائیک قسطوں پر خرید لی تھی۔ ہر شام ارسلان اور وہ شہر کی طرف رخ کر لیتے تھے جبکہ جیب میں رزق حلال کے چند نوٹ انہیں پرلے درجے کی خوشی مہیا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا کرتے تھے۔

اتنی طویل ٹریننگ کے بعد ان کی زندگی کا یہ نیا سفر انہیں خاصا خوش آئند اور مبارک لگا تھا۔ کم از کم اسکواڈرن میں انہیں پائیلٹ کے عظیم نام سے پکارا جانے لگا تھا۔

کراچی میں قیام کے دوران جواد نے محسوس کیا جگری یار اس سے مشورہ لیے بغیر ہی کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو چکا ہے۔ اسے اس انکشاف پر شاک لگا تھا۔ کیونکہ اس محاذ پر بھی وہ اس سے سینکڑوں قدم آگے تھا۔ وہ ہر شام اس لڑکی کو آفیسرز میس کے ٹیلیفون سے کال بک کراتا تھا۔ رینک کے مطابق اس کی باری کہیں آدھی رات کو آتی تھی۔

مگر ارسلان ان عاشقوں میں سے ایک ایسا عاشق تھا جو اپنی باری کے انتظار میں ٹیلیفون کی بیل پر کان لگائے تحمل سے بیٹھا رہتا تھا اور جب کال ملتی اور تین منٹ کے حسین لمحے پلک جھپکتے گزر جاتے تو وہ تشنگی کے عالم میں آہیں بھرتا ہوا اپنے کمرے میں آجاتا۔ اس کی آمد سے جواد چونک کر جاگتا اور فوراً اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھ کر اسے ملامتی انداز سے گھورتا۔

☼ ☼ ☼

جواد ارسلان کی روٹین سے تنگ آکر ایک دن چیخ پڑا۔

"ارسلان مجھے تمہاری یہ روٹین قطعاً" پسند نہیں۔ اگر تمہیں خود پر رحم نہیں آرہا تو خدا کے لیے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کی خوشیوں کا ہی دھیان کرلو۔ انہیں جیتے جی جہنم رسید کرنے کا جو تم نے پروگرام بنا رکھا ہے یہ ان پر بہت بڑی زیادتی اور ظلم ہے۔" جواد نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا مگر وہ خاموشی سے اسے تکنے لگا۔

"تین منٹ کی کال سے تمہیں کیا حاصل ہوا ماسوائے بے تابی اور تشنگی کے۔ سراسر خسارے کا سودا ہے اس سے دو ٹوک بات کرو۔ کہ تم اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اور اس کے انکار پر تم جہاز سے کود جانے کا فیصلہ بھی کر چکے ہو۔" جواد کے لہجے میں قدرے سختی تھی۔

"میری کم عمری ہمارے درمیان اک فولادی دیوار کی طرح حائل ہے۔ میں ایئر فورس کے لا اینڈ ریگولیشن کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھانا چاہتا۔ کیونکہ میں نے صدق دل سے قرآن پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھایا ہے۔ مگر میری جاب مجھے پیار کرنے سے تو نہیں روک سکتی۔ جہاں فلائنگ میری روح کی غذا ہے۔ وہاں دل میرے وجود میں خون کی حدت سے مجھے جینے کے گر سکھاتا ہے۔ میں قانونی اصلاح میں ترمیم کر سکتا ہوں نہ ہی اس سے انکار کرتا ہوں انہونی اور غیر مناسب بات ہے کہ چوبیس سال کا ہونے کے باوجود ایئر فورس کے قانون میں میں ابھی شادی کے قابل نہیں ہوا۔ ایک کھلنڈرا اور لاابالی بچہ ہوں ابھی تک جواد تم سچ ہی تو کہتے ہو جسے ماننے کو دل نہیں چاہتا۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"چھبیس سال پورے ہونے میں ابھی دو سال باقی ہیں۔ اس سے خط و کتابت پر ہی گزارا کرو فون کا پیچھا چھوڑو۔ آج کے خطوط تمہارے کل میں خوشنما رنگ بھردیں گے۔" جواد نے سنجیدگی سے کہا "ڈیٹ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کیسی عجیب باتیں کرتے ہو۔ جس سے اپنی نسل بڑھانے کا ارادہ ہو اس سے ڈیٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ ناراضی سے بولا۔

"چلو تمہارا تجسس و اشتیاق ختم کرتا ہوں کہ بعض اوقات رانگ نمبر زندگی کی حسین راہ دکھاتا ہے دو

گھنٹے کی گفتگو کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اسے رانگ نمبر کہنا زیادتی ہے۔ یہ تو بہت درست نمبر تھا۔" جواد ایک جھٹکے سے بیٹھ گیا۔ چہرے پر مسرت رقصاں تھی۔

"مجھے بھی اس نیک کام میں شامل رکھتے تو کتنا مزا آتا۔ مگر تمہیں تو غیرت ہی لے بیٹھی۔"

"بھی سمجھو ویسے تم چھٹی پر تھے۔ اس مبارک دن گھڑی زدوروں پر تھی۔ دوپہر گزرنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ تم بھی غائب تھے۔ سوچا دوپہر کاٹنے یخ بستہ سینما ہال چلتے ہیں۔ دوپہر بھی کٹ جائے گی اور فلم بھی میری پسند کی ہے اور پھر وہ دوپہر یادگار بن گئی وہ اتفاقاً" وہاں موجود تھی۔ میرے پہلو میں بیٹھی فلم دیکھتے ہوئے مجھ سے مسلسل کمنٹس شیئر کرتی رہی میں نے اسے آواز سے پہچان لیا تھا۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو وہ بری طرح میرے ہوش و حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے گھر کا نمبر بھی میرے کہے بغیر مجھے لکھوا دیا مگر اس نے میرا نمبر لینے کی خواہش کا ہلکا سا اظہار بھی نہ کیا تھا۔ میں بہت حیران تھا۔ کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟" وہ خاموش ہو کر کہیں کھو سا گیا تھا۔

"بڑی پچھے دار کہانی ہے آگے بولو۔" جواد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دوسرے ہی دن میں نے اس کے گھر فون کیا تو اس کی چھوٹی بہن نے فون اٹھایا۔ میں نے اسے اپنا تعارف کرانے میں ہچکچاہٹ محسوس کی۔ لیکن وہ میرے بارے میں سب کچھ جان چکی تھی میری آواز سنتے ہی اس نے شمائلہ کو آواز دی۔ باجی آپ کا دلِ پھینک فائٹر پائیلٹ۔ ساتھ ہی ایک تمسخرانہ نسوانی قہقہہ ابھرا اور میں شمائلہ کی آواز میں کھو گیا۔ اور پھر اپنی ذلت سے ایسا لاتعلق ہوا کہ آج تک ہوش نہیں آیا۔ مجھے اس کی بہن نے جو لقب دیا تھا خوب لگا۔" ارسلان نے تکیہ درست کیا اور پھر لیٹ گیا۔

"اب تم تسلی سے سو جاؤ کیونکہ اس کے آگے کی کہانی نجانے کیا روپ اختیار کرلے تم میرے لیے ہر وقت دعا کیا کرو۔" ارسلان نے سنجیدگی سے کہا اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"ارسلان تم نے تو خوب لمبا ہاتھ مارا ہے۔ سچ مچ بھابھی کسی پرستان کی باسی معلوم ہوتی ہیں۔ اتنی حسین نیچر کو قابو میں کرنا ذرا مشکل ہے۔ دوسرا یہ سوچ لو کہ کراچی کی پیداوار ہے۔ یہاں کی لڑکیاں پنجاب کی لڑکیوں سے قدرے مختلف ہیں۔" جواد نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اخلاقاً" اصولاً" یا مزاجاً"؟" ارسلان کچھ نہ سمجھ کر حیرت سے بولا۔

"عورت کا مزاج تو دنیا کے ہر حصے میں ایک دوسرے سے ننانوے فیصد مشابہت رکھتا ہے۔ میں اصول و اخلاق کی بات کر رہا ہوں۔ کیا شمائلہ بھابھی تمہارے ماحول میں ایڈجسٹ ہو سکتی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے لیے مسائل کھڑے ہو جائیں۔" جواد نے برادرانہ انداز میں کہا تو ارسلان ہنسنے لگا۔

"میری بات کو ہنسی مذاق میں ٹالنے کی کوشش مت کرو۔" جواد نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو سب ٹھیک ٹھاک ہے۔" وہ تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"اس وقت تمہاری آنکھوں پر عشق کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ ذہن و قلب پر دیوانگی نے غلبہ پا رکھا ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ شادی کے فوراً" بعد تمہیں ازدواجی زندگی گزارنے کے تمام بنیادی اصول بہت اہم محسوس ہونے لگیں گے۔ اگر اس نے تمہاری سوچ سے اتفاق نہ کیا تو پھر کیا ری ایکشن ہوگا تمہارا۔ ذرا یہ سوچ لو ابھی سے۔" جواد نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"دادا ابو! تھینک یو سو مچ۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں راز کی۔ تم جانتے ہو کہ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ تو سنو کہ شمائلہ موافق اور ناموافق ہر حال میں میرا ساتھ دے گی۔ میرے کہنے کی دیر تھی اس نے بلا تامل جاب چھوڑنے کا تہیہ کر لیا۔ اسے کہتے ہیں تابعداری اور فرمانبرداری۔ میری مجبوری کا سن کر وہ

مجھے گھر نہ ملنے کی صورت میں میرے پیرنٹس کے ساتھ رہنے کے لیے صدق دل سے تیار ہے۔ اب اس سے بڑھ کر تمہیں اور کیا گارنٹی دوں۔ میرا دل و روح مطمئن ہے۔ تم دیکھنا دو سال پلک جھپکتے ہی گزر جائیں گے۔ پھر بیس پر کوئی شیلٹر تو مل ہی جائے گا۔ تمام سہولتیں حاصل کر سکوں گا۔ جب دل اداس ہو گا C130 زندہ باد۔ مجھے کوئی گمبھیر مسئلہ نظر نہیں آرہا۔ میرا گھر چکلالہ سے ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر تو ہے کوئی مشکل نہیں۔ عشق میں تھل کے ریگستان بھی سرسبز دکھائی دیتے ہیں۔" وہ پرسکون لہجے میں بولا۔

"یعنی آگ دونوں طرف برابر لگنے کی وجہ سے سوچ و سمجھ پر تالے لگ چکے ہیں۔ کراچی کی لڑکی دو سال کے لیے پنجاب کے گاؤں میں کیسے رہے گی وہ بھی شوہر کے بغیر' جاب کے بغیر۔ سسرال کی خدمت گزاری کیسے کر سکتی ہے؟ گاؤں کی لائف کو تم جانتے ہو۔ قید تنہائی ہے وہاں۔ پھر آسائشات کی کمی اور وہاں کی سیاست معاشرت اور حد درجے کا بے تکلفانہ رویہ و سلوک یہ سب اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گا۔ اس وقت وہ وعدے وعید کیے جا رہی ہے۔ دو زندگیوں کی خوشیوں کا سوال ہے۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری جاب ریکوائرمنٹس میں تمہارا ذہنی طور پر پرسکون رہنا کتنا اہم ہے۔" جواد نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"یار اس وقت تم میرا ساتھ دینے کا سوچو۔ والدین کا پنجاب سے یہاں آنا بارات کے ساتھ اور شادی کر کے ہمیں گاؤں لے جانا بہت مشکل ہے۔ تم اس مسئلے کا حل سوچو۔ میری خوشی کی خاطر میرے والدین نے ہر فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے۔ جبکہ مجھے علم ہے کہ گاؤں کے رسم و رواج اور رشتے داروں کے طعنے و تشنے انہیں چین نہیں لینے دیں گے۔ پھر بھی انہوں نے فراخدلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جواد والدین جیسا میٹھا رشتہ تو کسی اور سے استوار ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل میری اماں جی کی دور اندیشی اور دانشمندی کا جواب ہی نہیں۔" ارسلان نے عقیدت مندانہ لہجے میں کہا۔

"مطلب یہ ہوا کہ تم میری ایک نہیں سنو گے۔ بلکہ اس کھیل تماشے میں مجھے برابر کا شریک ہونا پڑے گا۔" جواد نے مسکرا کر کہا۔

"اب پروگرام بناؤ اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے بارے میں سوچو۔ ولیمہ کا فنکشن گاؤں میں ہی ہو گا۔ اس سے پہلے کے تمام کام تمہارے ذمے۔ میں کچھ نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گا۔" ارسلان نے کہا۔

☼ ☼ ☼

شانے پر ایک پٹی کا اضافہ ۔۔۔ ان کے رگ و پے میں طمانیت اور غرور سرائیت کر گیا۔ جیسے ان جیسا دھماکہ خیز پائلٹ تو اس ایئر فورس میں پیدا ہوا ہے نہ ہی مستقبل میں اس کے امکان ہیں۔ فلائٹ لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد دونوں کی پوسٹنگ لازم تھی۔ دونوں سینئر پائلٹ بن کر چار جہازوں کو لیڈ کرنے لگے تھے۔ مسرور میں ہی ایک اسکواڈرن سے دوسرے دو اسکواڈرن میں ان کی پوسٹنگ ہو گئی اور دونوں کا نام سینئر پائلٹس کی فہرست میں لکھا جانے لگا۔ اسکواڈرن کمانڈر نے ارسلان کو شادی کرنے کی اجازت تو دے دی۔ مگر بیس پر گھر اور باقی تمام فسیلٹیز دینے سے انکار کر دیا کیونکہ چھبیس سال کی عمر سے پہلے کسی بھی افسر کا شادی کرنا ایئر فورس میں قانوناً "ممنوع" تھا۔ ارسلان کو اسی جواب کی توقع تھی۔ اس لیے اسے یہ سن کر شاک نہ لگا تھا۔ فوراً "یہ خوشخبری شمائلہ کے گوش گزار کی۔ دونوں نے اجازت نامے کو ہی غنیمت جانا۔

☼ ☼ ☼

"پتر ایک بار پھر سوچ لو کہ شہری لڑکی اس گاؤں میں کتنے دن رہ سکتی ہے۔ یہ تمام وعدے اور خوش فہمیاں شادی سے پہلے کی ہوتی ہیں۔ جوانی دودھ کا ابال ہے پتر۔" ارسلان کے والد راجہ حکم داد نے بیٹے کی خواہش سن فکر مندی سے کہا۔

"راجہ جی اگر ہمارا بچہ خوش ہے تے انکار نہ کرو۔ میرے اس لاڈلے بچے کے لیے ذات برادری وچ تے

لڑکی ہے نہیں۔ آخر تو انوں بہو غیروں سے ہی لانی ہوگی۔ کہاں جگہ جگہ ڈھونڈو گے۔ اب اتنی ہمت ہے نہ ہی ہمارے پاس زیادہ وقت ہے۔" ماں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"بات تو ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ اس پڑھے لکھے پائلٹ بیٹے کے لیے ہم کس کا در کھٹکائیں گے۔ آج تک گاؤں سے باہر نہ میں نے قدم رکھا ہے نہ ہی تم کسی پڑھے لکھے خاندان کو جانتی ہو۔ میری زندگی اسکول کی نوکری میں اور تمہاری اس گھر کے اندر بچے پالنے میں ہی گزر گئی۔" والد نے گہری سوچ بچار سے حقے کے لمبے کش لے کر کہا۔

"آپ کی اجازت اور فقط آپ کی دعائیں چاہئیں۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ دیں۔" ارسلان نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"اگر اس نے یہاں رہنے سے انکار کر دیا تو پھر کیا کرو گے؟ اتنے بڑے شہر میں کرائے پر گھر لینا آسان نہیں۔ اس تنخواہ سے بجلی پانی کے بل کیسے ادا کرو گے؟ یہاں تمہاری بہن کا جہیز بن رہا ہے۔ تمہاری مدد کے بغیر تو تمہاری بہن اسی چوکھٹ پر بیٹھی رہ جائے گی۔"

والد نے عینک درست کرتے ہوئے غور سے بیٹے کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

"راجہ جی! ہماری مجبوریاں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ کیا بچے کو کنوارہ بٹھانے دا ارادہ اے۔ دوسرے بیٹوں سے بات کرو۔ آخر وہ بھی تو ہماری اولاد ہیں نا۔ کیا مجال کہ کبھی پھوٹی کوڑی دینے کے روادار ہوئے ہوں۔" شماں نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

"تسی ہی کچھ نہیں کہندے۔" "بھلے لوک۔ وہ تینوں افسر نہیں ہیں۔ مشکل سے اپنا گزارا کرتے ہیں۔ ان سے خفا نہ ہوا کر۔ ان کی انکم کم مگر اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ سمجھا کر۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"اس پر تو افسر بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ چند سال رک جاتے تو بہتر تھا۔ ہمارے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ پھر شادی کا سوچے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟"

"ابا جی۔ آپ کی ماہوار بند نہیں کروں گا۔ یہ وعدہ ہے میرا۔ جب تک مجھے گھر نہیں ملتا وہ آپ کے پاس رہنے کے لیے تیار ہے۔ دال روٹی پر بھی صبر و شکر کر لے گی۔ آپ بالکل فکر مند نہ ہوں۔" ارسلان نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

"یہ بہت چھوٹے مسئلے ہیں۔ ہر لڑکی اپنے سسرال میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش تو کرتی ہی ہے۔ اور پھر وہ تو ہے بھی بہت عقلمند۔ یہ تو میں آپ کو گارنٹی دے سکتا ہوں۔ کہ آپ کو وہ بہت خوش رکھے گی۔" ارسلان نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"اپنی ماں کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤ۔ یہی براتی ہے اور یہی دلہے کی ماں ہے۔ ولیمہ اپنی برادری رشتے داروں میں کرنا بہت ضروری ہے۔ جب اسے چھوڑنے آؤ گے تو پھر ہم کچھ رونق کر لیں گے۔" والد نے سنجیدگی سے کہا۔ تو ارسلان کا دل بلیوں اچھلا۔

"زیور کپڑے کی فکر نہ کریں۔ وہ اپنی پسند کی چیزیں خود بنا لے گی۔ خصوصاً" کپڑے کیونکہ پسند میں بہت فرق ہے۔" ارسلان نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یار فکر کیوں کرتے ہو۔ آنٹی تمہارے ساتھ آرہی ہیں۔ خوشی کی بات ہے نہ کہ پریشانی کی۔ میں اپنے کولیگ کے کمرے میں شفٹ ہو جاؤں گا چند دنوں کی تو بات ہے۔ تم جلد از جلد پہنچو۔ تمام دوست بہت ایکسائیٹڈ ہیں۔" جواد مسرور لہجے میں بول رہا تھا۔

"کل صبح آٹھ بجے C-130 سے میں آرہا ہوں پی آئی اے کی فلائٹ کا وقت ساڑھے سات بجے ہے ہو سکتا ہے۔ C130 لیٹ ہو جائے۔ تم اماں کو ایئر پورٹ سے ریسیو کر لینا۔ ورنہ وہ بہت پریشان ہو جائیں گی۔" ارسلان نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

"انہیں کیسے پہچانوں گا۔" جواد نے سنجیدگی سے کہا۔

"ان کی پہچان مشکل نہیں فلائیٹ کے پسنجرز میں سے سب سے سادہ لوح خاتون میری ماں ہو گی۔ گھبرائی

مجھے گھر نہ ملنے کی صورت میں میرے پیرنٹس کے ساتھ رہنے کے لیے صدق دل سے تیار ہے۔ اب اس سے بڑھ کر تمہیں اور کیا گارنٹی دوں۔ میرا دل و روح مطمئن ہے۔ تم دیکھنا دو سال پلک جھپکتے ہی گزر جائیں گے۔ پھر بیس پر کوئی شیلٹر تو مل ہی جائے گا۔ تمام سہولتیں حاصل کر سکوں گا۔ جب دل اداس ہوگا C130 زندہ باد۔ مجھے کوئی گمبھیر مسئلہ نظر نہیں آرہا۔ میرا گھر چکلالہ سے ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر تو ہے کوئی مشکل نہیں۔ عشق میں تھل کے ریگستان بھی سرسبز دکھائی دیتے ہیں۔" وہ پرسکون لہجے میں بولا۔

"یعنی آگ دونوں طرف برابر لگنے کی وجہ سے سوچ و سمجھ پر تالے لگ چکے ہیں۔ کراچی کی لڑکی دو سال کے لیے پنجاب کے گاؤں میں کیسے رہے گی وہ بھی شوہر کے بغیر، جاب کے بغیر۔ سسرال کی خدمت گزاری کیسے کرسکتی ہے؟ گاؤں کی لائف کو تم جانتے ہو۔ قید تنہائی ہے وہاں۔ پھر آسائشات کی کمی اور وہاں کی سیاست معاشرت اور حد درجے کا بے تکلفانہ رویہ و سلوک یہ سب اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگا۔ اس وقت وہ وعدے وعید کیے جارہی ہے۔ دو زندگیوں کی خوشیوں کا سوال ہے۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری جاب ریکوائرمنٹس میں تمہارا ذہنی طور پر پرسکون رہنا کتنا اہم ہے۔" جواد نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"یار اس وقت تم میرا ساتھ دینے کا سوچو۔ والدین کا پنجاب سے یہاں آنا بارات کے ساتھ اور شادی کر کے ہمیں گاؤں لے جانا بہت مشکل ہے۔ تم اس مسئلے کا حل سوچو۔ میری خوشی کی خاطر میرے والدین نے ہر فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے۔ جبکہ مجھے علم ہے کہ گاؤں کے رسم و رواج اور رشتے داروں کے طعنے و تشنے انہیں چین نہیں لینے دیں گے۔ پھر بھی انہوں نے فراخدلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جواد والدین جیسا بیشمار رشتہ تو کسی اور سے استوار ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل میری اماں جی کی دوراندیشی اور دانشمندی کا جواب ہی نہیں۔" ارسلان نے عقیدت مندانہ لہجے میں کہا۔

"مطلب یہ ہوا کہ تم میری ایک نہیں سنو گے۔ بلکہ اس کھیل تماشے میں مجھے برابر کا شریک ہونا پڑے گا۔" جواد نے مسکرا کر کہا۔

"اب پروگرام بناؤ اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے بارے میں سوچو۔ ولیمہ کا فنکشن گاؤں میں ہی ہوگا۔ اس سے پہلے کے تمام کام تمہارے ذمے۔ میں کچھ نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگا۔" ارسلان نے کہا۔

☼ ☼ ☼

شانے پر ایک پٹی کا اضافہ ان کے رگ و پے میں طمانیت اور غرور سرائیت کر گیا۔ جیسے ان جیسا دھماکہ خیز پائلٹ تو اس ایئر فورس میں پیدا ہوا ہے نہ ہی مستقبل میں اس کے امکان ہیں۔ فلائٹ لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد دونوں کی پوسٹنگ لازم تھی۔ دونوں سینئر پائلٹ بن کر چار جہازوں کو لیڈ کرنے لگے تھے۔ مسرور میں ہی ایک اسکواڈرن سے دوسرے دو اسکواڈرن میں ان کی پوسٹنگ ہوگئی اور دونوں کا نام سینئر پائلٹس کی فہرست میں لکھا جانے لگا۔ اسکواڈرن کمانڈر نے ارسلان کو شادی کرنے کی اجازت تو دے دی۔ مگر بیس پر گھر اور باقی تمام فسیلٹیز دینے سے انکار کر دیا کیونکہ چھبیس سال کی عمر سے پہلے کسی بھی افسر کا شادی کرنا ایئر فورس میں قانوناً "ممنوع" تھا۔ ارسلان کو اسی جواب کی توقع تھی۔ اس لیے اسے یہ سن کر شاک نہ لگا تھا۔ فوراً "یہ خوشخبری شمائلہ کے گوش گزار کی۔ دونوں نے اجازت نامے کو ہی غنیمت جانا۔

☼ ☼ ☼

"پتر ایک بار پھر سوچ لو کہ شہری لڑکی اس گاؤں میں کتنے دن رہ سکتی ہے۔ یہ تمام وعدے اور خوش فہمیاں شادی سے پہلے کی ہوتی ہیں۔ جوانی دودھ کا ابال ہے پتر۔" ارسلان کے والد راجہ حکم داد نے بیٹے کی خواہش سن فکرمندی سے کہا۔

"راجہ جی اگر ہمارا بچہ خوش ہے تے انکار نہ کرو۔ میرے اس لاڈلے بچے کے لیے ذات برادری دوچ تے لڑی ہے نہیں۔ آخر تو انوں بھو غیروں سے ہی لانی ہوگی۔ کہاں جگہ جگہ ڈھونڈو گے۔ اب اتنی ہمت ہے نہ ہی ہمارے پاس زیادہ وقت ہے۔" ماں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"بات تو ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ اس پڑھے لکھے پائلٹ بیٹے کے لیے ہم کس کا در کھٹکائیں گے۔ آج تک گاؤں سے باہر نہ میں نے قدم رکھا ہے نہ ہی تم کسی پڑھے لکھے خاندان کو جانتی ہو۔ میری زندگی اسکول کی نوکری میں اور تمہاری اس گھر کے اندر بچے پالنے میں ہی گزر گئی۔" والد نے گہری سوچ بچار سے حقے کے لمبے لمبے کش لے کر کہا۔

"آپ کی اجازت اور فقط آپ کی دعائیں چاہئیں۔ باقی سب مجھ پر چھوڑیں۔" ارسلان نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"اگر اس نے یہاں رہنے سے انکار کر دیا تو پھر کیا کرو گے؟ اتنے بڑے شہر میں کرائے پر گھر لینا آسان نہیں۔ اس تنخواہ سے بجلی پانی کے بل کیسے ادا کرو گے؟ یہاں تمہاری بہن کا جہیز بن رہا ہے۔ تمہاری مدد کے بغیر تو تمہاری بہن اسی چوکھٹ پر بیٹھی رہ جائے گی۔" والد نے عینک درست کرتے ہوئے غور سے بیٹے کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

"راجہ جی! ہماری مجبوریاں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ کیا بچے کو کنوارہ بٹھانے دا ارادہ اے۔ دوسرے بیٹوں سے بات کرو۔ آخر وہ بھی تو ہماری اولاد ہیں نا ۔ کیا مجال کہ کبھی پھوٹی کوڑی دینے کے روادار ہوئے ہوں۔" ماں نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

"تسی ہی کچھ نہیں کہندے۔" "بھلیے لوکے۔ وہ تینوں افسر نہیں ہیں۔ مشکل سے اپنا گزارا کرتے ہیں۔ ان سے خفا نہ ہوا کر۔ ان کی انکم کم مگر اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ سمجھا کر۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"اس پر تو افسر بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ چند سال رک جاتے۔ تو بہتر تھا۔ ہمارے حالات بہتر ہوجائیں گے۔ پھر شادی کا سوچے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟"

"ابا جی۔ آپ کی ماہوار بند نہیں کروں گا۔ یہ وعدہ ہے میرا۔ جب تک مجھے گھر نہیں ملتا وہ آپ کے پاس رہنے کے لیے تیار ہے۔ دال روٹی پر بھی صبر و شکر کرلے گی۔ آپ بالکل فکرمند نہ ہوں۔" ارسلان نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

"یہ بہت چھوٹے مسئلے ہیں۔ ہر لڑکی اپنے سسرال میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش تو کرتی ہی ہے۔ اور پھر وہ تو ہے بھی بہت عقلمند۔ یہ تو میں آپ کو گارنٹی دے سکتا ہوں۔ کہ آپ کو وہ بہت خوش رکھے گی۔" ارسلان نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"اپنی ماں کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤ۔ یہی براتی ہے اور یہی دلہے کی ماں ہے۔ ولیمہ اپنی برادری رشتے داروں میں کرنا بہت ضروری ہے۔ جب اسے چھوڑنے آؤ گے تو پھر ہم کچھ رونق کرلیں گے۔" والد نے سنجیدگی سے کہا۔ تو ارسلان کا دل بلیوں اچھلا۔

"زیور کپڑے کی فکر نہ کریں۔ وہ اپنی پسند کی چیزیں خود بنالے گی۔ خصوصاً" کپڑے کیونکہ پسند میں بہت فرق ہے۔" ارسلان نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یار فکر کیوں کرتے ہو۔ آنٹی تمہارے ساتھ آرہی ہیں۔ خوشی کی بات ہے نہ کہ پریشانی کی۔ میں اپنے کولیگ کے کمرے میں شفٹ ہوجاؤں گا چند دنوں کی تو بات ہے۔ تم جلد از جلد پہنچو۔ تمام دوست بہت ایکسائیٹڈ ہیں۔" جواد مسرور لہجے میں بول رہا تھا۔

"کل صبح آٹھ بجے C-130 سے میں آرہا ہوں پی آئی اے کی فلائٹ کا وقت ساڑھے سات بجے ہے ہوسکتا ہے۔ C130 لیٹ ہوجائے۔ تم اماں کو ایئرپورٹ سے ریسیو کرلینا۔ ورنہ وہ بہت پریشان ہوجائیں گی۔" ارسلان نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"میں نہیں کیسے پہچانوں گا۔" جواد نے سنجیدگی سے کہا۔

"ان کی پہچان مشکل نہیں فلائیٹ کے پسنجرز میں سے سب سے سادہ لوح خاتون میری ماں ہوگی۔ گھبرائی

اور پریشان سی مجھے ڈھونڈ رہی ہوگی۔ سفید رنگ کی لمبی چادر میں تم انہیں با آسانی پہچان لو گے۔" ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"او کے۔" جواد بھی ہنس پڑا۔

"آج رات ہم ماں بیٹا چکالہ بیس میں رہیں گے۔ کیونکہ صبح سویرے گاؤں سے آنا بہت مشکل ہے ورنہ ہم دونوں فلائیٹس مس کر دیں گے۔ ارسلان نے سنجیدگی سے کہا۔ "بس تم اماں جی کو وقت پر ریسیو کر لینا۔ اور انہیں کمرے میں چھوڑ دینا۔"

"یار کیوں فکر مند ہو رہے ہو؟ بس تم نے حکم کر دیا ہم نے سر تسلیم خم کر لیا۔"

جواد نے اسے مطمئن کرنے کی خاطر ایک خوشگوار قہقہہ لگا کر کہا تو ارسلان ہنسنے لگا۔ اور شکریہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

اس نے بیرے کو کھانے کا آرڈر دیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی بیرہ ٹرے میں کھانا رکھے کمرے میں داخل ہوا۔ بید کی دو کرسیوں کے سامنے رکھے ہوئے ٹیبل پر اس نے قرینے سے کھانا چن دیا۔ جب وہ باہر نکل گیا تو اماں جی نے کرسی پر بیٹھ کر کھانے کا جائزہ لیا اور چمچہ سے معمولی سا کھانا ہتھیلی پر ڈال کر چکھا۔

"سوئے گوشت کا قیمہ۔ اور مسور کی دال۔ افسروں کو یہ کھانا کھلاتے ہیں۔ نری بیماری۔" وہ نخوت سے بولیں۔

"جی اماں جی۔ مجھے تو اس کھانے کی عادت ہو گئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے آپ کے ہاتھ کے کھانے کبھی بھولتے نہیں۔ پراٹھے پر مکھن کا پیڑہ اور ساتھ گرم دودھ پتی کا پیالہ۔ کیا مزا آتا ہے؟ اور پھر دوپہر میں لسی اور تنور کی بیسن کی روٹیاں۔ اور گھر کا کھیرا اور پیاز اور تازے پودینے کی چٹنی۔ تمام مرغن غذاؤں پر بھاری ہے۔" وہ ماں کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے بولا۔

"تمہاری افسری کا مزا نہیں آیا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ تم بنگلوں میں ٹھہرتے ہو اور جنتی کھانا کھاتے ہو۔ میرا تو یہ کمرہ دیکھ کر دل ہی مندا پڑ گیا ہے۔ چلو ایک فائدہ ہے۔ پنکھے کی ہوا اور بلب کی روشنی کا۔" وہ منہ سا بنا کر بولیں۔ تو ارسلان مسکرا کر رہ گیا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ اپنی جگہ اور اپنے ماحول کو اعلانیہ سمجھا جائے تو وہاں ایک لمحہ گزرنا بھی مشکل ہو جائے۔ جس زندگی کو میں فخر و تکبر سے دیکھتا ہوں۔ اماں نے آتے ہی اس کے نقص نکال دیئے۔ اور پل بھر میں میرا مان مٹی میں ملا دیا۔

"اور ایسا بے سوادا کھانا۔ میرے گھر کا کتا بھی منہ نہ لگائے۔" وہ تلخی سے بولیں۔

"اماں جی! اب آپ کے پکے ہوئے کھانے تو میرے میں ملنے سے رہے۔ بس اسی پر صبر و شکر کرنا پڑتا ہے۔ کیا کریں مجبوری ہے نا؟ اب آپ کو سمجھ آگئی ہوگی کہ میں شادی کیوں کرنا چاہتا ہوں؟" وہ موقع غنیمت جان کر بولا۔

"بیوی کو تو میرے پاس چھوڑ دو گے۔ رہو گے میس میں ہی۔ اس کا فائدہ نظر نہیں آرہا۔" ماں نے نوالہ زہر مار کرتے ہوئے کہا۔

"بہت فائدے ہیں اماں جی۔ آپ سے کھانا پکانا سیکھ کر میرے پاس آئے گی۔ مجھے اور کیا چاہیے؟" نہایت ملائمت سے بولا۔

"ہاں پتر فائدے تو بہت ہیں۔ شہری لڑکی ہے۔ ہمارے ساتھ رہ کر ہمارے اصول طریقے، رہن سہن میل جول اور رکھ رکھاؤ سیکھ لے گی۔ آخر اب ہم لوگ تو اس کے اپنے ہی ہیں۔ میکا تو شادی کے بعد پرایا ہو جاتا ہے۔"

انہوں نے اپنی قمیص کی سائیڈ پاکٹ سے رومال نکالا اور منہ صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"آپ نے کھانا نہیں کھایا۔ کچھ اور منگوا دوں؟" فکر مندی سے بولا۔

"دودھ پتی اور دیسی گھی کا پراٹھا منگوا دو۔ اسے کہنا دودھ پتلا نہ ہو اور گھی میں ملاوٹ ہوئی تو مجھے فوراً سمجھ آجائے گی۔ آج کل ڈالڈا نیا نیا چلا ہے۔ ہر کوئی اسی کے گن گا رہا ہے۔ میں نے بھی بڑے شوق سے

ڈالڈے گھی میں ہانڈی بنائی۔ اور سارا گھر ہی بیمار پڑ گیا۔ بلغم اور ریشہ جان ہی نہ چھوڑ رہا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ پردیس میں بیمار پڑ جاؤں۔ ہائے میں مر جاواں قید خانے میں آگئی ہوں۔ ارسلان پتر کیا کراچی میں بھی تم ایسے ہی بند کمرے میں رہتے ہو۔ تمہارا سانس نہیں گھٹتا۔" وہ لمبے سانس لیتے ہوئے گھبراہٹ سے بولیں۔ وہ ذرا سا مسکرایا اور سر جھکا کر دل میں ہی سرگوشی کی۔ اب اس کا دعوا تو میں نہیں کر سکتا اماں۔ چند دن تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ دل کو تھوڑا بڑا ہی کرلیں۔ کیسی حیران کن بات ہے کہ انہیں آسائش بھری زندگی اس قدر اذیت ناک لگی ہے۔ یہاں کا صاف ستھرا ماحول اور پرسکون فضا میں انہیں گھٹن کا احساس مارے جا رہا ہے۔

"چپ کیوں ہو؟ پتر یہ بتاؤ کہ کیا تم سچ مچ افسر ہو نا۔" وہ متذبذب لہجے میں بولیں۔

"آپ جیسا سمجھیں۔" وہ ماں کی معصومیت پر ہنستے ہوئے ان کے کندھے دبانے لگا۔ اور وہ پژمردگی سے اسے دیکھنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"پتر کڑی تو پسند آہی گئی ہے۔ مگر اتنے بڑے شہر میں ڈربے میں ہی رہتی ہے اس کی اماں بتا رہی تھی کہ یہ ڈربا بھی کرائے پر ہی لے رکھا ہے۔ لعنت ہو ایسی شہری زندگی پر۔ ہم نے اپنی دادی جی کی زبانی سنا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ دنیا کی آبادی اتنی بڑھ جائے گی کہ لوگ درختوں پر گھر بنا کر رہنے لگیں گے۔

پتر یہ گھونسلوں میں رہنے والے لوگ میدانوں میں آکر کیوں نہیں بس جاتے۔ کھیتی باڑی کریں اور ہماری طرح آزاد اور کھلی تازہ ہوا میں عیاشی کریں۔"

وہ حیرت و تاسف بھرے لہجے میں بولیں۔ مگر ارسلان نے جواب نہ دیا۔ وہ سادگی اور معصومیت کی اس مقدس دیوی پر زندگی کے کون سے پرت کھولتا۔

"تو پھر پرسوں یعنی جمعے کے خطبے کے بعد نکاح اور رخصتی ہے۔ کیسی عجیب شادی ہے کہ اپنوں کے بغیر غیروں کے ساتھ شادی منائی جا رہی ہے۔ نہ بہنوں نے شگن کیے نہ ماموں پھوپھیوں نے لاگ دیئے۔ چلو پتر تیری خوشی پر ہم بھی واری صدقے۔"

وہ بیٹے کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر آہستگی سے بولیں۔ اور اٹیچی کھول کر اس سے ایک میلی کچیلی تھیلی نکالی۔ اور اس کے سامنے کھولتے ہوئے بولیں۔

"زیور تو میں لے آئی ہوں۔ ذرا تم بھی دیکھ لو۔ ضروری ہے۔ کیونکہ کل یہی زیور تمہاری بہن کو جائیں گے۔"

"اماں جی اس کی ضرورت تو نہیں ہے۔ کل اس سے زیور واپس لینا مناسب نہیں لگے گا۔ وہ اپنا ویڈنگ ڈریس خود سے خرید رہی ہے۔ زیورات بھی خرید ہی سکتی ہے۔ انہیں رہنے ہی دیں اماں۔ میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا۔" وہ نرمی سے بولا۔

"پتر، سہاگ کا جوڑا اور زیور تو سسرال کی طرف سے ہوتے ہیں۔ جوڑا بھی میری پسند کا ہونا چاہیے۔ مگر اب وہ قسمن خرید ہی رہی ہے تو اسے پیسے دے دینا۔ خوامخواہ احسان چڑھاتی رہے گی۔ زیور تو یہی پہنے گی۔" وہ مستحکم لہجے میں بولیں۔ اور زیور اسے بڑے چاؤ سے دکھانے لگیں۔ ارسلان کو زیورات پسند تو نہ آئے تھے۔ مگر خاموشی میں ہی عافیت جان کر مسکرا کر پسندیدگی کا اظہار کرنے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"یعنی آج کی رات اس کمرے میں اماں کے ساتھ گزرے گی۔ ارسلان کسی ہوٹل میں ہی کمرہ بک کرا لیتے۔" وہ کرسی پر بیٹھی حیرت سے کمرے میں بچھے ہوئے دو پلنگوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

"آہستہ بولو اماں جی کے کان بہت تیز ہیں۔ باتھ روم تک تمہاری آواز با آسانی ان کی سماعتوں کو چھو سکتی ہے۔ بے چاری دو ہفتے سے اس کمرے میں قید ہیں۔ میس کا کھانا انہیں پسند نہیں آرہا کمزور پڑ گئی ہیں اور چڑچڑی ہو گئی ہیں۔ تم ان کی کسی بات کا برا نہ منانا۔ گاؤں کے لوگ ان ہی کی طرح بڑے سچے اور کھرے

ہوتے ہیں۔ جو بات دل میں آئی اگلے کے منہ پر دے ماری۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"فار گاڈ سیک ارسلان مجھے ڈرانے کی نہیں ہو رہی۔" وہ خوفزدہ سی ہو کر بولی۔

"کل صبح ہم گاؤں سدھاریں گے۔ خوب بڑی حویلی ہے مگر ہے کچی اینٹ گارے سے بنی ہوئی۔ تمہیں بہت اچھے لگے گا دیہاتی ماحول' شور شرابا ہے نہ ہی وہاں کے بکینوں میں کھوٹ ہے۔" وہ تسلی دینے کے انداز میں بولا۔

"اماں جی پرانے خیالات کی خاتون ہیں۔ انہیں اس کمرے میں تنہا چھوڑ کر میں ہوٹل میں کمرہ بک نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ مجھے اعتراض کیونکر ہوتا۔ تم کیا جانو اس دل ناداں کا حال۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر محبت آگیں لہجے میں بولا تو وہ شرما سی گئی۔ اسی اثنا اماں جی باتھ روم سے باہر نکل آئیں اور ارسلان کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بہو! آدھی رات ہو گئی ہے۔ کپڑے وپڑے بدلو اور سو جاؤ۔ تم بھی پورے دن کی تھکی ہوئی ہو اور میرا پتر بھی جمائیاں لے رہا ہے۔"

وہ اپنے پلنگ پر بیٹھ کر عینک اتارتے ہوئے بولیں۔

"زیور اتار کر مجھے دے دو۔ اپنے پاس رکھ لیتی ہوں۔ تم سفر میں کہیں ادھر ادھر ہی نہ کر دو۔"

شمائلہ نے سرسری سی نظر ارسلان پر ڈالی تو اس نے آنکھ کے اشارے سے اسے زیورات دینے کی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ شمائلہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ اٹھی کمخواب کا شاکنگ پنک غرارہ اور ٹشو کا گوٹا لگا ہوا دوپٹہ سنبھالتی ہوئی واش روم کی طرف چل پڑی۔ وہ شاور کے نیچے سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ ارسلان کی ماں کے سامنے بے بسی اور لاچارگی پر وہ حیران و پریشان تھی۔ اس نے سنا تھا کہ گاؤں کی عورتیں جب جوان بچوں کی مائیں بن جاتی ہیں تو بہت ضدی اور ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ مگر مجبوراً" انہیں بھی عزت و تکریم بھی دیتے ہیں اور لحاظ اور پاسداری میں بھی فرق نہیں آتا۔ آج یہ جیتا جاگتا نمونہ اس نے دیکھ لیا تھا۔

ایک گھنٹہ گزر جانے کے بعد ارسلان جو کہ قالین پر بچھے ہوئے گدے پر لیٹا ہوا تھا۔ چونک کر اٹھا ماں کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ ابھی تک جاگ رہی تھیں یہ شاید زیورات کا انتظار تھا یا نو بیاہتا جوڑے کے کمرے میں اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ وہ واپس اپنے گدے پر لیٹ کر شمائلہ کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

شمائلہ نے زیورات ڈریسنگ روم میں شیشے کے سامنے شیلف پر رکھے اور بالوں کو تولیے میں لپیٹ کر اپنے پلنگ پر آ کر لیٹ گئی۔ قریب ہی گدے پر ارسلان نے لیٹے ہوئے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو شمائلہ نے تکیے سے سر اٹھا کر اسے حسرت و یاس سے دیکھا اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

✲ ✲ ✲

مین روڈ سے حویلی تک کا پیدل سفر گرمی میں کاٹے نہ کٹ رہا تھا۔ جہاں سڑک نام کو نہ تھی۔ اونچی نیچی ایک راہ قدموں کی وجہ سے نمایاں تھی۔ اس کے لیے چلنا مشکل ہو گیا تھا مگر وہ خاموش تھی۔ ماں بیٹے کے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔

حویلی میں اسے نندوں' جیٹھانیوں' اور باقی گھر کے افراد نے ریسیو کیا۔ وسیع و عریض برآمدے میں وہ چارپائی پر بیٹھی کسی عجوبے سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ سہاگ کا جوڑا زیب تن تھا نہ ہی میک اپ سے نوک پلک سنوری تھی۔ اور زیورات تو تھے ہی اماں کے پاس۔ اجڑی اور اداس سی دلہن سب میں گھری سب کی باتیں سن کر ان کے خیالات کا اندازا لگا رہی تھی۔

ارسلان مردوں میں جا چکا تھا۔ ساس دوسری طرف چارپائی پر لیٹی اپنے سفر کی روداد سنا رہی تھیں۔ شمائلہ نے یکدم ہی اپنا مزاج خوشگوار کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ یہ اس کی اپنی پسند تھی۔ والہانہ محبت تھی اور ارسلان کی شخصیت سے بے پناہ عشق تھا اور فلائنگ سے دیوانگی کی حد تک عقیدت تھی۔ اس نے اس کے حصول کی خاطر یہ سب کچھ قبول کیا تھا۔ کیونکہ ارسلان نے اسے دھوکے و فریب میں نہیں

رکھا تھا۔ اسے گاؤں کا ماحول اور اپنے مالی مسائل کا ذکر تفصیلاً" بیان کر دیا تھا۔ پھر پریشان ہونے والی بات تو تھی نہیں۔ اسے ذہنی طور پر اس کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔ مگر انسانی فطرت کے سامنے وہ ہار گئی تھی۔ محرومیت کے احساس نے اسے تمام سوچوں اور وسوسوں سے باہر نکال دیا تھا۔ وہ چھوٹی نند کا ہاتھ پکڑ کر چارپائی سے اٹھی اور مسکرا کر تھوڑا لجا شرما کر اس سے اپنے کمرے کے بارے میں پوچھا۔ تو وہ مسکراتی ہوئی اسے اس کے کمرے تک چھوڑ آئی۔

کمرے میں کچے فرش پر دو چارپائیوں کے علاوہ تیسری شے نظر نہ آئی تھی۔ دل کو ایک دھچکا سا لگا اس سے پہلے کہ ذہن میں شیطانی سوچوں کا بسیرا ہوتا۔ فوراً" خود کو شاکڈ کیفیت سے نکال کر بڑبڑائی۔

"دنیاوی چیزوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ انسان اپنی ہر خواہش کو اپنی بساط کے مطابق پوری ضرور کر لیتا ہے۔ اصل تو انسان کے اندر چھپی ہوئی وہ خصلتیں ہیں۔ جس کے بغیر کوئی بھی خونی رشتہ نبھ نہیں پاتا۔ ارسلان انمول ہے ہر لحاظ سے۔ مجھے اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا احساس ہے۔ ان لوگوں میں قیام کرنا میرے لیے مشکل نہیں ہو گا۔ اس کی یادوں کے سہارے اور اس کی آمد کے انتظار میں ہر آزمائش پر پوری اتر جاؤں گی۔" اس نے آگے بڑھ کر چارپائی کی کڑھائی شدہ سفید چادر' روئی کی دلائی اور تکیے کو اچھی طرح جھاڑا۔ چارپائی پر بستر بچھا کر اس نے کمرے کو اوپر نیچے دائیں بائیں بغور دیکھ کر ایک لمبی آہ بھری۔ بجلی ندارد ایک لالٹین کمرے کے کونے میں اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اور ہاتھ کا شیشوں سے بھاری بھر کم پنکھا دوسرے چارپائی کے سرہانے پر رکھا اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور بستر پر نیم دراز ہو کر خود کو پنکھا جھلنے لگی۔ شب بھر کی بے داری نے اسے اپنی آغوش میں لے کر اک میٹھی سی لوری سنائی تھی۔

کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا چکا تھا اور شدت کی گرمی میں کمی ہونے کی وجہ سے اس کی نیند اور گہری ہوتی چلی گئی۔ ارسلان کی آواز پر وہ پسینے میں بھیگی ہوئی چونک کر بیٹھ گئی۔ اسے خواب کی دنیا سے نکل کر حقیقی اور اصلی زندگی میں آتے ہوئے چند سیکنڈ لگے۔

ارسلان اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا اس کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"بھوک ہڑتال کا ارادہ ہے کیا سرِشام سب کھانا کھا کر سو چکے ہیں تمہیں جگانا مناسب نہ لگا۔ دیکھو میں چپکے سے کھانا یہاں ہی لے آیا ہوں دونوں مل کر کھائیں گے۔" وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"سب سے پہلے لائٹ کا انتظام کریں کچھ نظر نہیں آ رہا۔" وہ آہستگی سے بولی۔ ارسلان نے اپنی جیب کو ٹٹولا اور ماچس کی ڈبیا نکال کر اس نے لالٹین جلائی۔

"تھینک گاڈ۔" شمائلہ نے طویل سانس لیا۔

اس نے روٹی کی چنگیر اور مٹی کے پیالے میں دیسی مرغی کا سالن اس کے سامنے رکھ دیا۔ اور عقیدت مندانہ لہجے میں بولا۔

"تمہیں کھانے کا مزا آ جائے گا اماں نے اپنے ہاتھ سے ہمارے لیے بنایا ہے۔ میں جب بھی یہاں اپنی چھٹی گزارنے آتا ہوں۔ اماں جی روزانہ بلاناغہ ایک مرغی میرے لیے ذبح کرواتی ہیں اور مٹی کی ہانڈی میں لکڑی کی آگ پر اپنے تجربہ کار ہاتھوں سے کھانا پکاتی ہیں۔ میں ایک مہینے کی چھٹی میں ڈربا خالی کر کے رخصت ہو جاتا ہوں۔ اگلے ہی دن پھر سے مرغی کو انڈوں پر بٹھا دیا جاتا ہے۔" شمائلہ نے تنور کی روٹی کا نوالہ توڑ کر شوربے میں ڈبویا اور منہ میں ڈال کر بے اختیار بولی۔

"ویری ٹیسٹی۔"

"اب تمہیں سمجھ آ گئی ہو گی کہ اماں جی نے میس کے کھانے کو ری جیکٹ کیوں کیا تھا؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"تمہاری آمد کی خوشی میں منہ میٹھا کرانے کے لیے دودھ اور سوجی کا حلوہ بھی اماں جی نے بنایا ہے۔ کھاؤ گی تو ٹرائفل اور چیز کیک کو بھول جاؤ گی۔ تم کھانا کھاؤ میں

حلوہ لے کر آتا ہوں۔ جب سے اماں جی نے گھر میں قدم رکھا ہے پھرکی بنی ہوئی ہیں۔ بہت خوش ہیں۔ تم انہیں بہت اچھی لگی ہو۔" ارسلان نے بھی منہ میں نوالہ ڈالا اور چباتا ہوا سرعت سے باہر نکل گیا۔

شمائلہ کو اس کی اس توجہ پر بے پناہ پیار آیا۔ خوشی آنکھوں سے چھلکنے کے لیے بے چین ہوگئی۔ وہ پنکھا جھلتی ہوئی ارسلان کا انتظار کرنے لگی۔ اس کی قربت کے بغیر نوالہ حلق میں اٹک سا گیا تھا۔

"اس میں رونے والی کون سی بات ہے؟ آخر مجھے واپس جاب پر جانا تو ہے۔" ارسلان نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"دو ہفتے بعد ملنے آؤں گا اس دیوانی سے۔ مجھے ہنس کر رخصت کرو۔ ورنہ فلائنگ کے دوران تمہاری یہ روتی ہوئی آنکھیں مجھے رستے میں بھٹکادیں گی اس کا انجام تو تم جانتی ہونا۔"

"جاتے جاتے ایسی پریشان کن باتیں کیوں کررہے ہیں؟ میرے دل کا سکون و چین غارت کرکے آپ کو کیا ملے گا۔" اس نے تڑپ کر اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ تو ارسلان نے اس کے ہاتھ کو چوم لیا۔ وہ پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

"معاملہ کچھ سسی، سوہنی اور ہیر جیسا ہی لگ رہا ہے۔ شمائلہ آئی ایم سو ہیپی کہ اس دور میں ابھی تک بے ریا پیار کرنے والی لڑکیاں موجود ہیں۔" وہ چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

"لیکن افسوس کہ دوسری طرف ٹھنڈ ہے۔ نجانے پنوں، مہیوال اور رانجھا کہاں رہ گئے۔" وہ برجستہ بولی۔

"وہ بے چارے اپنی نوکریوں میں جتے ہوئے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا اور کھڑا ہوگیا۔

"ہمت و حوصلے سے کام لینا۔ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑنا۔ اماں جی کی بات ایک کان سے سنو اور دوسرے کان سے نکال دو۔ ویسے تمہیں سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کافی سمجھدار ہو، پڑھی لکھی ہو۔ یہاں کے سادہ لوگوں کو ہاتھ میں کرنا تمہارے لیے مشکل نہیں۔" وہ اسے اپنے سینے سے لگائے محبت آگیں لہجے میں بول رہا تھا۔

"ایک شرط ہے۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

"فرماؤ۔" اس نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر کہا۔

"مجھے روزانہ خط لکھنا مت بھولیے گا یہاں ڈاکیہ تو آتا ہی ہوگا۔" وہ یقین سے بولی۔

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں آتا؟ تم بھی روزانہ مجھے لمبا چوڑا لو لیٹر لکھ کر اسی ڈاکیے کو دے دیا کرنا۔ وہ پوسٹ کردے گا یہاں یہی طریقہ چلتا ہے۔" وہ ابھی بھی مسکرائے جارہا تھا۔ مگر دل تھا کہ اسے یہاں چھوڑ کر اکیلے جاتے ہوئے اداس ہوگیا تھا۔ پورے وجود کو جیسے کوئی کاٹ رہا تھا۔

"ایک ہفتے بعد آنے کی کوشش کیجیے گا۔ دو ہفتے کا وقت بہت طویل اور جان لیوا ہوگا میرے لیے۔" وہ آنسو کو دباتے ہوئے بولی۔

"سب سے گھل مل کر رہوگی تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوگا۔" وہ نرماہٹ سے بولا۔

"ارسلان میں نے خوامخواہ ہی جذبات میں آکر نوکری چھوڑ دی۔ دوبارہ جوائن کرلیتی ہوں۔ کم از کم ایک چھوٹا سا گھر با آسانی کرائے پر لے سکتے ہیں۔ آپ کی رفاقت میں جھونپڑی بھی محل ہوگی۔ مجھے اجازت دے دیجیے اور ساتھ لے چلیے۔ کچھ دن امی کے پاس رہ لوں گی وہ بھی تو اداس ہوگئی ہوں گی۔ سب کچھ ہی "آنا فانا" جو ہوگیا۔ اب تو وہ بھی شاک سے نکل آئی ہوں گی۔"

"میری غیرت گوارہ نہیں کرتی تم میری ذمہ داری ہو۔ تھوڑے عرصے کی بات ہے۔ سب درست ہوجائے گا۔ دوسرا اماں جی کو بھی تو تمہیں اپنے پاس رکھنے کا بے تحاشا شوق ہے وہ بھی پورا ہونا لازم ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"اگر اس وقت میرے پاس گھر ہوتا بھی تو میں کچھ عرصے کے لیے تمہیں اپنے پاس رکھنے کی گستاخی نہ کرسکتا۔ آخر ان والدین کے بھی تو کچھ خواب ہوتے ہیں بلا نہیں خوش آئند تعبیر دینے کا حق اولاد کو حاصل ہے۔"

"آپ نے درست کہا ہے۔" وہ بجھے ہوئے دل سے منمنائی۔

"گڈ گرل۔" اس نے اسے گلے لگایا۔ شمائلہ نے آنسوؤں کے ریلے پر ہمت و حوصلے کا بند باندھ کر ارسلان کو خدا حافظ کہا۔ اور اپنے کمرے میں آکر دروازہ بند کرکے زارو قطار رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

"بیگم ہوگی تم وہاں۔ یہاں تو بہو ہو۔ تیرے ہوتے ہوئے میری بیٹی کسی کم نوں ہاتھ نہیں لگائے گی۔ کیونکہ میرے بعد اس گھر بار کی تم ہی تو مالکن بنو گی نا۔ دوسری بہوؤں نے سات سال ساڈی ایسی خدمت کی ہے کہ شریکہ برادری اج وی یاد کرتا ہے۔ تم سے بھی مجھے یہی امید ہے۔ دن چڑھے تک سوتے رہنا شیطان دا کم اے۔ رات دیر تک جاگتے رہنا نری نحوست اے۔ ساڈا تعلق الوذات نا ہرگز نہیں۔ وقت تے روٹی کھا۔ فرتوں صبح تے سو سکے گی۔ تڑکے دی نماز نال اپنے سسر جی کون گرم دودھ اور ایک ابلا ہویا انڈا دینا کل توں شروع۔ بھل نہیں جانا۔"

ساس نے بھنویں چڑھا کر سخت لہجے میں کہا۔ تو اس نے فورا" کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

"پیٹ بھر کر کھانا کھالو۔ کل اپنے میاں نوں الٹا سبق نہ پڑھا دینا کہ مجھے بھوکا مار دیتا اے۔ کل سے چولہے چوکے کی مالک تم ہو۔ جی بھر کر کھاؤ یا دن بھر بھوکی رہو۔ پھر ہم جواب دہ نہیں ہیں۔ ہائے میں مرگئی۔" انہوں نے ایک طویل ڈکار لیا اور چارپائی پر لیٹ گئیں۔

"اف کتنی کٹ دار باتیں آتی ہیں اس گاؤں کی سیدھی سادی، جاہل اور ان پڑھ عورت کو۔ میری زبان تو جیسے گدی سے نکال ڈالی ہو۔ ہم شہری لوگ آج تک اسی گمان میں رہے کہ گاؤں کے لوگ بہت معصوم اور پرخلوص ہوتے ہیں۔ میں تو غلط فہمی میں ہی ماری گئی۔ اچھی بھلی نوکری بھی چھوڑ دی یہ سوچ کر کہ ایک فائٹر پائلٹ کی بیوی کو معمولی ٹیچنگ سوٹ نہیں کرتی۔ شہری زندگی کی تمام آسائشات کو بھی بغیر سوچے سمجھے خیرباد کہہ دیا۔ اپنی شخصی آزادی کو تیاگ دیا۔ اپنے تمام خونی رشتوں کو چھوڑ کر چلی تھی ایک جری، بہادر اور نڈر فائیٹر پائلٹ کی بیوی بننے۔"

فورا" اس نے خود کو کوسا اور خود کلامی کی کہ شمائلہ بیگم جس فخر و مسرت اور شوق و اشتیاق سے اس کی زندگی میں شمولیت اختیار کی ہے۔ اسی جذبے کے ساتھ اب اس رشتے کو نبھانے کی کوشش کرو۔ وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی۔

"پتر چپ کیوں ہو؟ میں نے ایک بھی غلط بات نہیں کی۔" لہجے میں ہلکی سی نرماہٹ عود کر آئی تھی۔ شمائلہ نے حیرت سے ساس کی طرف دیکھا۔ جنہوں نے پینترا بدلنے میں دیر ہی نہ لگائی تھی۔

"آپ درست فرمارہی ہیں۔" اس نے نہایت آہستگی سے کہا۔ اسی سمے نند باورچی خانے میں آکر اسے لفافہ پکڑاتے ہوئے شریر لہجے میں بولی۔

"بھابھی۔ لگتا ہے۔ بھایا بھی تمہاری طرح رات بھر نہیں سوتے۔ دیکھو تو کتنا بھاری لفافہ ہے۔ کسی ڈائجسٹ کا افسانہ لگتا ہے۔"

شمائلہ نے تیزی سے لفافہ اس کے ہاتھ سے لیا۔ اور اسے محفوظ کرلیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہوچکی تھی۔ اور چہرے پر شرم و حیا کی لالیاں بکھر گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼
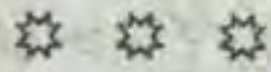
"ارسلان آپ کے بغیر اس چکرا دینے والی گرمی میں دو ہفتے مجھے دو صدیوں کے برابر لگے ہیں۔ پلیز مجھے ساتھ لے چلیے۔ میرے ذہن میں گاؤں کا تصور کچھ اور تھا۔ میں اس ماحول میں مزید نہیں رہ سکتی۔ اگر طاہرہ نہ ہوتی اور میں ہر روز آپ کا خط وصول نہ کرتی تو یقین جانیے میں پاگل ہوگئی ہوتی؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

"کاش میں امی کی ہم خیال ہوتی۔ نرالی اور انہونی شادی

کے نتائج بھی تو ویسے ہی ہوں گے۔ مجھے ممی کے پاس چھوڑ دیجیے؟" اس کے لہجے کی پختگی کو محسوس کرتے ہوئے ارسلان کے تحت الشعور میں خطرے کی گھنٹیاں بجیں۔

"میں تمہاری تکلیف و اذیت کو کوسوں دور بیٹھا محسوس کرتا ہوں۔ مگر کیا کروں مجبوری ہے۔" وہ بہلانے کے انداز میں بولا۔ "میں نے اڑتی ہوئی خبر سنی ہے کہ بہت جلد میری پوسٹنگ ایریا ہیڈ کوارٹر چکلالہ ہونے کے چانسز ہیں۔ پھر مسئلہ نہیں ہوگا روزانہ گھر آجایا کروں گا۔ اس وقت تمہیں ممی کے پاس چھوڑنا مناسب نہیں لگتا۔ تم میری ذمہ داری ہو میں انہیں تنگ نہیں کرنا چاہتا۔ سمجھا کرو اچھی بھلی سمجھ دار لڑکی ہو۔" وہ سنجیدہ ہوگیا۔

"یہاں آپ صبح کے گئے شام کو گھر پہنچیں گے۔" مجھے اس کا کیا فائدہ ہوگا۔ وہ پژمردگی سے بولی۔

"دن آپ کی غیر موجودگی میں اور رات آپ کے خراٹوں پر قربان ہوجائے گی۔"

"فائدہ ہی ہوگا یار؟" وہ آنکھ مار کر شریر لہجے میں بولا۔ "رات تو ہم اکٹھے ہوں گے نا۔ کچھ میں کہوں گا کچھ تم کہوگی تمہارا دل بہل جائے گا۔"

"ارسلان کیا آپ اس فرسودہ اور پراگندہ ماحول کو بدل سکتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ مجھے یہاں اب ایک لمحہ بھی نہیں رہنا۔" وہ طفلانہ انداز میں بولی۔

"یعنی تم نے فیصلہ کرلیا ہے؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ "بے وقوفانہ اور باغیانہ فیصلے اٹل نہیں ہونے چاہئیں۔ ورنہ انجام تم جانتی ہو۔" وہ اس کی اس بات پر ایک دم سے مدھم پڑگئی۔

"جی۔" وہ اثبات میں سر ہلا کر نظریں جھکا کر بولی۔

"اس شدید گرمی میں بغیر بجلی کے رہنے والے یہ انسان ہی ہیں تمہاری طرح کے۔ کیا انہوں نے اپنے گھروں کو خیرباد کہہ دیا ہے؟" اس کے لہجے میں تیکھاپن تھا۔

"انہیں یہاں رہنے کی عادت ہے ارسلان۔ یہ لوگ یہاں کے پیدائشی اور رہائشی ہیں۔ نسلوں سے یہاں کے ماحول میں آباد ہیں۔ ان کے لیے سب نارمل ہے۔" وہ لاچارگی سے بولی۔ "بھلا میں یہاں کیسے رہ سکتی ہوں؟ آپ خود انصاف کریں۔"

"تم نے تو دو سال کا وعدہ کیا تھا۔ دو ہفتوں میں ہی سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ تم تو میرا پیار اور میری زندگی کی ساتھی ہو۔ نشیب و فراز، اتار چڑھاؤ، گرمی سردی، نرمی سختی میں تمہاری قربت میرے لیے ٹانک کا کام کرے گی۔ افسوس کہ تم ابھی سے گھبرا گئیں۔ آگے چل کر کیا کروگی۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

"آپ سے پیار اور عقیدت نہ ہوتی تو پھر میرے لیے مسئلہ نہ ہوتا۔ محبت کا یہاں رہنے سے دور پار کا تعلق اور واسطہ نہیں۔ آئندہ ایسا طعنہ دیا تو آپ سے کبھی بات نہیں کروں گی۔ میں اپنی اذیت کرب و رنج آپ کے ساتھ شیئر نہ کروں تو کس سے کروں؟" وہ کومگو کیفیت میں بولی۔

"آئی ایم سوری میں بیس کمانڈر سے بات کرتا ہوں۔ شنوائی تو نہیں ہوگی خوامخواہ مجھے شرمندہ کراؤ گی۔ میں پالیسی کو قطعاً بدل نہیں سکتا۔ شمائلہ تم جب تک یہاں سے فرار حاصل کرنے کا پلان بناتی رہوگی تو بھلا ایڈجسٹ منٹ کیسے ہوگی۔ آخر یہ تو ہمارا اپنا جدی پشتی ٹھکانہ۔ ہماری عیدیں، شب راتیں ہماری تمام چھٹیاں یہاں ہی گزریں گی۔ چاہے جھلسا دینے والی گرمی ہو چاہے ٹھٹھرتا ہوا جاڑا۔ ہمارا جینا مرنا ان ہی لوگوں سے ہے۔ ان میں رہنا اٹھنا بیٹھنا سیکھ لو، ان میں اپنا مقام بنالو۔ میرے ساتھ چلی گئیں تو پھر ایسا گولڈن چانس تمہیں نہیں ملے گا۔ تم مرتے دم تک ان سب کے لیے اجنبی اور یہ تمہارے لیے ناآشنا ہی رہیں گے۔" وہ سوچتے ہوئے سنجیدگی سے بولا تو شمائلہ پلکیں جھپکتے ہوئے آنسو اندر ہی دبانے کی کوشش کرنے لگی۔ جسے ارسلان نے بھی محسوس کرلیا تھا۔

"تمہاری لڑکیوں کا یہی تو مسئلہ ہے کہ پل میں تولہ، پل میں ماشہ۔ خوش ہونا چاہیں تو معمولی سی بات پر اڑی اڑی جائیں۔ ناخوش رہنا چاہیں تو آسمان سے ستارے توڑ کر ان کی مانگ میں سجا دو رتی بھر جو مزاج میں فرق

آجائے۔ "ظاہر ہے لوگوں سے ڈیلنگ کے طریقے سیکھ لو۔ خوش رہوگی۔ اماں جی کی طرح اسٹرانگ بن جاؤ۔ میری زندگی تو پانی کے بلبلے کی مانند ہے۔ چھوئی موئی بنی رہوگی تو اپنوں اور غیروں کے قدموں کی دھول بننے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" وہ ناقدانہ اور فکرمندانہ لہجے میں بولا۔

وہ دلچسپی سے بات سنتی رہی دونوں باتوں میں اتنے مگن تھے کہ صبح ہوگئی۔ اسی اثناء اماں جی کی آواز پر وہ اچھل کر چارپائی سے نیچے اتری۔

"کہاں جارہی ہو؟" ارسلان نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"اماں جی کا ناشتا لیٹ ہوگیا ہے۔ انہیں فجر کی نماز کے فوراً بعد ایک ابلا ہوا انڈا، مکھن میں فرائی کی ہوئی ادرک اور دودھ پتی کی پوری کیتلی چاہیے۔ پراٹھے کا ناشتا تو وہ دس بجے لیتی ہیں۔" وہ بالوں کی پونی بناتے ہوئے بولی اور دوپٹا سر پر لپیٹ کر باہر نکلنے لگی تو وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

"ویسے مجھے رات بھر جگائے رکھنے کی شکایت ایک چائے کی پیالی سے دور ہوسکتی ہے۔" وہ شرماتے ہوئے باہر نکل گئی۔ ارسلان کی تسلی و تشفی کی وجہ سے اس کا دل بھی بہل گیا تھا اور اماں جی کا سامنا کرتے ہوئے خوف کا احساس بھی کم ہوگیا تھا۔

ارسلان کو خدا حافظ کہتے ہوئے دل میں ہوک تو اٹھی تھی۔ مگر جذبات پر بھرپور قابو تھا۔ اسے اپنی شگفتہ مسکان سے رخصت کرکے وہ اپنے کمرے میں آکر خوب روئی تھی۔ آج کے آنسو یہاں رہنے کے کرب سے نہیں بلکہ اپنی محبت کی جدائی پر بہہ نکلے تھے۔

☼ ☼ ☼

"جواد کی شادی خوب دھوم دھام سے ہورہی ہے۔ اس نے تمہیں بھی انوائیٹ کیا ہے۔" ارسلان نے جب یہ مژدہ راحت و مسرت اسے سنایا تو وہ اچھل پڑی۔ خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"بچوں کی طرح ذرا سی بات پر خوش اور پل بھر میں ناراض۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"ایسی بھی بات نہیں اب شمائلہ کے اندر اماں جی کی روح آہستہ آہستہ سرائیت کرچکی ہے۔ اب اس گاؤں میں، میں نے اپنا مقام بنالیا ہے، اسی ہتھیار سے جس پر اماں جی کو بڑا مان تھا۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"تعلیم یافتہ بیوی کا یہی تو فائدہ ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات کو اپنے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ اگر اس حربے میں ناکام رہے تو پھر خود کو وقت کے سانچے میں ڈال کر ویسی ہی شکل اختیار کرلیتی ہے۔" وہ فخریہ انداز میں بولا۔

"جب آپ کے ساتھ جینے اور مرنے کا عہد صدق دل سے کرہی لیا ہے تو پھر قربانی تو لازم ہے۔ رب العالمین وہیں سے آزماتا ہے جہاں سے انسان گھبراتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"آزمائش بہت حقیر اور ناتواں ہوجاتی ہے۔ جب اس کا مقصد سمجھ آجائے۔ اب یہ امتحان تو اک کھیل تماشا معلوم ہوتا ہے۔"

"تھینک یو۔" وہ روئی کے بھاری لحاف کو اردگرد لپیٹتے ہوئے کیف آگین لہجے میں بولا۔

"تم میری پسند کی داد ہی دے ڈالو کہ میرا انتخاب لاجواب ہے نا۔" اشارہ شمائلہ کی طرف تھا۔

"آپ نے کبھی میری پسند کو سراہا ہے جو میں آپ کی پسند کی داد دوں۔" وہ جاندار قہقہہ لگا اٹھی تو وہ اس کے فسوں میں کھو سا گیا۔

"سچ ہے کہ شوہر کا پیار اور توجہ بیوی کو انگاروں کے بستر پر بھی طمانیت، راحت اور مسرت سے ہمکنار رکھتا ہے۔ ڈیڑھ سال پہلے والی شمائلہ کہیں کھو گئی۔ اسی ماحول میں اسی فضا اور اسی مٹی میں۔ آج کی شمائلہ زندگی کے ہر رنگ میں ڈھل جانے والی ہستی ہے اور اپنی دانشمندی اور وسیع النظری سے اپنے حقوق حاصل کرنے کی ہمت بھی رکھتی ہے۔ اللہ ـــ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے چند جملوں پر مبنی گفتگو نے شمائلہ کو بے دار کردیا ورنہ ہماری شادی کب کی ٹوٹ چکی ہوتی۔" وہ لحاف میں اسے اپنے ساتھ لگائے سوچے

جارہا تھا۔

"مجھے لگتا ہے آپ کو سردی لگ رہی ہے' کیوں نہ کوئلوں کی انگیٹھی سے کمرے کو گرم کیا جائے۔" وہ چھلانگ لگا کر بستر سے باہر نکل آئی۔

"تم نے وقت دیکھا ہے۔ رات کے دو بجے انگیٹھی کو رہنے دو۔ تمہاری چٹ پٹی باتیں ہی کافی ہیں گرم کرنے کو۔" وہ اسے پکڑتے ہوئے والہانہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔

"تو پھر یہ بتاؤ کہ شادی کی تیاری کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ شادی اٹینڈ کرنے کے لیے تمہارے پاس کپڑے تو ہوں گے اور زیور بھی۔"

"اماں جی نے تمام بھاری جوڑے تو طاہرہ کے لیے شروع کے دنوں میں ہی مجھ سے لے لیے تھے اور زیور تو ولیمہ کے بعد دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوا۔ ارسلان مجھے ان مادی چیزوں کی چاہ ہے اور نہ ہی ان کی خاطر اپنا سکون برباد کرتی ہوں۔ آپ سلامت رہیں مجھے کسی چیز کی کمی نہیں۔ پیار ہے تو جہان ہے۔ مجھے صرف اور صرف اماں جی کے توہین آمیز رویے پر اعتراض تھا اور ہے۔ کوئی عورت چاہے کسی غلاظت کے ڈھیر سے ہی کیوں نہ اٹھائی گئی ہو وہ نسوانی وقار کی طلبگار ہوتی ہے۔ نفس پر جملہ کوئی عورت برداشت نہیں کرپاتی۔" وہ اتنی سنجیدگی سے بول رہی تھی کہ اسے احساس ہوا کہ وہ کتنا کٹھور دل' بے حس و بے پروا ہے کہ اپنے گھریلو ماحول یہاں کی سخت زندگی کو جانتے ہوئے بھی اسے ذلتوں اور اذیتوں کے سپرد کرکے خود آفیسرز میس کی آرام دہ زندگی میں شاداں و فرحاں ہے اس کا یہ کیسا پیار ہے؟ جبکہ اس نے ارسلان کی خوشی اور سکون و پیار کی خاطر زہر کو شیر مادر سمجھ کر اپنے اندر اتار لیا اور کبھی گلہ کیا نہ ہی اس کو اماں جی اور باقی رشتے داروں کے ظلم و ستم کی داستانیں سنا کر اس سے ہمدردی وصول کرنا چاہی۔

"ارسلان آپ کس سوچ میں پڑ گئے ہیں۔" وہ چونک کر لالٹین کی ملگجی دھندلی سی روشنی میں اس کے منور چہرے کو دیکھنے لگا جس پر سوائے وفا و محبت کے اور کوئی دوسرا نشان نہ تھا۔

"میں نے ابھی ابھی ایک فیصلہ کیا ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"خدا خیر کرے۔" وہ حیرت سے بولی۔

"تم کل میرے ساتھ کراچی چلوگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اب تمہارے بغیر ایک پل بھی گزارنا مشکل ہے۔" وہ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"کیا گھر مل گیا ہے؟" وہ ایک دم سے اچھلی۔

"ہاں یہی سمجھو۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ آنکھوں میں ابھی بھی سوچ و بچار کے سائے لہرا رہے تھے پیشانی کی شکنیں اندرونی کیفیات کی غمازی کررہی تھیں۔

"آپ نے یہ خوشخبری ہضم کیسے کرلی؟ گھر کے اندر قدم رکھتے ہی اعلان کردیتے تو کیا ہی مزا آتا۔ یہ معجزہ کیسے رونما ہوا؟ ابھی تو میری قید بامشقت کے چھ مہینے باقی ہیں۔" وہ خوشی سے رونے لگی تھی۔

"جواد کو تین بیڈ روم کا فلیٹ مل گیا ہے۔ اس میں ایک کمرہ ہمارا ہوگا۔ وہ کب سے مجھے کہہ رہا تھا' مگر میں ہی بہت باغیرت اور خوددار بنا انا کا خاردار سفر طے کرنے پر مصر تھا۔" وہ اسے گلے لگا کر بولا۔

"ممی کا گھر بھی نزدیک ہے ہم سنڈے کی چھٹی ان کے ساتھ گزارا کریں گے۔ وہ لوگ بھی بہت اداس ہوچکے ہیں تمہارے لیے۔"

"ارسلان! میں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔" وہ خوشی سے مغلوب ہو کر بولی۔

"یہ حقیقت ہے جان من۔ چھ مہینوں کی تو بات ہے۔ اچھا ہے اس کی وائف سے تمہاری بھی دوستی ہوجائے گی۔ پرسوں صبح ساڑھے آٹھ بجے C130 سے شورکوٹ ایربیس جہاز کا ایک گھنٹے کا اسٹے ہے۔ وہاں سے جہازوں کے پرزے اتار کر پینجرز لیں گے اور کراچی روانہ ہوجائیں گے۔ وہاں تمہیں ممی کے پاس چھوڑ دوں گا' جیسے ہی کمرہ سیٹ ہوگا۔ تمہیں وہاں سے لے آؤں گا۔ یہ ہے سارا پروگرام جو میں نے ابھی ابھی سوچا ہے۔"

"برا وقت گزر چکا اب تو ہماری زندگی کا ہر دن عید اور ہر رات شب برات ہوگی۔ جب اپنا گھر ہوگا تو اماں جی اور ابا جی کو ہم ساتھ لے جائیں گے۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی بہت مشکل سے کاٹی ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ زندگی جتنی مشکل اور کٹھن ہوتی ہے مزاج اسی کے حساب سے تلخ اور زہر آلود ہوتے ہیں۔ میری طبیعت میں بھی ——— سختی کی وجہ یہاں کا ماحول ہے۔ اگر میں کچھ عرصہ اور یہاں گزار لیتی تو ——— چھوٹی اماں جی کے رتبے پر براجمان ضرور ہوجاتی۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"بھئی ذرا محتاط رہو۔ میری اماں جی پر ہنسنے کی نہیں ہورہی۔"

ارسلان نے اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا اور دونوں ہنستے ہوئے لحاف میں گھس گئے۔

☼ ☼ ☼
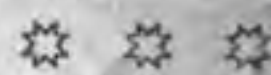
چکلالہ آفیسرز میس کے کمرے میں نچ پر وہ بجلی کے ہیٹر کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگی۔ ارسلان نے بیرے کو لنچ کا آرڈر دیا اور فریش ہونے باتھ روم میں چلا گیا جب تک وہ واپس آیا بیرے نے کھانا کونے میں رکھے ہوئے فور سیٹر ڈائننگ ٹیبل پر لگا دیا تھا۔ شمائلہ نے باتھ روم میں پہنچ کر اپنا جائزہ نہایت تنقیدی نظر سے لیا۔ ڈیڑھ سال میں وہ کس قدر بدل گئی تھی۔ اس پر گاؤں کی چھاپ نمایاں تھی۔ اس نے ڈریسنگ روم میں آکر بیگ سے دھلا ہوا گرم سوٹ نکالا اور اسے بڑے چاؤ سے استری کرکے باتھ روم میں چلی گئی۔ گرم شاور لیتے ہوئے اسے اتنا مزا آیا جیسے اس کے بدن کے پور پور سے گاؤں کی مٹی اور میل کچیل جو ڈیڑھ سال سے اس پر چپک کر رہ گئی تھی دھل گئی ہو۔ بال بھی ڈیڑھ سال میں کمر تک کو چھونے لگے تھے۔ انہیں بھی دوبار شیمپو کیا۔ چہرے کا کولڈ کریم سے دیر تک مساج کرتی رہی جب وہ تیار ہو کر ڈائننگ ٹیبل تک آئی تو اسے سرتاپا بدلا ہوا دیکھ کر ارسلان کھل اٹھا۔

"لوکنگ ویری نائس۔ آج تم پہلے والی شمائلہ سے تھوڑی بہت مشابہت رکھنے لگی ہو۔ ماحول انسان کو کتنی تیزی سے بدلتا ہے۔ اندر سے نہ سہی۔ ظاہراً" تو اس ماحول کی گہری چھاپ شخصیت میں نمایاں طور پر نظر آنے لگتی ہے۔" ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ماحول باطن پر اثر انداز ہوتا ہے تو ظاہر میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ ارسلان آپ سے پیار و عشق میں میرا باطن اور ظاہر ہی بدل گیا تھا اور مجھے خبر ہی نہ ہوئی آپ کے فسوں میں ہی ڈیڑھ سال گزار لیا۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "یا دیں ساتھ چھوڑ دیں تو پھر ایک لمحہ بھی صدیوں پر بھاری ہوجاتا ہے۔ آپ کی یاد اور آپ کے انتظار میں ہی تمام گھڑیاں گزر گئیں۔ میں اللہ تعالیٰ کی احسان مند ہوں' جس نے مجھے ثابت قدم رہنے کی توفیق دی اور آج مجھے آپ کے سامنے سرخروئی حاصل ہوئی۔"

"اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اوہو کھانا تو ٹھنڈا ہوگیا تمہارے انتظار میں۔" ارسلان نے ڈونگے میں چمچہ ڈالتے ہوئے کہا اور بیل پر انگلیاں رکھ دیں۔ بیرہ فوراً" اندر آکر احتراماً" نظریں جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

"اتنی شدید سردی میں کھانا ہی ٹھنڈا ہوگیا۔" ارسلان نے نرمی سے کہا۔

"سر ابھی گرم کھانا لے آتا ہوں۔" وہ مودبانہ انداز میں بولا اور کھانا ٹرے میں رکھنے لگا۔

☼ ☼ ☼
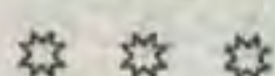
C130 نے شورکوٹ رن وے پر لینڈ کیا اور پچھلی سائیڈ کا دروازہ کھل گیا۔ تمام پینجرز جن کا تعلق ایئر فورس سے تھا جن میں ایئرمین اور ان کی فیملیز بھی تھیں۔ افسران بھی موجود تھے۔ سب اپنی باری سے جہاز سے اترنے لگے۔ ارسلان کا دوست شاہد اپنی بیوی کے ساتھ انہیں ریسیو کرنے آیا ہوا تھا۔ ارسلان اور شمائلہ ایک گھنٹے کے لیے ان کے ساتھ اس کے گھر

چلے گئے۔ مسز شاہد نے نہایت اپنائیت اور لگاوٹ سے انہیں جلدی سے لنچ کرایا۔ باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ بمشکل افراتفری کے عالم میں وہ جہاز پکڑ سکے۔ شور مچاتا ہوا C130 اسٹارٹ ہو چکا تھا جونہی انہوں نے جہاز کے اندر قدم رکھا۔ دروازہ بند ہو گیا اور جہاز نے جنبش کی۔ شمائلہ اپنے شوہر کے ساتھ نئی زندگی میں قدم رکھنے جا رہی تھی۔ وہ حیران بھی تھی اور بے تحاشا شاداں بھی کہ یہ آناً "فاناً" اس کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب کیسے آگیا؟

مسرور رن وے پر ہی جواد انہیں ریسیو کرنے آیا ہوا تھا۔ وہ ایئر فورس کی بس میں تمام پسنجرز اور جواد کے ساتھ سوار ہوئے فلیٹ کو جواد نے سیٹ کر لیا تھا کچن میں بھی ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ صرف فریج کی کمی تھی جو جواد کے سسرال سے آج کل میں ہی پہنچنے والا تھا۔ انہیں اپنا کمرہ بہت پسند آیا۔ کمرے میں دو پلنگ اور دو کین کی کرسیاں اور ایک ٹیبل اور ڈریسنگ روم میں چھوٹا سا ڈریسنگ ٹیبل اور صاف ستھرا چپس کے فرش والا باتھ روم۔

بیرہ — کھانا لے آیا تھا۔ بہت سادہ کھانا تھا دال چاول اور شامی کباب کے ساتھ رائتہ اور سلاد

تینوں نے گپ شپ کرتے ہوئے کھانا تناول کیا۔ بیرے نے گھر کے کچن میں ہی سبز قہوہ بنایا اور اس سے فارغ ہونے کے بعد ارسلان شمائلہ کو اس کے میکے چھوڑنے چل دیا۔

جہاں وہ ڈیڑھ سال بعد قدم رکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اپنے گھر آئے چار مہینے ہی تو ہوئے ہیں کہ آپ کی پوسٹنگ آگئی۔ پیکنگ، شفٹنگ اور پھر نیا بیس سرگودھا، نئے لوگ اور نیا ماحول۔ دل کچھ پریشان سا ہو گیا ہے۔" شمائلہ نے پوسٹنگ کی خبر سنتے ہی بے ساختہ کہا

"ہم سے یاری لگاؤ گی تو یہی کچھ ہو گا۔" ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جانتی ہو سرگودھا کی پوسٹنگ کے بارے میں وہاں کی پوسٹنگ کے لیے ہر پائلٹ دعائیں مانگتا ہے۔ یہ میرے کیریئر کے لیے بہت اچھا ہے۔ چند مہینوں کی بات ہے۔ تمہارا شوہر نامدار وہیں اسکواڈرن کمانڈر بن جائے گا۔ بس یوں سمجھو کہ میری مشقت اور تمہاری عیاشی کے دن شروع ہونے والے ہیں۔ وہاں کا لیڈیز ونگ بھی خوب ایکٹو ہے۔ تمہیں وہاں بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔ پسند کا کمیونٹی سینٹر جوائن کر لینا۔ اچھی ہے بزنس کے اصول سیکھ جاؤ گی۔" وہ اسے خوش دیکھ کر کھلکھلا کر بولا۔

"ہمارا قیام میس میں ہی ہو گا۔ امید ہے کہ تم اس لائف کو خوب انجوائے کرو گی۔ نہ کھانا پکانے کی فکر بس چراغ رگڑو اور خدمت گار کو حاضر پاؤ گی۔ دوسرا سب سے جو بڑا فائدہ ہے کہ میں اماں جی کے قریب ہو جاؤں گا۔ پنڈی کون سا دور ہے۔ آنکھ جھپکتے پہنچ جایا کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ اماں جی بھی چکر لگاتی رہیں۔ کراچی بہت دور ہے۔ میں بھی تھک سا گیا۔" وہ خوشی میں بولے جا رہا تھا۔

"آپ کو خوش دیکھ کر مجھے بہت مزا آرہا ہے۔" وہ مسرت آگیں لہجے میں بولی۔

"اب تمہیں ماں اور مجھے باپ بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اب ہم ہر لحاظ سے تیار ہیں۔" وہ اپنی ہی لے میں بولے جا رہا تھا۔ "اپنی تمام ذمہ داریاں بھی ختم ہو گئیں جونہی گھر ملے گا اماں جی اور ابا جی کو اپنے پاس لے آؤں گا۔ وہ بھی اپنی آخری عمر سکون و آرام میں گزار لیں۔ یہ میری خواہش ہے شمائلہ۔"

"کیوں نہیں ارسلان؟ میں نے بھی یہی سوچ رکھا ہے۔ مجھے ان پر بہت ترس آتا ہے اپنی اولاد کو وہاں سے نکال کر خود بالکل ہی تنہا ہو کر رہ گئے ہیں۔" وہ رحم دلانہ لہجے میں بولی۔

"اگر میرا بیٹا ہوا تو شمائلہ میں اسے بھی فائٹر پائلٹ بناؤں گا اور دیکھنا ایک دن ہمارا بچہ ہمارا نام روشن کرے گا بہت اعلا عہدے پر فائز ہو گا۔" وہ سحر زدہ آواز میں بولا۔

"اگر بیٹی ہوئی تو؟" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"تو اس کی شادی فائٹر پائلٹ سے کروں گا۔" وہ برجستہ بولا۔

"اب اپنے اس دائرے سے باہر نکلنا میرے لیے بہت محال ہے۔"

"میرا ابھی کچھ یہی حال ہے۔ چلیں آج ایک بہت فیصلہ تو ہوا۔" وہ ہنستے ہوئے کافی بنانے اٹھ گئی۔

"ہاں تو فی الحال کافی کے بعد کیا پروگرام ہے؟" وہ رسٹ واچ کی طرف دیکھ کر بولا۔

"سینما ہال میں موؤی دیکھنے کا آئیڈیا کیسا ہے۔"

"آئیڈیا تو برا نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی اور ارسلان نے جواد سے بات کرنے کے لیے کال بک کرا دی تاکہ اس کے سامان کے لیے کسی گیراج کا انتظام کرے کیونکہ نجانے اسے کتنے مہینے آفیسرز میس میں ہی رہنا پڑے گا۔

☼ ☼ ☼

گھر کا سامان زیادہ نہ تھا۔ سامان کو بذریعہ کارگو ٹرین سرگودھا کے لیے بک کرا کر دونوں میس کے کمرے میں شفٹ ہو گئے اور اگلی ہی صبح C130 سے سرگودھا پہنچ گئے۔ آفیسرز میس میں جواد کے کمرے کے سامنے والا کمرہ ارسلان کا تھا۔ دونوں بے پناہ خوش تھے اور ایک بار پھر سے دونوں فیملیز مل جل کر رہنے لگیں۔ ڈنر ڈائننگ ہال کے بجائے بلا ناغہ ارسلان کے کمرے میں کیا جانے لگا اور دونوں جوڑے رات دیر تک سکرابیل سے محظوظ ہوتے رہتے۔

زندگی نہایت خوشیوں کے ہمراہ رواں دواں تھی کہ مسز جواد اور شمائلہ دونوں پریگننٹ ہو گئیں۔ مشترکہ دلچسپیوں نے انہیں ایک دوسرے کے اور نزدیک کر دیا تھا۔ چیک اپ کے لیے مل کر اسپتال جانا اور مل کر بچوں کے لیے ہر وہ ضرورت کی چیز بنوائی جس کا انہیں شوق تھا۔ شمائلہ نے بچے کا تمام سامان بلو کلر کا بنوایا کیونکہ اسے بیٹے کی خواہش تھی اور مریم نے پنک کلر کو فوقیت دی۔ کیونکہ اسے بیٹی چاہیے تھی۔ کیونکہ وہ پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ بچپن سے آج تک وہ بہن کے رشتے کو تلاشتی رہی۔ یہی وجہ تھی کہ شمائلہ کے ساتھ اس کی دوستی چند دنوں میں ہی اتنی گہری ہو گئی تھی کہ اس کے بغیر وہ کہیں نہ جاتی تھی۔ چھ مہینے جو انہوں نے فلیٹ میں اکٹھے گزارے تھے۔ یادگار بن گئے تھے۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے شمائلہ کو اس کی خواہش کے مطابق اولاد نرینہ سے نوازا اور مریم ایک مہینے بعد بیٹی کو پا کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ اب دونوں کی دن بھر کی روٹین اپنے بچوں کے اردگرد گھومنے لگی۔ بچے زندگی کا محور بن گئے تھے۔

ارسلان کے والدین اپنا پوتا دیکھنے آئے، مگر ایک رات سے زیادہ وقت بند گھر میں گزارنا ان کے لیے خاصا جان لیوا تھا۔ اس لیے دوسرے دن ہی ارسلان انہیں گاؤں چھوڑ آیا۔

☼ ☼ ☼

65 کی جنگ نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پاکستان ایئر فورس کا ہر پائلٹ جام شہادت نوش کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ دن رات میٹنگز سے جنگ آپریشن پلان تیار ہو چکا تھا کہ پاکستان کے ہر ایئر بیس پر کتنے جہاز بھیجے جائیں۔ سپر لڑاکا طیارہ بمباری میں بھی لاجواب تھا اور ڈیفنس میں بھی خوب تھا۔ یعنی دشمن کے علاقوں پر بمباری کے ساتھ اپنے تمام علاقوں کی حفاظت بھی کرتا تھا۔ اسی فضائی لڑاکا جہاز پر ارسلان اور جواد کو بھی متعین کیا گیا تھا۔ سب سے پہلا اٹیک ارسلان نے سپر طیارے میں سرگودھا ایئر بیس سے کیا تھا۔ جواد نے پشاور ایئر بیس سے واہگہ اور شکر گڑھ کے علاقوں کی حفاظت کے لیے یکے بعد دیگرے اٹیک کیے۔ دوسرے دن ہی ارسلان نے نہایت دلیری اور بے باکی کا ثبوت دیتے ہوئے دشمن کا طیارہ گرا دیا اور پاکستان ایئر فورس میں ہلچل مچ گئی۔ حوصلے بتدریج بلند ہوتے چلے گئے اور ان کے حملوں نے دشمن کو سر اٹھانے کا موقع ہی نہ دیا۔ تیسرے دن ارسلان ایک

دشمن جہاز کے پیچھے لگ گیا۔ فضائی لڑاکا طیارے کی اپنی بھی لمیٹیشنز ہوتی ہیں کہ وہ اک خاص فاصلے تک فائٹ کرسکتا ہے کیوں کہ فیول کو مد نظر رکھ کر سپر طیارہ 250 کلومیٹر تک فائٹنگ کرسکتا ہے۔
ارسلان سری نگر اٹیک کے لیے پھرتی اور دلیری سے سفر میں جارہا تھا جب دشمن کے طیارے نے اس پر اٹیک کردیا۔ فضا میں دیر تک دونوں کی آنکھ مچولی جاری رہی۔ ارسلان دشمن کا طیارہ گرانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا رخ سری نگر کی طرف تھا۔ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے وہ سری نگر پر حملہ کرنے میں کامیاب ہوگیا اور وہاں بمباری کرنے کے بعد وہ سرعت سے اپنے وطن کے کسی بھی ایئر بیس پر لینڈ کرنے کے لیے آرہا تھا کہ اپنے وطن کی فضاؤں میں داخل ہوتے ہی طیارے نے خطرے کا الارم بجایا اور ATC سے ایجیکٹ کرنے کا سگنل آگیا کہ اپنی جان بچالے۔ اس کے پاس دو منٹ سے زیادہ وقت نہیں ہے۔ ایجکشن ایجکشن کے لفظ پر وہ چوکنا ہوگیا کیونکہ جہاز کا فیول ختم ہوچکا تھا۔

☼ ☼ ☼

شمائلہ کا ہر سانس ارسلان کی سلامتی اور فتح یابی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ آج امان کی برتھ ڈے تھی۔ ارسلان نے اسے کیک بنانے پر رضامند کرلیا تھا جبکہ شمائلہ کا دل مطمئن نہیں تھا۔ ارسلان کو رخصت کرتے ہوئے وہ دیر تک سجدے میں گری رہی۔ خشوع وخضوع سے پاک ذات کے ناموں کا ورد کرتی رہی۔ ہمت کرکے اس نے امان کا برتھ ڈے کیک جہاز کی شیپ میں بنایا۔ بیٹ مین کے ساتھ مل کر لذت سے بھرپور کھانا بنا کر اس نے غسل کیا اور ارسلان کے پسندیدہ وائٹ کلر کی شفون کی ساڑھی زیب تن کی اور بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگی۔
ارسلان دن اور رات کی پہچان کو فراموش کرچکا تھا۔ پھر بھی بیٹے کی پہلی برتھ ڈے کا کیک کاٹنا اسے اپنی فلائنگ کی طرح بہت اہم لگا تھا۔
وہ اس کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کررہی تھی۔ سفید ساڑھی میں اس کا حسن کسی دیوی سے کم نہ لگ رہا تھا۔ وہ اس کی جان کی سلامتی وبقا کے لیے اپنے کے اندر ہی اندر ورد کررہی تھی۔ چلتے پھرتے اس کی نظریں وال کلاک کی طرف اٹھ جاتیں۔
شام گہری ہوتی جارہی تھی، مگر ارسلان کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ اس نے آج واپس آنے کا وعدہ کیا تھا۔ امان کا کیک کاٹنے میں اس کا ساتھ دینا تھا۔ وہ کہاں رہ گیا؟ بے تابی سے اپنے امان کو گلے لگا کر باہر نکلی ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ تمام لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔ کچھ قریبی مورچوں میں اپنے بچوں کے ساتھ براجمان تھے سب اپنی فتح مندی کے لیے دعا گو تھے۔ اس نے اپنے قریب ہی یکے بعد دیگرے کئی سائے محسوس کیے۔ کسی کے ہاتھ میں روشنی کی کوئی چیز نہ تھی بلیک آؤٹ کا سائرن تیزی سے بجے جارہا تھا اور وہ خوف زدہ ہوتی ہوئی مریم کے گھر کی طرف بڑھی۔
"جواد بھائی ارسلان نجانے کہاں رہ گئے؟" مریم نے اسے گلے لگالیا اور اپنی ہمت بحال کرتے ہوئے بولی۔
"شمائلہ اندر چلو یوں باہر اندھیرے میں کسے ڈھونڈ رہی ہو۔" جواد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔
"میرا ارسلان کہاں ہے؟ وہ مجھ سے واپس آنے کا وعدہ کرکے گئے تھے۔ انہوں نے دیر کیوں کردی۔ جواد بھائی آپ چپ کیوں ہیں؟ ارسلان نے آپ سب کو امان کی برتھ ڈے کا ضرور بتایا ہوگا۔ کیک ان کی عدم موجودگی میں تو نہیں کٹے گا۔ آج پہلی برتھ ڈے اس تاریکی میں منائی جائے گی اور اس پاک ذات سے صدق دل سے وعدہ کیا جائے گا کہ امان بھی فائٹر پائلٹ ہی بنے گا اور اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان کی پروا نہیں کرے گا۔"
وہ مسلسل بولے جارہی تھی، مگر دوسری طرف مکمل طور پر خاموشی تھی۔
"آپ چپ کیوں ہیں؟" وہ وہیں نیچے فرش پر بیٹھ

گئی۔
"جواد بھائی آپ کا بھائی شہید ہوگیا۔ قربان ہوگیا اپنے ملک پر اپنی دھرتی پر اور اپنی ماں، بہنوں کی عزت و تحفظ پر۔ یہی ہوا ہے نا۔"
اس نے امان کو اپنی بانہوں میں زور سے سمیٹا اور جواد کے ساتھ لاؤنج میں آگئی۔ پل بھر میں اندر باہر ایئر فورس فیملی کا ہر فرد موجود تھا۔ وہ تنہا نہیں تھی، مگر پھر بھی اکیلے پن کا احساس اس کے ہوش وحواس پر سوار ہوچکا تھا۔ امان کو گلے لگائے وہ اندھیرے میں مسلسل روئے جارہی تھی۔ خود پر کنٹرول نہ تھا آنکھوں میں بے یقینی کیفیت کے ساتھ بے بسی ولاچارگی بھی بے تحاشا تھی۔ ڈاکٹر نے تاریک لاؤنج میں موم بتی کی روشنی میں اسے انجکشن لگادیا اور جواد نے امان کو اس کے ہاتھوں سے لے کر اپنے گلے لگالیا۔ مریم شمائلہ کو سہارا دے کر بیڈ روم میں لے گئی۔
"مریم مجھے سچ سچ بتاؤ کہ کیا ارسلان ہم سے دور بہت دور چلا گیا ہے۔ میرا دل نہیں مان رہا۔ وہ وعدہ خلافی نہیں کرسکتا۔ تم خاموش کیوں ہو؟" وہ چیخ اٹھی تھی اور پھر نڈھال سی ہوکر بیڈ پر گرگئی۔

☼ ☼ ☼

ارسلان کی باڈی اس کے آبائی گاؤں لے جائی گئی۔ اس کے چھوٹے سے گاؤں میں اس کی کچی سال خوردہ خستہ حال حویلی کو دیکھ کر جواد چونک سا گیا تھا جہاں شمائلہ نے ڈیڑھ سال گزارا تھا، مگر اس کی زبان پر کبھی شکایت نہ آئی تھی۔ آج بھی وہ گاؤں کا ذکر بہت عقیدت سے کرتے ہوئے ارسلان کے خاکی جسم کو اسی دھرتی کے سپرد کرنے آگئی تھی۔ لیکن سسرال کا ہر فرد اسے کچوکے لگا رہا تھا۔ طعنے وتشنے دے رہا تھا جیسے ارسلان کی موت کا سبب شمائلہ ہی تو تھی۔ بھائیوں نے والد صاحب کو سمجھا بجھا کر اس بات پر رضامند کرلیا کہ ارسلان کی پنشن اور باقی فنڈز پر بیوی سے بڑھ کر والدین کا حق ہے۔ انہوں نے فوراً" ایئر فورس کے اعلیٰ حکام کی طرف درخواست بھیج دی۔ جس پر جواد تلملا اٹھا تھا ایسے گھناؤنے واقعات تو ہر شہادت کے بعد دیکھنے میں آئے تھے۔ مگر اتنے سادہ لوح اور شریف النفس لوگوں سے اس کی امید ہرگز نہ تھی۔ جواد کے شعور میں یہ بات آچکی تھی کہ یہ لوگ اتنے معصوم اور بھولے بھالے ہرگز نہیں جیسے دیکھنے میں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ شمائلہ کے ساتھ نہ تو چلیں گے، نہ ہی اسے اس کے حال پر چھوڑیں گے۔ اس کی زندگی حرام کرنے میں وہ اس پر الزامات بھی لگا سکتے ہیں۔ بچہ بھی چھین سکتے ہیں اور اسے اغوا بھی کراسکتے ہیں۔ ان تمام خدشات کے پیش نظر جواد اور مریم نے رسم قل کے بعد اسے بمشکل واپس سرگودھا جانے کا مشورہ دیا۔ جسے شمائلہ نے چالیسویں سے پہلے قبول کرنے سے انکار کردیا۔
چالیس دن اسے وہاں چالیس سالوں کے برابر لگے۔ امان بھی بیمار ہوگیا۔ گرمی دانوں نے نرم ملائم جسم پر اس بری طرح حملہ کردیا تھا کہ وہ نہ دن کو چین لیتا تھا نہ ہی رات بھر سوتا تھا۔ رو رو کر اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ شمائلہ کی طبیعت بھی ڈاؤن تھی۔ اس کی قے رک نہیں رہی تھی۔ نقاہت سے برا حال تھا اور سسرال کی جاہلانہ باتیں اسے مضطرب کیے ہوئے تھیں۔ اس کا اور امان کا فیوچر کیسا ہوگا۔ حال کیسے بیتے گا؟ وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ پائی تھی۔ سسرال میں رہنا کسی سزا سے کم نہ تھا۔ بچے کی تمام تر ذمہ داریوں کے ہمراہ ممی کے پاس جانا بھی ممکن نہ تھا۔ وہ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی۔ اسی بے یقینی کے عالم میں دن اور راتیں گزر رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ارسلان! ہر کام میں جلد بازی تمہاری فطرت کا حصہ تھی۔ اس بے ثبات دنیا سے کوچ کرنے میں بھی تیزی اور پھرتی دکھا گئے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ تمہارا ننھا سا امان کسے ڈیڈی کہہ کر پکارے گا۔ کون ہوگا جو اس کا سہارا بنے گا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ شمائلہ بھابھی کی محبت کی تم نے یہ پاسداری رکھی۔ اسے اس بھری

دنیا میں اکیلا چھوڑتے ہوئے تمہیں اس پر ترس کیوں نہ آیا؟" جواد' ارسلان کی قبر کے سرہانے بیٹھا بڑبڑا رہا تھا۔

اس کے کانوں میں ارسلان کی عقیدت و احترام کے جذبے میں سرشار آواز گونجی۔

"غازی بننے کا شوق نہیں شہادت کو گلے لگانے کی خواہش ہے یار اس پہناوے کی قیمت ارزاں نہیں۔ انمول ہے یہ نمازیوں اور شہدا کا پیرہن۔ جب اس پر شہید کے خون کے چھینٹے پڑتے ہیں تو تب حق ادا ہوجاتا ہے۔ مجھے وہ حق ادا کرنا ہے جواد۔"

"تم نے تو اپنے وفائے عہد کا حق ادا کردیا۔ مگر ہمارے لیے تمہاری جدائی اور دوری ناقابل برداشت ہے۔" وہ پھر بڑبڑایا تو اسے ایسے محسوس ہوا جیسے ارسلان اس کے دائیں جانب کھڑا ہے۔ جواد آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا کہ ارسلان کی آواز نے پھر سماعتوں میں شیرینی گھول دی۔

"شمائلہ بہت اکیلی ہے۔ جواد اس کا ساتھ نہ چھوڑنا اور میرے امان کے سر پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر اپنی سچی دوستی کی ایسی مثال قائم کرنا کہ کوئی بیوہ کبھی خود کو لاوارث اور لاچار تصور نہ کرے؟؟"

جواد بند آنکھوں سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جوں ہی اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو ارسلان کو غائب پایا۔ جواد تیزی سے کھڑا ہوکر گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔ قبرستان میں دور بہت دور جہاں اس کے بزرگوں اور رشتے داروں کی بوسیدہ قبریں تھیں ایک سایہ سا نظر آیا۔ غور کرنے سے لگا جیسے اسٹیل گرے کور آل اور ہاتھوں میں ہیلمٹ اٹھائے ارسلان شان بے نیازی سے چلتا جارہا ہے۔ جواد نے آواز دینا چاہی، مگر وہ تو حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی۔ جسم سوکھے پتے کی مانند لرزنے لگا تھا اور آنکھوں کے سامنے دھند لگا سا چھا گیا۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ سنبھل چکا تھا۔ مگر اب وہاں ارسلان تھا' نہ ہی اس کا سایہ تھا۔

"ارسلان! تم تو زندہ ہو۔ ہماری نظروں سے اوجھل ہونے کو موت کا نام دینا کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاک و مقدس کلام پر یقین و بھروسہ ہمیں شہادت کے جذبے سے سرشار کیے رکھتا ہے۔ تم تو میرے ساتھ ہو' ہر ساعت و زماں سوتے جاگتے' چلتے پھرتے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ شمائلہ بھابھی کو تمہارا قرب نصیب نہ ہوتا ہوگا۔ تم بذات خود ان کا سائبان ہو' ان کا سہارا ہو۔ میں ان کے لیے بھلا کیا کرسکتا ہوں۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ تم تو اس سچائی سے بھی کوسوں دور تاقیامت زندہ و جاوید ہو۔ کاش ارسلان میں بھی تمہاری طرح ہمیشہ کی زندگی پالیتا۔ میں کتنا بدنصیب ہوں کہ میں نے ایک حسن کارکردگی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا۔ مگر شہادت کا سحر زدہ آب حیات کا پیالہ ہونٹوں کو نہ لگا سکا۔ بقول تمہارے کہ میں ہر کام میں ہی لیٹ ہوجاتا ہوں۔ مگر مجھے وہ ثابت قدمی' صبر و تحمل اور بتدریج کوشش سے نہیں گھبراتا۔ آخر کار کامرانی و شادمانی کو اپنا رفیق بنا کر ہی لیتا ہوں۔ 65ء کی جنگ میں نہ سہی۔ جب بھی ملک پر مشکل وقت آیا۔ پھر سہی' منتظر ہوں اور گول اچیو کرنے میں ہردم کوشاں ہوں۔"

وہ خود کلامی کرتا ہوا قبرستان سے باہر نکل آیا۔ باہر مریم انتظار کررہی تھی۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے ارسلان کے قدموں کی چاپ اس کے پیچھے آنے کی نشاندہی کررہی ہے۔ جواد نے مڑ کر دیکھنا چاہا۔ مگر خود پر قابو پاکر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ارسلان کے آبائی گھر کی طرف چل پڑا۔ جہاں شمائلہ بیوگی کی حالت میں نہ جانے کتنی ہی سوگوار تھی۔

"شرارتیں کرنے سے باز مت آنا میرے یار۔ آنکھ مچولی مت کھیلو میرے ساتھ۔" وہ بڑبڑایا۔

اب جواد کی رگ و پے میں اداسی اور مایوسی سرایت کرچکی تھی۔

"ابھی میرے قریب ہوا گلے لمحے دور بہت دور۔ تمہاری ستانے کی عادت نہ گئی۔" شہر خموشاں کا اپنا ہی پرسکون اور پراسرار سا ماحول ہوتا ہے۔ جو زندہ انسان پر اپنا تاثر چھوڑے بغیر نہیں رہتا۔ اسی کے اثرات میں گرفتار وہ ارسلان کے گھر پہنچ گیا۔ جہاں اس کے چالیسویں کی تیاریاں ہورہی تھیں۔

چالیسویں کے بعد مریم نے اماں جی سے شمائلہ کو ساتھ لے جانے کی اجازت طلب کی تو گھر میں قیامت برپا ہوگئی۔ ضد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ ڈھٹائی' بے لحاظی اور بے شرمی کی انتہا دیکھ کر جواد کو اندازا ہوگیا کہ شمائلہ کا سسرال اسے اپنے پاس رکھنے پر اس لیے بضد ہے کہ انہیں ارسلان کا پیسہ نظر آرہا ہے۔ جبکہ والدین تقریباً اپنی عمر کے آخری حصے میں تھے اور شمائلہ کے سامنے پہاڑ جیسی جوانی اور طویل کٹھن اور خاردار رستوں کا سفر باقی تھا۔ ارسلان کی پنشن اور باقی زرِ زندگی کے بغیر وہ اپنی اور بچے کی زندگی کو باعزت اور قابل فخر بنانے سے قاصر رہے گی۔ سسرال کے سامنے ہر وقت بھکاری بننا اتنا آسان نہیں۔

آخر سسرال کی تمام مجبوریوں اور آہ و بکا سن کر جواد نے مریم سے مشورہ کیا اور ارسلان کے والدین کو شمائلہ اور امان کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ سنایا جس پر کافی گرما گرمی ہوئی اور اس کی سسرال والوں نے شمائلہ سے قطع تعلق کا اعلان کردیا۔

پنڈی سے سرگودھا تک کا سفر خاصا دشوار تھا۔ سفر نے شمائلہ کی حالت خراب کردی۔ وہ نڈھال اور لاغر ہوکر پچھلی سیٹ پر ڈھے گئی تھی اور امان اس کے اوپر ہی روتا ہوا لیٹ گیا۔ مریم کی کوشش کے باوجود وہ ماں سے چمٹا رہا اور اسی حالت میں سسکیاں بھرتا ہوا سو گیا۔

سرگودھا ایئربیس داخل ہونے سے پہلے ہی جواد شمائلہ اور بچے کو PAF اسپتال لے گیا۔ جہاں ماں بیٹے کو فوراً "ایڈمٹ" کرکے ڈرپ لگادی۔ جواد نے اپنی بچی حنا کو اپنے ساتھ لیا اور مریم کو ان کی نگہداشت کے لیے اسپتال چھوڑ دیا۔ ایک شہید کی بیوہ کا رتبہ بھی کوئی چھوٹا موٹا تو تھا نہیں۔ تمام ڈاکٹرز اور نرسز نے ان کی تیمارداری اور علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اس رزلٹ کے ساتھ کہ شمائلہ ماں بننے والی ہے۔ انہیں ڈسچارج کردیا۔

شمائلہ نے گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے یہ اطلاع اپنے سسرال پہنچائی کہ ہوسکتا ہے۔ ان کے سخت دلوں میں کچھ نرمی آجائے اور دوسری جو کہ سب سے بڑی وجہ تھی کہ انہیں فوری طور پر مطلع کرنے میں اس کی اپنی پاک دامنی اور پاک بازی کی بحالی کی اشد ضرورت تھی۔ ایسے تو اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں کہ شوہر کی وفات کے فوراً" بعد جو عورت حاملہ ہے اسے سرعام اعلان کرنا واجب ہے۔ شرم و حیا میں حمل کو صیغہ راز میں رکھنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ کتنی بڑی مصلحت ہے اس میں۔ انسانی شعور اس سے انکار نہیں کرسکتا۔

سسرال میں اس کا خط پہنچا تو اس خبر نے گھر میں ایک بار پھر صف ماتم بچھادی۔ ارسلان کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر اس کی ماں نے شب و روز شمائلہ کی زیادتیوں اور بے انصافیوں کا واویلا مچایا۔ مگر ارسلان کی طرف سے اس کا کیا جواب ملتا۔ ان کا دل مطمئن کیسے ہوتا؟ جبکہ ارسلان کا شہید جسم قبر میں محفوظ تھا۔ اس کی روح تو ماں کے آس پاس ان کے ناروا سلوک کی وجہ سے بے چینی میں بھٹک رہی تھی۔

سسر نے شمائلہ کو اک توہین آمیز طویل خط لکھ کر اپنے پوتے اور آنے والے بچے سے ہمیشہ کے لیے ناتا توڑ لیا۔ اب شمائلہ کی غیرت و خودداری نے بھی انگڑائی لی اور اس نے ہمت سے زندہ رہنے کے وہ تمام اصول دوہرائے جو ارسلان اسے سکھاتا تھا۔

جوں ہی اس کی طبیعت بہتر ہوئی۔ اس نے دوبارہ PAF اسکول میں نوکری کی درخواست دے ڈالی۔ جو کہ اسی وقت منظور کی گئی۔ شمائلہ اسی ایئربیس پر امان کے برسرروزگار ہونے تک سیٹل ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ صبر و شکر کرنے والوں کے لیے اپنی رحمتوں اور فضل و کرم کے دروازے ان ہی طریقوں سے وا کردیتا ہے کہ انسانوں کی صورت میں فرشتے ان کی مدد کے لیے زمین پر اتر آتے ہیں اور ان کے تمام فکرات تمام بوجھ کی ذمہ داری اٹھالی جاتی ہے۔

چمن کی پیدائش پر وہ ارسلان کو یاد کرکے بہت روئی تھی۔

ہفتے دنوں اور مہینوں میں جا چھپے اور مہینے سالوں کا روپ دھار گئے۔ امان اپنے شہید پاپا کی خواہش کے مطابق پائلٹ آفیسر بن گیا اور جواد کی بیٹی حنا کے ساتھ اس کی ایسی محبت چلی کہ ارسلان کی طرح چوبیس سال کی عمر میں ہی شادی کرنے کا تہیہ کرلیا۔ آخر یہ عشق و دیوانگی اسے ورثے میں ملی تھی۔ اس کا قصور تو نہیں تھا۔ شمائلہ نے لاکھ سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔

جواد بھی گزرے ہوئے سالوں میں ونگ کمانڈر کی پروموشن کے لیے اسٹاف کالج کا کورس کرنے فیصل کراچی ایک سال رہا۔ وہاں بہترین پرفارمنس کی وجہ سے ایک سال DS (یعنی کالج میں ہی استاد کی حیثیت سے جو کہ کسی کو نصیب ہوتی ہے۔) مقرر کیا گیا۔ باعزت طریقے سے کچھ وقت گزارنے کے بعد اسے گروپ کیپٹن کا رینک ملا اور OC فلائنگ کے عہدے پر میانوالی اس کی پوسٹنگ ہوگئی۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد سرگودھا ایر کموڈور (جو کہ بریگیڈیر کا رینک ہوتا ہے۔) کا رینک حاصل کرکے بیس کمانڈر کے عہدے پر فائز ہوگیا۔

شمائلہ بچوں کے ہمراہ ابھی تک ایر فورس کے عنایت کردہ شیلٹر میں ہی رہائش پذیر تھی۔ امان کی پوسٹنگ کراچی ہی تھی جواد کی بہترین کارکردگی کے بعد اسے ایر مارشل بے رینک کے لیے ایر ہیڈ کوارٹرز چکلالہ (راولپنڈی) مدعو کیا گیا تو شمائلہ کی آنکھوں کے سامنے ارسلان گھوم گیا۔ جس نے یہ دنیاوی رینکس تو حاصل نہ کیے تھے وقت نے اسے اجازت ہی نہ دی تھی۔ لیکن اس کی شہادت کا رینک یہاں کے ہر رینک پر حاوی تھا۔ اسے اسی پر فخر اور مسرت تھی۔

رینک کی پٹیاں لگنے کے بعد اس کی پوسٹنگ ایر ہیڈ کوارٹرز ہوگئی اور اسے آپریشن DCS کے عہدے پر فائز کردیا گیا۔ اس کے چیف ایر مارشل یعنی ایر فورس کا سربراہ بننے کے چانسز بہت روشن نظر آنے لگے تھے۔ شمائلہ بیٹے کے لیے حنا کا ہاتھ مانگنے گئی تو مریم اور جواد کے چہروں پر اپنائیت اور انسیت کی جگہ غیریت اور لاتعلقی دیکھ کر گھبرا گئی۔ دنیاوی شان و شوکت اور آن بان کے سامنے اس کی حیثیت ایک بیوہ ایک معمولی سی ٹیچر کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔ اس نے خود کو اس محل نما گھر میں مس فٹ محسوس کیا اور اگلے ہی دن وہ واپس سرگودھا آگئی۔ چھوٹا سا شیلٹر جس نے اسے سر چھپانے اور ہر طرح کے طوفانوں سے محفوظ رکھا تھا۔ مریم کے محل سے بہت عظیم تھا۔ یہ اسٹیٹس، مال و دولت اپنوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے۔ اس کا یقین تو اسے ارسلان کے جانے کے فوراً" بعد ہی ہوگیا تھا۔ مگر جواد اور مریم کی تو [illegible] پر یقین نہیں آرہا تھا۔ امان نے ماں کی خاموشی اور اداسی سے ناکامی کا اندازہ لگا ہی لیا تھا۔ حنا کو فوراً" مطلع کرنا ضروری سمجھا۔ وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کے لیے تیار تھا۔

✡ ✡ ✡

"شمائلہ! تمہارے لیے خوش خبری ہے۔ کل انگوٹھی لے کر پہنچو۔ تاکہ ان دو عدد چغد بچوں کی زندگیوں کا فیصلہ کیا جائے۔ چمن کو ساتھ لانا مت بھولیے گا۔" مریم نے نہایت اپنائیت سے کہا۔

"اس کے لیے بھی ایک مناسب رشتہ آیا ہے۔ تم بھی اپنے فرض سے سبکدوش ہوجاؤ۔ جواد بھی چاہ رہے ہیں۔"

"یہ سب کیسے ہوگیا۔ معجزاتی طور پر۔" وہ دل میں ہی بڑبڑائی۔

"آپ خاموش کیوں ہیں؟ پلیز شمائلہ انکار مت کرنا۔ حنا نے ہمیں خودکشی کی دھمکی دی ہے۔ آپ میری بہن کی جگہ پر ہیں۔ ہم نے سوچ بچار کے بعد سوچا ہے کہ فی الحال ان کی منگنی یا نکاح کردیتے ہیں اور دو سال بعد رخصتی ہوگی۔ جب امان کے پاس گھر ہوگا۔ وہ آپ کے ساتھ شیلٹر میں رہنے کے لیے تیار ہے۔ مگر مجھے علم ہے کہ یہ نشہ وقتی اور عارضی ہے۔ اس ابال ذرا سی حدت کم ہونے سے دودھ کی طرح بیٹھ جائے گا اور پھر عمر بھر کھولتے رہنا اس کا مقدر بن جائے گا۔ یہ شروع کے دن ہی تو میاں بیوی کو ایک دوسرے کے قریب کرتے ہیں۔ جب ان دنوں میں ہی تلخی اور گھٹن ہو تو باقی ماندہ زندگی دکھوں، غموں اور پچھتاووں کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ آپ اپنے بیتے ہوئے ماضی کا موازنہ کریں کہ آج آپ اتنی تنہا کیوں ہیں؟ سسرال نے کبھی پلٹ کر دیکھنا گوارا کیوں نہ کیا؟ کیونکہ شروعات میں ہی جو چاؤ چونچلوں اور لاڈ و پیار کا وقت تھا۔ ظلم و ستم سہتے اور زبان پر گرہ لگا کر صبر و تحمل میں بیت گیا۔ اس لیے ہم تاریخ کو دوہرانا نہیں چاہتے۔ بچوں کی پسند اور مرضی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ رشتہ جوڑنے کا فیصلہ تو کرلیا ہے۔ مگر شرط ہر صورت میں اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔" مریم نے نہایت ملائمت اور اپنائیت سے کہا۔

"مجھے قطعاً" اعتراض نہیں مریم۔ مجھے جواد بھائی کے انکار، اعتراض اور اقرار پر پورا بھروسا ہے۔ وہ ہمارے لیے جو فیصلہ کریں گے اس میں ہماری بہتری ضرور ہوگی۔" شمائلہ نے احسن طریق سے اس رشتے کا اقرار کیا۔

اگلے ہی دن وہی سونے کی سادہ رنگ جو ارسلان نے منگنی پر اسے دی تھی۔ اسے پالش کرواکر نیا پن دیا اور مٹھائی کے دو ٹوکرے لے کر بمعہ امان کے جواد کے گھر پہنچ گئی۔ دن کے چند گھنٹے وہاں گزارنے کے بعد جواد نے انہیں چکلالہ میس بھجوا دیا۔ شمائلہ حیران و پریشان ہوکر سوچے جارہی تھی کہ جب جواد کے پاس ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا تو اس کا دل سمندر سے گہرا اور دھرتی کی طرح وسیع تھا۔ آج محل میں ان کے رہنے کے لیے جگہ ہی نہ تھی۔ کیونکہ دل پر اسٹیٹس کی جو چھاپ لگی تھی۔ وہ اتنی گہری تھی کہ آج اپنے جگری یار کی کمی محسوس ہوئی نہ ہی شمائلہ کے ایثار و قربانی پر فخر ہوا۔ طوعاً" کرہاً" بیٹی کی جان کی سلامتی کے لیے اسے فیصلہ کرنا پڑا تھا۔

گھر واپس آکر اس نے پھر سے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ شمائلہ اور چمن نے ایک دوسرے کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا۔ تو شمائلہ نے آہستگی سے

کہا۔
"میں نے تمہارے پاپا کی خواہش کو پورا کرنے میں دن رات مشقت کی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ فائٹر پائلٹ بن گیا' لیکن اس کی شادی حنا سے کرنے کا انہوں نے کبھی مذاق بھی ذکر نہ کیا تھا۔"
"ممی! اس وقت دونوں بہت چھوٹے تھے۔ اگر پاپا آج زندہ ہوتے تو وہ امان کی حنا سے ہی شادی کرنے کا فیصلہ کرتے اور جواد انکل ۔۔۔ کسی اعتراض کے بغیر امان کو اپنے سینے سے فخرو مسرت سے لگالیتے۔ کیوں کہ پاپا بھی تو ہر صورت ایر مارشل کے عہدے پر فائز ہوتے۔
ممی! ہم دنیا کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اسی دو کمروں کے شملٹو میں ہم نے ماضی گزارا' حال بھی یہیں گزرنے کے چانسز ہیں۔" چمن روہانسی ہو گئی۔
"مگر تمہارے پاپا کا ایک خواب کیسے پورا کروں؟" شمائلہ نے اس کی رنجیدہ باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔
"وہ کون سا خواب تھا۔" وہ حیرت سے بولی۔
"وہ کہا کرتے تھے کہ اگر بیٹی ہوئی تو اس کی شادی فائٹر پائلٹ سے ہی کروں گا۔" وہ ایک طویل آہ بھر کر بولی۔ "کہاں سے ڈھونڈ نکالوں تمہارے لیے فائٹر پائلٹ کا رشتہ۔"
"ممی میں حنا سے شادی نہیں کروں گا' میں نے آپ کی ہر بات پر غور کیا ہے۔ آپ صحیح فرماتی ہیں کہ ان میں اور ہم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اپنے اسٹیٹس کے خاندان میں رشتہ کرنے سے ہمارے مسائل کم ہوں گے۔ کہاں حنا گاڑیوں میں گھومنے والی اور کہاں میں خستہ حال موٹر بائیک چلانے والا۔ ایسا بے جوڑ رشتہ زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ ویسے بھی ممی شادی تو محبت کی قینچی ہے پھر میں اس ہتھیار کا سودا کیو نکر کروں۔ مجھے حنا سے تاحیات محبت رہے گی۔ میں اسے کبھی بھی بھلا نہیں سکوں گا' لیکن اپنی خودداری اور غیرت کو اس کی محبت کی بھینٹ نہیں چڑھاؤں گا۔ جواد انکل نے مجھے بہت غلط سمجھا ہے۔
مجھے ان کے رینک سے کیا غرض کیا لینا دینا وا... نصیب ہے۔" امان نے ماں کے پاؤں میں ... کر بمشکل کہا۔
"بیٹا اگر تم اس سانحے کو بخوشی برداشت کر سکو تو درست ہے۔ تم اپنے باپ کی طرح خوبرو اور ... وجاہت کے شاہکار ہو۔ تمہیں اسی ایر فورس کی ... بھی فیملی سے رشتہ مل جائے گا۔ اس کی مجھے فکر ... دو سال بعد تمہیں گھر بھی مل جائے گا' اپنی بیگم ... ساتھ پہلے دن سے ہی اس گھر کو آباد کر لینا مجھے ... کی طرف سے یہ سائبان ملا ہوا ہے یہاں بقیہ زند... بھی گزر ہی جائے گی۔ مجھے چمن کی فکر کھائے جا... ہے۔" وہ چمن کی طرف افسردہ نظروں سے دیکھ... بولی۔
"ممی چمن کی فکر نہ کریں' میری بہن میری ذ... داری ہے۔ میرے اسکواڈرن کمانڈر نے اپنی خواہش کا اظہار مجھ سے کیا تھا' میں نے خاص لفٹ نہیں کر... تھی۔ افسوس کہ مجھے ۔۔۔ اپنی ہی خواہش یاد رہی بہن کے بارے میں کچھ نہ سوچا تھا۔ اب چمن کی شا... مجھ سے پہلے ہوگی۔ یہ میں نے سوچ لیا ہے آپ ... فکر ہو جائیں۔" وہ ماں کے پاؤں دباتے ہوئے بولا۔
"ممی! میری کوتاہیوں کو درگزر کر دیجیے گا اور ... معاف کر دیں۔ ہم آج ایک بہت بڑی غلطی کر... سے بال بال بچ گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ جواد انکل... اپنا رنگ ڈھنگ ہمیں بروقت دکھا دیا۔"
"بیٹا! ایک بار پھر سوچ لو۔ غیر فطری اور جذ... فیصلوں میں دم نہیں ہوتا۔ تمہارا اس وقت کا فیصلہ جذباتی اور لمحاتی ہے۔ میں تمہیں دو دن اور دیتی ہو... سوچنے سمجھنے کے لیے پھر جیسا کہو گے ویسا ہی کرو... گی۔" وہ بولی۔
"ہم جواد انکل کے پیار میں اپنی حیثیت ہی بھو... گئے۔ پاپا کو اس دنیا سے رخصت ہوئے سالہا سال گ... گئے ہیں۔ لوگ انہیں بھول چکے ہیں جواد انکل کو... یاد رکھیں گے۔ مجھے ان سے کوئی گلہ نہیں دنیا ای... نام ہے۔ جس کے ہم باسی ہیں۔" امان نے ایک...

سرد آہ بھر کر کہا۔ اس کی مفلوج ذہنی کیفیت لمحہ بہ لمحہ دور ہو رہی تھی اور اس کی باتوں میں مضبوطی آگئی تھی۔
"ممی میں آج سرگودھا جانے سے پہلے پاپا سے ملوانے لے جاؤں گا۔ مدت ہی ہو گئی ان سے ملے۔ پھر دادا اور دادی سے بھی ملوا کر لاؤں گا۔"
"وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں بیٹا۔ ورنہ یوں ہمیں بے یارومددگار نہ چھوڑ دیتے۔" وہ تڑپ کر بولی۔
"آپ نے ان کے ظلم وستم کے باوجود انہیں ہمیشہ حج پہ بھیجا۔ ان کے حج کے تمام انتظامات اور اخراجات آپ نے اٹھائے' ہمیں ان سے ملنے سے بھی روکا نہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کو دیکھ کر ان کے دلوں میں نرمی آجائے۔ دل کی کدورت ختم ہو جائے۔ وہ بھی تو نجانے کتنے دنوں کے مہمان ہیں۔ آپ ہی فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں معاف کر دیں۔" وہ سعادت مندی سے بولا۔
"تم ٹھیک کہتے ہو' میں نے تو پہلے دن سے ہی انہیں درگزر کر دیا تھا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔
"ممی چاہے وہ گھر دوزخ ہے پھر بھی میرا نام اور میری عزت اسی سے وابستہ ہے' ہم اپنے ددھیال کے ہوتے ہوئے لاوارث نہیں کہلائے جائیں گے۔ جڑ کو چھوڑ کر ناتواں شاخوں کو پکڑنے سے ہم منہ کے بل نیچے گر سکتے ہیں۔ ممی آپ نے دانشمندی اور دوراندیشی سے مجھے گرنے سے بچا لیا۔ تیار ہو جائیے۔ ہم واپس جارہے ہیں۔ دادا اور دادی ہمارے ساتھ چلیں گے اور ان کی دعاؤں کے سائے میں چمن کا جلد از جلد رشتہ طے کر دیا جائے گا۔ پاپا کے دونوں خواب آپ نے پورے کر دیے اب تو خوش ہو جائیے ممی یو آر گریٹ لیڈی۔ آئی لو یو ممی۔" امان نے عقیدت کے جذبے سے مغلوب ہو کر ماں کو اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔
امان اور چمن نے ماں کی عظمت کو سلیوٹ کیا تو شمائلہ نے اپنے سراپے پر نظر دوڑائی۔ طویل مدت کے بعد آج تار تار پیرہن پر اس کے صبرو ایثار' وفا اور عطا کے ان گنت رنگ برنگ پیوند نے اسے کس قدر خوشنما بنا دیا تھا۔ آج وہ ادھوری نہیں تھی۔ تنہا اور نامکمل نہیں تھی۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے ارسلان اس کے قریب آکر شہدا کا پیرہن (جس پر یہ مرمٹی تھی) اپنے تمام میڈلز اور رینکس کے ہمراہ اسے تھما کر ہنسا اور کانوں میں جیسے اس نے سرگوشی کی ہو۔
"تم بھی میری شہادت میں برابر کی شریک ہو۔ میں نے جان کی قربانی دی اور شوق شہادت کو منوالیا۔ تم نے اپنے جذبات و احساسات کو قربان کر دیا اور اپنی ذات کی نفی کر دی۔ بولو عظیم کون ہوا۔" یکدم کمرے میں لوبان' اگربتی کی خوشبو کے ساتھ تازہ گلاب کے پھولوں کے سحرزدہ مہکار نے سب کو چونکا دیا۔
"شہادت موت نہیں۔ نئی حیات کا آغاز ہے۔ جس میں باری تعالیٰ کی طرف سے عنایات و نوازشات ہیں۔ نہ دکھ ہے نہ کوئی ڈر ہے۔ نعمتیں ہی نعمتیں ہیں۔" شمائلہ نے یہ سوچتے ہوا اعتراف و اقرار میں اپنا سر جھکا لیا۔

دروازے پر کسی نے دستک دی تو مہر عارف نے سر اٹھا کر دیکھا وہ کافی دیر سے ضروری کاغذات پر نظرثانی میں مصروف تھیں۔

"کیا میں اندر آسکتی ہوں میڈم؟" مسز شکیل نے دروازے پر کھڑے ہو کر پوچھا۔ مسز شکیل نہایت ہی سنجیدہ' عقل مند عورت تھیں جو کہ مہر کے والد محمد عارف صدیقی کی حیات میں ان کی پرسنل سیکریٹری رہ چکی تھیں اور ان کی وفات کے بعد تقریباً" تین سال سے وہ اب مہر فاطمہ کی پرسنل سیکریٹری کے عہدے پر فائز تھیں۔

"لیس کم ان۔" مہر فاطمہ نے انہیں اجازت دی تھی۔

"میڈم آپ کی دس منٹ بعد آڈیٹوریل میٹنگ ہے' میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ یہ میٹنگ آپ بورڈ روم میں اٹینڈ کریں گی یا پھر یہیں؟"

"یہیں۔" مہر فاطمہ نے پین ہولڈر گھماتے ہوئے کہا تھا۔ "اور میں یہ میٹنگ مکمل طور پر اٹینڈ نہیں کرسکوں گی' میں صرف مسٹر ابتہاج سے ہی ملوں گی جو کہ مجھے یہ بتائیں گے کہ ہماری کتابوں کی مارکیٹنگ کیسے ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر ابتہاج ہمارے اشاعتی ادارے کے انتظام کی قدر دانی کریں گے۔"

مسز شکیل نے سامنے لگے شلف میں سے ایک کتاب اٹھالی۔ "عارف صاحب کی یہ کتاب کشتی کو دریا میں اترنے کے لیے کافی ہے"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہی نہیں بلکہ یہ مسٹر ابتہاج کو بھی دریا میں اتارنے کے لیے کافی ہے اور ڈیڈی کو کون نہیں جانتا ان کا تو نام ہی مارکیٹنگ کی دنیا میں کافی ہے۔" مہر فاطمہ کو شروع ہی سے اپنے مقام پر فخر تھا۔

مسز شکیل ہمیشہ سوچتی رہتی تھیں کہ مہر فاطمہ دوسرے لوگوں سے کتنی مختلف ہیں۔ کبھی بہت پرسکون کبھی بے چین' اتنی حوصلہ مند خاتون مگر یہ حوصلہ دکھاتیں تو کبھی دھوکہ نہیں کھاتیں اور اگر ڈھونڈنا چاہتیں تو محبت کرنے کے لیے صحیح آدمی ڈھونڈنے میں مشکل پیش نہیں آتی۔ ان کی شادی کے مخالفین میں کئی آدمی تھے مگر وہ مخالفت پر اس لیے نہ تھے کہ انہیں مہر فاطمہ سے ہمدردی تھی بلکہ وہ سب اس مقام اور اس موقع کی تلاش میں تھے جس کے ذریعہ وہ شہرت اور دولت حاصل کرپاتے۔ ان سب کی محبت اس لیے نہیں تھی کہ مہر فاطمہ انہیں جسمانی فکری اور جذباتی طور پر محبت دیتیں بلکہ وہ تو ان کی طاقت اور پیسہ کے حصول اور ان کی شہرت میں حصہ لینے کے آرزو مند تھے اور اگر ممکن ہوتا تو وہ ہر چیز کا حصول بالجبر اور ناحق بھی لے لیتے کیوں کہ انہوں نے کبھی بھی ایسی عورت نہیں دیکھی تھی۔

اور وہ عورت کیا تھی؟ ان کے والد مرحوم بڑے ہی قابل اور کامیاب رائٹر اور بزنس مین تھے اور ماں کے بچپن میں ہی گزر جانے کی وجہ سے مہر فاطمہ ہمیشہ سے ہی والد کی سرپرستی میں رہیں اور اسی دوران ان سے کافی کچھ سیکھ بھی لیا تھا۔

یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ عقل مندی اور بے انتہا

شعور مہر کو وراثت میں ملا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اعلا کتابوں اور دوسرے اشاعتی اداروں سے ممتاز ادارے کی مالک تھیں، لیکن یہ شاید ایک طرح کی بدقسمتی تھی کہ محمد عارف انہیں بہت کچھ سکھانے میں ناکام رہے اور جلد وفات پا گئے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ انہیں ایک مکمل عورت کی خوبیوں اور انسان کی پہچان کا بھی شعور دے پاتے یا پھر انہوں نے اس بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔

فون کی گھنٹی بجتے ہی مہر فاطمہ نے سارے کام چھوڑ دیے تھے۔

"ہیلو۔" مہر نے فون اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

"ہیلو! مہر میں افضال بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے آنے والی آواز مہر فاطمہ کے سو کالڈ شوہر کی تھی۔

"جی افضال!" مہر فاطمہ حالانکہ بہت بڑے بزنس کی مالک تھیں، مگر افضال کے سامنے نہ جانے کیا ہوتا کہ بڑے ہی مودبانہ انداز میں حکم کی تعمیل کرنے کے انتظار میں رہتیں۔ مہر فاطمہ اپنے شوہر سے دل و جان سے محبت کرتی تھیں اور اس کا خیال رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھیں۔

"میں دس بجے کی فلائٹ سے آرہا ہوں۔ مجھے ریسو کرنے کے لیے کسی کو بھیجو۔" افضال کسی حاکم اور جابر سے کم نہ تھا اسے معلوم تھا کہ وہ مہر فاطمہ کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ فوراً حکم دے کر فون رکھ دیا تھا۔

مہر فاطمہ پر اضطرابی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔

"مسز شکیل آج کی میٹنگ کینسل کر دیں اور الیاس سے کہیں کہ افضال کو ٹھیک ٹائم پر ایئرپورٹ سے پک کریں اور گھر پہنچا دیں۔" وہ آفس سے نکلتے ہوئے جلدی جلدی بول رہی تھیں۔ مسز شکیل ہر بار مہر فاطمہ کا تجزیہ کرنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ دراز قد، بہترین انداز، شاہانہ چال ڈھال کی مالکہ، کپڑوں کا رنگ ہمیشہ ایسا ہوتا تھا جو ان کی شخصیت کو نمایاں کرتا تھا۔ بیضوی گہری کالی آنکھیں اور ان پر لمبی لمبی پلکیں، سنہرے بال، یہ سب ہونے کے بعد تو مہر فاطمہ کو کوئی بھی شوہر مل جاتا، مگر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ قسمت انسان کی زندگی میں ہر موڑ پر عمل دخل کرتی ہے۔

"مسٹر ابتہاج آج کی میٹنگ کینسل ہو گئی ہے۔ میڈم کو بہت ضروری کام سے جانا پڑا۔" مسز شکیل مسٹر ابتہاج سے مخاطب تھیں۔ مسز شکیل کے پاس کچھ نہ تھا، مگر ان کے پاس سکون کی وہ دولت تھی جو پیسوں سے نہیں خریدی جا سکتی۔ ان کے شوہر کی آمدنی کوئی خاص نہیں تھی۔ اس لیے وہ اپنے بچوں کو اچھے اسکول میں تعلیم دینے اور دوسری ضروریات پورا کرنے کے لیے شوہر کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ روزانہ آفس سے واپسی پر بچوں کو اسکول سے لے جاتی تھیں۔ مہر عارف سے خود کو بہتر خیال کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔

کھانے کی میز پر مسز شکیل اپنے شوہر سے باتوں کے دوران مہر کے قصہ کو لے کر بیٹھ گئیں۔

"میں سمجھتی ہوں کہ پیسہ ضروری ہے، لیکن اگر پیسہ کو اپنی زندگی بھر کی راحت سمجھتے ہیں اور سکون کا ذریعہ بھی اسی کو مانتے ہیں۔ ان کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ رشتوں کو بھی پیسوں سے خریدا جا سکتا ہے، لیکن حقیقت تو نہیں کیوں کہ اگر رشتے نہ ہوں تو پیسہ حیثیت رکھتا ہے شکیل۔"

"ٹھیک کہا تم نے عائشہ! زندگی کی پہلی اور ضروری ترجیح رشتے ہی تو ہیں۔ رشتوں سے خاندان بنتا معاشرہ وجود میں آتا ہے اور رشتہ ہی تو انسان کی پہچان ہوتی ہے۔" شکیل نے ان کی بات کی تائید کی تھی۔

"اب دیکھیے نا شکیل! مسٹر عارف نے ساری زندگی محنت کی اور اپنی اکلوتی بیٹی مہر فاطمہ کے لیے عیش و عشرت کا سامان کر دیا یہاں تک کہ مہر کے بچپن میں ہی ان کی ماں گزر گئی تھی اگر وہ چاہتے تو دوسری شادی کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے مہر فاطمہ کے دوسری شادی بھی نہیں کی۔ انہوں نے مہر کی

پرورش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ سب ہی کچھ تو مہیا کر دیا، مگر افسوس موت نے انہیں مہلت نہیں دی کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے کوئی شریک حیات ڈھونڈ پاتے، مگر مہر فاطمہ نے اس سلسلے میں جو فیصلہ کیا وہ سراسر غلط ہے۔ اب ظاہر ہے کہ انسان کو پتا تو نہیں ہوتا کہ بظاہر اچھا نظر آنے والا شخص اندر سے کتنا غلیظ ہوگا۔ لوگوں کا نظریہ ہے کہ شادی جوا ہے، فائدہ نقصان کا کھیل ہے، لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ نکاح تو سنت ہے اور اس کے بغیر عورت اور آدمی کبھی مکمل نہیں ہو سکتے۔"

"اچھا جی! تو ہمارے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا۔" شکیل نے عائشہ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

"دیکھیے شکیل ہر چیز کے بگاڑ اور سنوار میں خود ہمارا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر ہم زندگی کو اس کے اصولوں اور ضابطوں کے مطابق گزاریں تو کبھی ناکام نہ ہوں اور میں تو اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں، میرے بچے میرا گھر اور آپ سب ہی مجھے پرسکون رکھتے ہیں۔" مسز شکیل نے کہا تھا اور وہ دونوں مسکرا دیے تھے۔

☆ ☆ ☆

ہمیشہ کی طرح وہ سادہ سا لباس ہی ملبوس کیے ہوئے تھیں۔ آستین لاپروائی سے فولڈ کی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے کلائی پر گھڑی کے ٹائٹ ہونے کا اندازہ ہو رہا تھا۔ دوسری کلائی میں سونے کا بریسلیٹ اور گلے میں سونے کا نیکلس پہنا ہوا تھا۔ یہ ان کے والد کی طرف سے انہیں دیا ہوا آخری تحفہ تھا اور کافی عرصہ سے انہوں نے اسے پہنا بھی نہ تھا۔ بھاری سونے کے زیورات ان کی شخصیت اور متاثر کن کر رہے تھے اور ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ بھی تھے۔ انہی میں سے ایڈووکیٹ الیاس بھی تھے جو مہر فاطمہ کے فیملی لائیر تھے اور ان سے شادی کے خواہش مندوں میں سرفہرست تھے، مگر مہر فاطمہ کے ہاتھوں ریجیکٹ بھی ہو چکے تھے۔

مہر فاطمہ اپنی کرسی پر بیٹھی گلاس وال سے باہر کے مناظر دیکھ رہی تھیں ان کی نظریں سامنے موجود آفس کی چھتوں پر پڑ رہی تھیں سامنے ہی معروف نیوز چینل کا دفتر تھا، لیکن ان کے آفس کی بلڈنگ تمام آفس سے اونچی تھی جو ان کے لیے باعث فخر تھی۔ ان تمام کامیابیوں میں ان کے والد کی محنت و مشقت شامل تھی، لیکن مہر فاطمہ بھی کافی محنت سے کام کرتی تھیں انہیں اپنے والد کی یاد بے حد ستا رہی تھی۔ وہ اپنی کرسی ٹیبل کی طرف گھما چکی تھیں پھر بھی انہوں نے سامنے کھڑی مسز شکیل کو دیکھا نہ تھا۔ ان کی سوچوں کا محور ان کا ماضی تھا۔ صبح کا وہ وقت مہر کبھی نہیں بھولتی تھیں جس دن ان کے والد نے انہیں آخری دفعہ پکارا تھا۔ وہی والد جنہوں نے ـــ کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ ان کی ہر خواہش کو پورا ہونے کے لیے صرف ان کی زبان تک آنا ہوتا تھا۔

مہر عارف کے سوچوں کے بھنور سے نکلنے کے انتظار میں کھڑی مسز شکیل پر مہر کی نظر پڑ ہی گئی تھی۔

"ہاں کیا ہوا؟" وہ بے اختیاری کی کیفیت میں مخاطب ہوئی تھیں۔

"میڈم آپ ٹھیک ہیں؟" مسز شکیل نے انہیں اتنا بے بس کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کمرے میں ایئرکنڈیشن آن ہونے کے باوجود پسینہ کے ننھے ننھے قطرے ان کے ماتھے پر براجمان تھے اور چہرے پر شکست کے نشان نمایاں تھے۔

"بیٹھیے مسز شکیل!" مہر فاطمہ نے ہاتھ کے اشارے سے عائشہ کو بیٹھنے کا کہا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ مہر فاطمہ اپنی بے بسی کو ظاہر ہونے سے روک نہ سکی تھیں۔ شاید وہ مسز شکیل کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اپنا درد شیئر کرنا چاہتی تھیں یا پھر وہ تھک گئی تھیں۔ ان کے ساتھ کوئی تھا بھی تو نہیں جس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ پاتیں یا پھر اپنا درد و غم شیئر کر سکتیں۔

"جی میڈم!" مسز شکیل نے بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

مہر فاطمہ اپنے آنسوؤں پر ضبط نہیں کر پائیں اور

آنسو ان کے گلابی رخساروں پر بکھر گئے۔

"کچھ نہیں بس کبھی کبھی انسان بے بس ہوجاتا ہے۔ تم کسی کام سے آئی تھیں؟" مہرفاطمہ ایک مجبور عورت تھیں فوراً بات کا رخ بدل دیا۔

"میڈم آپ اگر مجھے اس قابل سمجھیں تو اپنا دکھ مجھ سے شیئر کرسکتی ہیں۔" مسز شکیل نے اپنی ہمدردی کا احساس دلاتے ہوئے کہا تھا۔

"افضال نے دوسری شادی کرلی ہے اور اس نے فیصلہ مجھ پر چھوڑا ہے کہ چاہوں تو ساتھ رہوں یا پھر علیحدہ ہوجاؤں۔" مہرفاطمہ اپنا ذاتی مسئلہ مسز شکیل سے شیئر کررہی تھیں۔ شاید ان کو مسز شکیل پر اعتبار تھا یا پھر اگر ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کردیتیں۔ معاملات ہی کچھ ایسے تھے۔ مہرفاطمہ نے جس طرح کی زندگی گزاری تھی اس زندگی میں ان کے لیے سب سے زیادہ اہم پیسہ تھا اور اسی پیسہ نے انہیں تمام دوستوں، رشتہ داروں سے دور کردیا تھا۔ فخر و غرور کے عوض انہیں تنہائی ہی تو ملی تھی، لیکن اس وقت بھی ان کی سمجھ میں نہ آیا جب انہوں نے سعود علی کی محبت کو مذاق میں اڑا دیا تھا، کیوں کہ ان کے نزدیک تو محبت بھی پیسوں سے خریدی جاسکتی ہے اور وہی انہوں نے کیا۔ محبت کو پیسوں سے خرید لیا۔ افضال جس کی پوری نظران کے اسٹیٹس پر تھیں شادی کرکے عروج پر پہنچا دیا وہی افضال جو ان کے آفس میں معمولی کلرک تھا اور اس قابل نہ ہوتے ہوئے بھی عارف صاحب نے اسے جاب دے دی تھی۔ وہ بلا کا پرکشش اور دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ شاید قسمت اسے یہاں لائی تھی۔ قسمت ہی تو فیصلہ کرتی ہے۔ افضال کی مالی حالت بھی قدرے خراب تھی، مگر اس نے اپنی محبت بھری باتوں سے مہرفاطمہ کے دل میں گھر کرلیا تھا اور مہرفاطمہ میں ہر وہ خوبی تھی جو کسی شخص کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھی، مگر زندگی میں آزمائش بھی ہوتی ہیں جو کسی بھی طریقے اور کسی بھی صورت میں رونما ہوسکتی ہیں، لیکن یہ ضرور ہوسکتا تھا کہ اگر عارف صاحب کی زندگی میں مہرفاطمہ اس قسم کا فیصلہ کرتیں تو وہ انہیں روک لیتے کیوں کہ وہ ایک سمجھ دار اور عقل مند انسان تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی جسے انہوں نے دنیا کی ہر خوشی دی تھی کو کوئی ایسا ہم سفر اور ساتھی ملے جو اس کی دولت سے نہیں بلکہ اس کے جذبات سے محبت کرے، اس کے خیالات سے محبت کرے کیوں وہ جانتے تھے کہ مہر فاطمہ کتنی جذباتی ہیں، مگر ضروری تو نہیں کہ خواہش تکمیل کو پہنچے اور کبھی زندگی بھی تو مہلت نہیں دیتی۔ انسان اچھے مستقبل کی تلاش میں رہتا ہے اور ساری زندگی مستقبل کی فکر کرتا ہے اور اسے سنوارنے میں زندگی صرف کردیتا ہے، لیکن کیا کبھی اس نے سوچا کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے۔ زندگی تو پانی کے بلبلے کی مانند ہواؤں کے زور پر کچھ دیر کے لیے رونما ہوتی ہے۔

عارف صاحب نے بھی اپنی بیٹی کا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے سعود علی جیسے باہنر، عقل مند اور دیانت دار شخص کا انتخاب کیا تھا۔ سعود علی مہرفاطمہ کا فرسٹ کزن تھا اور اس وقت سے ان سے محبت کرتا تھا جب وہ کالج میں اسٹوڈنٹ تھیں اس نے کافی دفعہ مہر سے محبت کا اظہار کیا، مگر انہوں نے انکار کردیا، مگر جب وقت آنے پر عارف صاحب نے خود ہی سعود علی کے دل کی بات کردی اور وہ بخوشی رضامند بھی ہوگیا تو مہر نے سعود کی بھری محفل میں بے عزتی کردی۔ ان کا خیال تھا سعود کو ان سے محبت نہیں ہے ان کی دولت سے ہے ان کی یہ بات سن کر عارف صاحب بھی خاموشی اختیار کرگئے۔

"میڈم آپ پریشان مت ہوں اللہ بہتر کرے گا۔" مسز شکیل نے تسلی دی تھی۔

"انسان جو کچھ کرتا ہے اسے جتانے کے لیے کسی دوسرے شخص کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ سب سے پہلے اس کا ضمیر اسے آگاہ کردیتا ہے۔

میڈم زندگی میں سب ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ میں آپ کو کافی عرصہ سے جانتی ہوں۔ آپ کے موجودہ حالات ماضی کی بہ نسبت کافی بدل گئے ہیں اور حالات تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔ میڈم پیسہ اہمیت رکھتا ہے مگر اہمیت اس شخص کی زیادہ ہوتی ہے جو بدلتے حالات کا سامنا کرتے ہوئے ثابت قدمی سے زندگی کے ہر مقام پر ہمارا ساتھ دینے والا ہوتا ہے۔ آپ کے والد نے محنت و مشقت سے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اس مقام کو برقرار رکھیں۔ آپ نے اب تک ہر فیصلہ دل سے کیا ہے اب ایک بار دل کی جگہ دماغ سے فیصلہ کرکے دیکھیے۔"

مسز شکیل کمرے سے باہر جاچکی تھیں۔ وہ مہرفاطمہ کی طرف سے پریشان تھیں۔ اور ان سے درجہ میں بہت ہی کم ہونے کے باوجود بھی انہیں اہم سبق دے چکی تھیں۔

☆ ☆ ☆

بیل بجنے پر افضال چائے کا سپ لیتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھا تھا۔

"سر! یہ نوٹس آپ کے لیے ہے۔" دروازے پر کھڑے شخص نے براؤن کلر کا لفافہ ان کے ہاتھوں میں تھمادیا تھا۔

دروازہ بند کرتے ہوئے افضال نے ٹی وی لاؤنج کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ لفافہ کھولنے پر معلوم ہوا کہ نوٹس کورٹ کی طرف سے تھا جسے پڑھ کر افضال کے پیروں تلے زمین نکل رہی تھی۔

"تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو مہر۔" افضال فون پر بدستور چلا رہا تھا۔

"مجھے کنگال کرکے تم نے کیا سوچا کہ میں تمہارے قدموں میں پڑجاؤں گا، تم نے میرے سارے اکاؤنٹ سیل کروادیے اور یہ طلاق نامہ؟ اس پر سائن کرکے کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہو تم؟ تم کیا سمجھتی ہو؟ میں نے کبھی تم سے محبت کی ہی نہیں مہر۔"

"شٹ اپ افضال!" مہر نے پہلی بار افضال سے اس طرح بات کی تھی۔

"میں نے جو کیا سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ آئندہ مجھے کال کرنے یا مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔" مہر فون رکھ چکی تھیں۔

ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ افضال ان کی کمزوری تھے جسے انہوں نے ہمیشہ کے لیے خود سے دور کردیا تھا۔ مگر یہ دوری کا فیصلہ ان کی زندگی کا بہترین فیصلہ تھا۔ اب وہ اس بات کو سمجھ رہی تھیں کہ افضال نے صرف ان کی دولت اور شہرت سے محبت کی تھی۔

"آج میں بالکل اکیلی ہوں میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ عشق نامکمل ہے اور رشتہ بھی ادھورے رہ گئے۔ زندگی نے دھوکہ دیا، مگر زندگی ختم کرکے بھی تو کچھ نہ ہوگا۔ کسی نے کبھی روکا ہی نہیں۔ اتنی دولت، شہرت، مگر کسی کام کی نہیں۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے زارو قطار رو رہی تھیں کہ انہوں نے کسی کا ہمدردانہ ہاتھ اپنے کندھے پر محسوس کیا اور پلٹ کر دیکھا۔

"میں اب بھی تمہارے ساتھ ہوں مہر۔ اپنائیت محبت، خلوص کے ساتھ تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہی لہجہ، وہی انداز، وہی محبت جو تین سال پہلے تھی۔ اس وقت مہرفاطمہ اس محبت کو، اس لہجہ کو نہ سمجھ پائی تھیں۔ جتنا اب سمجھ رہی تھیں۔

"مجھے معاف کردو سعود، میں خودغرض تھی۔" مہر نے روتے ہوئے کہا تھا۔

"مہر میرے ساتھ چلو میرے گھر، چلوگی؟" سعود نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا تھا۔

مہر نے مسکراتے ہوئے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ اب انہیں ہر چیز مکمل مل گئی تھی۔ مکمل عشق، مکمل رشتہ، مکمل گھر اور مکمل زندگی۔ اور دوسری طرف مسز شکیل اس ملن پر بے حد مسرور تھیں سعود کو مہر عارف کے سارے حالات بتا کر ان کی زندگی میں محبت کے در وا کرنے کا سہرا تو مسز شکیل کے ہی سر جاتا ہے۔ سچ ہے اچھے اور پرخلوص لوگ اللہ کا انعام ہوتے ہیں۔

☆ ☆

مکمل ناول

ولیم پیٹرسن کو اپنے گھر کے مختصر کوریڈور سے ہو کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھتا دیکھ کر اس کے پہلے سے کشیدہ عضلات مزید تن گئے تھے۔ وہ چہرے پر شدید کھچاؤ کے تاثرات لیے تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھی۔

فاصلہ چونکہ زیادہ نہیں تھا۔ سو پاٹنے میں مختصر وقت لگا۔

"انکل! کیا آپ میری بات سننے کے لیے دو منٹ رکیں گے پلیز!"

وہ اس کی پکار پر ایڑیاں گھما کے پلٹا تھا آنکھوں میں حیرت کا ہلکا سا رنگ لیے، وہ مضبوط قدموں سے چلتی اس کے عین سامنے آن ٹھہری تھی۔

"میری ماما سے نہ ملنے کے مطالبے کے عوض مجھ سے کیا شرط منوانا چاہیں گے؟" ولیم کی آنکھوں سے جھلکتی الجھن مزید بڑھی تھی۔ وہ ناسمجھی سے اس کے چہرے کو تکتا رہا جو سینے پر بازو باندھے بہت اطمینان سے اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"میں سمجھا نہیں۔" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"میری ماما سے ملنا چھوڑ دیں۔ ان ایفیکٹ میری ماما کو چھوڑ دیں۔" اس سے زیادہ واضح الفاظ میں وہ اسے سمجھا بھی نہیں سکتی تھی۔

"لیکن کیوں؟" ولیم کی آنکھوں کے نیلے کانچ ناگواری سے چمکے تھے۔

"مجھے آپ کا ان سے رابطہ رکھنا پسند نہیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"لیکن مجھے ہے۔" وہ فوراً بولی تھی۔

"تمہارا اعتراض بے جا ہے۔ مجھے لگتا ہے تمہیں خود بھی اس بات کا احساس نہیں کہ تم اس وقت کتنی فضول بات کر رہی ہو۔"

"اور اگر اس قسم کی فضول بات آپ سے آپ کی "موجودہ" فیملی کرے تو؟"

"ہمارے ہاں دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی سے گریز کر کے وسیع القلبی اور فراخ ذہنیت کا ثبوت دیا جاتا ہے۔"

"اوہ! مطلب آپ کے ہاں فیملی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔" اس نے سمجھ کر سر ہلایا تھا۔

"فیملی؟"

"جی جناب! اگر آپ کا کوئی فیملی ممبر تفریح میں کسی ٹاور پر کھڑا ہو کر نیچے چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتا ہو اور آپ اسے دیکھتے ہوئے یہ سوچ کر گزر جائیں کہ مجھے اس کے معاملے میں دخل اندازی کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی مرضی بھلے جیے یا مرے۔ اس کا تو پھر یہی مطلب نکلتا ہے نا کہ آپ کے نزدیک سرے سے فیملی کی ہی کوئی اہمیت نہیں۔"

اس نے بہت سکون سے اپنی بات مکمل کر کے سامنے والے ادھیڑ عمر مرد کا سکون رخصت کیا تھا۔

"تمہاری خواہش کے پس پردہ سوچ کا بے تکا پن میں فی الحال سمجھنے سے قاصر ہوں۔ حالانکہ میرین ڈی سوزا اور کیتھرین وغیرہ کی طرح تمہاری ماں میری دوست ہی ہے اور اگر ہم ایک دوسرے کی کمپنی میں اچھا وقت گزارتے ہیں تو میرا نہیں خیال تمہیں یہ بات بری لگنی چاہیے۔"

"میں سارا سیٹ اپ تبدیل کرنے پر تو قادر نہیں، البتہ جو میرے دائرہ اختیار میں ہے وہ ضرور کروں گی۔" اس کا لہجہ اب بھی ہموار تھا اور انداز مناسب، لیکن مقابل کو شاید یہ دونوں ہی پسند نہیں آرہے تھے۔

"بہت محدود سوچ ہے تم لوگوں کی۔" وہ کلس کر بولا تھا۔

"ہاں محدود، لیکن اچھی! ہمیں حدیں توڑنا پسند نہیں ہے نا۔" وہ جان بوجھ کر مسکرائی تھی اور ولیم پیٹرسن اسے خونخوار نظروں سے گھورتا واپس مڑ گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

بات تو کچھ خاص نہیں تھی۔ بلکہ وہی کچھ ہوا تھا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور شاید ہوتا رہے گا۔ لیکن کچھ تھا ایسا جس نے ضحیٰ میر کے اندر کی مشرقی عورت کو بے دار کر دیا۔ جس نے اس کی سوچ، احساسات، دل،

یہاں تک کہ زندگی تک بدل دی۔ کچھ تو ایسا خاص تھا بہرحال۔۔۔

وہ ہمیشہ کی طرح جودت رائے کی برتھ ڈے پر اسے کوئی خاص تحفہ دینے کے لیے پرجوش ہو رہی تھی اور اسی جوش میں اس نے اس کے شایان شان تحفہ خریدنے کے لیے پورے چار گھنٹے مارکیٹ میں صرف کیے تھے۔

جودت سے اس کی شناسائی اور شناسائی سے پھر دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ لیکن وہی اس کی خود سے وابستہ رشتوں کو اہمیت دینے والی عادت۔ وہ اس سرد ملک کی اسی فیصد بروکن فیملیز میں سے ایک سے تعلق رکھتا تھا۔ جودت اس کی کس چیز سے متاثر ہوا وہ نہیں جانتی تھی، لیکن وہ یقیناً" اس کی ذہانت سے ہی متاثر ہوئی تھی۔

"یو آر لکنگ سو گارجنس!" اس نے تھوڑا سا قریب ہو کر آئینے میں ابھرتے اپنے دلکش عکس کو دیکھا تھا۔ نائٹ فنکشن کے حساب سے اس کی تیاری پرفیکٹ تھی۔ تب ہی اچانک ماما کے ہونے والے معمولی ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر وہ اتنی حواس باختہ ہو گئی کہ اگلے دو دنوں میں اسے کسی اور چیز کی طرف دھیان دینے کا خیال ہی نہیں آیا۔ لیکن تیسرے دن ماما کو ہشاش بشاش آفس کے لیے تیار ہوتا دیکھ کر اس کی جان میں جان آگئی تھی۔ تب اسے یاد آیا وہ جودت کی برتھ ڈے پارٹی مس کر چکی ہے۔ "اوہ! جودت نے اسے کتنا مس کیا ہوگا۔" اس خیال کے آتے ہی اس نے سیل فون اٹھا کر ان باکس چیک کیا۔ لیکن جودت کے نام کا نہ تو کوئی ٹیکسٹ موجود تھا اور نہ ہی کوئی مسڈ کال! "وہ یقیناً" مجھ سے خفا ہوگا اور ہونا بھی چاہیے۔"

وہ اس سے ملنے اور برتھ ڈے پارٹی میں نہ آسکنے کی وجہ بتانے کے لیے گفٹ پیک سنبھالتی اس کے اپارٹمنٹ چلی آئی۔ لیکن یہاں آ کر اسے پتا چلا کہ جودت اس وقت تنہا نہیں ہے کیرولین اس کے ساتھ تھی۔ وہ کچھ لمحوں کے لیے ادھ کھلے دروازے پر ٹھہر سی گئی۔ شاید اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ غیر ارادی طور پر کسی کی پرائیویسی میں مخل ہونے کے بعد اسے کیا کرنا چاہیے؟

اس پر نگاہ پڑتے ہی کیرولین کی سفید چمڑی تن سی گئی اور کانچ سی نیلی آنکھوں میں ناگواری در آئی۔

"ہائے ضحیٰ!" جودت اٹھ کر اس کی جانب آگیا تھا جبکہ کیرولین چہرے پر ناگواری کے تاثرات لیے اپنا پرس اٹھاتی کھڑی ہو گئی۔

"اوکے! جودت! آئی تھنک آئی ہیو ٹو گو ناؤ۔" جودت سے "الوداعی مصافحہ" کر کے دروازے پر استادہ ضحیٰ کو نظر انداز کرتی وہ باہر نکل گئی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" جودت نے اس کے ہاتھ میں تھامے گفٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"تمہارا برتھ ڈے گفٹ!" ضحیٰ کا ذہن اس لمحے کہیں اور الجھا تھا اور ذہن کا انتشار اس کی نگاہوں کا ارتکاز بھٹکا رہا تھا۔

"اوہ! ایک اور گفٹ" جودت کے سیاہ پڑتے ہونٹ بے ساختہ پھیلے تھے۔

"ایک اور؟" ضحیٰ بڑبڑائی۔

"جودت! اس رات پارٹی میں۔۔۔"

"وہ رات بلاشبہ ایک حسین رات تھی۔ ایکچولی! مجھے یہ کہنے دو کہ اس رات مجھے پارٹی میں مزا آیا بھی صرف تمہاری وجہ سے تھا۔" ضحیٰ کا منہ مارے حیرت کے کھل گیا۔

"میری وجہ سے؟"

"حالانکہ لیزا اور کیتھی نے اپنی طرف سے خوب رونق لگائی تھی۔ لیکن جو سرور مجھے تمہاری موجودگی نے بخشا ہے وہ کسی اور میں کہاں؟" وہ اس کے تاثرات سے بے خبر اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر ضحیٰ کے قدم دو انچ پیچھے سرکے تھے۔

"لیکن میں تو پارٹی میں آئی ہی نہیں تھی۔" وہ بہت بے ساختہ انداز میں قدرے اونچی آواز میں بولی تھی۔ جودت ایک دم چپ ہو گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"اوہ ڈونٹ ٹیل می یار!"

"آئی ایم ناٹ جوکنگ۔ جودت! میں واقعی پارٹی میں نہیں آئی تھی۔" اب کی بار اس کا لہجہ کچھ بدل سا گیا تھا۔ جودت چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"اس رات اچانک میری ماما کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے میں پارٹی میں نہیں آسکی۔"

"تو پھر۔" جودت کو لگا وہ سچ کہہ رہی ہے۔

"تو پھر وہ میڈی ہوگی جسے میں ضحیٰ میر سمجھ رہا تھا۔" اب کی بار اس کا انداز کھسیاہٹ لیے ہوئے تھا۔

"میں بھی کہوں ضحیٰ میر یوں ایک دم سے مجھ پر مہربان کیسے ہو گئی۔" دوسرے لمحے اس نے کھسیاہٹ کو معنی خیزی کا لبادہ اوڑھا دیا۔ ضحیٰ کے دیکھنے کا انداز نہیں بدلا تھا لیکن اور بہت کچھ بدل گیا۔

"اوکے! فارگیٹ اٹ، رات گئی بات گئی کھڑی کیوں ہو، اندر آجاؤ نا۔" جودت کا لہجہ اور انداز دونوں نارمل تھے اور نارمل ہی ہونے چاہیے تھے۔ ادراک کا لمحہ تو اس کی زندگی میں آیا تھا جس نے آگہی کے کئی در وا کر دیے۔ وہ گہری سانس کھینچتی اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

"میرا نہیں خیال کہ میرے یہاں رکنے کا کوئی جواز ہے۔" وہ دو قدم مزید پیچھے ہٹی اور پلٹنے ہی لگی تھی کہ جودت کی حیرت میں ڈوبی آواز ابھری۔

"تم اپنے ابنارمل رویے کی وضاحت دینا پسند کرو گی؟"

"میری وضاحت سے تمہاری تشفی نہیں ہوگی سو رہنے دو۔" اتنا کہہ کر وہ باہر نکل آئی تھی۔

اس کا نارمل رویہ جودت کو ابنارمل لگا تھا تو پھر وضاحت پیش کر کے کیونکر اس کی تشفی کرا سکتی تھی۔ بعض اوقات الفاظ بہت قیمتی ہوتے ہیں اتنے کہ سامنے والے کی ذہنیت کو سمجھتے ہوئے آپ انہیں لٹانے سے گریز کرتے ہیں۔

وہ جس جودت کو دوست سے بڑھ کر سمجھنے لگی تھی اس کے نزدیک میڈی اور ضحیٰ میں کوئی فرق نہیں۔ اگر ضحیٰ نہ سہی تو کوئی میڈی اس کی کمی بہت آسانی سے پوری کر سکتی ہے۔ بس اتنی سی اہمیت؟ وہ جو ہر رشتہ مکمل اور بھرپور چاہتی تھی اس قدر ادھورے کھوکھلے رشتے کے ساتھ بھلا کیونکر زندہ رہ پاتی۔ سنگی سرد بنچ پر گھنٹوں ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے اس نے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

ماما آج آفس سے جلدی واپس آگئی تھیں اور اس وقت فریش ہونے کے بعد کھانے کی ٹیبل پر ضحیٰ کی منتظر تھیں۔

"واؤ ماما! کتنا اچھا لگ رہا ہے یہ سب۔ آپ اور میں نجانے کتنے دنوں بعد ایک ساتھ کھانا کھا رہے ہیں نا؟" وہ گرمجوشی سے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتی اپنی مخصوص کرسی کھینچ کر ان کے مقابل بیٹھ گئی۔

"وہ سب کیا تھا ضحیٰ؟" اس کا سلاد کی پلیٹ کی جانب بڑھتا ہاتھ رک گیا تھا۔

"کیا؟" ماما اس کی جانب دیکھ رہی تھیں اور اسے ان کی آنکھوں میں اپنے لیے شدید خفگی نظر آئی تھی۔

"ولیم کی انسلٹ کرتے ہوئے تم نے کچھ سوچا تھا؟"

"انسلٹ؟" اس نے آہستگی سے دہرایا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں نے ان کی کوئی انسلٹ نہیں کی۔ بلکہ ان سے بات کرتے ہوئے اس سے زیادہ مہذب الفاظ میں استعمال کر بھی نہیں سکتی تھی جو میں نے کیے۔"

"تم نے اسے کہا وہ مجھ سے ملنا ترک کر دے؟" ماما نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے پوچھا۔

"بالکل میں نے ایسا کہا۔"

"کیوں؟" ماما چیخی تھیں۔

"ماما! آپ جانتی ہیں وہ اس وقت اپنی فیملی اور آپ دونوں کو چیٹ کر رہا ہے؟" اس نے چمچ سے چاول ادھر ادھر گھماتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ وہ اپنی زبان کی تیزی اس ماں پر نہیں آزمانا چاہتی تھی جس نے اسے بولنا سکھایا تھا۔

"ایک دم فضول بات ہے یہ" ماما نے ناک پر سے

بھی اڑائی تھی۔

"ماما! وہ آپ کی کمپنی میں انجوائے کرتا ہے لیکن یہاں سے اٹھ کر جانے کے بعد اسے آپ کا نام تک یاد نہیں رہتا ہوگا۔ اسے صرف اس وقت آپ کی یاد آتی ہے جب اسے آپ کی ضرورت ہو۔ کیا یہ انسلٹنگ نہیں ہے ماما؟ اور کسی کی نظر میں نہ سہی لیکن انسان کی نظر میں تو اس کی اپنی اہمیت ہونی چاہیے نا؟"

ماما بہت حیرت سے اس کا ایک ایک لفظ سن رہی تھیں۔ جو اپنی بات مکمل کرکے چہرہ نیچے کیے شاید خود پر کنٹرول پانے کی سعی کر رہی تھی۔ اسے اپنا چہرہ تپتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"ضحیٰ! تم ــــ یہ پاکستان کی ٹپیکل عورتوں والی سوچ تمہارے اندر کہاں سے آگئی؟" ضحیٰ نے ایک دم جھکا سر اوپر اٹھایا تھا۔

"پاکستان کی عورتیں بھی ایسا سوچتی ہیں؟" اسے اپنی آواز کھنکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی لیکن ماما نے شاید غور نہیں کیا تھا۔ جب ہی نخوت سے سر جھٹکتے ہوئے بولیں۔

"ہاں! سرخ حویلی میں ایسی سوچ رکھنے والی عورتوں کی کمی نہیں تھی۔" ان کا لہجہ استہزائیہ تھا پھر دوسرے ہی لمحے سر کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"بہرحال! یہ امریکہ ہے میری جان! اگر یہاں ایسی باتیں سننے کو ملیں تو سامنے والا "گڈ جوک" کہہ کر گزر جائے گا۔" نفاست سے پلیٹ میں کھانا نکالتیں وہ اور بھی کچھ کہہ رہی تھیں، جبکہ ضحیٰ حسب عادت گرم جوشی سے ہاتھ آپس میں ملتی خوشگواری سے سوچ رہی تھی۔

"پاپا کی سرزمین کی عورتیں بھی ایسا سوچتی ہیں!"

☼ ☼ ☼

اور اس کا اگلا مطالبہ انہیں سر تا پا ٹھٹکانے کے لیے کافی تھا۔ حیرت کا غلبہ اتنا شدید تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے بول نہیں پائی تھیں جبکہ ضحیٰ ان کی حیرت کو نوٹ تو کر رہی تھی لیکن ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"ضحیٰ! کیا مجھے یہ کہنا چاہیے کہ تمہارا دماغ چل پڑا ہے؟"

"ماما!" اس نے خاصی ناراض نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"اس میں دماغ چلنے والی کون سی بات ہے؟"

"تو تمہیں لگتا ہے تم بہت عقل مندانہ بات کر رہی ہو؟ ہم یہاں سیر تفریح کے لیے نہیں آئے کہ جی کام ختم تو واپس بوریا بستر سمیٹ کر چلتے بنیں۔ ہمارا گھر، بزنس سب کچھ یہیں پر ہے اور تم چاہتی ہو ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے؟" انہوں نے غصے سے سر جھٹکا تھا پھر پانی کا گلاس بھر کر لبوں سے لگا لیا۔

"میں یہ نہیں کہہ رہی سب کچھ اچانک چھوڑ کر چلے جائیں۔ آہستہ آہستہ بھی تو سب کچھ وائنڈ اپ ہو سکتا ہے نا اور ویسے بھی وہاں بھی تو آپ کا گھر، فیملی ہے سچ پوچھیں تو آپ کو تو یہ فیصلہ بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ یہاں ہمارا ہے ہی کون سا؟ یہ فیشنی لوگ جن کے اندر جذبات نام کی کوئی چیز نہیں ہمارے کچھ نہیں لگتے، مجھے ان لوگوں کے بیچ اپنی زندگی نہیں گزارنی۔"

اس کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ ماما ٹھٹک کر اس کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھیں وہ جو یہ سمجھ رہی تھیں کہ ضحیٰ نے محض گپ چھوڑی ہے در حقیقت اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ اتنی گہرائی تک سوچ بیٹھی ہے۔

"یہ ممکن نہیں ہے بیٹا! تم نے اپنی زندگی کے انیس میں سے سولہ سال تو یہیں گزارے ہیں۔ پھر تمہیں تو اس سب کا عادی ہو جانا چاہیے تھا اور ویسے بھی تم نے صرف پاکستان کا نام سن رکھا ہے۔ وہاں کے مسائل سنو گی تو اپنا وہاں جا کر رہنے کا فیصلہ تمہیں خود ہی احمقانہ لگے گا۔" اب کی بار ان کا لہجہ رسانیت لیے ہوئے تھا۔ ضحیٰ نے اس وقت دانستہ خاموشی اختیار کر لی تو انہیں لگا وہ اس کی بات سمجھ گئی ہے، لیکن بہت جلد ان کی خام خیالی دور ہو گئی اور ہر گزرتے دن نے انہیں احساس دلایا کہ ان کی بیٹی ضد کرنے پر آئے تو اپنی ماں کی مشہور زمانہ ضدی طبیعت کو بھی پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ پاکستان کے بگڑے حالات کے ڈراوے، یہاں کی آزادی، منظم زندگی کے فوائد وقتاً "فوقتاً" دہرانے کے بعد بھی بے اثر گئے تھے۔

اور جس رات وہ خالی پیٹ انہیں شب بخیر کہے بغیر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تب انہیں لگا اس کی بات ماننے کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی چارہ نہیں رہا کیونکہ ضحیٰ میران کی زندگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ماما! مجھے اپنی ایک الجھن آپ سے شیئر کرنی ہے۔"

صالحہ بیڈ پر ڈھیر سارے کاغذات پھیلائے آنکھوں پر سنہری کمان والی عینک لگائے بری طرح مصروف تھیں اسے ایک نظر دیکھنے کے بعد پھر سے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"میں سوچ رہی تھی ماموں کی فیملی کے لیے کچھ شاپنگ کروں، لیکن مجھے اس سلسلے میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" وہ ان کے قریب ہی بیڈ پر آرام دہ انداز میں بیٹھ گئی۔

"تم میری مصروفیت کا اندازہ لگا سکتی ہو ضحیٰ! اس لیے خود ہی یہ کام نبٹاؤ۔" انہوں نے مصروف انداز میں جواب دیا تھا۔

"لیکن مجھے کوئی آئیڈیا نہیں ہے ان کے بارے میں شاپنگ کرنے کا۔" اس نے یونہی ایک فائل اٹھا کر اس کے صفحے الٹنا پلٹنا شروع کر دیے تھے۔

"آئیڈیا ہو بھی تو کیسے تم کون سا ان سے ملی ہو؟" انہوں نے عینک اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور قدرے تھکے تھکے انداز میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی تھی۔ ضحیٰ کے آنے سے ان کی توجہ بٹ گئی تھی۔

"آپ تھک گئیں ماما!" ضحیٰ نے فائل ایک طرف رکھ کر محبت سے ان کی بند آنکھوں والے تھکے ماندے چہرے کو دیکھا تھا اور بیڈ پر پھیلے کاغذات سمیٹ کر ترتیب سے رکھنے لگی۔

"جانتی ہو ضحیٰ! جب تمہارے پاپا کا انتقال ہوا تب انہوں نے اس بزنس کی صرف بنیاد رکھی تھی۔ آج بزنس کو اس مقام تک پہنچانے کے لیے میں نے بے انتہا محنت کی ہے، لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اگلے کچھ سالوں میں شاید میں اس بزنس کو اتنا ٹائم، اتنی توجہ نہ دے پاؤں، اس لیے میں تم سے توقع کر رہی تھی کہ تم ہی یہ سب سنبھالو گی، ان فیکٹ میں نے تو یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ کسی اچھے سے لڑکے سے یہیں تمہاری شادی کرکے خود کو تھوڑا سا ٹائم دوں گی میں ریلیکس ہونا چاہ رہی تھی، لیکن تمہاری اس ضد اور خواہش کی وجہ سے مجھے اپنا برسوں سے بنا بنایا ذہن چینج کرنا پڑا۔"

"ماما!" ضحیٰ نے محبت سے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"پلیز ماما! پریشان مت ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں ایک وقت آئے گا جب آپ کو پاکستان جانے کا فیصلہ بالکل درست لگے گا۔" ان کے کندھے پر سر ٹکاتی وہ یقین سے بولی تھی۔ صالحہ نے ذرا سی آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور اپنا دوسرا بازو اس کے گرد پھیلا دیا۔

☼ ☼ ☼

"زی! تم پاکستان جا رہی ہو؟"

میڈونا کو پتا چلا تو وہ مارے حیرت کے چیخ ہی تو پڑی اسے یہ نیوز جودت نے سنائی تھی۔ تب اسے یقین نہیں آیا تھا سو ضحیٰ سے مل کر کنفرم کرنے کو ترجیح دی اور ضحیٰ کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ تاسف سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"تم اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو؟ میرے پیرنٹس کا تعلق پاکستان سے ہے تو اس حساب سے وہ میرا بھی وطن ہے۔ تو کیا اپنے وطن میں جا کر رہنے کی خواہش کا اظہار کرنا اتنی ہی غیر معمولی بات ہے جو تم یوں اوور ری ایکٹ کر رہی ہو؟" اس کے ناراض لہجے پر میڈونا

اپنے سر کو خفیف جنبش دیتے ہوئے بولی۔

"میں جب بھی پاکستان کے حالات کے بارے میں کچھ سنتی ہوں تو یہی سوچ ذہن میں آتی ہے کہ لوگ اتنے خراب حالات میں اتنے ڈھیر سارے مسائل کے ساتھ وہاں رہ کیسے رہے ہیں؟" اس نے گویا اپنے رد عمل کی وضاحت دی تھی۔

"کیسے حالات، کون سے مسائل؟"

ضحیٰ نے دونوں بازو سینے پر باندھ کے بہت اطمینان سے پوچھا تھا۔ وہ دونوں اس وقت رات کے پہلے پہر صاف شفاف سڑک پر ست روی سے چلتیں، دونوں اطراف میں بنی دکانوں کے شوکیس میں سجی اشیا پر بھی ایک آدھ نظر ڈال لیتیں۔

"بم بلاسٹ، لوڈ شیڈنگ، بے روزگاری بلکہ میں نے تو یہ بھی سن رکھا ہے کہ وہاں کبھی بھی ہنگامی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے ایسے میں گھر سے نکلے شخص کو یقین نہیں ہوتا آیا وہ بخیر و عافیت گھر پہنچے گا بھی یا نہیں؟"

"میڈونا! تمہارے پاس اس وقت لائف سرٹیفکیٹ ہے جس پر درج ہو کہ تمہارے ساتھ آج کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آئے گا اور تم بخیر و عافیت گھر پہنچ جاؤ گی؟"

"نہیں، وہ ایکچولی....!" میڈونا قدرے گڑبڑائی تھی۔

"اس پوری کائنات میں کسی کے پاس بھی اس بات کی شیورٹی نہیں ہے۔ کیا یہاں گولیاں نہیں چلتیں، کرپشن نہیں ہوتی، بم بلاسٹ نہیں ہوتے، پیرنٹس کے ساتھ بد سلوکی نہیں کی جاتی یا ہر بندہ شاندار سی سیٹ پر جاب کرتے ہوئے بہترین زندگی کے مزے لوٹ رہا ہے؟ بات دراصل یہ ہے میڈونا ڈیئر! کہ مسائل ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اچھی صورت حال کو بگڑتے، بگڑی کو سنورتے دیر نہیں لگتی پھر کوسب کے لیے پاکستان کے مسائل ہی کیوں؟ کیوں لوگ پاکستان کو کائنات کا عضو معطل ثابت کرنے پر تلے ہیں؟"

اس کا تنفس تیز ہو گیا تھا اور چہرے کی سفید رنگت معمول سے ہٹ کر بے حد سرخ۔ میڈونا نے سر جھکا لیا تھا اب اس کی نظریں تارکول کی سیاہ شفاف سڑک پر آگے بڑھتے اپنے قرمزی اور ضحیٰ کے سرخ جوتوں پر بھٹک رہی تھیں۔ جب وہ بولی تو اس کی آواز بہت مدھم تھی۔

"تم سچ کہہ رہی ہو ڈزی! لیکن.... میں نے تو یہ بھی سن رکھا ہے کہ پاکستان میں مرد چار چار شادیاں کرتے ہیں۔"

"کیا سارے پاکستانی مرد؟" ضحیٰ نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"سارے.... شاید سارے تو نہیں صرف وہی۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی کیونکہ بات پوری کرنے کے لیے اس کے پاس پوری معلومات نہیں تھیں۔

"جب تمہیں ان کے چار چار شادیاں کرنے کے عمل کے پیچھے کار فرما وجوہات کا پتا چل جائے تب مجھے بتانا تم اس عمل کو کس کیٹگری میں رکھتی ہو۔"

"او نہوں!" میڈونا نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"ادھوری معلومات ہمیشہ ناقص ہوتی ہیں اور میں آدھی ادھوری معلومات کے بل بوتے پر پھر سے کسی کے بارے میں غلط رائے قائم نہیں کرنا چاہتی۔"

میڈونا کی بات پر ضحیٰ کھل کر مسکرائی تھی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے دباتے ہوئے بولی۔

"اندازے لگانا برا نہیں، لیکن اس حد تک کہ ان سے کسی دوسرے کا وقار، اس کی عزت مجروح نہ ہو۔"

☼ ☼ ☼

"ماما! ہم پاکستان میں رکیں گے کہاں؟ ماموں کے ہاں یا پھر.... پاپا کی حویلی؟" صالحہ کی گود میں سر رکھے چینل سرچ کرتی وہ اچانک پوچھنے لگی تھی اس کے بالوں میں حرکت کرتی صالحہ کی انگلیاں لمحہ بھر کے لیے تھم گئی تھیں پھر وہ گہری سانس کھینچتی ہموار لہجے میں کہنے لگیں۔

"حویلی والوں سے میرے تعلقات کبھی بھی خوشگوار نہیں رہے۔ حقیقت تو یہ ہے انہوں نے کبھی بہو کی حیثیت سے مجھے قبول ہی نہیں کیا تھا اور پھر ہمارے یہاں سیٹل ہونے کا فیصلہ انہیں بہت ناگوار لگا تھا وہ تو تمہارے پاپا تھے جو میری خاطر ان کے سامنے اسٹینڈ لے لیتے، لیکن ان کے چلے جانے کے بعد تو گویا وہ باب ہی بند ہو گیا نہ تو حویلی والوں سے کوئی رابطہ رہا اور نہ ہی رشتہ۔"

ضحیٰ ایک جھٹکے سے اٹھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔ ماما پہلی بار اس سے حویلی کے متعلق کچھ شیئر کر رہی تھیں۔ عموماً تو ان کی باتوں میں پاکستان میں مقیم رافعہ ممانی لوگوں کا ذکر ہوتا تھا۔ زاہد ماموں کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے معاشی حالات کچھ اچھے نہیں تھے، وہ اکثر فون پر اپنے تنگی حالات کا رونا روتی رہتیں اور ماما انہیں ہر ماہ خطیر رقم پابندی سے بھیجتی تھیں۔

یہ سب تو وہ ہمیشہ سے سنتی آئی تھی چونکنے کی بات تھی کہ ماما نے پہلی بار اس کے سامنے حویلی سے متعلق لب کشائی کی تھی۔ وہ یہ لمحہ غنیمت جانتے ہوئے پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"لیکن ماما رابطہ نہ رکھنے سے رشتے تو نہیں ٹوٹ جایا کرتے، ہم ان کے خاندان کا حصہ ہیں اس حویلی کا تعلق پاپا سے ہے تو ہم کیسے اس سے لاتعلق ہو سکتے ہیں۔" ماما کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرتکز تھیں، لیکن ضحیٰ نے ہمت نہیں ہاری۔

"ماما! ہم رافعہ ممانی کے ہاں کب تک رہ سکتے ہیں؟ حویلی میں رہتے ہوئے ہمیں کم از کم خود کو مہمان تصور تو نہیں کرنا پڑے گا۔ بے شک، بہت سا وقت بیت گیا، لیکن رشتے ناتے کوئی کچی ڈور تو نہیں ہوتے جو اتنی آسانی سے ٹوٹ جائیں اور اگر کوئی غلط فہمی ہے بھی تو دور کی جا سکتی ہے۔"

ماما کی نظروں کا ارتکاز ٹوٹ گیا تھا۔ وہ گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھنے لگیں۔

"یہ ابھی قبل از وقت ہے، وہاں جا کر ہی سچویشن کا پتا چل سکتا ہے۔ بہرحال تم فکر مت کرو، میرے نزدیک تمہاری خوشی مقدم ہے۔"

☼ ☼ ☼

اور ماما نے سچ کہا تھا سچویشن کا پتا وہاں جا کر ہی چل سکتا ہے انہیں ایئرپورٹ پر ریسیو کرنے رافعہ ممانی، ارسل اور سدرہ آئے تھے جبکہ مومن اور علشبہ نے گھر پر ہی رہ کر ان کے استقبال کو مناسب سمجھا تھا۔

اسے ماموں کی ساری فیملی ہی اچھی لگی تھی۔ سب نے ان سے خوب محبت اور لگاوٹ کا اظہار کیا تھا۔ وہ یہاں آ کر خوش تو تھی، لیکن مطمئن نہیں، کچھ تھا ایسا جو اسے Irritate کر رہا تھا، لیکن کیا تاحال وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

رافعہ ممانی کے اپنی تنگدستی اور بے کسی کے وہی قصے جو وہ فون پر سنایا کرتی تھیں اب بھی شد و مد سے جاری تھے۔ حالانکہ یہاں پر کوئی ایسی صورت نظر نہیں آ رہی تھی جو ان کے کہے پر مہر تصدیق ثبت کرتی الٹا ضحیٰ کو تو حیرت ہی ہوئی تھی۔

اتنا شاندار سا دو منزلہ گھر، ایک ہی وقت میں پکنے والے مختلف انواع کے کھانے، لباس، کراکری، الیکٹرک کا سامان غرض ہر چیز پرفیکٹ تھی اور یہ سب کچھ اس کے تصور کے برخلاف ہی تھا۔

شاید کچھ لوگوں کو عادت ہوتی ہے اپنی خود ساختہ مجبوریوں کی داستانیں سنا کر دوسروں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی۔ رافعہ ممانی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی تھی گویا اس خیال کو جھٹکنے کی سعی کی ہو۔

اسے ارسل کا اپنے ارد گرد غیر ضروری منڈلانا کوفت میں مبتلا کرنے لگا تھا۔ حالانکہ اس کی شخصیت بہت متاثر کن تھی اور ڈریسنگ غضب کی، لیکن گفتگو!

چند ایک مرتبہ اس نے اتنے عامیانہ انداز و الفاظ میں ضحیٰ کی تعریف کی کہ وہ کچھ دیر کے لیے بول نہیں پائی تھی۔ شاید اسے ارسل سے اس بے باکی کی توقع نہیں تھی۔ اسے اپنا چہرہ تپتا ہوا محسوس ہوا مزید کسر

سدرہ اور علشبہ کی معنی خیز ہنسی نے پوری کردی۔
ضحیٰ نے محسوس کیا کہ ارسل کے ساتھ اس کی موجودگی پر دونوں بہنیں عجیب معنی خیز فقرے اچھالتیں' جواباً" ارسل مصنوعی غصے سے انہیں گھورتے ہوئے کبھی کان کھجانے لگتا یا پھر ہنس پڑتا جیسے کوئی طے شدہ پلاننگ!

ضحیٰ بہت من موجی قسم کی لڑکی تھی۔ اسے ایک دم سب کا یوں سر پر سوار ہونا حواس باختہ کر گیا تھا۔ مزید رافعہ ممانی صالحہ کو سارا وقت یوں باتوں میں الجھائے رکھتیں کہ اسے ماما سے اکیلے میں بات کرنے کے لیے موقع ڈھونڈنا پڑتا۔

اب بھی ضحیٰ اپنے لیے چائے بنانے کچن میں آئی تو تھوڑی ہی دیر بعد اسے اپنے علاوہ یہاں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے یونہی گردن گھما کر دیکھا دروازے میں ایستادہ ارسل اسے اپنی طرف دیکھتا پاکر مسکراتے ہوئے اندر آگیا۔ نجانے وہ کب سے وہاں کھڑا تھا۔ ضحیٰ سر جھٹکتی چائے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"چائے بنا رہی ہو؟ میرے لیے بھی ایک کپ بنا دو۔"

وہ کرسی کھینچتا اس سے تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھ گیا تھا اور کمال بے تکلفی سے ٹیبل پر پڑا اس کا موبائل اٹھالیا۔ ضحیٰ کے ماتھے پر ناگواری سے شکن ابھری آئی۔ اس نے بمشکل خود کو کچھ کہنے سے روکا تھا۔

"اوہو! ہمارا کچن تو آج پکنک اسپاٹ کا منظر پیش نہیں کر رہا؟"

علشبہ اندر داخل ہوتے ہی آنکھیں مٹکاتی ذو معنی لہجے میں بولی تھی۔ ارسل اس کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا پھر ہنسی روکتے ہوئے قدرے ڈپٹنے کے سے انداز میں بولا۔

"تمہارا ہر وقت بی جمالو بن کر ٹپک پڑنا ضروری ہوتا ہے؟" لیکن جلد ہی دونوں کو احساس ہوگیا کہ ضحیٰ تو ان کی طرف متوجہ ہی نہیں' سو خود ہی بحث سمیٹ کر ایک طرف رکھ دی۔

علشبہ پانی کی بوتل فریج میں رکھنے کے بعد ارسل کی کرسی کی بیک تھام کر کھڑی ہوگئی۔ نظریں اس کے ہاتھوں میں دبے ضحیٰ کے ٹچ موبائل کی اسکرین پر تھیں۔ جہاں وہ ضحیٰ کی مختلف تصاویر انگوٹھے کے دباؤ کی مدد سے اوپر نیچے کر رہا تھا۔

"ضحیٰ! یہ تمہارے ساتھ لڑکا کون ہے؟ بھورے بالوں والا جس نے ایک کان میں بالی پہن رکھی ہے۔"
علشبہ کے استفسار پر اس کا ہاتھ لمحہ بھر کے لیے تھما تھا پھر وہ نارمل لہجے میں بولی۔

"جودت ہے' میرا دوست۔"

"اوہ... لگتا ہے بہت قریبی دوست ہے تمہارا۔"
علشبہ نے سیٹی کے سے انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے تھے۔ ضحیٰ ایک دم اس کی جانب گھومی اس کے یوں براہ راست دیکھنے پر علشبہ کے لبوں میں دبا بات کا ادھورا حصہ بھی پھسل پڑا۔

"تصویروں سے تو یہی لگ رہا ہے۔" اور ضحیٰ کو لگا بے تکلفی کی اس حد کے آگے اور کچھ نہیں۔

"میرا موبائل واپس کرنا پسند کریں گے آپ۔"
ارسل کے سامنے چائے کا مگ رکھتے ہوئے وہ بہت سنجیدگی سے بولی تھی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" ارسل نے فوراً" سے پہلے موبائل اس کی جانب بڑھایا تھا۔

"بہت شکریہ! ویسے اگر دوسروں کی چیز اٹھانے سے پہلے اجازت لے لی جائے تو اگلے بندے پر اچھا امپریشن پڑ سکتا ہے۔" موبائل اس کے ہاتھ سے لیتی علشبہ کو نظر انداز کرتی وہ باہر نکل آئی تھی' چائے کا مگ سلیب پر جوں کا توں چھوڑ کر اس وقت اس کا دل بہت برا ہو رہا تھا' اپنے اور ماما کے مشترکہ کمرے میں رافعہ ممانی کی موجودگی نے اس کی کوفت میں مزید اضافہ کیا تھا۔

وہ چپ چاپ ماما کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی اور کلائی میں پڑا ڈائمنڈ سے جگمگاتا اپنا نفیس بریسلٹ گھمانے لگی۔ یہ وہ واحد جیولری تھی جسے وہ ہمیشہ اپنی

کلائی کی زینت بنائے رکھتی۔

اس کا انداز واضح تھا کہ دونوں ماں بیٹی کو اب کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا جائے' لیکن رافعہ ممانی نے نہ تو اپنا انداز نشست بدلا اور نہ ہی موضوع بدلنے کی زحمت کی۔

"ہاں تو صالحہ! کیا بتا رہی تھیں تم آگے کا کیا پروگرام ہے تمہارا؟ وہاں سے بزنس وائنڈ اپ کرکے یہاں شروع کروگی؟"

"ارے نہیں بھابھی!" صالحہ ان کی بات پر ہلکے سے ہنسی تھیں۔

"مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں ہے' سوچا تو میں نے یہی تھا کہ ضحیٰ اپنی پڑھائی مکمل کرلے تو آہستہ آہستہ سارا بزنس اس کے حوالے کردوں گی لیکن اس کا تو سرے سے کوئی رجحان ہی نہیں ہے اس طرف۔ اگر دلچسپی ہے تو صرف اس حد تک کہ جتنے پیسوں کی ضرورت ہوئی چیک کاٹ کر نکلوالیے۔"

ضحیٰ جانتی تھی ماما نے یہ بات اسے چھیڑنے کے لیے ہی کہی ہے سو وہ ہلکے سے مسکرا کر رہ گئی۔

"وہاں سے بزنس وائنڈ اپ کرنا بہت مشکل ہے' میرے آفس میں چند ایک آفس ورکرز ہیں ایسے جو میری غیر موجودگی میں بھی سب کچھ اچھے طریقے سے سنبھال سکتے ہیں اور میں خود بھی ہر ماہ ایک آدھ چکر لگالیا کروں گی' ویسے بھی ہمارا موجودہ بینک بیلنس میرے اور ضحیٰ کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔ میرا نہیں خیال مجھے اس سلسلے میں خود کو مزید تھکانے کی ضرورت ہے۔"

رافعہ ممانی بدقت تمام ان کی باتوں پر سر ہلاتے ہوئے مسکرائی تھیں۔

"ہاں یہ بات تو ہے اور شاہ نواز کی آبائی جائیداد' حویلی میں بھی تو اچھا خاصا حصہ بنتا ہے تمہارا۔" بظاہر وہ لاپروا لہجے میں کہہ رہی تھیں' لیکن زیرک نگاہیں صالحہ کے چہرے کے تاثرات جانچنے میں مشغول تھیں۔

"شاہ نواز اپنی زندگی میں ہی بہت کچھ ہمارے نام کر گئے تھے بھابھی! ہمیں ان کی آبائی جائیداد میں کوئی دلچسپی نہیں۔" صالحہ کے پرسکون الفاظ و انداز پر رافعہ ممانی چمک کر بولیں۔

"ارے واہ! دلچسپی کیوں نہیں؟ حق ہے تمہارا' ایسے کیسے چھوڑ دوگی؟"

ضحیٰ کو ان کے الفاظ اور لہجہ دونوں کچھ عجیب سے لگے تھے' اس کے لیے رافعہ ممانی کا ان کے ذاتی معاملات میں اس قدر مداخلت کرنا خاصے اچنبھے کا باعث تھا۔ جبکہ ادھر وہ اپنی جلد بازی کو کوستی مربیانہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔

"دیکھو صالحہ! برا وقت بتا کر نہیں آتا اور پھر کل کس نے دیکھا ہے؟ مانا کہ ضحیٰ تمہاری اکلوتی بچی ہے لیکن بیٹھ کر کھانے سے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہوسکتا ہے اور اس بے چاری کے سر پر تو نہ باپ کا سایہ ہے اور نہ بھائی کا ہاتھ' اس لیے کہہ رہی ہوں تم خود سمجھداری سے کام لو۔ شاہ نواز کے بعد اس کی تمام جائیداد پر ضحیٰ کا حق ہے اور تم یہ حق اتنی آسانی سے ان لوگوں کو دے رہی ہو جنہوں نے کبھی تمہاری اچھائیوں کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ شاید تمہیں یہ خوف لاحق ہے کہ وہ لوگ تمہارے اس مطالبے پر تمہیں بے عزت نہ کردیں' لیکن صالحہ! بے عزتی کی نوبت تو تب آتی ہے جب ان کی نظروں میں تمہارے لیے کوئی عزت ہوتی' بہت دکھ کی بات ہے' لیکن سچ یہی ہے نا۔" خاصے ہمدردانہ انداز میں صالحہ کے کندھے پر آہستگی سے ہاتھ تھپتھپاتی' اپنی بات مکمل کرکے وہ باہر چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد ضحیٰ ایک دم جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ "ماما!" اس کی پکار میں جھنجلاہٹ تھی۔

"بور ہو رہی ہو؟"

"یہ بوریت نہیں ہے ماما!" اس نے ماتھے پر آئے بالوں کو جھٹکا تھا۔

"کوئی بغیر اجازت آپ کا موبائل اٹھالیتا ہے اور دوسرا بجائے سرزنش کرنے کے بے ہودہ مذاق کرکے خود ہی لطف لیتا ہے یہاں تک کہ آپ کے انتہائی پرسنل فیملی میٹرز کو ڈسکس کرکے یوں اپنائیت جتائی

جاتی ہے گویا ہمارے پاس عقل نام کی کوئی چیز نہ ہو۔" غصے سے ایک ایک لفظ چبا کر کہتے آخر میں اس کے لہجے میں عجیب بے بسی گھل گئی تھی۔

"تمہیں یہ سب ناگوار لگ رہا ہے؟"

"اف کورس ماما! آپ جانتی ہیں اتنی جلدی فرینک ہونے والے لوگوں سے مجھے الجھن ہوتی ہے کجا کہ اتنی بے تکلفی!"

"اور جانتی ہو تمہاری رافعہ ممانی کیا کہہ رہی تھیں؟" صالحہ نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی تھی۔

"جی! ان کے فرمان ابھی اپنے کانوں سے ہی سنے ہیں۔" وہ سخت جھلائی ہوئی تھی۔

"نہیں! تمہارے اس کمرے میں آنے سے پہلے کی بات کر رہی ہوں۔"

ضحیٰ یونہی سوالیہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھنے لگی۔

"تمہارے اور ارسل کے رشتے کی بات کی ہے انہوں نے مجھ سے۔"

"واٹ!" ضحیٰ اچھلی تھی۔ "ماما! دس از ٹو مچ" وہ مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔

"تمہیں ارسل پسند نہیں آیا ضحیٰ؟"

"بات پسند ناپسند کی نہیں ہے ماما! سات دنوں میں انہوں نے کوئی سات سو ایسی باتیں کی ہیں جن کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ماما! یہ سب لوگ کیوں ہم پر اس قدر حاوی ہونے کی کوشش کر رہے ہیں؟"

اس کا چہرہ اس وقت ہزار ہا رنگ بدل رہا تھا اور آواز عجیب پھٹی پھٹی سی۔ اس نے پہلے کبھی کسی بات پر اتنا شدید رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ زور زور سے پلکیں جھپکتی وہ اپنی آنکھوں میں در آتی نمی کو باہر آنے سے روکنے کی سعی کر رہی تھی۔

"ضحیٰ!" صالحہ کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔

"مجھے حویلی جانا ہے ماما! اپنے پاپا کی حویلی!" ہاتھ کی پشت سے اپنا تر چہرہ صاف کرتی وہ سکون سے بولی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو صالحہ! وہ کم عمر ہے' نا سمجھ ہے لیکن تم تو عقل سے کام لو۔ سولہ سال پہلے جو ہوا کیا تم بھول چکی ہو؟ یا پھر دانستہ اس بات کو اہمیت نہیں دے رہیں؟ جو بھی ہے اتنا بتا دوں وہ لوگ کچھ نہیں بھولے ہوں گے اور اپنے پرانے حساب چکانے کے لیے خدا معلوم وہ ضحیٰ سے کس قسم کا رویہ روا رکھیں؟"

رافعہ ممانی نے انہیں گویا جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ جان بوجھ کر اس بات کو اہمیت نہیں دے رہی تھیں یا ماضی میں جو کچھ ہوا فراموش کر چکی تھیں۔ بات یہ تھی کہ وہ پاکستان آتے وقت ضحیٰ سے ہر ممکن تعاون کا وعدہ کر چکی تھیں اور یہ کہ جو اسے مناسب لگے گا وہ اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گی اور اب ضحیٰ کی سنجیدگی انہیں احساس دلا چکی تھی کہ وہ اس سلسلے میں کوئی آرگومنٹ نہیں سنے گی۔

"بہت چھوٹ دے رکھی ہے تم نے اپنی بیٹی کو صالحہ! ورنہ وہ یوں تن تنہا اتنا بڑا فیصلہ نہ کرتی۔" ماں کے برعکس اچھی خاصی معاملہ فہم تھی اور رافعہ ممانی کو یہ جان کر دھچکا لگا تھا کہ وہ اپنی ماں کی طرح دوسروں کی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے اپنی سوچ ارادے اور باتوں کو اہمیت دیتی ہے۔

وہ جو یہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ ہمیشہ کی طرح چکنی چپڑی باتیں کر کے صالحہ کے ساتھ اس کی بیٹی کو بھی آؤٹ کر لیں گی تاحال تو ان کی خام خیالی ہی ثابت ہوئی تھی۔

"تم کیسی ماں ہو صالحہ! جان بوجھ کر اپنی بیٹی کو کنویں میں چھلانگ لگاتا دیکھ رہی ہو اب بھی کچھ نہیں بگڑا اسے حویلی جانے سے روک لو۔"

ان کا بس نہیں چل رہا تھا ضحیٰ کو کسی جادو کی چھڑی کے بل پر اپنا تابع کر لیں کچھ اس طرح کہ وہ صرف ان ہی کی سنے اور ان ہی کی مانے۔

"ماما!" ضحیٰ نے اندر جھانکا تھا۔

"جان ماما!" صالحہ نے پلٹ کر محبت لٹاتی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ وہ اس وقت بلیک پینٹ پنک کلر کی اسٹائلش شرٹ پہنے کندھے سے نیچے آتے سلکی بالوں کی پونی ٹیل بنائے بہت فریش لگ رہی تھی۔

"اس بار نہ سہی' لیکن اگلی بار میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔ تیار رہیے گا۔" اس کی بات پر ان کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا۔

"ہو سکتا ہے اس بار بھی سب کچھ تمہاری توقع کے برخلاف ہو۔" وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکی تھی۔ پھر بے نیازی سے کندھے اچکا دیے۔ "دیکھا جائے گا۔"

صبح کا وقت تھا اور افراد خانہ اس کے جانے کی خبر سن کر ناشتا وغیرہ سب بھولے اس کمرے میں جمع تھے۔

"اتنی رونق ہو گئی تھی تمہارے دم سے اور اب تمہارے یوں چلے جانے سے دیکھو سب کے چہرے کیسے اتر گئے ہیں۔"

رافعہ ممانی اپنے بچوں کے "اترے" چہروں کو دیکھتی افسردگی سے گویا ہوئیں۔

پھر گہری سانس فضا کے سپرد کرتی فراخدلانہ انداز میں کہنے لگیں۔

"خیر! جو تمہاری مرضی' تیار ہو جاؤ تو بتانا ارسل تمہیں چھوڑ آئے گا۔"

"ارے نہیں ممانی جان! شکریہ میرے پاس ایڈریس ہے میں خود چلی جاؤں گی۔"

"تم کہاں جانتی ہو' یہاں کے راستے؟" ارسل نے لب کشائی کی۔

"جن کے دلوں میں منزل تک پہنچنے کی لگن ہو' انہیں راستے خود بخود مل جایا کرتے ہیں۔" وہ آگے بڑھ کر ماما کے گلے لگ گئی تھی۔ "اپنا خیال رکھیے گا ماما۔"

"آئی ایم سوری بیٹا! کوئی کمزور لمحہ تھا جس کی گرفت میں وہ آ گئی تھیں۔"

"فار واٹ ماما؟" ضحیٰ نے محبت سے ان کے آنسو پونچھے تھے۔

"فار ایوری تھنگ!"

ان کی بھیگی آنکھیں نہ جانے کون سی ان کہی بیان کر رہی تھیں۔ ضحیٰ رک کر انہیں پڑھنے کی کوشش نہ کر پائی۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

"کھانا کھایا آپ نے؟" وہ کلائی میں بندھی ریسٹ واچ پر نظریں دوڑاتا' مضبوط قدموں سے چلتا ہوا ان کے سامنے آ رکا تھا۔ جھریوں زدہ چہرے پر مہربان مسکراہٹ والی معمر عورت نے جھولا روکا اور اپنی گود میں رکھی ضخیم کتاب بند کر کے اس کی جانب متوجہ ہوئی تھیں۔ جو کیمل کلر کے شلوار قمیص پر چاکلیٹ کلر کی چادر ایک کندھے پر ڈالے اپنے سوال کے جواب کا منتظر تھا۔

"کھانا کھایا آپ نے؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"نہیں' دل نہیں چاہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کھالوں گی۔"

"میں جانتا تھا آپ کا جواب یہی ہو گا۔ اسی لیے سب کچھ چھوڑ کر چلا آیا۔" اس کے خفا لہجے پر ان کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی تھی۔

"خوامخواہ کے وہم مت پالا کرو میر شعیب! جب بھوک لگے گی' سکینہ سے کہوں گی کھانا گرم کر کے لا دے گی۔ تمہیں اتنا اہم فنکشن چھوڑ کر آنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"خوامخواہ کے آرگیومنٹ مت دیا کریں۔ معزز خاتون! مجھے جو کرنا چاہیے تھا' وہ میں نے کیا۔" ٹھیک ان ہی کے سے انداز میں کہتا۔ وہ ان کے پہلو میں جھولے پر بیٹھ گیا تھا اور ضحیٰ میر نے اسی دم حویلی کے اندر اپنا پہلا قدم رکھا تھا۔ اسے لگا وہ کسی ونڈر لینڈ میں آ گئی ہے۔ اس نے صرف حویلی کا نام سنا تھا لیکن آج اس حویلی میں پہلا قدم رکھتے ہی جس شدید قسم کی حیرت اور بے یقینی نے اسے چھوا' وہ اندر بڑھتے ہر قدم کے ساتھ دوچند ہو گئی۔

ایسی شاندار جائے رہائش اس کے پاپا کی تھی؟

میر شاہ نواز کی اکلوتی بیٹی ضحیٰ نے اسی حویلی میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں قدم آگے

بڑھارہی تھی۔

قدموں کی چاپ پر ان دونوں نے ایک ساتھ سر اٹھا کر سامنے دیکھا تھا۔ ضحیٰ کے قدم ٹھٹکے تھے۔ اسے سامنے بیٹھے نفوس کی آنکھوں میں اپنے لیے الجھن اور شدید ترین حیرت تیرتی دکھائی دی۔

"وہ... میں... ضحیٰ... ضحیٰ میر! میر شاہ نواز کی بیٹی۔" اسے اپنا تعارف کروانا بہت دشوار لگا تھا اس سمے۔

مہربان مسکراہٹ والی بوڑھی عورت پتھرا کر اسے دیکھے گئی۔ جبکہ ساتھ بیٹھا ان کا خوبرو پوتا ایک جھٹکے سے جھولا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کون ضحیٰ؟ ہم کسی ضحیٰ کو نہیں جانتے۔ آپ یقیناً" غلط جگہ پر آگئی ہیں۔" جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔

"نہیں!" ضحیٰ کی زبان لڑکھڑائی تھی۔ "میں نے حویلی کے ماتھے پر اپنے دادا میر شاہ جہاں کا نام پڑھا ہے۔ آپ..."

"بس!" اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

"یہ حویلی میر شاہ جہاں کی ہی ہے۔ لیکن آپ کا ان سے کوئی رشتہ نہیں۔" اس نے دوٹوک انداز میں گویا بات ہی ختم کردی۔ مقابل کے غصے سے اندر ہی اندر خائف ہونے کے باوجود وہ چیختے ہوئے بولی۔

"میں میر شاہ جہاں کے سب سے چھوٹے بیٹے میر شاہ نواز کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میرا ان سے کوئی رشتہ ہی نہیں؟ مانا کہ میرے پاپا اس دنیا میں نہیں رہے لیکن میرا رشتہ آج بھی اس حویلی سے مسلم ہے۔"

"لگتا ہے آپ ایسے نہیں مانیں گی۔" وہ جارحانہ تیور لیے اس کی جانب بڑھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی۔ وہ اس کا ہاتھ کھینچتا بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ حیرت اور بے یقینی کا غلبہ اتنا شدید تھا کہ وہ کوئی مزاحمت کر ہی نہ پائی۔

"رک جاؤ میر شعیب!" جھولے پر ساکت بیٹھے وجود میں جان پڑی تھی۔ آہنی گرفت لمحہ بھر کے لیے ڈھیلی ہوئی۔ دوسرے لمحے وہ پھر سے اسے گھسیٹنے لگا۔

"میرے شاہ نواز کی نشانی کو مت دھتکارو میر شعیب۔" آنسوؤں میں ڈوبی لرزتی آواز پر اس کے قدم ساکت ہوئے تھے۔ ضحیٰ نے اسی پل کا فائدہ اٹھایا۔ اس کے ہاتھ سے اپنی کلائی چھڑوائی بھاگ کر ان کے پاس آئی تھی۔

"آپ... میری گرینڈ ماں ہیں نا؟ میرے پاپا کی ماں!" شدت جذبات سے اس کی آواز نکل نہیں پارہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھی اپنے دونوں ہاتھ ان کی گود میں رکھے یک ٹک ان کے چہرے کو تک رہی تھی۔ انہوں نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا تو وہ ان کی گود میں سر رکھے رونے لگی تھی۔

"مت کریں ایسا دادی!" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا عین اس کے سر پر آکھڑا ہوا تھا۔

"اس بار میرا دل تمہاری بات ماننے سے منکر ہے۔ میرے بچے! میں کیا کروں؟" ان کے جھریوں زدہ چہرے سے آنسو موتی کی لڑیوں کی مانند ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ وہ نفرت سے اس کے جھکے سر کو دیکھتا آگے بڑھا اور جھٹکے سے اس کا ہاتھ کھینچ کر کھڑا کرتا تنفر زدہ لہجے میں بولا۔

"غور سے دیکھیں اسے یہ کہیں سے آپ کو اپنے بیٹے کی اولاد نظر آتی ہے؟ کچھ ہے ایسا اس میں جو جتائے یہ ہمارے خاندان کا حصہ ہے؟ غور سے دیکھیں دادی! یہ میر شاہ نواز کی نہیں صالحہ اکرام کی بیٹی ہے۔ وہی صالحہ اکرام جس نے برسوں پہلے ہمارے خاندان کو طوفانوں کے سپرد کردیا تھا۔ آج وہی صالحہ ایک بار پھر ہمارے لیے تباہی کا سندیسہ لیے ہماری چوکھٹ پر کھڑی ہے۔"

اس کی سلگتی نگاہیں اس کے وجود کے آرپار گزر رہی تھیں۔ اس کا جسم سن ہوگیا۔ اسے لگا وہ شدید ترین اعصابی جنگ میں اپنی جان ہار دے گی۔

"اتنے سال آزادی کی دلدادہ اپنی ماں کی صحبت میں گزارنے کے بعد آپ کو لگتا ہے یہ اس حویلی میں

رہنے کے قابل ہے، ہرگز نہیں۔" ضحیٰ نے شدت کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

"میرے شاہ نواز کے خون پر انگلی مت اٹھاؤ میر شعیب! مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" وہ آہستگی سے جھولا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ شعیب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے لب بھینچے غصے سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ اس کے قدموں کی دھمک سے حویلی گونج اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آؤ میرے ساتھ آجاؤ۔" وہ چپ چاپ کسی روبوٹ کی مانند ان کے پیچھے چل پڑی کتنے زینے، کتنے راہ داریاں طے کیں، اسے کچھ خبر نہ تھی۔ اس وقت اس کا ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت گنوا بیٹھا تھا۔

"اندر آجاؤ، یہ میرا کمرہ ہے۔" لکڑی کا بھاری منقش دروازہ ہلکی سی چرر کے ساتھ بند ہوگیا تھا۔ یہ ایک کشادہ، کم ساز و سامان سے مزین آرام دہ کمرہ تھا۔ جس کی سجاوٹ میں سادگی کا عنصر نمایاں تھا۔

"تم فریش ہو جاؤ، غسل خانہ اس طرف ہے۔" وہ آہستگی سے سر ہلاتی اس جانب مڑ گئی۔ جس طرف انہوں نے اشارہ کیا تھا۔ اسی طرح شاور لینے کے بعد اسے اپنی طبیعت پر چھایا بوجھل پن دور ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے ایک بار پھر وہی لباس پہن لیا تھا۔ اس کا بیگ تو حویلی میں داخل ہوتے ہی کہیں ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔

"تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی، پہلے کھانا کھالو۔" انہوں نے سنگل صوفے کے آگے پڑی میز پر رکھے کھانے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ضحیٰ نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے اس وقت بھوک محسوس نہیں ہو رہی۔"

"کھانا شروع کرو بھوک خود ہی جاگ اٹھے گی۔" ان کا لہجہ اتنا نرم، اتنا گداز تھا کہ ضحیٰ کا دل چاہا وہ چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہے۔ حالانکہ وہ اس وقت ان سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ اس کے دماغ میں

اودھم مچاتے سوال اپنا جواب پانے کے لیے سر پٹخ رہے تھے۔ "بڑی دلہن کے بھائی کے نکاح کی تقریب ہے آج، سب وہاں گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کچھ دیر میں واپس آجائیں۔"

جب تک اس نے کھانا ختم کیا، تب تک وہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہیں۔

"یہ میرا بستر ہے، تم یہاں آرام سے سو سکتی ہو۔ کوئی تمہارے آرام میں مخل نہیں ہوگا۔" وہ نرمی سے کہتیں اٹھ کر باہر کی جانب بڑھ گئیں۔

ضحیٰ انہیں روکنا چاہتی تھی لیکن محض لب پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ کچھ دیر ان کے پیچھے ہلتے پردے کو دیکھتے رہنے کے بعد لیٹ گئی۔ کمرے کا خوابناک ماحول تھا یا دادی کے نرم لہجے کی تاثیر! تھوڑی ہی دیر میں اس کی پلکیں آپس میں جڑنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا صالحہ پاکستان واپس آگئی ہے؟"

تایا ابا کے منہ سے حیرت بھری آواز نکلی تھی۔

"اتنے برس بعد اس کی پاکستان واپسی اور پھر اپنی بیٹی کو یوں تن تنہا حویلی بھیجنے کی اجازت۔ اس سب کے پیچھے کیا وجہ ہوسکتی ہے؟"

فرقان چاچا نے بند مٹھی ہونٹوں پر رکھتے پرسوچ انداز میں دادی جان کو دیکھا تھا۔

"ہوسکتا ہے وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہو؟" تائی اماں ہمیشہ تصویر کا مثبت رخ ہی دیکھتی تھیں۔

"اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنی بیٹی کو بھیجنے کے بجائے خود یہاں آتی۔" مہناز چچی نے فی الفور ان کے خیال کی تردید کی تھی۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ مختلف قیاس آرائیاں کرکے اپنے ذہن کو تھکایا جائے؟ کچھ دن صبر کرو جلد ہی ساری بات سامنے آجائے گی۔" دادی جان نے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

"لیکن میری ایک بات سن لو، اس کے ساتھ کوئی بھی رویہ اختیار کرنے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ وہ

صرف صالحہ کی نہیں میر شاہ کی نواز کی بھی اولاد ہے۔"

"اماں!" تایا ابا نے خفگی سے انہیں دیکھا تھا۔

"آپ ہمیں ایسا سمجھتی ہیں؟" "نہیں حقیقتاً" افسوس ہوا تھا کہ اماں انہیں اتنا گرا ہوا سمجھتی ہیں جو صالحہ کے لگائے زخموں کا بدلہ وہ اس کی بیٹی سے لیں گے۔ اس وقت ہر شخص اپنے اپنے انداز میں سوچ رہا تھا۔ صرف شعیب تھا جو کاؤچ پر بیٹھا اپنے موبائل پر مصروف تھا۔ اس نے اگرچہ ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا لیکن اس کے چہرے کے پتھریلے تاثرات اس کے اندرونی جذبات عیاں کررہے تھے۔ بزرگوں کی محفل برخاست ہوئی تو نوجوان پارٹی جو ابھی تک خاموش تماشائی بنی بیٹھی تھی، فل فارم میں آگئی، موضوع گفتگو چچازاد تھی میرہی تھی۔ "امریکہ سے آئی ہے، مغرور تو خوب ہوگی۔" کسی بھی موضوع پر بلا تکان بولنے والی ثانیہ کو کم گو لوگ ہمیشہ مغرور ہی لگا کرتے، سوا سے پہلے اسی خدشے ہی ستایا۔ "نجانے لباس کیا پہنتی ہے؟" جدید تراش خراش کے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس ثوبیہ کو اس کے لباس کی فکر لگ گئی۔

"خوب پٹر پٹر انگریزی بولتی وہ تو ہم سب کو شدید احساس کمتری میں مبتلا کردے گی۔" فرسٹ ایئر میں انگریزی کے پیپر میں دوبار فیل ہونے والی گل کی پریشانی بے جا نہیں تھی۔ عبدالرافع کو اس کی شکل دیکھ کر ہنسی آگئی۔

"میں تمہیں ڈکشنری لادوں گا گل! فکر مت کرو، بس جب وہ تم سے بات کرے تو سر ہلاتی رہنا بھلے ایک لفظ بھی پلے نہ پڑے۔ بعد میں ذہن نشین ہونے والے موٹے موٹے الفاظ کے ڈکشنری میں معنی ڈھونڈ کر "مفہوم" سمجھ لینا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" گل ایسے ہی تو اس کی مریدنی نہیں تھی۔ اس کے پاس کم از کم گل کے ہر "مسئلے" کا حل ضرور موجود ہوتا تھا۔

"نہ جانے ہمیں کب اس سے شرف ملاقات بخشا جائے گا؟" مہران نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"بس کرو تم لوگ!" شعیب ناگواری سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"وہ بھی تم لوگوں کی طرح ایک انسان ہی ہے۔ زیادہ سر پر چڑھانے یا متاثر ہونے کی ضرورت نہیں اور بلا ضرورت بے تکلفی یا دوستی تو ہرگز نہیں۔ سن لیا تم سب نے؟" سب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتا وہ باہر نکل گیا تھا۔ میر شعیب کو حویلی کا بڑا پوتا ہونے کا شرف حاصل تھا اور اپنے اس "عہدے" سے وہ کما حقہ فائدہ اٹھاتا۔ خود سے چھوٹے بہن بھائی ثوبیہ اور عبدالرافع کے ساتھ ساتھ فرقان چاچا کے مہران، ثانیہ اور گل پر بھی اس کا خوب رعب چلتا۔ پیٹھ پیچھے چاہے اچھلیں یا کودیں۔ لیکن اس کی موجودگی میں شرافت کے جامے میں رہنے میں ہی انہیں اپنی بھلائی نظر آتی تھی۔ اب بھی اس کے "حکم" پر تابعداری سے سر جھکا دیا تھا۔ لیکن اس کے باہر نکلتے ہی عبدالرافع کھڑا ہو کر کہنے لگا۔

"سنا گل تم نے وہ بھی ہماری طرح انسان ہی ہے۔"

"ہاں رافع! اسے سر پر چڑھانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اس لیے تم پلیز میرے لیے ڈکشنری مت لانا۔" "دیکھو! ثوبی خبردار! تم نے اس سے متاثر ہونے کی غلطی کی تو۔" مہران نے مصنوعی غصے سے ثوبیہ کو وارننگ دی "اور بلا ضرورت بے تکلفی یا دوستی کا تو سوچنا بھی مت۔" ثانیہ نے ہاتھ اٹھا کر اعلانیہ انداز میں کہا۔ اگلے ہی پل سب کے چھت پھاڑ قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

حویلی کے ہزارہا کونے تھے اور ہر کونے میں اس کی ذات سے متعلق سرگوشیاں ہورہی تھیں۔ پھر اس تک کیسے نہ پہنچتیں؟ اس کے نیم خوابیدہ احساسات ایک دم بےدار ہوئے تھے۔

"کیا مجھے ایک بار پھر ان سب کی نفرت بھری نگاہوں کا سامنا کرنا ہوگا؟ ان میں سے کوئی ایک بار پھر مجھے ہاتھ سے پکڑ کر باہر نکالنے کی کوشش کرے گا؟ ایک بار پھر وہی ذلت!" اسے ہمیشہ اپنے ہشاش بشاش رہنے والے اعصاب تھکے ماندے محسوس ہوئے۔

پورا دن گزر گیا تھا۔ دوپہر سے شام ڈھلی اور شام سے پھر رات۔ وہ خود میں باہر جانے کی ہمت پیدا نہ کرسکی۔ اب بھی وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے افسردہ سی بیٹھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا اپنے تایا ابا سے بھی نہیں ملو گی بیٹی؟" وہ آہستگی سے قدم اٹھاتے اس کے قریب آن ٹھہرے تھے اور اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ وہ جھجکتی ہوئی ان کے سینے سے لگ گئی۔

"ایسی مضبوط پناہ! ایسا گھنا سائبان!" اس نے طمانیت سے آنکھیں بند کرکے دل کی تمام تر شدتوں سے اس لمس کو محسوس کیا تھا۔

"اسی سایہ دار پیڑ کی میٹھی ٹھنڈی چھاؤں تلے آنے کے لیے ہی تو میں نے اتنا سفر کیا اور کوئی آکر اتنی بے رخی سے کہے کہ تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ تایا ابا کے سینے سے الگ ہوئی تو دیکھا دادی جان کا کشادہ کمرہ بھر گیا تھا۔ فرقان چاچا، تائی اماں، مہناز چچی اور اتنے ڈھیر سارے کزن! اس کا روم روم خوشی سے مہک اٹھا۔

"اگرچہ تمہارا باپ عمر میں مجھ سے چھوٹا تھا۔ لیکن اپنے قد کاٹھ کی وجہ سے ہمیشہ بڑا لگتا۔ لوگوں کے لیے یہ پزل رہا تھا کہ ہم دونوں میں سے چھوٹا کون ہے اور بڑا کون؟ جہاں اسے بڑا بن کر فائدہ نکلوانا ہوتا میں آسانی سے چھوٹا بن جاتا اور جہاں میرا مفاد چھوٹا رہنے سے پورا ہوتا۔ وہ کامیابی سے بڑے بھائی والا کردار نبھا لیتا۔" فرقان چچا کی بات پر وہ بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔

"اور جانتی ہو غضب کا چلبلا تھا تمہارا باپ ایک دن سوتے میں میرا ہاتھ اٹھا کر اپنی بکری کے منہ میں دے دیا۔ میری آنکھ جب تک کھلی اس کی وفادار بکری میرا ایک ناخن اکھاڑ چکی تھی۔ یہ والا۔" تایا ابا نے کہنے کے ساتھ اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی اس کے سامنے کی۔ جس کا آدھا ادھورا ناخن عجیب ہیئت کا بن چکا تھا۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ پہلی بار کوئی اس سے اس کے پاپا کے متعلق ایسی باتیں کررہا تھا۔ ان کی عادات، مزاج، شخصیت کی پرتیں! یوں ہی ہنستے آنکھوں کی نمی انگلی کی پور سے جھٹکتے اس کی نگاہ دروازے پر ایستادہ شعیب کے سرد چہرے جا ٹکرائی تھی۔ نگاہیں ملنے پر وہ ایک دم مڑا اور باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

رات اتری تو آسمان کے سیاہ سینے پر ڈھیر سارے ستاروں کے جھرمٹ میں گھرے چاند نے چہار سو اپنی نرم چاندنی پھیلا دی تھی۔ فضا میں رات کی رانی کی مہک رچی بسی تھی اور باد صبا کے جھونکے چمپا کے پھولوں کی مہک اس میں مدغم کررہے تھے۔ وہ گہری سانس کھینچ کر پھولوں کی باس اپنے اندر اتارتی باہر نکل آئی تھی۔ لان میں چاند کی نرم روشنی کے علاوہ چند ایک مصنوعی بتیاں جل رہی تھیں۔ وہ آہستگی سے نرم گھاس پر چہل قدمی کرتی ماما سے فون پر بات کرنے لگی۔

"ضحی! کیسی ہو میری جان! وہاں سب ٹھیک ہے نا؟" صالحہ نے اس کی آواز سنتے ہی بے تابی سے پوچھا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں ماما اور یہاں سب سیٹ ہے۔ آپ کی آواز کو کیا ہوا ہے؟" اس نے قدرے تشویش سے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں، ابھی سو کر اٹھی ہوں تو شاید اسی لیے بھاری ہورہی ہے۔ تم بتاؤ وہاں کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟ دیکھو، اگر کوئی تم سے مس بی ہیو کرے تو فوراً واپس آجانا۔"

"اوہ کم آن ماما! آپ تو۔" اس کی زبان اور قدم ایک ساتھ رکے تھے۔ شعیب عین اس کے سامنے ہی تو جما کھڑا تھا۔ اس نے بوکھلا کر جلدی سے کال ڈسکنکٹ کردی۔

"اوکے ماما! میں آپ سے بعد میں بات کرتی ہوں۔"

"خبر دے دی والدہ محترمہ کو کہ اپنے مقصد تک

پہنچنے کے لیے میں نے پہلی سیڑھی بہت کامیابی سے طے کرلی ہے؟" سینے پر بازو باندھے بہت چبھتے لہجے میں وہ پوچھ رہا تھا۔
"کون سا مقصد؟ کیسی سیڑھی؟ آپ میری ماما کے بارے میں اتنے شکوک و شبہات کا شکار کیوں ہیں؟" اگرچہ اس کی اردو صاف تھی۔ لیکن لہجہ غیر ملکی زبان کی آمیزش لیے ہوئے تھا۔ "شکوک و شبہات" جیسے الفاظ بولتے ہوئے اسے اچھا خاصا زور دینا پڑا تھا۔
"کوئی مشکوک ہوتا ہے تو ہی اس پر شک کیا جاتا ہے نا؟ بہرحال تم اپنی ماں کی پڑھائی گئی پٹیوں کی مدد سے سب کو بے وقوف بنا سکتی ہو' لیکن مجھے نہیں۔ اس لیے ابھی سے وارن کررہا ہوں۔ اگر اس بار حویلی والوں کو زک پہنچانے کا سوچا بھی تو تم دونوں ماں' بیٹی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"
وہ انگلی اٹھا کر سرد لہجے میں تنبیہہ کرتا واپس مڑ گیا تھا۔ ضحیٰ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ وہ سفید چہرہ لیے اس کی پشت گھورتی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼
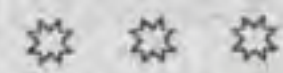
"مہران! یہ چیٹنگ ہے۔ میری گوٹ واپس رکھو۔" سبز گوٹ کو گھر کی طرف لوٹتا دیکھ کر ثوبیہ چلائی تھی۔
"ارے واہ! اپنی گوٹ گھر کو لوٹے تو چیٹنگ!" مہران نے ہاتھ بلند کیے زور' زور سے ڈبی میں "چھکا" گھما کر اس کا احتجاج رد کیا تھا۔ سب اس وقت صحن میں دری بچھائے گول دائرے میں لڈو کی زبردست بازی جمائے ہوئے تھے۔ ضحیٰ پہلی بار یہ گیم کھیل رہی تھی اور اسے خوب مزا آرہا تھا۔ اپنی ہی گوٹ کو مزے سے کک آؤٹ کرنے پر وہ جس بے ساختہ خوشی کا اظہار کرتی اس کی پارٹنر بنی ثوبیہ کا جی چاہتا اپنا سر جا کے کہیں دے مارے۔ درحقیقت وہ ضحیٰ کو اپنی پارٹنر بنانے پر خود کو کوس رہی تھی۔
"لگتا ہی نہیں یہ اس صالحہ کی بیٹی ہے۔ جو ہم سے سیدھے منہ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔"
دوپہر کے کھانے کے لیے ملازماؤں کو ہدایت مہناز چچی نے کھڑکی سے باہر نظر آتا منظر دیکھ کر ایک پھر وہی بات دہرائی تھی جو وہ اب اکثر اٹھتے بیٹھتے دہرانے لگی تھیں۔ "اس کی رگوں میں ہمارے نواز کا خون ہے۔ جو محبت' اپنائیت اور خلوص بھرے جذبوں سے گندھا تھا۔"
تائی اماں نے محبت سے اپنے دیور کا ذکر کیا تھا۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے ان کا بھی خوب لاڈلا تھا۔ کھیل ختم ہوگیا تھا اور اب گل اور مہران اپنی کامیابی بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ جبکہ کبھی نہ ہارنے والی ثوبیہ ہار کا سہرا ضحیٰ کے سر باندھ رہی تھی اور اس کی معصومیت سے "اتنا اچھا تو کھیلی میں" کہنے پر سب ہنس ہنس کر دوہرے ہوگئے تھے۔
"ضحیٰ! فارم ہاؤس چلوگی؟" اپنی کامیابی کی خوشی مہران سخی بنا پوچھ رہا تھا۔
"چلیں گی کیا دوڑیں گی' اتنا مزا آئے گا۔" ثانیہ چہکی تھی۔
"لیکن شعیب بھائی سے اجازت کون لے گا؟" عبدالرافع کے سوال پر گل بے نیازی سے بولا۔
"واپس آکر لے لیں گے۔" ثانیہ کو ہنسی آگئی۔ "کرنے کے بعد کون سی اجازت لی جاتی ہے؟ پاگل!"
"کہہ دیں گے ضحیٰ کو تربوز کے پیڑ دیکھنے کا شوق ہورہا تھا۔ کیوں ثوبیہ تمہارے افسانوں کی شہری ہیروئن کو بھی تو کھیتوں میں جا کر ہی پتا چلتا ہے ناکہ تربوز پیڑوں پر نہیں بلکہ بیلوں پر لگتے ہیں؟"
مہران ثوبیہ کو چھیڑتے ہوئے بولا تھا۔ ثوبیہ نے ناک چڑھا کر رخ دوسری طرف کرلیا۔
"دادی! میری پیاری دادی!" سامنے سے آتی دادی جان کو دیکھ کر عبدالرافع جذباتی انداز میں کہتا ان کی جانب بڑھا تھا۔
"اپنی ضحیٰ بی بی کو پیڑ سے لٹکتے میرا مطلب ہے بیلوں پر لگے تربوز دیکھنے کا دل چاہ رہا ہے۔ آپ سے اتنی گزارش ہے کہ فارم ہاؤس جانے کی اجازت

عنایت فرما دیجیے۔" "سیدھے الفاظ میں بات نہیں کرسکتے؟" دادی کو ہنسی آگئی تھی۔
"سیدھے الفاظ میں بات کروں تب بھی کون سا لوگوں کو سمجھ میں آجاتی ہے؟ دانستہ مشکل الفاظ استعمال کرتا ہوں' کچھ لوگوں پر اپنا رعب برقرار رکھنے کے لیے۔" وہ گل کی طرف دیکھتا معنی خیزی سے بولا تو دادی اس کی بات سمجھ کر ہنس پڑیں۔ سب جانتے تھے کہ گل اور عبدالرافع ہم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ اس حویلی کے سب سے چھوٹے بچے تھے۔ بڑوں کی محفل میں جگہ نہ ملی تو خود ہی آپس میں دوستی گانٹھ لی۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔
دادی نے خوش باش ضحیٰ کو دیکھا اور جانے کی اجازت دے دی۔ لڑکیوں کو اپنی اپنی تیاری کی فکر لگ گئی۔ جبکہ لڑکے وہیں صوفوں پر ڈھیر ہو کر ان کا انتظار کرنے لگے۔ ضحیٰ کو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا تیاری کرے۔
اس نے بلو ٹراؤزر پر گرے کلر کی دھاریوں والی شرٹ پہن کر بالوں کی حسب عادت پونی ٹیل بنائی تھی۔ ثانیہ اندر آئی تو اسے دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک گئی۔ ضحیٰ جب سے آئی تھی اسی قسم کے لباس پہن رہی تھی۔ وہ یقیناً" اسی ڈریسنگ کی عادی تھی۔ سب کی موجودگی میں اس کے بنا دوپٹے کے یوں آزادانہ گھومتے پھرنے سے ثانیہ لوگوں کی نگاہیں جھک جاتیں۔
دادی جان نے کہا تھا کوئی اس پر انگلی نہ اٹھائے۔ وہ برسوں سے ایسی زندگی جیتی آئی ہے۔ گنتی کے چند دنوں میں اس کا سراپا بدلنا ناممکن ہے۔ اچھا ہوگا وہ خود ہی یہ تبدیلی محسوس کرے۔
سو سب نے اس سلسلے میں چپ سادھ لی تھی۔ لیکن حویلی سے باہر اس لباس میں جانا ثانیہ کو کھٹک رہا تھا۔ گھر میں بے شک بے جا روک ٹوک نہیں تھی۔ لیکن وہ ماں' باپ' بھائیوں کے سامنے ہمیشہ سر پر دوپٹا اوڑھے رکھتیں اور باہر نکلتے وقت شیشوں کی کڑھائی والی بڑی بڑی مخصوص چادریں سر پر لیتیں۔
"کیا ہوا؟" اسے اپنی طرف یوں تکتا پاکر ضحیٰ نے استفسار کیا۔
"وہ... ضحیٰ! اصل میں..." ثانیہ ہچکچائی' کہیں وہ اس کی بات پر مائنڈ نہ کر جائے۔
"کوئی پرابلم ہے ثانیہ؟"
"ہاں! نہیں' میرا مطلب ہے' تم یہ چادر لے لو پلیز!"
اس نے جلدی سے بولتے ہوئے اپنی نیوی بلو شیشوں والی چادر اس کی طرف بڑھادی۔
"اصل میں حویلی کی عورتیں باہر نکلتے وقت چادر کے استعمال کرتی ہیں۔" اس نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا۔ لیکن ضحیٰ نے کوئی تبصرہ کیے بغیر خاموشی سے چادر اوڑھ لی۔
"کیا محض سر ڈھکنے سے عورت کے گرد اتنا دلکش ہالہ بن جاتا ہے؟" ثانیہ کو وہ بہت بدلی بدلی ضحیٰ لگی تھی۔ دلکش اور پاکیزہ!
"تم لوگوں کے سولہ سنگھار ختم ہوگئے ہوں تو باہر آجاؤ... ورنہ میں پروگرام کینسل کررہا ہوں۔" مہران کی دھمکی خاصی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ سب بھاگم بھاگ گاڑی میں گھس گئیں۔ فارم ہاؤس پہنچنے تک انہوں نے گاڑی میں ہی خوب غل غپاڑہ مچار کھا۔
"ضحیٰ! جانتی ہو ساگ کا کوئی درخت نہیں ہوتا اور خربوزے کا بیج خشک کرکے فارغ اوقات میں کھانا گاؤں کی خواتین کا دل پسند مشغلہ ہے۔" مہران سیر کے ساتھ ساتھ اس کی معلومات میں اضافہ بھی کرتا جارہا تھا۔ ضحیٰ کو اس کے انداز پر بے ساختہ ہنسی آجاتی۔ نہر کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھتے ہوئے اس نے خوب انجوائے کیا تھا۔
عبدالرافع برگد کے پیڑ تلے پڑی چارپائیوں پر بیٹھا مہارت سے تربوز کے ٹکڑے کاٹنے کے ساتھ ساتھ انہیں آوازیں بھی لگا رہا تھا۔
ادھر سے سب ہاتھ ہلا کر "آرہے ہیں' آرہے ہیں" کہتے مزید آگے بڑھ جاتے۔
"بے چارہ کب سے اکیلا لگا ہوا ہے۔" گل بڑبڑاسا

چھرا اٹھائے حق دوستی نبھانے کے لیے اس کے ساتھ چارپائی پر چڑھ گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد "ہائے میرا ہاتھ کٹ گیا" کا واویلا کر کے سب کو منٹوں میں اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔

"یہ ہاتھ کٹا ہے تمہارا؟" ثوبیہ اس کے ہاتھ پر لگے ذرا سے کٹ کو دیکھتے ہوئے غرائی۔

"ہاتھ پر کٹ لگا ہے تو ہاتھ کٹ گیا کہوں گی نا؟" وہ معصومیت سے بولی تھی۔ حالانکہ یہ ان سب کو بلانے کا ایک بہانہ تھا۔ تربوز کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے اس نے اپنے کارنامے پر خود کو ہی داد دی تھی۔ "سنو! مجھے ہارس رائیڈنگ کرنی ہے۔"

اصطبل میں بندھے اعلانسل کے گھوڑوں کو دیکھ کر ضحیٰ کی پرانی خواہش انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی۔ وہ ایک سفید گھوڑے پر محبت سے ہاتھ پھیرتی سوالیہ نگاہوں سے ثوبیہ کو دیکھنے لگی۔ "یہ شعیب بھائی کا گھوڑا ہے اور وہ اس پر سواری کی اجازت کسی کو نہیں دیتے۔" "لیکن مجھے تو اس پر کہیں بھی ان کا نام لکھا نظر نہیں آرہا اور مجھے نہیں لگتا میرے سواری کرنے پر اس گھوڑے کو کوئی اعتراض ہوگا۔"

اس نے چادر اتار کر جنگلے کی سلاخوں پر ڈال دی تھی اور گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر باگ ہلائی تو گھوڑا ہنہنا اٹھا تھا۔

وہ اگرچہ یہاں کے راستوں سے واقف نہیں تھی۔ لیکن سرسبز گھنے پیڑوں میں گھری سڑک پر سرپٹ گھوڑا دوڑاتے وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ پونی ٹیل سے بالوں کی لٹیں نکل کر اس کے چہرے پر آرہی تھیں۔ سرپٹ دوڑتا گھوڑا اچانک اگلے دونوں پاؤں فضا میں بلند کر کے رک گیا تھا۔ ضحیٰ کا مارے خوف کے دم نکلنے لگا۔ گھوڑے نے پاؤں دوبارہ زمین پر ٹکائے تو وہ ایک جھٹکے سے نیچے اتر آئی تھی۔ میر شعیب ایک بار پھر اس کے سامنے دیوار کی مانند ایستادہ تھا۔

"اُف!" وہ ہوا سے اڑتے اپنے بالوں کو کان کے پیچھے اڑستی خود کو اس وقت خاصا احمق تصور کر رہی تھی۔ اسے گھوڑے پر اس کا نام لکھا نظر نہیں آیا لیکن گھوڑا اپنے مالک کے سامنے اپنی وفاداری کا اظ... کر چکا تھا۔

"حویلی سے باہر قدم نکالنے کے لیے تمہیں ... سے زیادہ واہیات اور کوئی لباس نہیں ملا تھا پہننے کو؟" وہ چبھتی نگاہیں اس کے سراپے پر گاڑے سرد ... میں پوچھ رہا تھا۔ ضحیٰ نے قدرے حیران ہو کر خود کو ... سے اوپر تک دیکھا تھا۔

"میں ہمیشہ سے ایسا ہی لباس پہنتی آرہی ہوں۔"

"محترمہ! یہ آپ کا امریکہ نہیں ہے۔ ہمارے ... عورتیں اتنا بے ہودہ لباس پہن کر باہر نہیں ... کرتیں۔"

"شکر! آپ نے مجھے اپنے خاندان کا حصہ تو تسلیم ... کیا۔" وہ اسی پر خوش ہو گئی۔

"بہت خوش فہم ہیں آپ۔" وہ گویا اس کا تمسخر ... رہا تھا۔

"ہائے داوے! والدہ محترمہ کے بھیجے گئے مشن ... کس حد تک کامیابی حاصل کر لی؟" وہ طنزیہ انداز ... ابرو اچکا کر پوچھ رہا تھا۔

"آپ میری ماما سے اتنی خار کیوں کھاتے ہیں؟"

"جو خار دلانے والے کام کرتے ہیں، ان سے خار ... آئے گی ہی۔" وہ باگ اس کے ہاتھ سے لیتا گھوڑے ... سوار ہو گیا تھا۔ انداز میں یکایک ڈھیر ساری لاتعلقی ... آئی تھی۔ قریب تھا کہ وہ باگ کو جھٹکا دیتا اور گھوڑا ... سرپٹ دوڑنے لگتا۔ وہ حواس باختہ ہو گئی۔

"آپ مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ میں یہاں سے ... کیسے جاؤں گی؟"

"دوسروں کی چیز اجازت کے بغیر استعمال کر... سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ وہ کسی بھی وقت اپنی ... واپس لے سکتا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ گھوڑا دوڑاتا آگے نکل گیا۔ اتنی دیر ... گھوڑے کی ٹاپیں اسے اپنے اعصاب پر ہتھوڑے ... مانند لگی تھیں۔ نہ جانے کتنا وقت بیت گیا وہ دھوا... دھواں چہرہ لیے پہلو میں بازو گرائے بے حس و حرکت

کھڑی رہی۔

درخت پر بیٹھا کوئی پرندہ زور سے چلایا تھا۔ اس کی ساکت آنکھوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور وہ ایک ایک قدم اٹھاتی واپسی کے لیے مڑی تھی۔ کتنا وقت بیت گیا وہ ایسے ہی چلتی رہی۔ چل چل کر اس کی ٹانگیں شل ہونے کے قریب تھیں کہ سامنے سڑک پر اسے مہران لوگ حواس باختہ سے اپنی جانب آتے دکھائی دیے۔

"ضحیٰ!" انہوں نے بھاگتے ہوئے درمیانی فاصلہ عبور کیا تھا۔ سب کو ایک دم اپنے سامنے دیکھ کر وہ وہیں زمین پر بیٹھ کر گھٹنوں میں سر دیے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آتے وقت وہ جتنی پرجوش تھی واپسی پر اس سے کہیں زیادہ پژمردہ۔ سب اسے باتوں میں لگائے بہلانے کے جتن کرتے رہے لیکن وہ مسکرا تک نہ سکی۔

وہ محبتوں کی امین تھی۔ محبتیں لٹانا، محبتیں وصول کرنا اس کی سرشت میں تھا۔ اسے ناجائز راستے، ناجائز رشتے کبھی پسند نہیں رہے تھے۔ اتنی صاف اتنی کھری سوچ رکھنے والی کے لیے یہ تصور جان لیوا تھا کہ کوئی اس سے اس حد تک نفرت کرتا ہے۔ وہ ساری رات ٹھیک سے سو نہیں پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح آنکھ کھلی تو اسے حویلی میں غیر معمولی چہل پہل محسوس ہوئی تھی۔ بڑے گول کمرے میں چاندنیاں بچھائی گئیں۔ اگردان میں اگربتیاں جل رہی تھیں بیچ میں سفید ململی کپڑے پر سپارے اور کھجور کی گٹھلیاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں گاؤں کی عورتیں جمع ہونے لگیں۔ حویلی کی عورتیں، لڑکیاں سب باوضو ہو کر قرآن شریف پڑھنے بیٹھ گئیں۔ حویلی سے باہر شعیب اور مہران لوگ اپنی نگرانی میں بریانی کی دیگیں پکوا رہے تھے۔

"دادی! آج حویلی میں کوئی فنکشن ہے کیا؟" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بالوں میں برش کر رہی تھی کہ دادی کے اندر داخل ہونے پر ان سے پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"شاہ نواز کی برسی ہے آج۔" ضحیٰ کا ہاتھ جہاں تھا تھم کر رہ گیا۔

"پاپا کی برسی!" وہ گم سم سی ہو گئی۔

دادی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں سے کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ انہیں مطلوبہ چیز مل گئی تو واپسی کے لیے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

"دادی!" اس نے بے چین ہو کر انہیں پکارا تھا۔

"نہیں....." اس کے خاموش لبوں کا سوال آنکھوں میں لکھا تھا۔

"وضو کر کے یہ دوپٹا اوڑھ لو۔"

کچھ دیر بعد وہ دادی کے ہمراہ سفید ململ کا دوپٹا اچھی طرح اپنے گرد اوڑھے بڑے کمرے میں داخل ہوئی تو نہ جانے کتنی نگاہیں اس کی جانب اٹھی تھیں۔ ثوبیہ نے تھوڑا سا کھسکتے ہوئے اپنے قریب اس کے لیے جگہ بنائی تھی۔

اس نے گود میں رکھا سیپارہ آہستگی سے کھولا اور لرزتی انگلی سیاہ موٹے حروف پر رکھ دی۔ "آج کے دن پاپا ہم سے بچھڑے تھے" اس کی آنکھوں کی سطح گیلی ہونے لگی۔ "آج کے دن میں یتیم ہوئی تھی" الفاظ دھندلائے تو وہ زور زور سے پلکیں جھپکنے لگی۔

"آج کے دن میرے سر سے باپ کا سائبان اٹھا لیا گیا تھا۔"

موٹے موٹے آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر بہہ نکلے تھے۔ آج پہلی بار وہ اس قسم کے محسوسات سے دوچار ہوئی تھی۔ سیپارہ ختم کرنے کے بعد وہ چہرہ صاف کرتی باہر نکل آئی تھی۔ صحن میں طویل دسترخوان لگا کے گاؤں بھر کی دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دیہاتی حلیے والی عورتیں پیٹ بھرنے پر ڈکار لیتیں، باآواز بلند میر شاہ نواز کی مغفرت کی دعا کرتی اٹھ جاتیں۔

"ضحیٰ! یہاں کیوں کھڑی ہو بیٹا؟ اندر آجاؤ، دعا میں شریک نہیں ہونا؟" تائی اماں کے کہنے پر وہ گہری سانس

کھینچتی پلٹی، لیکن بڑے کمرے میں جانے کی بجائے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ پھر کچھ سوچ کر ماما کا نمبر ملانے لگی۔

"ہیلو ضحیٰ! کیسی ہو میری جان؟" اس نے ہمیشہ کی طرح "میں ٹھیک ہوں ماما، آپ کیسی ہیں" کہنے کی بجائے بہت مدھم آواز میں پوچھا۔ "کیا کر رہی تھیں ماما؟"

"کچھ خاص نہیں بیٹا! بس ابھی کچھ دیر پہلے مارکیٹ سے واپس آئی ہوں۔ تمہاری ممانی جان نے کچھ شاپنگ کرنی تھی۔" صالحہ قدرے بشاش لہجے میں بولی تھیں۔ ضحیٰ کے اندر کچھ چبھا تھا۔

"ماما! آپ جانتی ہیں آج پاپا کی برسی تھی؟" اس کی آواز اب بھی بہت مدھم تھی اور لہجہ پست!

"ضحیٰ!" دوسری طرف وہ واضح طور پر ٹھٹکی تھیں۔ لیکن اس نے بغیر کچھ کہے کال کاٹ دی۔

اگلے دو دن وہ اسی کیفیت کے زیر اثر رہی۔ ماما کا فون آتا بھی تو وہ مختصر بات کر کے "پھر بات کروں گی ماما" کہہ کر رابطہ منقطع کر دیتی۔ انہی روکھے پھیکے دنوں میں اچانک مہران اور ثوبیہ کے نکاح کا غلغلہ اٹھا۔

☆ ☆ ☆

اگلا دن خوب پر رونق اور ہنگامہ خیز تھا۔ معنی خیز سرگوشیاں، شاداں و فرحاں چہرے، جھینپی جھینپی مسکراہٹیں، شوخ قہقہے، رنگین لہراتے آنچل، ڈھول کی تھاپ پر لڑکیوں کا بڑے گول دائرے میں "جھمر" کا روایتی رقص!

غرض حویلی کے اندر قوس قزح کے سارے رنگ اتر آئے تھے۔ ضحیٰ کو ماما کے بغیر یہ سب بہت ادھورا بہت نامکمل لگ رہا تھا۔ وہ جو سمجھتی تھی کہ پاکستان جاتے ہی برسوں سے بیچ میں حائل غلط فہمیاں دور کر کے خاندان کے کٹے حصے کو پھر سے جوڑ دے گی۔ اب نا ممکن نہیں تو مشکل ضرور لگ رہا تھا، کیونکہ ناگواری، غصہ، رنج، خفگی اپنی جگہ لیکن یہ لاتعلقی و بے گانگی کی انتہا تھی کہ حویلی میں کوئی ماما کا ذکر تک نہ کرتا تھا۔ ان تمام دنوں میں ایک بار بھی کسی کی زبان سے ان کا نام نہیں سنا تھا۔

اور جو کبھی وہ باتوں باتوں میں اپنا اور ماما کا کوئی تذکرہ چھیڑ بیٹھتی تو سب یا تو خاموش ہو جاتے یا پھر تائی اماں بہت مہارت سے مسکراتے ہوئے بات بدل دیتیں، پھر مہناز چچی کو کوئی کام یاد آنے پر با آواز بلند بڑبڑاتی اٹھ جاتیں۔ کوئی تبصرہ، کوئی رد عمل، کچھ نہیں! لیکن یہ کب تک چلے گا؟

اس کی آنکھوں میں سجے خواب کی یہ تعبیر ادھوری تھی۔ اور "ادھورا پن" ضحیٰ میر کو کبھی پسند نہیں رہا تھا۔ خواتین کے گھیرے میں بیٹھی دادی کو دیکھتے ہوئے اس نے کچھ سوچا اور مطمئن ہو گئی۔

تائی اماں نے فنکشن میں پہننے کے لیے اس کا لباس خود منتخب کیا تھا۔ سرخ و سبز امتزاج کے چوڑی دار پاجامے کے ساتھ دھاگوں اور شیشوں کے کام کے ساتھ مزین لمبی گھیر دار فراک! وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے پھیلائے اس "لباس فاخرہ" کو دیکھ رہی تھی۔

"میں یہ نہیں پہن سکتی۔" اس نے گویا جھرجھری لی تھی۔

"کیوں نہیں پہن سکتیں؟" ثوبیہ کو تیار کرنے کے بعد سامان سمیٹتی ثانیہ نے ابرو اچکائے۔

"میں نے ایسا ڈریس پہلے کبھی نہیں پہنا اور..."

"ضحیٰ! تم نے پہلے کبھی پاکستان میں کسی کے نکاح کی تقریب میں شرکت کی ہے؟"

"نہیں!"

"نکاح کے بعد خواتین کو اپنے زرق برق دوپٹے کے پلو چھوہاروں کے لیے پھیلاتے دیکھا ہے؟"

"نہیں!"

"ڈھول کی تھاپ پر عبدالرافع اور گل کا بھنگڑا دیکھا ہے؟"

"ارے بھئی نہیں!"

"جب زندگی میں پہلی بار اتنا کچھ نیا دیکھ رہی ہو تو

تیاری میں بھی نیا پن ہونا چاہیے۔ بس مزید کوئی بحث نہیں چلے گی۔ جلدی سے کپڑے بدل کر آؤ پھر دیکھنا میں اپنے ماہرانہ ہاتھوں سے کیسے تمہارے اس حسن کو "دو آتشہ" بناتی ہوں۔"

اور واقعی ثانیہ نے کہنے سے کرنے تک کا مرحلہ بخوبی طے کر لیا۔

ضحیٰ سے اپنا آپ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ سلور کلر کی نازک سینڈل میں پاؤں پھنسائے، دونوں ہاتھوں سے فراک کو تھوڑا سا اوپر اٹھا کر وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔ ہیئر پونی ٹیل میں بندھے سلکی بال اس وقت خوب صورت انداز میں سیٹ کیے ہوئے تھے۔ ہلتے جھمکے اور کلائیوں میں کھنکتی چوڑیاں اس کے اندر عجیب سا احساس جگا رہے تھے۔

دادی نے اس کی بلائیں لیں تو تائی اماں اور مہناز چچی نے خوب دل کھول کر تعریف کی۔ اس کے لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ ٹھہر سی گئی تھی۔

فنکشن کا انتظام باہر صحن میں کیا گیا تھا۔ زیادہ گیدرنگ نہیں تھی افراد خانہ کے علاوہ چند ایک قریبی دوست مدعو تھے۔ پھر بھی اچھی خاصی رونق لگ گئی۔

وہ ثانیہ وغیرہ کا گول دائرہ میں تالیوں اور چٹکیوں میں مخصوص رقص انجوائے کرتی خوب تالیاں پیٹ رہی تھی۔ گلاب اور موتیے کے پھولوں سے سجے جھولے پر ثوبیہ کے ہمراہ بیٹھے مہران سے رہا نہیں گیا تو اٹھ کر اس دائرے میں شامل ہو گیا۔

ضحیٰ کو دانستہ دعوت نہیں دی کہ جس طرح وہ اپنے لباس اور جوتوں کی وجہ سے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہی تھی لگتا کیچڑ میں رکھی اینٹوں پر چل رہی ہو ذرا سی بے احتیاطی ہوئی نہیں اور وہ دھڑام سے نیچے! دفعتاً اسے احساس ہوا وہ مسلسل کسی کی نگاہوں کے حصار میں ہے۔ اس نے چہار اطراف نظریں دوڑائیں لیکن سب اپنی اپنی دھن میں مگن تھے۔ تب ہی اس کی نگاہ تھوڑے سے فاصلے پر سیاہ شلوار قمیص پر اپنی مخصوص چادر ایک کندھے پر ڈالے شعیب پر پڑی۔ جو کسی سے بات کرنے کے ساتھ ساتھ ایک آدھ سرسری نظر اس پر بھی ڈال لیتا اور یہ ایک آدھ "سرسری" نظر پتھر میں شگاف ڈالنے کے برابر تھی۔ ضحیٰ عجیب احساس سے دوچار ہوتی رخ موڑ گئی۔

تب ہی اسے خیال آیا کہ اس حلیے میں اپنی ایک اچھی سی تصویر کھنچوا کر ماما کو سینڈ کر دے وہ یقیناً اسے اس روپ میں دیکھ کر حیران رہ جائیں گی۔ اپنے اس خیال کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے اس نے پاس سے گزرتے ایک لڑکے کو آواز دے کر روک لیا۔

"ایکسکیوز می پلیز!"

لڑکا مہران کے دوستوں میں سے تھا۔ پلٹ کر نسوانی آواز کے تعاقب میں دیکھا اور جی جان سے متوجہ ہوا۔

"میری ایک تصویر اتار دیں گے پلیز؟" اپنا سیل فون اس کی جانب بڑھاتی وہ شائستگی سے پوچھ رہی تھی۔

"ضرور کیوں نہیں۔"

"دیکھیں! تصویر اس اینگل سے کھینچیں کہ سر سے لے کر پاؤں تک سب کچھ آجائے رائٹ؟" وہ تھوڑا سا دور ہٹ کر اسے ہدایت دیتی اپنے دوپٹہ درست کرنے لگی۔ لڑکا فرصت سے اپنے سامنے کھڑی اپسرا کو دیکھے گیا جو اناڑی پن سے دوپٹہ ادھر سے ادھر ڈالتی غالباً اسے "سیٹ" کر رہی تھی۔

میر شعیب نے یہ منظر دیکھا اور دیکھ کر سرتاپا سلگ کر رہ گیا۔ پیشانی پر ابھرتی ناگواری کی ہزار ہا شکنیں وہ چند قدم چل کر اس تک آیا تھا۔

"عمران! یہ مجھے دو اور تم جاؤ۔"

خشک انداز میں کہتا وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے موبائل لے چکا تھا۔ لڑکا جی بھر کے بدمزا ہوا۔ جبکہ وہ اب حیرت سے آنکھیں پھیلائے کھڑی ضحیٰ سے دانت پیستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تمہیں تصویریں کھنچوانے کے لیے اس پوری تقریب میں صرف یہی ایک ملا تھا؟"

"واٹس رونگ ود یو میر شعیب! میرے ہر کام میں مداخلت کرنا آپ نے اپنا حق کیوں سمجھ رکھا ہے؟" حیرت کی جگہ ناگواری نے لے لی تھی۔ وہ اپنی اس دن والی انسلٹ بھولی نہیں تھی۔

"آپ کے کام ہی ایسے ہوتے ہیں محترمہ!"

"بہرحال دوسروں کے معاملات میں انٹرفیر کرنے سے پہلے انسان کو سوچ لینا چاہیے کہ وہ آپ کی مداخلت پسند کرتا بھی ہے یا نہیں؟"

اس کے ہاتھ سے اپنا سیل فون لے کر' وہ پرانا حساب چکاتی دونوں چٹکیوں سے فراک تھوڑا سا اوپر اٹھائے اس کے پہلو سے نکل گئی تھی۔

جبکہ وہ وہیں کھڑا حیرت سے اس کی پشت دیکھتا رہ گیا۔ وہ غصے سے تیز تیز قدم اٹھاتی دھم سے ثوبیہ کے قریب جھولے پر بیٹھ گئی تھی۔

"تمہارا چہرہ اتنا تپا تپا کیوں لگ رہا ہے؟ خیریت؟"

ثوبیہ کے استفسار پر اس نے یونہی ماتھے پر گرے بالوں کو جھٹکتے ہوئے گویا اسے ٹالنے کی سعی کی تھی۔

نیچے دری پر ڈھولکی لے کر گاتی میراثن نے منٹوں میں اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی تھی۔ وہ سب کچھ بھول بھال کران کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ایسے میں اس کی گود میں گنگناتے موبائل نے بہت مشکل سے اسے اپنے مسلسل بجتے رہنے کا احساس دلایا تھا۔ اسکرین پر "میڈونا کالنگ" جل بجھ رہا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر نسبتاً "تنہائی والے گوشے میں چلی آئی۔

"کیسی ہو زی؟"

"ٹھیک' خوش اور مطمئن!" اس کا لہجہ اپنے کہے کی تصدیق کر رہا تھا۔

"سدا رہو!"

"جانتی ہو میڈونا! میں اس وقت اپنے پاپا کی حویلی میں ہوں۔ جہاں ملازموں کو ملا کر پچیس سے زیادہ افراد رہتے ہیں۔"

"اوہ! ڈونٹ ٹیل می یار!" میڈونا حیرت سے چیخی تھی۔

"زی! تم اتنے کراؤڈ میں کیسے رہ رہی ہو؟ تمہارا دم نہیں گھٹتا؟"

"میں بھی اسی کراؤڈ کا حصہ ہوں میڈونا! اور اسی کراؤڈ میں آکر میرے اندر کی گھٹن کو باہر نکلنے کے راستے ملے ہیں۔"

وہ یونہی بات کرتے کرتے اپنے اور دادی کے مشترکہ کمرے میں آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک ہنگامہ خیز دن بالآخر اپنے اختتام کو پہنچا تو گہری سیاہ رات کی گمبھیرتا نے کائنات پر اپنا فسوں طاری کر دیا۔ پرسکون' ٹھنڈی چاندنی لٹاتا چاند آوارہ بادلوں کے ٹکڑوں سے آنکھ مچولی کرتا اپنے سفر پر گامزن تھا۔

"دادی! آج آپ بہت خوش ہیں نا؟" ضحیٰ لباس بدل کر آئی تو دادی کو بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کچھ سوچتے پایا۔ وہ اپنا تکیہ لے کر ان کے ساتھ ہی نیم دراز ہو گئی۔

"ہاں! بیٹا ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب اولاد کی خوشیاں بوڑھے ماں باپ کے ناتواں وجود میں خون بن کر دوڑتی ہیں۔" ان کے ضعیف جھریوں زدہ چہرے پر مخصوص مسکراہٹ ابھری تھی۔

"لیکن دادی! خوشیاں اگر ادھوری ہوں تو رگوں میں خون جمنے لگتا ہے۔ آپ کو نہیں لگتا سب کچھ پرفیکٹ ہوتے ہوئے بھی ادھورا تھا؟"

اس کی بات پر دادی کے چہرے پر تاریک سایہ سا آ کر گزر گیا تھا۔ جب وہ بولیں تو ان کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"میرا شاہ نواز موجود نہیں ہے۔ مجھے اس کے بغیر خوشیاں تو کیا زندگی بھی ادھوری لگتی ہے۔"

"لیکن دادی! ان کا ہمارے درمیان موجود نہ ہونا خدا کی مرضی ہے۔ کوئی اور بھی تو ہے جو زندہ ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں۔"

دادی چونکی تھیں اور ضحیٰ کو لگا اب کھل کر بات کرنی چاہیے۔

"کیا شوہر کی وفات کے بعد عورت کا وجود اپنے سسرال والوں کے لیے اس قدر ممنوع بن جاتا ہے کہ اس کا نام تک کوئی زبان پر لانا پسند نہ کرے؟ رنجشیں' تلخیاں' غلط فہمیاں کہاں نہیں ہوتیں لیکن اس حد تک کہ رابطے اور رشتے کی کوئی راہ ہی نہ بچے؟ ایسا کیوں دادی؟"

اس کے اندر برسوں سے جنم لیتے سوال نوک زبان پر مچل رہے تھے' پھسل رہے تھے دادی بہت خاموشی سے اسے سنتی رہیں۔ اس کا گلا رندھ جاتا' آواز حلق میں اٹک جاتی' آنکھوں کے نم گوشے خود ہی ہتھیلیوں سے رگڑ آ۔ وہ اپنے سب سے پرانے زخم کا خود ہی اپنے ناخنوں سے کھرنڈ نوچتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ تھک کر چپ ہو گئی۔ تب دادی کے باہم پیوست لب وا ہوئے تھے۔

"کیا جانتی ہو تم میر شاہ نواز کے بارے میں کہ وہ تمہارا باپ اور تمہاری ماں کا شوہر تھا؟ بس؟ تمہیں اس کے صرف دو رشتوں سے آشنائی ہے۔ وہ کسی کا بیٹا' کسی کا بھائی' کسی کا دیور' کسی کا محبوب چچا تھا' اس کا وجود تو لاتعداد رشتوں کی ڈور میں بندھا تھا۔ اسے زندگی نے اس راہ پر لا کھڑا کر دیا تھا کہ ایک رشتے کو بچانے کے لیے اسے اپنے سب رشتے چھوڑنے پڑے۔

ہمارے ہاں خاندان سے باہر شادیوں کا رواج نہیں تھا۔ اس نے اپنی کلاس فیلو صالحہ سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو ہم نے اس کے دل کی خوشی کے لیے ریت رواجوں کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ ہمارے دل میں کوئی کدورت کوئی گلہ شکوہ نہیں تھا۔

خوشیوں سے لبریز دل کے ساتھ بڑی شان سے اسے بیاہ لائے۔ وہ آزاد فضاؤں میں اڑنے کی خواہش رکھنے والا ایسا پرندہ تھی جسے حویلی کی دیواریں پنجرے کی سلاخیں لگتیں۔

ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے والوں کو وہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ سے تشبیہ دیتی' بڑی بھابھیوں کا چھوٹے دیور کے لاڈ اٹھانے کو خرابی نیت گردانتی' مکمل ستر ڈھانپنے کی نصیحت کرنے والی ساس کا ہاتھ جھٹک کر دقیانوسی سوچ کی حامل بڑھیا قرار دیتی چیخ چیخ کر علی الاعلان ہمارے پہناوے' رہن سہن' ہماری سوچ کا مذاق اڑاتی۔ اس کا مطالبہ واضح تھا وہ یہاں سے رہائی چاہتی تھی۔ اسے خاندانی سیٹ اپ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سب سے الگ تھلگ اپنی مرضی کے مطابق اپنی الگ دنیا بسانا چاہتی تھی۔ تمہاری پیدائش بھی اس کی سوچ' اس کا طرز عمل نہیں بدل پائی تھی۔ ماں باپ اس کی کم عمری میں ہی گزر گئے تھے۔ بڑا بھائی تھا تو غم روزگار میں الجھا ایسے میں اچھائی برائی کا فرق بتانے کے لیے اس کے پاس صرف بھابھی ہی تھی۔ رافعہ! انتہائی خود غرض اور مفاد پرست عورت! اپنے تھوڑے سے فائدے کے لیے کسی کو بہت بڑے نقصان سے دوچار کرنے کے لیے لمحہ بھر بھی نہ سوچنے والی۔ صالحہ کی سوچ' کردار' عمل اور زبان پر اپنی بھابھی کا گہرا اثر تھا۔ اس کے آئے روز کے جھگڑوں سے گھر کا سکون درہم برہم ہو تا گیا۔ ہم نے شاہ نواز کو اس کا مطالبہ مان لینے پر اکسایا اور اس نے اپنی شادی شدہ زندگی کی بقا کے لیے اپنی بیٹی کی زندگی کو ماں یا باپ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی اذیت سے بچانے کے لیے اس کا مطالبہ مان لیا ہمارا خاندان ٹوٹ رہا تھا سب بکھر رہا تھا۔ بہت تکلیف دہ دن تھا وہ جب وہ اپنی تین سالہ بچی اور بیوی کو لے کر یہاں سے رخصت ہوا تھا حویلی کی دیواروں کو چپ لگ گئی۔ وہ ساری رونق جو اس کے دم سے تھی نجانے کہاں ہوا میں اڑ گئی۔ یہاں صرف اس کی کمی تھی۔ سب ایک دوسرے کی دلجوئی کر کے زندگی کی گاڑی کو جیسے تیسے گھسیٹ کر معمول کی ڈگر پر لے آئے تھے۔

لیکن وہ وہاں بہت تنہا ہو گیا تھا بہت اکیلا! ہم سب کی جدائی نہ سہار سکا۔ میر شاہ نواز ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا۔ ڈاکٹر کہتے تھے اس کا دل بہت کمزور ہو گیا تھا۔ پہلا ہی اٹیک جان لیوا ثابت ہوا۔" لرزتی' کانپتی' آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں وہ اپنی زندگی کا سب سے تکلیف دہ باب پرت در پرت کھول رہی تھیں۔ ضحیٰ ان کے سامنے بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ مٹی کے کسی بے جان مجسمے کی مانند!

"جب رات کو سب سو جاتے تب وہ چپکے سے میرے کمرے میں آتا اور دونوں پاؤں پر آہستگی سے بوسہ لیتا۔ وہ سمجھتا تھا میں سوئی پڑی ہوں مجھے خبر نہیں' لیکن یہ اس کی بے خبری تھی۔ اور جس رات اسے

ہارٹ اٹیک ہوا وہ فون پر مجھ سے کہہ رہا تھا اماں! مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔ میرے لب تشنہ ہیں۔ صبح اٹھتا ہوں تو سبزے پر چہل قدمی کرتے بابا دکھائی نہیں دیتے، خستہ پراٹھے اور دودھ پتی کا ناشتا تیار کیے آوازیں لگاتی بھابھی سنائی نہیں دیتیں، اپنے ساتھ زمینوں پر لے جانے کے لیے شعیب کے بازو اپنے کندھوں پر محسوس نہیں ہوتے۔ اماں! میں تو ایک دم خالی ہو گیا ہوں۔ ویران اور بنجر! میرے پاس آپ سب کی یادوں کی پونجی بچی ہے۔ جسے کسی مفلس کی مانند میں روز گنتا ہوں اور گن کر سنبھال لیتا ہوں۔"

دادی کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ ان کا بوڑھا وجود تیز جھکڑوں میں کمزور شاخ کی مانند لرز رہا تھا۔

"اور تم کہتی ہو ہم نے تمہاری ماں کو حویلی سے دور رکھ کر تنگ دلی کا ثبوت دیا ہے؟" ایک نظر اس کے پتھرائے ہوئے چہرے پر ڈالتیں وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے چہرہ خشک کرنے لگی تھیں۔ ضحیٰ کی ساکت پلکوں میں ہلکی سی لرزش اتری "آئی ایم سوری بیٹا! فور ایوری تھنگ!" کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آکر ماما نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ تب وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ لیکن آج وہ ساری ان کہیاں جان گئی تھی۔ اس کی بے حد اسٹائلش، طرح دار اور بے انتہا خوب صورت ماما نے اتنے سارے لوگوں کی زندگی میں خزائیں بھر دیں۔ ان کی زندگی کے سارے خوش نما رنگ نچوڑ لیے کیوں؟" اسے کسی پل قرار نہیں مل رہا تھا۔ وہ جلد از جلد ماما سے ملنا چاہتی تھی۔ اسے برسوں پرانے حساب بے باق کرنے تھے۔ اس نے بہت بے صبری سے صبح کا انتظار کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"صبح ابھی پوری طرح بے دار نہیں ہوئی تھی۔ فضا میں چڑیوں کی چہچہاہٹ گونج رہی تھی۔ اسے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر سب حیران رہ گئے تھے۔ ماما پر حیرت اور خوشی کا غلبہ ایک ساتھ چھایا تھا۔

"ضحیٰ! میرے بچے تم یوں اچانک" وہ چائے کا کپ رکھ کر والہانہ اس کی جانب بڑھی تھیں۔

"ماما! میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ پلیز اسے اتار دیں۔" عجیب عاجزانہ لہجے میں بولتی وہ ان سب کو شاکڈ کر گئی تھی۔ صالحہ نے رافعہ کو اور رافعہ نے صالحہ کو دیکھا تھا پھر دونوں نے نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں۔

"ضحیٰ! میری جان!" ماما کو اس کی متورم آنکھوں کی سرخی ہولائے دے رہی تھی۔

"ماما! آپ نے کہا تھا آپ کے حویلی والوں سے کبھی خوشگوار تعلقات نہیں رہے یہ کیوں نہیں بتایا کہ اس کے پیچھے اتنے ناخوشگوار حالات تھے؟ آپ نے کہا انہوں نے آپ کو کبھی بہو کی حیثیت سے قبول نہیں کیا یہ کیوں نہیں بتایا آپ نے پاپا کے رشتوں کو کسی بھی حیثیت سے قبول نہیں کیا تھا؟ آپ نے کہا انہیں ہمارا امریکہ شفٹ ہونے کا فیصلہ ناگوار لگا تھا یہ کیوں نہیں بتایا کہ امریکہ شفٹ ہونے کے لیے پاپا کو اپنے پیچھے کیا کچھ چھوڑنا پڑا تھا؟" وہ یک ٹک ماما کے چہرے کو دیکھتی یاسیت سے کہہ رہی تھی۔

"ضحیٰ! تم ان لوگوں کی باتوں میں آکر اپنی ماں پر الزام تراشی کر رہی ہو؟ ارے اس ماں پر جس نے تمہاری خاطر کیا کچھ نہیں کیا؟" صالحہ کو گم سم دیکھ کر رافعہ ممانی آگے بڑھ آئی تھیں۔

"دوسروں کو جذباتی بلیک میل کرنا بند کریں ممانی" وہ چیختی تھی۔ ممانی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔

"دوسروں کو غلط راہ دکھانے والے خائن کہلاتے ہیں خدا اور رسولؐ کی نظر میں آپ نے ہمیشہ ماما کے غلط اقدام کی حوصلہ افزائی کی۔ کبھی انہیں اچھائی کی ترغیب نہیں دلائی۔ صرف اس وجہ سے کہ ایسا کرنے سے آپ کا مفاد وابستہ تھا" اس کی نگاہوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔ ملامت، تاسف، بے اعتباری!

"میں نے جو کچھ کہا تمہاری ماں کے بھلے کے لیے کہا۔" ممانی نے اپنے کاندھے جھٹکے تھے۔

"ہاہ! بھلائی؟ آپ کی نظر میں بھلائی کے معنی یقیناً

کچھ اور ہوں گے۔ ماما کو ان کے سسرال والوں سے الگ کر کے آپ نے ان کی بھلائی چاہی تھی۔ ٹھیک! پاپا کے فوت ہونے کے بعد ان کی فیملی سے قطع تعلقی کا مشورہ دے کر آپ نے ان کی بھلائی چاہی تھی۔ یہ بھی ٹھیک! لیکن ممانی! ماموں کے فوت ہونے کے بعد آپ کیوں ان کا گھر چھوڑ کر اپنے والدین کے پاس نہیں گئیں؟ شوہر کی وفات کے بعد بھی ان کی بہن سے ناتا کیوں جوڑے رکھا؟ جو چیز دوسروں کے لیے غلط وہ آپ کے لیے صحیح کیسے ہو سکتی ہے؟" رافعہ ممانی کے پاس اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ نخوت سے سر جھٹکتی بڑبڑاتیں پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔ ضحیٰ گہری سانس کھینچتی ماما کی جانب متوجہ ہوئی۔

"ہم گزرا وقت واپس لانے پر قادر نہیں ماما! لیکن جو وقت ہماری مٹھی میں ہے اس میں اپنے کیے کی تلافی تو کر سکتے ہیں نا؟" اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"پلیز! میرے ساتھ چلیے ماما! ان سے معافی مانگ لیجیے۔"

"نہیں!" صالحہ نے اضطراری حالت میں گھرے بے ساختہ اپنے ہاتھ چھڑوائے تھے۔

"ماما! پلیز" ضحیٰ کی ملتجی نگاہیں ان کے چہرے پر جمی تھیں۔ انہوں نے رخ دوسری طرف پھیر لیا۔ ضحیٰ کا دماغ جھنجھنا اٹھا تھا۔

"تو آپ آج بھی اپنی پہلے والی روش پر قائم ہیں؟ آپ کو اب بھی اپنی جھوٹی عزت نفس اپنا پندار عزیز ہے؟ آپ نہیں جانتیں کسی کی خاطر کسی کو چھوڑنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ برسوں پہلے پاپا نے آپ کی خاطر یہ تکلیف جھیلی تھی اور آج آپ نے مجھے اس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ لیکن میں آپ کو بتا دوں ماما! آپ مجھے کھو دیں گی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیں گی۔ کبھی اپنی شکل نہیں دکھاؤں گی آپ کو ___ آواز سننے کے لیے ترس جائیں گی آپ میری۔"

عجیب ہیجانی انداز میں چلا کر کہتی وہ پلٹی اور بھاگتے ہوئے باہر نکل گئی۔ ماما کے رویے نے اسے بہت دلبرداشتہ کیا تھا۔ وہ بہت سی امید ڈھیر سارا مان لے کر ان کے پاس گئی تھی لیکن واپسی کے سفر میں اس کا دامن خالی تھا۔ وہ سارا راستہ ٹوٹنے بکھرنے کی کیفیت کے زیر اثر رہی۔

"کہاں گئی تھیں تم اتنی صبح؟" وہ گاڑی کا دروازہ بند کر کے پلٹی تو شعیب مجسم سوال بنا اس کی راہ میں حائل تھا۔

"گھر کا پہلا بچہ ہونے کی وجہ سے شاہ نواز کی جان تھی شعیب میں اور وہ بھی تو اسے دیکھ دیکھ کر جیتا، قلقاریاں مارتا، خوش ہوتا، کبھی باپ بیٹا، کبھی چچا بھتیجا تو کبھی گہرے دوست! ان کا ایک دوسرے سے جڑا ہر رشتہ انمول تھا۔ شاہنواز کے یہاں سے جانے کا سب سے زیادہ اثر اسی نے لیا تھا۔ کھانا، پینا، ہنسنا بولنا سب چھوڑ دیا اور شاہ نواز کے دنیا چھوڑنے پر تو اس نے جینا ہی چھوڑ دیا۔ بہت مشکل سے وہ زندگی کی طرف لوٹا ہے۔" بہت خاموشی سے اس کی نم آنکھیں اس کے سنجیدہ چہرے کا ایک ایک نقش چھو رہی تھیں۔

(یہ سب آپ کی عنایات ہیں ماما) اس کے اندر زخم پھر سے رسنے لگے تھے۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے کہاں گئی تھیں اتنی صبح؟" ضحیٰ کی پلکیں لرزیں اور لرز کر جھک گئیں۔

"میرا راستہ چھوڑ دیں میر شعیب! اس وقت میرا کوئی بھی لفظ آپ کو مطمئن نہیں کر پائے گا۔" وہ کنی کترا کر اس کے پہلو سے نکل گئی تھی۔

(تم اپنے رویے میں حق بجانب ہو میر شعیب) گزرے ان تمام دنوں میں شعیب کے کٹھور رویے کی وجہ سے اس کے دل میں کوفت، بے زاری، بے بسی، خفگی اور ناگواری کا جو صحرا اگ آیا تھا اسی پل اسی لمحے وہاں ایک ٹھنڈا میٹھا چشمہ پھوٹ نکلا تھا۔

"وہ نہیں مانیں دادی! میں انہیں نہیں منا پائی۔" جائے نماز پر بیٹھی دادی کی گود میں پناہ ڈھونڈتی وہ بری طرح بکھری تھی۔

☼ ☼ ☼

کبھی کبھی ہوتا ہے ایسا کہ زندگی انسان کو اس مقام پر لا کھڑا کرتی ہے جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔ ضحیٰ نے بھی نہیں سوچا تھا وہ کبھی ان حالات سے دوچار ہوگی۔ وہ بہت بے چین اور مضطرب تھی۔ شب و روز اسی بے کلی کی نذر ہونے لگے۔ اس کے ساتھ سب کا رویہ روز اول سے ہی مشفقانہ اور اپنائیت بھرا تھا۔ لیکن اب اس کے سوچنے کا انداز پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ ایسے میں ان سب کی محبتیں اس کے اندر پشیمانی کا احساس اور بڑھا دیتیں وہ خطاکار نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو ان سب کا مجرم گردانتی۔ بہت غیر محسوس انداز میں وہ ان کے رنگ ڈھنگ اپناتی جا رہی تھی۔

"افوہ! الماری بھری پڑی ہے ایک سے ایک کپڑوں سے لیکن پہننے کے مواقع ہی دستیاب نہیں۔"

الماری میں سر دیے کھڑی ثانیہ کپڑے نکالتی بیڈ پر ڈھیر کرتی جا رہی تھی۔ ضحیٰ نے ہچکچاتے ہوئے ایک جدید تراش خراش کا کاٹن کا سوٹ اٹھا کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

"یہ سوٹ میں لے لوں؟" خوشگوار حیرت میں گھری ثانیہ اور ثوبیہ بیک زبان بولی تھیں۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

"تم پر تو یہ جچے گا بھی بہت" گل کے توصیفی لہجے پر وہ جھینپ کر ہنس پڑی تھی اور اگلے دن تائی اماں نے درزن کو بلا کر اس کے ناپ کے ڈھیر سارے سوٹ سلوانے کے لیے دے دیے۔ سرخ، نیلے، پیلے، کھلتے ہوئے رنگوں کی دیدہ زیب کپڑے! وہ ان کی محبت پر نم آنکھوں سے مسکراتی رہی۔

"صالحہ کو ایک طرف رکھ دو شعیب! ہم اس وقت ضحیٰ کی بات کر رہے ہیں اور تم جانتے ہو وہ اپنی ماں کے کسی بھی عمل کے لیے ہمارے سامنے جوابدہ نہیں۔ وہ اپنی ساری کشتیاں جلا کر ہمارے پاس اس لیے نہیں آئی کہ ہم اسے اس کی ماں کے کیے کی سزا سنائیں۔ ہم سب کی دلی خواہش ہے کہ وہ تمہارے نام پر ساری زندگی اس حویلی میں مستحکم حیثیت سے رہے۔"

ضحیٰ کے قدم دہلیز پر ہی ساکت ہوئے تھے۔ اس کا دل نئی لے پر دھڑکا اور ہتھیلیوں میں پسینہ اترنے لگا۔

"مجھے آپ کا فیصلہ منظور نہیں ہے۔" وہ قطعی لہجے میں بولتا اس کا دل مسل گیا تھا۔

"تم اسے صالحہ کی وجہ سے ٹھکرا رہے ہو؟" تایا ابا نے ضبط سے پوچھا تھا۔

"میرے پاس اسے ٹھکرانے کے لیے اور بہت سی وجوہات ہیں بابا!"

"تم شاید بھول رہے ہو وہ شاہ نواز کی بیٹی ہے۔" فرقان چچا نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"آپ شاید بھول رہے ہیں کہ اس نے دیار غیر میں آزادی کی دلدادہ اپنی ماں کے زیر سایہ پرورش پائی ہے۔ کیا جانتے ہیں آپ کہ وہ اس تمام عرصے میں کس قسم کی زندگی گزارتی رہی ہے؟ کس قماش کے لوگوں سے اس کا واسطہ رہا؟ وہ جگہ جہاں مکر و فریب کے سنہری جال جا بجا پھیلے ہوتے ہیں اس کی عقلمند ماں نے اسے ان سنہری جالوں سے دور رکھنے کی کوشش کی ہوگی؟ کچھ نہیں جانتے آپ اور مجھ سے یہ توقع کرتے ہیں کہ میں آنکھوں دیکھی مکھی نگل جاؤں؟"

اور ضحیٰ کو لگا وہ مزید ایک لمحہ بھی یہاں کھڑی رہی تو اس کے دماغ کی شریان پھٹ جائے گی۔

"اسٹاپ اٹ! خاموش ہو جائیں آپ کو کوئی حق نہیں ہے یوں کسی کی ذات پر کیچڑ اچھالنے کا۔"

دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتی وہ پوری شدت سے چلائی تھی۔ وہ جو دروازے کی جانب پشت کیے کھڑا تھا پوری طرح اس کی طرف گھوم گیا۔ جبکہ کمرے میں موجود باقی نفوس کی رنگت متغیر ہو گئی تھی۔ ان کی متوحش نگاہیں ضحیٰ کی جانب اٹھ گئیں لیکن وہ ان میں سے کسی کو نہیں دیکھ رہی تھی۔

"میرے کردار پر انگلی اٹھانے سے پہلے اس بات کی وضاحت پیش کرنا چاہیں گے آپ کہ کب آپ نے مجھے اپنی شامیں رنگین کرتے نائٹ کلبوں کی زینت بنے دیکھا؟ کب آپ نے مجھے ہوش و خرد سے بیگانہ سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے پایا؟ کب آپ نے مجھے بے راہ روی کے ہاتھوں اپنی عفت و عصمت کے موتی رولتے دیکھا؟ ہے کوئی ثبوت آپ کے پاس ان سب الزامات کا؟"

اس کے چہرے پر آنکھیں گاڑے وہ درشتگی سے پوچھ رہی تھی۔ اس وقت وہ سب کچھ بھول گئی تھی یاد رہا تو صرف اتنا کہ کوئی اسے اور اس کی ماں کو بیچ چوراہے پر سنگسار کر رہا ہے۔

"اگر آپ خود کو پارسا اور باکردار سمجھنے میں حق بجانب ہیں تو صرف اس لیے کہ آپ نے حویلی کی چار دیواری کے اندر اپنے مضبوط رشتوں کی چھاؤں تلے زندگی بسر کی اور بدقسمتی سے مجھے یہ سب میسر نہیں ہوا تو آپ کو لگا میں آوارہ اور بدکردار ہو گئی؟ لیکن آپ کے اندازے آپ کی سوچ آپ کو ہی مبارک! مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہ سہی پر اتنا اطمینان ضرور ہے۔ نادانستگی میں کی گئی لغزشوں کے سوا میں نے کبھی جان بوجھ کر کوئی ایسا گناہ نہیں کیا جس کا بوجھ لیے میں اپنے خدا کے سامنے سر نہ اٹھا سکوں۔"

اس کے نم لہجے میں اپنی ذات کا اعتماد جھلکا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سر جھٹک کر استہزائیہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"دادی کہتی ہیں میر شعیب کو میرے پاپا سے بے انتہا محبت تھی۔ یہ کیسی محبت ہے کہ انسان اس ہستی سے وابستہ رشتوں کو ذلیل کرے جس سے وہ "محبت" کرتا ہے۔ محبت کا دامن تو بہت وسیع ہوتا ہے۔ اس میں "ہم" کی گنجائش بہت آسانی سے نکل آتی ہے۔ یہ محبت کا لبادہ اوڑھے خودغرضی کا نجانے کون سا مقام ہے جہاں صرف "میں" کی حکمرانی ہے اور آپ کو تو ہمیشہ سے یہی لگا تھا کہ میں اپنا کوئی گھٹیا مقصد پورا کرنے کے لیے یہاں آئی ہوں میں اور میری ماما آپ کی نظر میں گھٹیا جو ٹھہرے تو یقیناً "ہمارے مقاصد بھی ہمارے جیسے ہی ہونے چاہیے تھے۔ آپ کو کیا لگتا ہے ہمارے پاس بینک بیلنس کی کمی ہے اور مجھے اس حویلی کی چکا چوند اور آبائی جائیداد میں حصہ لینے کی خواہش نے یہاں آنے پر مجبور کیا ہے؟ لیکن میں آپ کو بتاؤں لازمی نہیں ہر ایک، آپ کی سوچ جتنا گھٹیا ہو۔ مجھے ایک خاندان چاہیے تھا، اپنے خونی رشتے چاہیے تھے۔ میرے لیے یہ احساس ہمیشہ ایک تازیانہ بنا رہا کہ میں ایک بروکن فیملی کا حصہ ہوں۔ بغیر جڑوں والے کسی کھوکھلے پیڑ کی مانند! جسے بدلتے حالات کی تند و تیز آندھی نجانے کب اکھاڑ پھینکے۔ پاپا موجود نہ سہی لیکن ان کا خاندان میرے لیے ایک مضبوط حوالہ تھا اور میں اسی حوالے سے پہچانی جاؤں یہی خواہش مجھے یہاں لائی۔" اس کی آنکھوں سے دو شفاف موتی ٹوٹ کر بکھرے تھے۔ لیکن اس نے سختی سے اپنے چہرے کو ہاتھ کی پشت سے رگڑا تھا۔

"لیکن میں خوش فہم تھی، غلط تھی، نہیں جانتی تھی کہ جن اپنوں کی چاہ مجھے یہاں لے آئی ہے ایک دن وہی اپنے مجھے کٹہرے میں کھڑا کر کے حالات کی کسوٹی پر پرکھیں گے غلط تھی میں خوش فہم تھی۔" وہ منہ پر ہاتھ رکھے سسکیاں روکتی الٹے قدم پیچھے ہٹی اور بھاگتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼
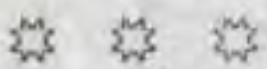
"ماما! آپ کو مجھ سے کتنی محبت ہے؟"

"اولاد کے لیے ماں کی محبت کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔"

"اس فلاسفی کو ایک طرف رکھ کر بتائیں آپ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہیں؟" اس کے بچگانہ انداز پر ایک محظوظ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آٹھہری تھی۔ ڈنر کے بعد ان کا چائے پینے کا موڈ ہوا تو کچن میں چلی آئیں۔ اور ضحیٰ بھی اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کرتی ان کے پیچھے آگئی تھی۔

"بتائیں نا ماما!" وہ اسٹول کھینچ کر ان کے قریب ریلیکس انداز میں بیٹھ گئی تھی۔

"ہوں! تو نل سے گرتے اس پانی کے قطروں کو گنا جا سکتا ہے، اس ڈبے میں موجود پتی کے دانوں کا شمار ممکن ہے، بڑے شوگر پاٹ میں بھری چینی کے دانوں کی گنتی بھی ہو سکتی ہے لیکن صالحہ اکرام کے دل میں

اپنی متاع حیات ضحیٰ کے لیے محبت کے خزانے کا کوئی شمار کوئی پیمانہ نہیں۔"

"اوہ ماما!" اس نے ایک ساتھ ان کے کئی بوسے لے ڈالے تھے۔

"تسلی ہوئی؟" چائے کا مگ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"آں! تھوڑی بہت۔" وہ شرارت سے ہنسی تھی۔ صالحہ اسے مصنوعی خفگی سے گھورتیں اپنا مگ اٹھائے کچن سے نکل گئیں اور ان کے پیچھے پیچھے وہ بھی۔

"لیکن ماما! وہ کہتے ہیں نا کہ محبت کبھی کبھی آزمائش میں بھی ڈال دیتی ہے۔ اگر میری محبت میں آپ کو کسی آزمائش سے گزرنا پڑے مطلب کوئی ایسا کام کرنا پڑ جائے جو کہ آپ ہرگز ہرگز نہیں کرنا چاہتیں لیکن میری محبت سے مجبور ہو کر......"

"میں ہر وہ کام کروں گی ضحیٰ! جس کو کرنے کے لیے مجھے تمہاری محبت مجبور کرے گی۔" اس کی بات کاٹ کر وہ جذب سے بولی تھیں اور ضحیٰ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"بس مجھے پیمانہ مل گیا۔" صالحہ بے چینی سے سینہ مسلتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

گہری سانس کھینچتی وہ کھلی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئیں۔ گرد سے اٹے آسمان کے سینے پر ایک چیل تیر رہی تھی۔ فضا میں حبس رچا بسا تھا۔ پیڑ، پتے، پودے سب ساکن تھے۔ گرد سے اٹا ہر منظر مبہم اور الجھا ہوا تھا۔

وہ یہ اعداد و شمار بھول جانا چاہتی تھیں کہ کتنے دن ہو گئے انہوں نے ضحیٰ کی آواز تک نہیں سنی، اس کا لمس محسوس نہیں کیا، اپنے سینے پر اس کی سانسوں کی مہک اترتی محسوس نہیں کی، اپنے ہاتھ کی پشت پر اس کے لبوں کا بوسہ محسوس نہیں کیا، کتنے دن ہو گئے انہوں نے خود کو جیتا جاگتا محسوس نہیں کیا۔

"اولاد چاہے ایک ہو یا دس اس کی جدائی پر کیا ہر ماں یونہی تڑپتی ہے؟"

"ماما! پلیز!" یہ ملتجی لہجہ ان کی سماعتوں میں ٹھہر گیا تھا۔ وہ کیسے اس کی بات مان لیتیں۔ کہاں سے لاتیں اتنا ظرف کہ وہ ان لوگوں کے سامنے کھڑی ہو سکیں، ان سے نظریں ملا سکیں۔ معذرت کا لفظ تو بہت چھوٹا اور معمولی ہے۔ وہ کیسے اس معمولی لفظ کا سہارا لے کر اپنے گزشتہ رویوں، لغزشوں، نادانیوں اور عاقبت نااندیشیوں کی تلافی کر سکتی ہیں؟

وہ جانتی تھیں ضحیٰ اگر حویلی گئی تو وہ ساحر لوگ اپنی محبت، اپنائیت اور خلوص سے اسے اپنا بنا لیں گے۔ ایک نہ ایک دن وہ ضرور ان کی ہمنوا بن کر ان کے سامنے کھڑی ہو گی۔ ایسے میں وہ کیا کریں گی؟ کچھ نہیں! ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

یہاں سے جانے کے بعد اپنے محبوب شوہر کو رات کے آخری پہر ٹیرس پر ٹہلتا، سگریٹ پھونکتا اور اپنی تین سالہ بیٹی کو سینے سے لگائے مسرور سی کیفیت میں حویلی کے قصے سناتا دیکھ کر ان کے اندر ایک عجیب سا احساس ندامت سر ابھارتا۔ لیکن بہت مختصر عرصے میں ان کی وفات کے بعد احساس ندامت کی جس کونپل نے سر اٹھایا تھا، اپنی موت آپ مر گئی۔

اس شتر بے مہار معاشرے میں انہوں نے جان بوجھ کر ایسے لوگوں سے روابط بڑھائے جن کے ساتھ دوستی اور تعلق داری بوقت ضرورت ان کے لیے فائدہ مند ہو۔ لیکن دوست، احباب، کولیگ، پڑوسی خواہ جتنے اچھے سہی حقیقی اور شرعی رشتوں کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔

سسرال سے دور اپنی الگ دنیا بسانے کی خواہش رکھنے والی صالحہ اکرام اگر جان لیتیں ایک دن ان کا یہ فیصلہ انہیں یوں تنہا کر دے گا تو وہ کبھی یہ فیصلہ نہ کرتیں۔ ان کے دل کی رونق، ان کے زندہ رہنے کا اکلوتا جواز ان کی بیٹی ان سے بہت دور ہو گئی تھی۔

"آپ مجھے کھو دیں گی ماما! ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیں گی۔"

"ایسا مت کہو میرے بچے! ماما مر جائیں گی۔" حلق میں اٹکی سسکی نے آج نوک زبان کو چھو لیا تھا۔ صالحہ کے لیے اپنا مضطرب دل سنبھالنا دشوار ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کا جسم بری طرح دکھ رہا تھا اور سر شدت درد سے پھٹنے کے قریب۔ کثرت گریہ سے آنکھیں بے حد سوج گئی تھیں اور اسے اپنے پورے چہرے پر ہلکا سا ورم محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے کمرے کے مقفل دروازے پر اب بھی دستک ہو رہی تھی۔ بہت محبت سے اس کے نام کی پکار پڑ رہی تھی۔ لیکن اسے لگا وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں گنوا بیٹھی ہے۔ "مجھے اپنے بابا کی حویلی میں رہنا ہے پورے حق کے ساتھ۔" اس کا اعتماد سے اٹھا سر اس وقت گھٹنوں پر گرا جھک رہا تھا۔ اتنے بڑے الفاظ، اتنے بڑے اندازے، اتنی بڑی سوچ میرے متعلق!

یہ احساس اس کی جان نکال گیا تھا۔ کتنی آسانی سے اس کی ذات کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ اس کا مان کرچی کرچی کیا گیا، اس کی عزت نفس کچلی گئی۔

دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اگر میر شعیب یہ سب سوچ سکتا ہے تو باقی سب کیوں نہیں؟ ہاں! وہ بھی تو اس کے بارے میں یہی کچھ سوچتے ہوں گے۔ اگر پہلے کبھی نہیں بھی سوچا تو اب میر شعیب کی باتیں ضرور انہیں ایسا سوچنے پر مجبور کر دیں گی۔ یا شاید مجبور کر چکی ہوں! وہ سراسیمگی کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں! میرے اندر اتنا حوصلہ نہیں۔" اضطراری انداز میں ادھر سے ادھر ٹہلتی وہ اس وقت خود کو دوراہے پر کھڑا محسوس کر رہی تھی۔

"مجھے یہاں نہیں رہنا اور..... ماما کے پاس بھی نہیں جانا کسی کو میرے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

دونوں ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی وہ ایک ان چاہا فیصلہ کر چکی تھی۔ کتنی دیر سے مقفل دروازے کی چٹخنی گری اور ہلکی سی چرر کے ساتھ دروازہ وا ہوتا گیا۔ وہ شکست و ریخت کے سارے مراحل گزار کے ایک بار پھر خود اعتمادی کا پیراہن اوڑھے باہر آ گئی تھی۔

"ضحیٰ.....!" دادی دیوانہ وار اس کی جانب لپکی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں تھاما چرمی بیگ انہیں اندیشوں کی نذر کر گیا۔ ایک دن وہ بھی تو یونہی حویلی سے چلا گیا تھا پھر کبھی لوٹ کر نہیں آیا اور اب ضحیٰ..... نہیں! ان کا لرزتا کانپتا ہاتھ اس کے کندھے پر آن رکا تھا۔ اس کے نیچے لو دیتا احساس واضح تھا۔

"ہماری معذرت یا شرمندگی اس اذیت کا احساس کم نہیں کر سکتی جو تمہیں جھیلنی پڑی۔ لیکن پھر بھی بیٹا اگر ہو سکے تو ہمیں معاف کر دو۔ جو بھی ہوا غلط ہوا اس کا ایک ایک لفظ جھوٹ تھا بکواس تھا۔"

تایا ابا کی نم آنکھوں نے اس کے معصوم چہرے کا بوسہ لیا تھا۔

"وہ خود تم سے معافی مانگے گا۔" تائی اماں شرمندگی سے چور لہجے میں دلگرفتی سے بولیں فرقان چچا نے اپنے تئیں اس کی دلجوئی کرنے کی سعی کی تھی۔ عبدالرافع، مہران سینے پر بازو باندھے بہت ملول اور افسردہ کھڑے تھے۔ گل کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز

"ضحیٰ! پلیز مت جاؤ!"

بے بسی سے لب کاٹتی ثانیہ کی نگاہوں نے اس سے التجا کی تھی۔ آہستگی سے نفی میں سر ہلاتے ضحیٰ بہت افسردگی سے مسکرائی تھی۔ ٹوٹی بے جان مسکراہٹ۔

"دنیا میں کچھ چیزیں ہمارے لیے نہیں ہوتیں۔ میں یہ بات اب سمجھ چکی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

تیری قربت کے لمحے پھول جیسے
اور پھولوں کی عمریں مختصر!

ایسا بھی ہوتا ہے کہ بالکل سامنے کی بات انسان کو سمجھ میں نہیں آتی اور وہ اپنا ذہن ادھر ادھر بھٹکاتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔

وہ جو کہتا تھا کہ اسے ضحیٰ میر کی ذات سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ جیے یا مرے اس کی جانے بلا! لیکن

ایک لمحہ اس پر منکشف کر گیا کہ وہ تو خود کو دھوکہ دیتا رہا ہے اگر اس کے نزدیک واقعی ضحیٰ کی کوئی اہمیت نہیں تو اسے اوٹ پٹانگ مغربی لباس میں دیکھ کر اسے اتنا برا کیوں لگتا تھا؟

میران کے نکاح کے فنکشن میں اسے تصویریں بنواتا دیکھ کر کیوں دل چاہا تھا کہ وہ عمران کو اٹھا کر کہیں دور پھینک آئے؟ وہ رویہ سڑک کے بیچ و بیچ اسے گھوڑے سے اتار کے تنہا جاتے ہوئے اس کا دل کیوں اس سے لڑ پڑا تھا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ پہلے ہی قدم پر اس سے اپنا وجود منوا چکی تھی۔ غلط یہ تھا کہ اسے بہت غلط موقع پر اس کا احساس ہوا۔ جب وہ اس کے ساتھ اتنا کچھ غلط کر چکا' اتنا کچھ غلط کہہ چکا۔

اسے اپنے کہے الفاظ یاد آتے تو دل چاہتا خود کو ختم کر دے۔ اپنی زبان کاٹ پھینکے' آنکھیں نوچ ڈالے۔ سچ تو کہہ رہی تھی وہ کیا جانتا تھا وہ اس کے بارے میں؟ محض' اندر کی بھڑاس' پست، ہوتی جھوٹی انا کی تسکین کے لیے اتنا بڑا تماشا لگا دیا اس کی ذات کا۔ وہ کیوں اس سے اتنی خار کھاتا تھا کہ اس کی ماں کی وجہ سے اس نے اپنے ایک عزیز رشتے کو ــــــ کھو دیا۔ لیکن یہ محرومی تو اس کی زندگی میں بھی آئی تھی۔ اس نے بھی تو اپنا باپ' باپ سے وابستہ رشتے سب کچھ کھویا تھا۔ ان گنت محرومیاں تو اس کی زندگی میں آئی تھیں تو پھر وہ کس محرومی کا واویلا مچاتا رہا؟ محبت کے نام پر خود غرضی دکھاتا رہا۔

ضمیر کے آئینے پر پڑی برسوں کی گرد ضحیٰ میر کے آنسوؤں کے چھینٹوں سے مٹنے لگی تھی۔ وہ آئینے میں ابھرتا اپنا عکس دیکھ کر سن سا بیٹھا تھا۔

"میں اور میری ماں آپ کی نظر میں گھٹیا جو ٹھہرے۔" اگر میں خود کو اس کی جگہ پر رکھوں اور کوئی میری ماں کے بارے میں ایسے الفاظ کہے تو۔ جسم پر رینگتی چیونٹیاں بھاگنے لگی تھیں۔

"لازمی نہیں ہے کہ ہر ایک آپ کی سوچ جتنا گھٹیا ہو۔" کتنا سچ بول گئی تھی وہ اس کا ایک ایک لفظ سچ تھا اس نے اعتراف کیا۔ لیکن وہ خود کو انگاروں پر چلتا محسوس کر رہا تھا۔ ضحیٰ کی آنکھوں کا گلابی پن' لبوں سے ٹوٹتی سسکیاں' اپنی ذات کے دفاع کے لیے چلانے سے گردن کی ابھری نسیں!

اسے چاروں اور ضحیٰ کے سوا کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ کچھ سنائی دے رہا تھا وہ وحشت زدہ سا اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے دل کا قرار ایسے نہیں لوٹے گا جب تک میری بے ساختگی سے تالیاں پیٹتی' آنکھوں میں نمی لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے' محبتیں لٹاتی' محبتیں وصول کرتی ضحیٰ میر سے اپنے ایک ایک لفظ کی معافی نہ مانگ لوں ہاں! میں سب کے سامنے اس سے اپنے بدصورت الفاظ' مکروہ رویے اور غلط سوچ کی معافی مانگوں گا۔

☼ ☼ ☼

یہ ورق ورق تیری داستان' یہ سبق سبق تیرے تذکرے

میں کروں تو کیسے کروں الگ تجھے زندگی کی کتاب سے

کتنے برس بیتے' موسموں نے کروٹیں بدلیں' بہار رت نے رخصت چاہی خزاں نے چہار سو اپنا ڈیرہ ڈال لیا۔ بے شمار زرد سوکھے پتے خیال کی ٹہنی سے جدا ہو کر بکھرتے رہے' اڑتے رہے۔ پیڑوں کی ٹنڈ منڈ برہنہ شاخیں بہار کا رستہ تکنے لگیں۔ بادصبا کے سبک جھونکے اپنے ساتھ بہار کی آمد کا سندیسہ لائے تو کوئل کوکنے لگی تھی۔ آم کے پیڑوں پر بور اترا تو شہد کی مکھیوں کی یلغار بڑھ گئی۔ ایک بار پھر وہی بدن پر سحر طاری کرتا موسم دستک دے رہا تھا۔

ان کے قدم خود بخود جانے پہچانے رستوں پر اٹھنے لگے۔ قدموں نے خود ہی راستوں سے برسوں کی شناسائی کا سفر طے کر لیا تھا۔ دھیان کے طاقچے میں رکھی یادیں انگڑائی لے کر بے دار ہو گئیں۔ پر شکوہ حویلی کی مغرور اٹھی ہوئی گردن نے آج بھی اپنا سر خم کرتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہا تھا۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی آگے بڑھتی رہیں یہاں تک کہ برسوں پرانے منظر نے قدم روک دیے۔ وہ سب آج بھی مالا میں پروئے موتیوں کی مانند ایک ساتھ جڑے ہوئے تھے۔

"مصالحہ" حیرت بھری بے یقین نگاہیں۔ وہ آج بھی اتنی ہی خوب صورت تھیں۔ شاندار اور چھا جانے والی لیکن چال کی شکستگی نے حسن گہنا دیا تھا۔ بنا کسی کی طرف دیکھے انہوں نے جھک کر اپنے مخصوص جھولے پر بیٹھی دادی جان کے پیروں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ سب اپنی اپنی جگہ ششدر رہ گئے تھے۔ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ لیکن بعض اوقات بنا کچھ کہے سارے اعتراف اپنا وجود منوا لیتے ہیں۔

دل پہ دھرا سارا بوجھ آنسوؤں ٹوٹی بے ربط ہچکیوں کی صورت اتار کے انہوں نے طویل عرصے بعد کھل کر سانس لی تھی۔ ثوبیہ سکنجبین بنانے کے لیے کچن کی جانب بھاگی۔

"ضحیٰ! ضحیٰ کہاں ہے؟" ان کی ساری پیاس آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔

"کیا ــــ؟" فق ہوتے چہرے' متوحش نگاہیں! انہیں کسی گڑبڑ کا احساس دلا گئے تھے۔

"اماں جان! پلیز مجھے بتائیں ضحیٰ کہاں ہے؟"

"ضحیٰ! تمہارے پاس نہیں آئی ــــ؟" ان کی زبان لڑکھڑائی تھی۔

"نہیں ــــ میرے پاس کہاں وہ تو مجھ سے خفا تھی۔" اندر بڑھتے میر شعیب کے قدموں سے کسی نے زمین کھینچ لی تھی۔ وہ الٹے قدم پیچھے ہٹا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

سنو!
تم عزم والے ہو
بلا کا ضبط رکھتے ہو
تمہیں کچھ بھی نہیں ہو گا
مگر دیکھو!
جسے تم چھوڑے جاتے ہو
اسے تو ٹھیک سے شاید ....
بچھڑنا بھی نہیں آتا

جسم سے جان نکلنے والے محاورے کی صداقت پر اسے آج یقین آیا تھا۔ وہ انتہائی ریش ڈرائیونگ کرتا پاگلوں کی طرح اسے تلاش کر رہا تھا۔ جس کے بارے میں وہ اگر سوچتا کہ وہ اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھ پائے گا تو اس کی سانس سینے میں اٹکنے لگتی۔

"آپ مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ میں یہاں سے کیسے جاؤں گی؟" ہرنی جیسی آنکھوں میں سراسیمگی بھرے وہ سراپا سوال بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ آسمان سرمئی بادلوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ فضا کا رنگ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ بادلوں کا ایکا دیکھ کر لگتا آن کی آن میں برس پڑیں گے۔ وہ اس موسم میں انجان رستوں پر بھٹکتی نہ جانے کس سمت نکل گئی ہو گی؟ شعیب کا دماغ پھٹنے لگا۔

"واٹس رونگ ود یو میر شعیب! میرے ہر کام میں مداخلت کرنا آپ نے اپنا حق کیوں سمجھ رکھا ہے؟"

"پلیز ضحیٰ! یہیں سے آجاؤ۔ تمہارے سب سوالوں کا جواب دے دوں گا۔" وہ ایک ہاتھ سے

اسٹیئرنگ سنبھالے دوسرے کی بند مٹھی ہونٹوں پر ٹکائے اپنی زندگی کے مشکل ترین مرحلے سے گزر رہا تھا۔

"شکر! آپ نے مجھے اپنے خاندان کا حصہ تو تسلیم کیا۔"

"میں تسلیم کرتا ہوں، تم میری زیست کا حصہ ہو۔"

ہوا نے پانی سے لدے بادلوں کا بوجھ سہارنے سے انکار کیا تو تڑتڑ بوندیں برسنے لگیں۔ ہوا کی شوریدہ سری میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

دوپہر تو کب کی ڈھل چکی تھی۔ لیکن اس وقت سہ پہر کے سنہری رنگ پر گہری کالی رات کا رنگ چھاتا محسوس ہورہا تھا۔ اچانک اس کا پاؤں بریک پر پڑا تھا۔ وہ اسے سڑک کے کنارے ایک بڑے سے کالے پتھر پر بارش میں بھیگتی دکھائی دی کسی بے جان مجسمے کی مانند۔

"ضحیٰ!" وہ اس کے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھا تھا۔

"میں میر شاہ جہاں کے سب سے چھوٹے بیٹے میر شاہ نواز کی اکلوتی بیٹی کو لینے آیا ہوں۔"

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔ ضحیٰ نے محض ایک نظر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا پھر رخ پھیر لیا تھا۔ بارش کی بوندیں اس کے سر سے پھسلتی ٹھوڑی سے ایک تواتر سے گرتی چلی جارہی تھیں۔ شفاف موتیوں کی لڑی کی مانند۔ "پلیز ضحیٰ!"

"جانتے ہیں میر شعیب! اگر بے حسی کا کوئی پیمانہ ہوتا تو میں آپ کو ناپ کر بتاتی کہ آپ اس وقت بے حسی اور سنگدلی کی کس حد پر کھڑے ہیں۔" اس کی بھیگی آواز پر بارش کا شور غالب آگیا تھا۔

"میں سب جانتا ہوں ضحیٰ! اور اگر تم اس وقت یہ سارے پتھر اٹھا کر مجھے دے مارو، پھر بھی میں اف نہیں کروں گا۔ بلکہ خاموشی سے اپنی جان دے دوں گا۔ لیکن میں جانتا ہوں ایسا کرکے بھی تمہارے جسم اور روح پر لگے زخموں کا مداوا نہیں ہوگا۔" وہ جیسے اس کی کوئی بات نہیں سن رہی تھی۔

"میرا کوئی گھٹیا مقصد نہیں تھا۔ میں کسی کو تکلیف پہنچانے نہیں آئی تھی۔" وہ اب بھی اسے اس کی باتیں یاد دلانے کی بجائے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی سعی کررہی تھی۔ بارش کا شور بڑھتا جارہا تھا اور اس کی آنکھوں کا گلابی پن بھی میر شعیب کا دل چاہا اپنا سب کچھ اس کے قدموں میں وار کردے۔ اس نے بے ساختہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔

"میں نہیں جانتا اپنی شرمندگی، ندامت، معذرت کا اظہار کیسے تم سے کروں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں، مجھے محبتوں سے گندھی لڑکی کا محبتوں پر، رشتوں پر اعتماد بحال کرنا ہے۔ اسے بتانا ہے کہ اس کا پاکستان آنے کا فیصلہ غلط نہیں تھا اس کا حویلی سے رشتہ آج بھی مسلم ہے۔ سب اس سے محبت کرتے ہیں اور... اور وہ حویلی میں بستے میر شعیب کے دل میں بستی ہے۔"

ضحیٰ کو نہ جانے کیا ہوا اسی کے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کے پھوٹ پھوٹ کے رودی۔ وہ دونوں اس وقت بارش میں بری طرح بھیگ چکے تھے۔

اس کا بیگ پچھلی نشست پر رکھنے کے بعد شعیب نے اپنی چاکلیٹ کلر کی چادر اس کے کندھوں پر پھیلا دی۔ جسے اس نے اچھی طرح اپنے گرد پھیلا کر اوڑھ لیا۔

بے چینی، اضطراب، خوف، واہمے! یہ سارے آکٹوپس صالحہ کو اپنے شکنجے میں جکڑنے کے لیے بے تاب تھے۔ لیکن شعیب کی ہمراہی میں قدم اندر رکھتی ضحیٰ کو دیکھ کر وہ تڑپ کر اٹھی تھیں۔

"ضحیٰ! میرا بچہ..." وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکی تھی پھر بھاگتے ہوئے ان کی کھلی بانہوں میں سما گئی۔

"چھوٹوں کے ہاتھ میں تھامے ننھے منے قمقمے بعض اوقات بڑوں کو راہ دکھانے کے لیے مشعل ثابت ہوتے ہیں۔"

اس کے بالوں کی نمی اپنے رخسار پر محسوس کرکے وہ طمانیت سے مسکرائی تھیں اور اس کے کندھوں پر پھیلی چادر سب کو یقین دلا گئی تھی کہ میر شعیب اس کی عدالت میں سرخرو ہوچکا ہے۔

☆ ☆

فاخرہ گل

ناولٹ
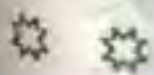
جو درد کے صحرا میں اکیلا بھی بہت ہے
اس کے لیے دیوار کا سایہ بھی بہت ہے
دیکھا نہیں تنہائی میں تم نے کبھی اس کو
بچھڑے ہوئے لوگوں کو وہ رویا بھی بہت ہے

رسم ورواج کی قیدی لڑکیوں کی مثال پنجرے میں بند ان رنگ برنگی چڑیوں کی سی ہوتی ہے جن کی چابی ہمیشہ ان کے بڑوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ وہ چاہیں تو پر کاٹ کر کچھ دیر باہر "آزادی" سے گھومنے پھرنے دیں اور اگر نہ چاہیں تو بس پنجرے میں ہی زندگی کی شام ہوجائے۔ ہاں البتہ چابی تھامنے والے ہاتھ تو ضرور تبدیل ہوجایا کرتے ہیں مگر نہ تو ذہن ہی بدلتا ہے اور نہ دل۔

مہربانو بھی انہی جیسی تو تھی جسے آزادی تو ضرور نصیب ہوئی تھی مگر پر کاٹ لیے جانے کے بعد۔

اپنے گھر، اپنے ماحول اور خصوصاً حویلی سے جڑی سوچ کا خوف ایک دیوہیکل جن کی طرح یوں اس کے ساتھ چمٹا رہتا کہ وہ چاہ کر بھی اس سے چھٹکارا نہ پاسکتی تھی۔

میران کے کبھی کبھار بن بتائے یونیورسٹی اس سے ملنے چلے آنے کی وجہ سے اس نے زیادہ لوگوں کے درمیان کھڑا ہونا چھوڑ دیا تھا۔ کلاس سے باہر نکلتے ہی بس میران کے ایک دم کہیں نظر آجانے کا دھڑکا سا لگا رہتا کہ میران کے منہ سے نکلی ہوئی بات شاہ سائیں اور ماکانی سائیں کے لیے کس قدر سچی اور اہمیت کی حامل ہوتی ہے اس کا اندازا مہربانو کو بہت اچھی طرح تھا۔

یہی وجہ تھی کہ میری اور کنول کے علاوہ وہ کسی کے ساتھ بھی فری ہو کر بات نہیں کرپاتی تھی۔ اس روز اکمل کے یوں ایک دم مخاطب کرلینے پر جو اس کا خون خشک ہوا تھا تو اس کا احساس کافی دیر تک ذہن پر رہا۔

اب بھی نماز پڑھنے کے بعد ذرا سا پیچھے کھسک کر سنگل بیڈ سے ٹیک لگا کر دعا مانگتے ہوئے یوں ہی اسے خیال آیا کہ اگر اس روز آئس کریم پارلر میں میران اس بندے کو اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا دیکھ لیتا تو یقیناً اب تک شاہ سائیں اور ماکانی سائیں تک واقعہ اس انداز میں پہنچ چکا ہوتا کہ مہربانو پڑھائی کے بہانے وہاں جا کر عیاشیاں کر رہی ہے اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی جاتا تو وہ بھلا اپنا یقین کیسے دلاتی؟ اور اس پر کوئی یقین کرتا ہی کیوں؟

شاہ سائیں بھی بعض اوقات حقیقت کو پس پشت ڈال کر میران کی کہی گئی بات کو تسلیم کرنے میں دیر نہیں لگاتے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ مہربانو کی نیچر سے اچھی طرح واقف تھے مگر میران پھر میران تھا۔

ان کا جگر گوشہ، ان کا وارث اور ان کی نسل آگے بڑھانے کا وسیلہ۔

جبکہ اس کے لیے تو یہی معجزہ غنیمت تھا کہ اسے آگے پڑھنے لکھنے کی اجازت مل گئی۔ میران کی مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے۔

اور اسے پتا تھا کہ اسے کبھی بھی کسی بھی قسم کا کوئی ایسا کام نہیں کرنا ہے جس سے میران کی کی گئی مخالفت کو تقویت ملے۔

"کیوں بھئی، دعا ختم ہوگئی ہو تو کوئی بات کرنے کی اجازت مل سکتی ہے؟"

مہربانو نے "میری" کی آواز پر چونک کر آنکھیں کھولیں تو وہ دوزانو ہو کر اس کے سامنے ہی بیٹھی نظر آئی۔

"ارے تم کب سے بیٹھی ہو یہاں؟"

مہربانو حیران تھی کہ آخر اس کے آنے سے وہ لاعلم کیسے رہی یعنی یا تو وہ دبے پاؤں آئی ہوگی یا پھر وہ کچھ زیادہ ہی محو تھی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئی تھی، تمہیں دعا مانگتے دیکھا تو جوتے اتار دیے کہ خلل نہ پڑے۔"

"ہوں۔" مہربانو مسکرائی۔

"ویسے کیا مانگ رہی تھیں اتنی توجہ اور دھیان سے۔" میری نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے آلتی پالتی مار لی تھی۔

"ابھی تو کچھ مانگا ہی نہیں۔۔۔ فی الحال تو بس رب سائیں سے باتیں کر رہی تھی۔"

"اتنی دیر تک صرف باتیں۔۔۔ اور کچھ مانگا بھی نہیں۔" میری کو حیرت ہوئی تھی۔

مہربانو نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ہمارے سامنے تو بہت کم بولتی ہو حالانکہ ہم تم سے کتنے ہی سوال جواب کرتے رہتے ہیں اور جہاں آگے سے صرف خاموشی ہی خاموشی میں جواب آتے ہوں وہاں کیسے باتیں کر لیتی ہو۔"

"ایسا نہیں ہے میری۔۔۔! بلکہ وہ تو میرے لیے ایک بہترین سامع ہے۔ جب دل چاہتا ہے اس کے سامنے دل کھول کر رکھ دیتی ہوں اور یقین کرو اکثر میں روتی آنکھوں سے بات کا آغاز کرتی ہوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ ختم کرتی ہوں۔ He is the one, who understands me" اور ویسے بھی نہ تو اُس سے کچھ چھپانا پڑتا ہے نہ ہی علی الاعلان بتانا۔۔۔ وہ میرا اللہ دل میں بستا ہے، دل کی باتیں سنتا ہے اور دلوں کو سکون دیتا ہے۔"

اس لمحہ میری کو لگا جیسے وہ جذب کے عالم میں اس کے بجائے کسی اور سے گفتگو کر رہی ہے۔

"تمہیں کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کی طرف سے تمہیں جواب مل رہے ہیں۔" میری کی حیرت بجا تھی کہ یہ موضوع آج ہی اتفاقاً ان کے درمیان آیا تھا۔

"پتا ہے میری۔۔۔! میرا دل بولنے لگتا ہے میرے اندر جیسے کوئی مکالمہ شروع ہو جاتا ہے اور پھر کوئی تشنگی کوئی محرومی نہیں رہتی۔"

"یعنی تمہارے اندر تو بہت روحانیت ہے۔" میری بڑی دلچسپی سے اس کے چہرے پر رقصاں جذب کو نوٹ کر رہی تھی۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے یار! یہ تو بس نارمل روٹین کی باتیں ہیں۔" مہربانو مسکرائی۔

"اچھا تم بتاؤ۔ مجھ سے کوئی کام تو نہیں تھا نا۔۔۔ اور کنول کہاں ہے؟"

"کنول کچن میں ہے اور خیر سے آج بھنڈی کھلانے کا ارادہ رکھتی ہے اور کام تو نہیں تھا مگر۔۔۔" میری نے منہ بسورا۔

"مگر۔۔۔؟"

"یار۔۔۔! ممی کا فون آیا تھا، نصیحت کر رہی تھیں کہ کالج میں داخلہ ملے اتنا ٹائم ہو گیا ہے مگر ایک دفعہ بھی خدا کا تھینکس کرنے چرچ تک نہیں گئی۔"

"ہوں۔۔۔" میری فرش سے اٹھی تو مہربانو نے بھی اٹھ کر جائے نماز بند کی اور سامنے میز پر موجود کتابوں ہی کے اوپر رکھ دی۔

"اگر آنٹی کہہ ہی رہی تھیں تو تمہیں جانا چاہیے نا، زیادہ نہیں تو ایک بار چکر لگا لو۔"

"ہاں سوچ تو میں بھی کچھ یہی رہی ہوں۔" میری نے بیڈ سے ٹیک لگاتے ہوئے تکیہ کا سہارا لیا۔

"کیوں نا آج ہی چکر لگا لیں۔۔۔ تم چلو گی میرے ساتھ؟"

فوراً سے پیشتر میری نے پروگرام ترتیب دیا تھا۔

"کنول کچن میں ہے، ہمارے آنے تک کھانا تیار ہوگا۔ کھانا کھا کر اکٹھے اسٹڈی کر لیں گے۔"

"میں۔۔۔؟" مہربانو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم اور کون۔۔۔ اور یقین کرو جلدی آ جائیں گے۔"

"یار! میرے گھر والوں کو میرا ہاسٹل سے یہاں وہاں جانا پسند نہیں ہے اور وہ بھی بغیر کسی کام کے۔۔۔" مہربانو نے جھوٹ کا سہارا لینے کے بجائے سچائی سے کام لیا۔

"ارے لیکن تم کون سا سینما جا رہی ہو؟ جیسے تم لوگ مسجد جاتے ہو ویسے ہم چرچ۔ پاک جگہ ہے یہ بھی ہمارے لیے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے مگر۔۔۔"

"شاید تم چرچ کی وجہ سے نہیں جانا چاہ رہیں۔" میری نے اپنے طور اندازا لگایا تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے یار! لیکن یوں سمجھو کہ اماں سائیں نے یہاں بھیجنے سے پہلے میرے گرد ایک دائرے کا حصار بنا دیا تھا، اور کہا تھا کہ اس دائرے میں جو مرضی میں آئے کرو، مگر ہاں دھیان رہے کہ ایک قدم بھی اس دائرے سے باہر نہ نکلنے پائے ورنہ اس حصار کے ٹوٹنے کی ذمہ داری سراسر میری اپنی ہوگی۔"

"یہاں تمہیں گھر کا کوئی فرد نہیں دیکھ رہا، اور نہ ہی کسی کے ابھی آنے کا امکان ہے پھر بھی تم اتنی محتاط ہو رہی ہو۔۔۔ ڈرپوک کہیں کی۔" میری کی بات پر مہربانو کے چہرے پر بڑی بھرپور مسکراہٹ ابھری تھی۔

"پازیٹو سوچتیں تو فرماں بردار بھی کہہ سکتی تھیں۔"

"نہیں یار اتنی بھی کیا فرماں برداری۔۔۔" میری نے دہانہ سکوڑتے ہوئے کہا۔

"تم کوئی غلط کام کرنے یا کسی غلط جگہ پر تھوڑی جا رہی تھیں۔۔۔ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ تمہیں مجھ پر بھروسہ ہی نہیں ہے۔ میرے ساتھ جانے پر شاید تم کترا رہی ہو۔"

"اچھا ایسا کرو تم اور کنول چلی جاؤ، بھنڈی میں بنا دیتی ہوں۔"

"مشورہ نہیں مانگا ہے تم سے۔۔۔ شکریہ۔" میری کے منہ کے زاویے جو بگڑے تو کلف لگے کپڑے کی طرح نرم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔

مہربانو جو اب تک اس بات کو نارمل سمجھ رہی تھی، معاملے کی سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی اب خود کو عجیب کشمکش میں مبتلا محسوس کر رہی تھی۔

"اپنی ذات کے اندر کوئی روزن، کوئی روشن دان ضرور بناؤ یار! ورنہ اس گھٹن اور حبس میں تو مر جاؤ گی تم۔"

"منظور ہے مجھے۔" مہربانو نے سنجیدگی سے کہا تو میری۔۔۔ چونک سی گئی۔

"اسی گھٹن اور حبس میں مرنا منظور ہے یار! مگر میں ایسا کوئی روزن یا روشن دان نہیں بنانا چاہتی جس سے آنے والی ہوا یا روشنی میرے والدین کے لیے ناپسندیدہ ہو۔"

"تمہارا کچھ نہیں بن سکتا یار You are just a mummy daddy child"

میری ہار مانتے ہوئے مسکرائی تو مہربانو نے بھی سکون کا سانس لیا۔

"ویسے حویلی کا نمبر کیا ہے؟"

"کیوں؟ خیر ہے؟ شکایت کرنی ہے کوئی؟"

"پھر بھی۔۔۔ بتاؤ تو۔۔۔"

میری نے سامنے رکھا موبائل ہاتھ میں لے کر اس کی طرف دیکھا اور مہربانو کے نمبر بتانے پر اسی لمحے ملا بھی لیا۔

☆☆☆

شیشے اُتے دھوڑاں جمیاں، کندھاں جھاڑی جاندے
جلداں سانبھ کے رکھ محمد، ورکے پاڑی جاندے
فجری ویلے بول نی کوئلے، بول غماں دی بولی
نہ وس تیرے نہ وس میرے، بھیا پے لیا جھولی

ہمارے حصے میں آنے والے بعض دکھ کسی شعبدہ باز کی مانند ہوتے ہیں جو پتلی سی رسی پر چڑھا خود تو ہوا میں معلق ہوتا ہی ہے مگر ساتھ ساتھ دیکھنے والوں کا بھی خون اس وقت تک خشک کیے رکھتا ہے جب تک اس کا اور رسی کا ساتھ چھوٹ نہ جائے۔ بالکل اسی طرح وہ دکھ جو بن چاہے اور خلافِ توقع ہماری جھولی میں آ گریں اور جن کے متعلق ہم اپنی ذات سے بھی ذکر

کرتے سے گریز کر رہے ہوں ایسے دکھ لمحہ بہ لمحہ ہمیں اندر سے دیمک کی طرح چاٹتے رہتے ہیں۔ پتا چلتا ہے تو تب جب انسانی بت کھوکھلا ہو کر زمین پر آگرے۔

پلنگ پر کسلمندی سے لیٹی ملکانی سائیں نے گہری سانس لیتے ہوئے کروٹ لی تو سونی نے بھرپور طریقے سے میاؤں کہہ کر انہیں اپنے ہونے کا یقین دلایا۔

حویلی میں اکثر اوقات وہ چونکہ اکیلی ہی ہوا کرتی تھیں سو جب دل بھیگی ہوئی روئی کی مانند بہت زیادہ بوجھل ہونے لگتا تو سونی سے ہی باتیں کرلیا کرتیں۔ وہ تھی بھی عقلمند۔ بات بے بات میاؤں کرنے کے بجائے بھی کبھار ہی میاؤں کرتی۔ جس سے ملکانی سائیں کو گمان گزرتا کہ جیسے وہ سب سمجھ رہی ہو۔

چھوٹی سی گلابی ناک والی سونی جانے کیا سوچتے ہوئے اکثر اپنی گول مٹول گہری سبز آنکھوں سے ملکانی سائیں کو دیکھا کرتی۔ گچھے دار انتہائی نرم جلد والی وہ سفید سی بلی ملکانی سائیں کے مزاج کے سب موسموں کی ساتھی تھی۔ کبھی جو انہیں مسکراتا دیکھتی تو اُس کا کھلنڈرا پن کود کر سامنے آجاتا۔ پھر ان کے آگے پیچھے پاؤں میں لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے کبھی اپنی دم سے کھیلا کرتی اور کبھی اپنی ہلکی سرخ زبان سے اپنے ہی پنجے چاٹنے لگتی۔

خدانا خواستہ اگر محسوس کرتی کہ جسم کے کسی عضو پر مٹی لگ گئی ہے تو پھر بھی اپنی زبان ہی سے گویا پورا جسم دھو ڈالتی۔ اس کے برعکس انہیں اداس یا معمول سے زیادہ خاموش دیکھتی تو خود بھی خاموشی سے دم سادھے Cattery میں پڑی رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ انہیں اس قدر عزیز تھی۔

حویلی کی بڑی بڑی دیواریں انہیں پر اسرار روحوں کی طرح گھورتیں۔ یہاں سے وہاں پھیلی تنہائی میں بعض اوقات ملکانی سائیں کو اپنا وجود بے کار سا لگنے لگتا۔ میران، مہربانو اور شاہ سائیں سب کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں جن میں وہ مکمل طور پر ڈوبے ہوئے تھے۔ ایسے میں وہ نوکر چاکر اور بے شمار جاگیر و وراثت کے ہوتے ہوئے بھی خود کو تنہا سمجھا کرتیں۔ حویلی کی ملازماؤں سے وہ کام کے علاوہ اگر اکثر اوقات چاہ کر بھی بات نہیں کر پاتی تھیں کیونکہ اب ان سے بات کرتے اور گھلنے ملنے کی خواہش کے در پردہ صرف اور صرف ان کی تنہائی چھپی تھی جبکہ اس تمام خواہش کے پیچھے ان کی زندگی کا وہ دور تھا جس میں انہیں بہتر "اعلا" خیال کیا گیا تھا اور بس۔۔۔

انہیں کبھی کبھار اپنا آپ اس بت کی طرح محسوس ہوتا جس کے سامنے بیٹھ کر لوگ بڑے ادب سے اپنی خواہشوں اور حسرتوں کا اظہار تو کرتے ہیں۔ تکریم کی شیرینی میں بھیگے لفظوں سے ان کے قصیدے بھی پڑھتے ہیں مگر کوئی بھی ان کے "منصب" کی توہین اور بے حرمتی کے ڈر اور خوف کے باعث ان کے سامنے ہنسی مذاق کرنے، دوستانہ لہجے میں بات چیت کرنے سے کتراتا ہے۔ پہلے مہربانو اُن کے پاس تھی تو تنہائی یوں اس قدر محسوس نہیں ہوتی تھی مگر اب ان کے لیے دن گزارنا ایک مشکل اور انتہائی غیر دلچسپ امر بنتا جا رہا تھا۔

تبھی ان کے ذہن میں ایک اچھوتا خیال اترا تو وہ ماتھے پر سوچ کی لکھی سطروں کو نظر انداز کرتیں لمحہ بھر میں مسکرا دیں۔ کام مشکل تو ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا اور اس کام کو سر انجام دینے کے لیے انہیں سب سے پہلے شاہ سائیں کی مشاورت اور پھر ان کی تائید درکار تھی جبھی وہ فوراً پلنگ سے اتریں اور شاہ سائیں کو فون ملانے لگیں۔ صرف اس خیال کے آتے ہی ان کے خون میں جو حرارت اور سنسنی پیدا ہوئی تھی وہ اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ اگر یہ کام ہو جائے تو ان کی روکھی پھیکی اور بے رونق زندگی میں بھی زندہ رہنے کی لگن پیدا ہو سکتی ہے۔ یوں بھی ناممکنات کو ممکن بنانے یا ممکن بنا لینے کی خواہش میں جو لطف ہے وہ ان حسرتوں میں نہیں جو دو قدم کے حصول پر ہوں اور ملکانی سائیں نے اب کے یہ لطف اٹھانے کی ٹھان ہی لی تھی۔

☆☆☆

صحن میں دیوار کے ساتھ لگی کیاریوں کو پانی دیتی ثمینہ عملی اور ظاہری طور پر اس وقت مصروف ضرور تھی مگر ذہن کا پہیہ گھڑی کی سوئیوں میں اٹکا ہوا تھا۔

اس وقت ہوا اور وہ لڑکی جس نے اپنا نام زرمین بتایا شاہ زین کے پاس پڑھنے کے لیے آئے۔

زندگی میں پہلی مرتبہ اسے گھر کے لیے کچھ کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ ورنہ آج تک تو اس نے شاہ زین کو انتھک محنت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جس طرح وہ علی الصبح جاگنے کے بعد ڈیوٹی پر جاتا اور اس سے پہلے کالج کے زمانے میں بھی کلاس شروع ہونے سے پہلے ہی دو ٹیوشنز پڑھا لیا کرتا تھا اور پھر اپنی کلاسز اٹینڈ کرنے کے بعد دوبارہ ٹیوشنز کا سلسلہ چلتا تو پھر رات گئے تک نہ رکتا۔

رزق اور محنت کے گرد طواف کرتے شاہ زین کو دیکھ کر اماں کا دل تو جو کڑھتا سو کڑھتا مگر خود ثمینہ کی بھی حالت اُن سے مختلف نہ تھی کیونکہ جانتی تھی کہ گھر کے اخراجات اور کالج کی فیس وغیرہ ادا کرنا تو ایک طرف مگر شاہ زین کے ذہن میں ثمینہ کو رخصت کرنے کا بھی ایک واضح تصور موجود تھا۔ جسے حقیقت کا روپ دینے کے لیے وہ دن رات ایک کیے ہوئے تھا۔ ایسے میں ثمینہ کی شدت سے یہ خواہش ہوتی کہ کاش وہ بھی گھر کے لیے کچھ کر پاتی اور اپنے بھائی کا سہارا بن کر مکمل طور پر نہ سہی کسی حد تک اُن کا بوجھ اور فکریں کم کر پاتی۔

سو اب جب یہ وہ موقع اس کے ہاتھ آن لگا تھا تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔ جلدی جلدی شام کے لیے کھانے کی تیاری بھی کر لی اور اماں کو چائے بھی بنا کر پلا دی۔ مگر ابھی تک زرمین کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔ جبھی اٹھ کر پودوں کو پانی دیا۔ پیڈسٹل فین صحن میں رکھا اور اس سے پہلے فون کر کے اس کے بارے میں کچھ معلوم کرتی، ڈور بیل دینے کے ساتھ ہی نہ صرف زرمین اندر داخل ہوئی بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک نوجوان بھی یوں داخل ہوا گویا وہ دونوں پہلے بھی یہاں آتے رہے ہیں۔ انتہائی بے تکلفانہ انداز اور دوستانہ اطوار کے حامل یہ دونوں افراد اماں سمیت ثمینہ کو بھی چونکا گئے تھے۔

آج سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ان کے گھر کے اندر کوئی مرد داخل ہوا ہو یہاں تو پھر ابھی اتنا عرصہ نہیں گزرا تھا مگر سابقہ محلے میں بھی یہ دستور رائج تھا کہ اگر کسی کو کوئی بھی کام ہوتا تو باہر ہی نبٹا لیا جاتا کیونکہ اس امر سے بھی بخوبی واقف تھے کہ ان کے گھر میں کوئی مرد نہیں اور شاہ زین اکثر ٹیوشنز کے سلسلے میں زیادہ تر وقت باہر ہی گزارتا۔ اسی لیے یہ پہلا اتفاق تھا کہ کوئی منہ اٹھا کر یوں ان کے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر اندر آگیا ہو۔ ثمینہ کے لیے چونکہ یہ تمام صورت حال خلاف توقع اور انوکھی تھی اسی لیے اس کی طرف سے کسی بھی قسم کا رد عمل آنے میں دیر لگی تب تک وہ اس کے اور اماں کے لیے گیٹ کے تھوڑا سا آگے رکھی کرسیوں پر ہی بیٹھ گئے۔

"السلام علیکم آنٹی!"

لاؤنج سے نکلتی اماں کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں موجود حیرت کو یکسر کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے لڑکے نے خود ہی آگے بڑھ کر انہیں سلام بھی کیا اور ساتھ ہی ان کے سامنے سر جھکا دیا تو زرمین کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑی۔

"جیتے رہو، خوش رہو۔"

دعائیہ کلمات کے دوران ہی ثمینہ نے مزید دو کرسیاں وہیں لا رکھیں تو اماں بھی وہیں بیٹھ گئیں اور سوچا کہ اس لڑکے کو اپنے گھر کی اقدار بتائی جائیں مگر شاید وہ کچھ زیادہ ہی جلد باز تھا جبھی ان کے بولنے کا انتظار نہ کرتے ہوئے خود ہی بول پڑا۔

"آنٹی، میں دراصل آج صرف زرمین کو چھوڑنے آیا تھا اور نہ صرف اس کی بلکہ ہم سب کی ہی یہ خواہش ہے کہ یہ کسی طریقے سے بہترین نمبرز کے ساتھ کامیاب ہو جائے۔"

"ہاں، ہاں بیٹا! کیوں نہیں، محنت کرنے والوں کو تو اللہ بھی دوست رکھتا ہے اور مجھے امید ہے کہ زرمین! تم بہت اچھے نمبر لو گی اس دفعہ۔" بات کرتے کرتے انہوں نے زرمین کو مخاطب کیا تھا۔

"جی آنٹی! کیوں نہیں۔" جواباً زرمین مسکرائی۔

"اگر نیک نیتی سے پڑھانے والا استاد مل جائے

تو کوئی بھی امتحان مشکل معلوم نہیں ہوتا۔"

"صحیح کہا۔" اماں نے تائید کی۔

"ویسے ثمینہ آپ تو کافی ذہین ہیں۔" اماں سے دھیان ہٹاتے ہوئے اس نے ڈائریکٹ ثمینہ کو مخاطب کیا، تو وہ چونکی۔

"مگر آپ کو کیسے پتا؟"

"پتا تھا تو یہاں تک پہنچے ہیں نا۔" مسکراتے ہوئے بات کرنے کے دوران اس نے زمین کو دیکھا جو چاروں اطراف کا جائزہ لینے میں مگن تھی۔

"ویسے آپ دونوں کیا اکیلی رہتی ہیں یہاں؟"

"نہیں بیٹا۔۔۔!" ثمینہ کے بجائے اماں نے جواب دیا۔

"ماشاء اللہ میرا بیٹا بھی ہے جو یہیں ہمارے ساتھ ہی رہتا ہے لیکن دوپہر کو عموماً جاب کی وجہ سے گھر پر نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ تم پہلے لڑکے ہو جو گھر کے اندر تک آ کر یوں بیٹھے ہو ورنہ اس کی موجودگی میں بھی کبھی ایسا اتفاق کم ہی ہوتا ہے۔"

اماں نے تفصیلاً آگاہ کیا۔

"لیکن آنٹی یہ تو کچھ عجیب سی بات ہے کہ دوست آئیں اور باہر سے ہی بھگتا دیے جائیں۔" زمین نے یہاں وہاں نظر دوڑانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

"ہاں بیٹا! بات تو یقیناً عجیب سی ہی لگے گی اگر دوست آئیں تو۔۔۔"

اماں نے بات ادھوری چھوڑی تو دونوں کی استفہامیہ نظریں ان کے چہرے پر آ رکیں۔ ثمینہ اسی دوران مشروب لے کر آئی اور خود سرو کرنے کے بجائے سامنے ٹیبل پر ٹرے رکھی، سب سے پہلے اماں کی طرف گلاس بڑھایا اور باقی دونوں نے رسمی طور پر کیے گئے اصرار کا انتظار نہ کرتے ہوئے خود ہی اپنے لیے گلاس تیار کیا اور ایک ایک گھونٹ کر کے پینے لگے۔

"کیا مطلب آنٹی؟"

"بیٹا میرا مطلب یہ ہے کہ شاہ زین نے اتنے دوست بنائے ہی نہیں ہیں کہ کوئی گھر تک آئے۔"

"ہوں۔۔۔"

ثمینہ نے معنی خیز انداز میں ان دونوں کی نظروں کا ٹکراؤ ہوتے دیکھا۔

"اس کا مطلب تو ظاہر ہے یہ ہے کہ آپ کو اس وقت میرا آنا اور یوں بیٹھنا ہرگز اچھا نہیں لگ رہا ہوگا۔"

"گھر آیا مہمان تو بیٹا سر آنکھوں پر، لیکن دراصل ہر گھر کا اپنا ایک ماحول ہوتا ہے نا، تو بس یوں سمجھو کہ ہمارے گھر کا ماحول ذرا مختلف ہے۔"

انتہائی نرم لفظوں اور مناسب لہجے میں اماں نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ ان کے گھر کے قاعدے قانون کیا ہیں۔

"او کے جی، میں تو پھر چلتا ہوں۔ میں ویسے بھی آج اس کا پہلا دن ہونے کی وجہ سے ساتھ چلا آیا تھا ورنہ تو اتنا ٹائم ہی نہیں ملتا۔" گلاس رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اماں نے چند الوداعی اور دعائیہ کلمات کہے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر رخصت کیا اور اس کے جانے کے بعد وہ تینوں اٹھ کر لاؤنج میں آ گئیں۔

مگر ایک چیز جو انہیں حیران کیے دے رہی تھی وہ اس کا بے تکلفانہ انداز تھا کہ اندر آتے ہی سب سے پہلے اس نے ثمینہ سے اپنا گھر دکھانے کی درخواست کی اور اس کی ہامی بھرنے پر اپنا شولڈر بیگ وہیں صوفے پر رکھا اور ثمینہ کے ساتھ سارے گھر کا جائزہ لینے لگی۔ کچن میں داخل ہوئی تو وہی ٹرے جو ثمینہ ان کے لیے باہر لے کر گئی تھی اور اندر آتے ہوئے اس نے گلاسوں کو بغیر دھوئے ٹرے کو ویسے ہی سلیب پر رکھ چھوڑا تھا، زمین نے دیکھا تو ثمینہ کے ہزار بار منع کرنے کے باوجود اس کے کسی حکم کو بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے گلاس اور ٹرے دھو کر اسپنج سے سنک کو خشک تک کر دیا اور پھر تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولی۔

میں اور تم صرف ایک اسٹوڈنٹ اور ٹیچر کی طرح [illegible] رہیں گے۔۔۔ ہم دوست بھی تو بن سکتی ہیں نا۔"

ثمینہ اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے مسکرائی۔

"ہاں کیوں نہیں، دوستی ہوگی تو پڑھائی کا مزا بھی آئے گا۔"

"بس تو پھر آج سے ہماری دوستی پکی۔"

زمین نے اس کے سامنے اپنا دایاں ہاتھ پھیلایا اور ثمینہ نے اسے تھامتے ہوئے دوستی کی ابتدا ہونے کا یقین بھی دلا دیا۔

☆☆☆

کچھ پنچھی جھنڈ میں اڑتے ہوں
اور رستہ بھی کچھ مشکل ہو
کچھ دور افق پر منزل ہو
اک پنچھی گھائل ہو جائے
اور بے دم ہو کر گر جائے
تو رشتے، ناتے، پیارے سب
کب اس کی خاطر رکتے ہیں
اس دنیا کی ہے ریت یہی
جو ساتھ چلو تو ساتھ بہت
جو رک جاؤ تو تنہا ہو

یوں بھی آج کل محبتوں سے گندھے ان خوب صورت رشتوں پر بدگمانیوں اور رنجشوں کی دھول پڑ چکی ہے اور اگر رشتوں پر بدگمانیوں کی گرد پڑنے لگے تو آنکھیں وہ بھی دیکھنے لگتی ہیں جو وقوع پذیر نہیں ہو رہا ہوتا، سماعتوں میں ان لفظوں کی چاپ بھی سنائی دینے لگتی ہے جو کبھی ادا ہوئے ہی نہ تھے، ایسے میں جب تک یہ گرد صاف نہ ہو، دل کچھ بھی اور سننے یا ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ دلوں میں پیدا ہونے والی بدگمانی کی پتلی سی لکیر آخر کار نفرت کی ایک بڑی دراڑ کی جگہ لے لیتی ہے اور پھر وہ محبتیں جن کے بغیر جینا تو دور اس امر کے بارے میں سوچنا بھی محال لگتا ہو، قصہ پارینہ بن کر آہوں اور سسکیوں میں بکھرتی رہتی ہیں یہ سب ندی کے ساتھ ہو رہا تھا۔

امی بستر پر پڑی تھیں، ناصر بھائی اور عائشہ ڈاکٹر کے ساتھ کھڑے تھے جبکہ وہ خود امی کے بیڈ پر ہی بیٹھی ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیے خالی خالی نظروں سے ان کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

گالوں کی جلد لٹک گئی تھی تو آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے آمد کے ساتھ ان کی آنکھوں کو بھی اندر دھنسا گئے تھے۔ ہاتھوں کی گہری سبز نسیں اس حد تک نمایاں تھیں کہ انگلیوں سے پہلے نظر اُن پر جا رکتی۔

"انہیں یقیناً بہت گہرا صدمہ ہوا ہے۔"

ڈاکٹر نے ناصر بھائی کو دوا کا پرچہ تھماتے ہوئے مخاطب کیا۔

"اسی وجہ سے اتنی لمبی بے ہوشی ان کے حواس پر طاری رہی مگر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ فی الحال یہ سو رہی ہیں۔ جب تک یہ خود نہ جاگیں، کسی قسم کے شور، آہٹ یا کھٹکے سے اچانک ان کی آنکھ نہ کھلے تو بہتر ہے۔"

"جی بہتر۔" ناصر بھائی نے دوا کے پرچے پر نظریں جمائے کہا۔

"اس وقت یہ اس ذہنی اسٹیج پر ہیں جہاں کوئی بھی انہونی، کوئی غیر متوقع عمل یا صدمہ ان کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔۔۔ اس لیے جس قدر خوش رکھ سکتے ہیں اتنا انہیں خوش رکھیے۔"

ڈاکٹر صاحب کے مشورے پر اچانک ہی لاشعوری طور پر ندی اور ناصر بھائی نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر دونوں ہی کو نظریں چرانی پڑیں۔

اور پھر اس دن باوجود اس کے کہ ندی بھی امی کے دائیں طرف بیٹھی بدستور ان کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ ناصر بھائی بھی دوسری طرف آ کر بیٹھ گئے۔ دھیرے سے ان کا ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے سہلانے لگے۔ نظروں کا مرکز البتہ امی کا چہرہ ہی تھا۔ جو گہری نیند میں ہونے کی وجہ سے بے حد پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔

ناصر بھائی کی دیکھا دیکھی عائشہ بھابھی بھی کچھ دیر تو وہاں رکیں مگر پھر ناصر بھائی کے جلد نہ اٹھنے کے

لرادے کو بھانپتے ہوئے کینہ توز نظروں سے ندی کو دیکھتی آخر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

کتنے ہی عرصے کے بعد آج یوں ناصر بھائی اور ندی ایک ساتھ ایک جگہ پر موجود تھے۔ لمحہ بھر کو ندی کا دل تو ضرور چاہا کہ اٹھ کر اُن سے اپنے سابقہ انداز میں مخاطب ہو۔ ان کے لیے اپنے دل میں موجود سارا غصہ نکال کر ان کے کندھے پر سر رکھ کر اتنا روئے کہ شک، بدگمانی، غلط فہمی اور کدورتوں کے جتنے بادل ان کے سامنے تھے سب ایک ہی دفعہ میں کھل کر یوں برسیں کہ مطلع نکھر جائے۔

مگر ایسا نہ ہوسکا۔

کچھ اس کو بھی عزیز ہیں اپنے سبھی اصول
کچھ ہم بھی اتفاق سے ضد کے مریض ہیں

خود ناصر بھائی جتنی دیر وہاں موجود رہے۔ ذہن کے پردے پر صرف ندی ہی کا بچپن گھومتا رہا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک گھر کا ماحول کس قدر خوب صورت تھا۔ اور ندی ان کے لیے کیا حیثیت رکھتی تھی اور پھر ندی نے جس طرح ان کے اعتبار کو ٹھیس پہنچائی ان تمام باتوں نے ان کے دل کو ایک بار پھر پارہ پارہ کر دیا تھا۔

امی کے کمزور اور نحیف چہرے سے ہوتی ہوئی ان کی نظر ندی کے زرد اور مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑی تو دل جیسے برف کا ٹکڑا ہوتا محسوس ہوا، آج کتنے ہی عرصے بعد انہوں نے ارادتاً ندی کو دیکھا تھا جس کے بغیر رات کا کھانا کھانا ایک ناقابل تصور عمل تھا۔ جسے دیکھے بنا انہیں رات کو نیند نہیں آتی تھی اور جس کی خاطر وہ کچھ بھی کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے اب اسے مخاطب بھی نہیں کرتے تھے۔ مسکراتی آنکھوں والی ندی اب وہ ندی تو لگ ہی نہیں رہی تھی جس کی آنکھوں کو عموماً لوگ کانچ سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ اب آنکھوں کے پپوٹے سرخ اور سوجے ہوئے تھے تو وہی کانچ بری طرح دھندلائے ہوئے تھے۔

لیکن دل کے بری طرح پسیج جانے کے بعد انہوں نے ندی ہی کو اس تمام صورت حال پر موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے بات کرنے کا خیال ترک کرتے ہوئے پھر سے امی پر نظریں مرکوز کر دی تھیں۔ جن کی طرف سے ہلکی سی حرکت محسوس ہونے پر جہاں ناصر بھائی کے دعا کرتے لب تیزی سے ہلنے لگے تھے وہیں ندی بھی اٹھ کر ان کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

چند لمحوں بعد انہوں نے آنکھیں کھولنے پر دونوں کو اپنے لیے متفکر اور سامنے موجود پایا تو ایک گہری سانس کے ساتھ آنسو خود بخود یہاں سے وہاں لڑھکنے لگے۔

☆☆☆

تعلق بعد میں تبدیل ہو کر جو بھی رہ جائے
محبت میں وہ پہلا مسکرانا یاد رہتا ہے
کسی کی لاکھ باتیں ایک پل میں بھول جاتی ہیں
کسی کا ایک ہی جملہ پرانا یاد رہتا ہے

میری نے اس دن ملکانی سائیں سے فون پر مہربانو کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت کیا کہہ کر لی اور کس طرح لی تھی یہ تو اسے معلوم نہیں تھا مگر ہاں اتنا ضرور تھا کہ میری موبائل ہاتھ میں لیے روم سے باہر نکلی تھی اور پھر چند ہی لمحوں بعد جب مسکراتے ہوئے اندر آ کر اس نے مہربانو کے کان سے فون لگایا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ موبائل میری کا اور آواز ملکانی سائیں کی۔

ناسمجھی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے اس نے میری کو دیکھا جو فرضی کالر جھاڑ رہی تھی۔

"میکوں فخر ہے مہربانو! کہ توں اتنی دور ہو کے بھی اساں کی مرضی اور پسند ناپسند دا کتنا خیال رکھتی ہے۔"

"اماں سائیں! یہ تو میں شروع ہی سے ایسا ہی کرتی ہوں۔"

"پتا ہے پتا ہے۔ اوپر اب ساریاں باتوں کو چھوڑ کے اپنی دوست کے ساتھ چلی جائیں۔ اچھے دل کی لڑکی ہے۔ بڑیاں منتاں کر رہی تھیں بے چاری۔"

"ٹھیک ہے اماں سائیں! جیسے آپ کی مرضی۔"

اس کے فون بند کرنے کی دیر تھی کہ میری "یاہو" کا نعرہ لگاتی ہوئی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"پھر بتاؤ، مان گئیں نا مجھے؟"

"میں تو شروع سے ہی تمہارے ماننے والوں میں سے ہوں۔"

مہربانو ہلکا سا مسکرائی۔

"پتا ہے بعض اوقات ہم خواہ مخواہ ہی خود پر دوسروں سے دو قدم آگے بڑھ کر پابندیاں لگا لیتے ہیں۔ اپنے ہی ہاتھوں سے خود پر زندگی تنگ کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم یہ سب کسی اور کی خوشی حاصل کرنے کے لیے کر رہے ہیں حالانکہ ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اسی دھن میں ہم انتہا کو چھو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ریس میں اول نمبر پر آنے والا امیدوار وننگ ربن کراس کر لینے کے باوجود بھی بھاگتا ہی چلے جائے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس کا یہ بھاگنا اب کسی شمار میں نہیں۔"

"اوئے ہوئے، میری آج تو بڑا فلسفہ سوجھ رہا ہے۔"

کنول نے اندر داخل ہو کر دھلے ہوئے کپڑے ان دونوں اور اپنے سامنے الگ الگ کر کے رکھے اور اسی دوران حیرت سے میری کی بات چیت بھی غور سے سنتی گئی۔

"بس میں چاہ رہی تھی کہ ہماری یہ پیاری سی دوست ابنارمل نہ رہے۔" میری نے ذو معنی انداز سے مہربانو کو دیکھا۔

"ابنارمل؟"

کنول کپڑوں کی تقسیم کے بعد اب اپنے کپڑے تہ کر رہی تھی۔

"تو اور کیا یار! چرچ جانے کا کہا تو منع کر دیا، اس دن آئس کریم پارلر میں اتنا ہینڈسم بندہ جان بوجھ کر اس کے پاس کھڑا رہا، پھر پیچھے کتاب دینے کے بہانے سے آیا بھی مگر یہ محترمہ تو جیسے وہاں موجود ہی نہیں تھیں۔"

میری کی بات پر کنول کھلکھلا کر ہنسی۔

اسی پل مہربانو کو بھی اس لمبے چوڑے نوجوان کا اپنے پاس کھڑا ہونا اور خواہ مخواہ بات کرنے کی کوشش کرنا یاد آیا تو ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی اور اس کا یوں مسکرانا فوراً میری کی نظروں نے پکڑ لیا۔

"اب تو بڑا مسکرا رہی ہو، اس وقت تو یقین مانو ایسا لگ رہا تھا جیسے ہونٹوں پر پپڑی جم گئی ہو، گالوں پر زردیوں کے ڈیرے اور آنکھوں میں وحشت کے سائے۔۔۔ اف اف اف۔۔۔"

میری نے جان بوجھ کر کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی کر دی تھی۔

"اچھا تو تمہارا کیا خیال تھا کہ اسے پکڑ کر قاضی صاحب کے پاس لے جاتی۔" کنول نے میری سے رائے طلب کی۔

"قاضی تک نہ سہی مگر بات چیت تو سہولت سے کر ہی لیتی نا، کیا پتا اسی سے آگے جا کر بات بن جاتی۔"

میری کی بات پر مہربانو کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی اور یہ سچ تھا کہ وہ بندہ پہلی دفعہ میں ہی اس کے دل پر دستک دینے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا مگر اس سے کہیں بڑا سچ یہ تھا کہ وہ اس دل کی چابی اپنے گھر والوں کے حوالے کر آئی تھی۔

"ویسے یار! یہ جو لڑکے ہوتے ہیں نا عجیب مخلوق ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ایسی لڑکیوں کی کوئی ویلیو نہیں ہوتی جو آسانی سے ان کی دسترس میں آ جائیں۔ یہ لوگ ہمیشہ دشوار گزار پہاڑیاں سر کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور پھر ان کی قدر بھی کرتے ہیں۔"

کنول نے اپنی دانست میں مہربانو کی طرف سے جواب دیا تھا۔

"شاباش، یعنی ایک نہ شد دو شد، میں خدانخواستہ تم لوگوں کو ہر ایرے غیرے کے ساتھ فری ہو جانے کو نہیں کہہ رہی، میں تو اسے صرف یہ سمجھا رہی تھی کہ لڑکا اچھا ہے۔ اب اگر کہیں ٹکراؤ ہو تو رسمی سلام دعا میں کوئی حرج نہیں۔۔۔ مگر مجال ہے، جو اس نے مسکرانے کے علاوہ کوئی اور جواب دیا ہو۔

میری کے منہ بسورنے پر اب مہربانو نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

"تم اچھا یہ سب باتیں چھوڑو، اور یہ بتاؤ چرچ کب جانا ہے؟ کنول کو بھی ساتھ لے لیں گے۔ کیا خیال ہے؟"

"ہاں شیور، کیوں نہیں۔"

مہربانو کے موضوع بدلنے پر میری نے بھی اپنا موڈ بدلا تھا۔

"چرچ جانا ہے؟ کیوں خیر تو ہے؟"

کنول کے یوں حیرت کا اظہار کرنے پر میری نے واضح طور پر برا منایا تھا۔

"تم لوگ مسجد جاتے ہو تو کوئی پوچھتا ہے کہ مسجد کیوں جا رہے ہو؟ خیر تو ہے؟"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل آج تک پہلے کبھی تم گئی نہیں نا تو بس اسی لیے پوچھ لیا کہ پہلے تو کبھی ذکر تک نہیں ہوا چرچ جانے کا اور اب ایک دم۔۔۔" کنول نے وضاحت کی۔

"مگر پھر بھی اگر تمہیں برا لگا ہو تو آئی ایم ریئلی سوری۔"

"اٹس او کے، مجھے پتا ہے تم نے کس سوچ سے کہا تھا۔"

"شکر ہے تم سمجھ گئیں، ورنہ میں تو سوچ رہی تھی ایسا نہ ہو مذہب کے نام پر اس کمرے میں بھی سرد جنگ کا آغاز ہو جائے۔" مہربانو نے سکون کا سانس لیتے ہوئے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

"ہاں، ایسا ضرور ہوتا، اگر ہمارے پیچھے بھی کوئی بیرونی ہاتھ ہوتا۔"

میری نے مسکراتے ہوئے بڑی گہری بات کی تھی۔

☆☆☆

امی نے لاکھ چاہا تھا کہ ابھی ندی کو ناصر بھائی کے ارادوں کی بھنک نہ پڑے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ناممکن تھا۔ ان کی طبیعت خرابی کا سن کر ثروت آپا سسرال سے آئی ہوئی تھیں اور ان کے کمرے میں ہی بیٹھی تھیں جب انہوں نے یہ ذکر چھیڑ دیا۔

ورنہ اس سے پہلے تو ندی کے علم میں تھا ہی نہیں کہ امی کو آخر بیٹھے بٹھائے ہوا کیا۔ وہ تو اپنی طرف سے یہی فرض کیے بیٹھی تھی کہ مسلسل ٹینشن کی وجہ سے آخر کار ان کے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔ مگر اب بھید کھلا تو حیرت کے مارے گنگ ہونا تو فطری تھا کہ وہ اس انتہائی قدم کی توقع ہرگز نہیں کر رہی تھی ان سے۔

"امی! ناصر بھائی نے مجھے بھی جلد از جلد ندی کی شادی کے لیے کوئی رشتہ لانے کا کہا ہے۔ لیکن اب ظاہر ہے میں بھی کیا کروں، ابھی تو بات تازی ہے، ابھی ہے بھی لوگوں کے ذہن میں ندی کی تصویریں موجود ہیں اور پھر ادھیڑ عمر، دوسری شادی والے، رنڈوے غرض یہ کہ کتنے ہی لوگوں نے بھی خود مجھے انکار کر دیا ہے۔ صرف یہ کہہ کر اندھی، بہری یا لنگڑی کسی بھی طرح کی عورت سے شادی کرنا تو پھر بھی انہیں منظور ہے مگر ایک اخباری شہرت والی لڑکی کو اپنا ساتھ تو کیا اپنا نام بھی نہیں دے سکتے۔" امی کے بے جان اور فق ہوتے چہرے کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے ثروت آپا خدا جانے کون سی بھڑاس تھی جو ان لفظوں کے ذریعے نکال باہر کرنے پر تلی تھیں۔

"آپا! آپ کہہ کیا رہی ہیں؟ پتا بھی ہے آپ کو؟"

ندی نے خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"وہی تو کہا ہے نا جو حقیقت ہے، اور پھر تم خود سوچو میں بھی سسرال میں ہوں۔ جن لوگوں کو تمہاری اس پھیلی ہوئی اسٹوری کا نہیں بھی پتا ہوتا میرے سسرال والے باتوں باتوں میں خود ہی کچھ ایسی بات کر جاتے ہیں کہ لوگ وہیں پر بات ختم کر کے آگے بڑھنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔"

انہوں نے ہاتھ مسلتے ہوئے اپنی مجبوری ظاہر کی تو ندی زچ ہو گئی۔

"اوہو مگر کیوں کر رہی ہیں آپ یہ سب، جب مجھے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔"

"نہیں کرنی تو پھر کیا کرنا ہے؟"

"مجھے یونیورسٹی جانا ہے آپا! بات سمجھنے کی کوشش کیا کریں۔"

ایک سیدھی سادی بات سمجھانے میں اسے کس قدر پیچیدگی کا سامنا تھا۔ اس امر کا بخوبی اندازا اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب اس کے الفاظ کہیں اس کے حلق میں ہی پھنستے محسوس ہونے لگے تھے۔

امی اس دوران خاموشی اختیار کیے بس قدرت کے بدلے حالات کا مشاہدہ ہی کرتی رہیں۔

"یونیورسٹی جانے کا خیال تو میری بہن اب تم دل سے نکال ہی دو۔" بات سمجھانے کے انداز میں انہوں نے نرم لہجہ اختیار کیا۔

"ناصر بھائی تمہاری جلد از جلد شادی کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے انہوں نے ہر ایک جاننے والے سے تمہارے رشتے کے لیے کہہ رکھا ہے۔"

"اس لیے اتنا لاڈلا رکھا تھا مجھے کہ اب آ کر ساری کسر نکال دیں گے۔" ندی نے تڑپ کر کہا۔

"اب کہاں ہے آپ لوگوں کا پیار، اب بھی تو میں وہی ندی ہوں نا، پھر آپ لوگ سب میرے لیے کیوں بدل گئے ہیں، میرا اعتبار کیوں نہیں رہا آپ لوگوں کو، خدا کے لیے آپا! کم از کم آپ تو انہیں سمجھائیں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔"

ندی بات کرتے کرتے ضبط کی آخری منزل پر تھی۔ باوجود اس کے کہ گلا رندھ گیا تھا مگر پھر بھی آنسو ابھی تک پلکوں پر ہی اٹکے ہوئے تھے۔

"کوئی بھی کیسے یہ بات مان سکتا ہے ندی کہ وہ سب جھوٹ تھا۔ جب تمہاری اور اس لڑکے کی ہوٹلوں میں کھنچی گئی تصویریں، مختلف کیفے ٹیریاز میں اور پکنک پوائنٹس پر انتہائی کلوز ہوتی تصویریں ساری دنیا نے دیکھی ہیں اخباروں میں۔۔۔ تو پھر بتاؤ کوئی کیسے یقین کرے اور بندہ کس کس کو یقین دلائے۔۔۔ میرا تو سر جھک گیا ہے سسرال میں۔"

"میں آج کے بعد کسی کو بھی یقین نہیں دلاؤں گی، میرا انصاف اب خدا کرے گا اور بس ٹھیک ہے میں اس کے ساتھ بے حد بے تکلف تھی مگر صرف اتنی ہی جتنی مجھے معلوم تھا کہ ہمارے گھر میں برا نہیں سمجھا جائے گا۔ اس سے آگے میں نے نہ تو اپنی کوئی بھی حد پھلانگی اور نہ ہی کبھی ایسا سوچا تھا۔"

ثروت آپا نے سرسری انداز میں اسے دیکھا۔

"اگر آج میں اس تمام دور سے گزر رہی ہوں تو بھی آپا مجھ سے کہیں زیادہ ذمہ دار آپ سب ہیں، میں نہیں۔ بچے تو پانی کی مانند ہوتے ہیں۔ ان کے بڑے انہیں جس برتن میں ڈال دیں وہ اسی Shape میں ڈھل جاتے ہیں۔ مجھے شروع ہی سے آپ لوگوں نے جس طرح پالا میں ویسی ہی بن گئی۔ اب۔۔۔ اب آ کر آپ کو وہ سب برا لگنے لگا ہے تو کیوں؟"

"اور امی۔۔۔!"

ثروت سے بات کرتے ہوئے اس نے ایک دم ہی امی کی طرف رخ موڑا اور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے کٹورے، ہتھیلی کی پشت سے مسل ڈالنے کے بعد بولی۔

"آپ ہی تو کہتی تھیں نا کہ خصوصاً بیٹیوں کو پانی کی مانند ہونا چاہیے کہ جس برتن میں ڈالو اسی کی شکل اختیار کر لیں، برف کی طرح نہیں ہونا چاہیے انہیں۔

پھر بتائیں نا امی میری کیا غلطی؟ ناصر بھائی کو آج سے پہلے ان باتوں کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ اب مجھے کیوں سزا دی جا رہی ہے۔"

"ندی! ناصر بھائی جو کر رہے ہیں وہ صرف اور صرف تمہارے بھلے کے لیے کر رہے ہیں اور کچھ غلط بھی نہیں کر رہے۔" ثروت آپا ابھی تک اپنے نقطے پر اڑی تھیں۔

"تم خود سوچو، ان کا تو سارا سارا دن لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے، جانے کیسے کیسے سوالات کا سامنا کرتے ہوں گے اکثر۔۔۔ اور یہ تو امی بھی جانتی ہیں، تم بھی اور میں بھی کہ غیرت کی بات آنے پر تو لوگ قتل تک کر ڈالتے ہیں۔" اتنے سفاک انداز پر امی نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

”تم تو ثروت ایسا نہ کہو اور وہ بھی اپنی گڑیا شہزادیوں جیسی بہن کے لیے۔“

ثروت آپا کی بات پر حقیقی معنوں میں امی کو تکلیف پہنچی تھی۔ حالات کس طرح اور کس نہج پر جارہے تھے اور وقت ریت کی طرح کتنی تیزی سے ان کی مٹھی سے پھسلتا جارہا تھا۔ اس بات کا اندازا اب انہیں بہت اچھی طرح ہوچکا تھا۔

”یہ سب میں صرف اسے اور آپ کو سمجھانے کی نیت سے کہہ رہی ہوں۔ امی۔۔۔! آپ کو تو پتا ہے نا ناصر بھائی کا غصہ کتنا تیز ہے اور اس پر اتنا بڑا واقعہ۔“

”یہ واقعہ آپا اتنا بڑا نہیں تھا جتنا آپ سب نے مجھے تنہا کھڑا کرکے بڑا بنادیا ہے۔“

”اس لیے کہ ہماری آنکھوں میں ابھی کچھ شرم باقی ہے اور دنیا والوں کے سامنے جوابدہ ہیں ہم لوگ۔“

”لیکن ثروت! ایک بات تو بتاؤ۔“

امی کے مخاطب کرنے پر دونوں کی توجہ اب مکمل طور پر ان پر تھی۔

”کبھی دنیا سے سوال جواب کرتے اپنے ضمیر کا بھی کوئی سوال سنا تم نے؟ دیا ہے کوئی جواب اسے بھی؟“

امی کی آواز میں نقاہت بھی تھی اور بات کرتے ہوئے لہجے کی مضبوطی بھی مفقود تھی۔ ندی کا دل چاہا تھا اس لمحے وہ ثروت آپا کو ہاتھ سے پکڑ کر اس کمرے سے باہر نکال دے تاکہ وہ مزید ان کی دل گرفتگی کا باعث نہ بن سکیں اور پھر ان کے گلے لگ کر ڈھیر سارا روئے، اتنا کہ بس پھر حاجت نہ رہے۔

”میں تو اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہ رہی تھی امی! ورنہ نکاح تو اس کا دو دن میں ہو ہی جانا ہے۔۔۔ اور پھر آپ خود سوچیں۔۔۔“ ایک بار کھڑی ہو کر وہ دوبارہ بیٹھ گئی تھیں۔

”اس میں ندی ہی کا بھلا ہے۔ ایک بار شادی ہوگئی تو کسی کی جرأت نہیں ہوگی اس پر انگلیاں اٹھانے کی اور فقرے کسنے کی۔۔۔ ایک مضبوط سائبان مل جائے گا اسے۔“

ثروت آپا ابھی ندی کی شادی کے مزید فوائد گنوانا چاہتی تھیں مگر امی نے ان کی بات کاٹ دی۔

”اور اس سائبان کا کیا؟ جو سر پر ہوتے ہوئے بھی یوں بے دردی سے چھینا جارہا ہے۔ میری معصوم سی پھولوں جیسی بچی کو تم لوگ بے سائبان کررہے ہو، تمہارا دل نہیں کانپتا؟“

امی کی آواز لڑکھڑا گئی تھی۔

”اور پھر تم خود یہ بات سمجھو ثروت اور ناصر کو بھی سمجھاؤ کہ کیا عزت ہوگی اس کی سسرال میں، جہاں تم لوگ اسے یوں چھپتے چھپاتے ایک مجبوری کے سودے کی طرح بھیج رہے ہو۔“

”واہ امی واہ۔۔۔ میں تو مان گئی آپ کو۔“

ان کے طنزیہ انداز پر ندی نے برہمی سے انہیں دیکھا تھا۔

”ندی جو ابھی سسرال کی دہلیز سے بھی شاید میلوں دور کھڑی ہے اس کی عزت کے لیے اتنی فکر اور میں جو بھرے سسرال میں صرف اس کی وجہ سے سر جھکائے رہتی ہوں میرا تو کوئی خیال نہیں آیا نا آپ کو۔“

اب کے وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”سب کی ناک کٹوادی اور اب بھی آپ اسے اپنے سر پر تاج کی طرح سجائے رکھنا چاہتی ہیں تو معاف کیجیے گا مگر اب ایسا ممکن نہیں لگتا۔“

اور تب ندی کو اس بات پر یقین آگیا تھا کہ رشتے خون کے نہیں احساس کے ہوتے ہیں۔ آج اسے اپنے ہی بہن بھائیوں کے سگے ہونے پر شک ہورہا تھا۔ جن میں رشتوں کا احترام تو دور ایک سنی سنائی بات کو سچا یا جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کسی بھی اقدام تک کو ناگوار نہیں کہا گیا تھا۔

جو دیکھا اور جو سنا بس اس کو سچ مان لیا۔ بغیر کسی تحقیق کے بنا اس کا پس منظر جانے، کبھی تو اسے یوں لگتا کہ شاید یہ سب ہوا ہی اسی لیے تھا کہ ان سب کی محبت کے سچے اور وقتی ہونے کا پتا چل پائے، لیکن

کچھ بھی تھا حقیقت تمام تر تلخی اور سختی کے باوجود اس کے سامنے حالات کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی اور اب آخری حد تک جانا ہی ندی کے نزدیک تمام مسائل کا واحد حل تھا۔

☆☆☆

جدا ہوں، دور ہوں، انجان بن جائیں ہم کتنے ہی
ہوائیں دوست ہیں اپنی
ہماری رازداں بھی ہیں
تمہارے ہونٹوں پر کھلی کلی جیسی ہنسی آئے
تو میرے چاروں جانب جلترنگ سی بجنے لگتی ہے
ہوائیں رقص کرنے لگتی ہیں تو یونہی درختوں پر
فضا میں پنچھیوں کے منہ اچانک چوم لیتی ہیں
میں بھی جھوم جاتی ہوں
لب مسکانے لگتے ہیں
تب میں جان لیتی ہوں
ہوائیں رابطے میں ہیں
تمہاری آنکھ کا ساحل جو گیلا ہو
ہوائیں جانے کیوں اک دم نمی سی بڑھنے لگتی ہے
موسم درد بھرنے لگتے ہیں میری نگاہوں میں
ستارے چھپ سے جاتے ہیں بادل کی پناہوں میں
تب میں جان لیتی ہوں
ہوائیں رابطے میں ہیں
تمہاری آنکھ کے آنسو بھی
مجھ تک کھینچ لاتی ہیں
تم بھی جان لو جاناں
کہ ایسے وقت میں اکثر
اکیلے تم نہیں روتے
میری آنکھیں بھی روتی ہیں

شاہ زین آج صبح بھی جب جاگا تو طبیعت بوجھل سی تھی۔ حالانکہ کل رات تک ایسی کوئی پریشانی اس کے ذہن کا احاطہ کیے ہوئے نہیں تھی جس کے باعث دیوں بوجھل ذہن اور بھاری دل کے ساتھ جاگتا۔

دل چاہ رہا تھا کہ آج فیکٹری نہ جائے اور گھر سے نکل کر یونہی بلا ارادہ چلتے ہوئے کسی سرسبز شاداب جگہ پر جا پہنچے اور بس وہیں بیٹھا رہے۔ حالانکہ پہلے وہ جتنا بھی ڈپریس ہوتا بھی اس نے فیکٹری نہ جانے کا نہیں سوچا تھا اور یہی وجہ تھی کہ آج اس کے لیے اس کیفیت کا تدارک کرنا نہایت مشکل معلوم ہورہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی جیسے تیسے فیکٹری گیا اور معمول کے مطابق تمام کام سرانجام دینے کی کوشش بھی کی مگر ہلکے انگوری رنگ کے خوب صورت لباس کو دیکھ کر جو ندی کی طرف دھیان گیا تو اسے لگا کہ شاید آج وہ ندی ہی کی وجہ سے پریشان ہے۔ یوں بھی اس نے ندی کے بارے میں سوچنے کے متعلق خود پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی سو جب چاہتا اسے دیر تک سوچا کرتا۔

مگر آج اس کے اندر ایک عجیب سا احساس تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا نقصان ہونے جارہا ہو، کوئی چیز چھن جانے کا ڈر، کچھ پرایا ہوجانے کا خوف۔۔۔ مگر یہ سب کیوں؟“

سارا دن تو جیسے تیسے گزارا ہی، گھر آیا تو ثمینہ نرمین کے متعلق اسے سب کچھ بتانے پر بے چین نظر آئی۔

”بھائی، مجھے تو لگ رہا تھا جیسے اسے پڑھنے سے کوئی غرض نہیں ہے اور نہ ہی وہ ہمارے گھر پڑھنے آئی ہے۔“

ٹیبل پر کھانا رکھتے ہوئے ثمینہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تو حقیقتاً چند لمحوں کے لیے شاہ زین کا ذہن دن بھر کی اداس کردینے والی کیفیت سے دور ہوتا محسوس ہوا۔

”تو پھر کس لیے آئی تھی؟“

”اللہ جانتا ہے، ہوسکتا ہے مجھ سے دوستی کرنے کی وجہ سے آئی ہو۔“ ثمینہ نے مسکرا کر اماں کو دیکھا۔

”ہاں بیٹا! انداز تو کچھ عجیب سا ضرور تھا۔ اتنی بے تکلف اور اس قدر کھلا ڈلا انداز تھا کہ لگتا تھا وہ ہمارے گھر نہیں آئی بلکہ ہم دونوں اُس کے گھر میں آئے بیٹھے ہیں۔“

”ہوں۔“ شاہ زین نے گہری سانس خارج کی

تھی۔
"رہتی کہاں ہے؟ کچھ اس کی فیملی کے متعلق بھی پوچھا تم نے؟"
"بھئی وہ اس قدر باتونی ہے کہ کسی اور کی سنتی ہی کہاں ہے، اماں تو اپنی نماز وغیرہ میں مصروف ہو گئی تھیں تاکہ میں اسے دھیان سے پڑھا سکوں مگر مجال ہے جو اس نے ایک لفظ بھی پڑھا ہو۔۔۔ کتاب تک نہیں کھولی اس نے۔"
بڑے دلچسپ انداز میں بار بار حیرت کا اظہار کرتی ثمینہ مزے لے لے کر اسے ساری باتیں بتا رہی تھی۔
"دو گھنٹے تک مجھے تو بس بولنے کی ہی آوازیں آتی رہیں۔"
ثمینہ کے انداز میں جھلکتی خوشی محسوس کرتے ہوئے اماں نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔
"ہاں تو اور کیا، وہ تو بس مجھ سے میرے اور آپ دونوں کے متعلق ہی پوچھتی رہی۔ کہہ رہی تھی اسکول کالج میں بھی تو پہلے دن صرف انٹروڈکشن چلتا ہے اور پھر پڑھائی اگلے روز سے شروع ہوتی ہے۔ اس لیے آج کا دن ہم بھی صرف باتیں ہی کریں گے اور پھر پڑھائی اگلے روز سے ہوگی، میں نے کہا ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔" ثمینہ نے کندھے اچکائے اور سالن کا ڈونگا اماں کی طرف بڑھانے کے بعد خالی پلیٹ بھی ان کے سامنے رکھ دی۔
"وہ تو سب ٹھیک ہے مگر دھیان سے ہاں، آج کل کسی کا اعتبار نہیں ہے۔"
"ہاں میں نے بھی اسے یہی سمجھایا ہے۔"
اماں نے شاہ زین کی بات کی تائید کرتے ہوئے پلیٹ اس کے آگے رکھی۔
"ویسے اماں! ایک بات کہوں۔"
"ہاں بولو بیٹا! آج کچھ الجھے الجھے لگ رہے ہو۔"
"میں سوچ رہا تھا کیوں نا کل پرانے گھر کا ایک چکر لگا لیں۔"
"خیر تو ہے نا سب۔"
"ہاں سب خیر تو ہے۔ بس یونہی آج صبح سے دل بہت گھبرا رہا ہے اور پھر کل ابا کی برسی بھی ہے اس لیے میں نے سوچا کہ کچھ وقت اسی جگہ جا کر گزاریں جہاں ہم نے بھی ان کے ساتھ بہت سا وقت بتایا تھا۔"
"اماں بات تو ٹھیک ہے، اور اس طرح ہم ابا کی برسی کا اہتمام بھی اسی گھر میں کر لیں گے اور اس سے بہتر بات اور بھلا کیا ہوگی۔"
"آہ۔۔۔" دونوں کی بات سننے کے بعد اماں نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔
"اتنا سارا وقت ان کے بغیر کیسے گزر گیا۔۔۔ سوچنے بیٹھوں تو دل مانتا ہی نہیں۔" اماں بھی افسردہ ہو گئیں اور ثمینہ کی آنکھیں بھی ضبط غم سے سرخ ہونے لگیں کہ اس نے تو ان کے ساتھ بہت کم وقت گزارا تھا اور ہر ہر موقع پر ان کی کمی کو محسوس کیا تھا۔
یوں بھی جن بچوں کی زندگی باپ کے سائے اور شفقت کے بغیر گزرتی ہے ان کی مثال سردیوں کی چھاؤں میں سکھائے گئے کپڑوں کی سی ہوتی ہے۔ ہر لحاظ سے مکمل اور قابل ہو جانے کے باوجود اپنے ادھورے ہونے اور زندگی میں موجود اس خلا اور کمی کا احساس ہمیشہ رہتا ہی ہے۔ ایسے میں اگر تو خوش قسمتی سے ان کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی ہمدرد کوئی اپنا ہو تو بات بن جاتی ہے بصورتِ دیگر یہ احساس محرومی خود رو جھاڑی کی طرح اندر کہیں خود بہ خود جنم لیتا اور پروان چڑھتا رہتا ہے۔
"چلیں پھر ایسا کرتے ہیں کہ صبح ان شاءاللہ تیار رہیے گا، جلدی نکلیں گے اور دیر تک وہیں رکیں گے، برسی وغیرہ کا اہتمام بھی کریں گے اور کچھ وقت وہاں گزاریں گے بھی۔"
"ٹھیک ہے بھائی ان شاءاللہ۔"
چند لمحے پہلے چہکتی ہوئی ثمینہ اب ایک دم سنجیدہ ہوئی تو ماحول کا بوجھل پن بڑھ گیا۔ خود وہ فیکٹری میں بھی سیریس رہتا مگر گھر آ کر اماں کو مطمئن کرنے کی غرض سے خوش رہنے کی جو اداکاری کرنی پڑتی اس میں بہت زیادہ تھک جاتا، مگر اب تو موضوع ہی ایسا چھڑ گیا تھا کہ سبھی اداس ہو گئے تھے۔
کھانے کی میز سے اٹھ کر وہ تینوں اماں کے کمرے میں آ گئے اور پھر دیر تک ابا کی یادیں اور باتیں ان کے ذہن کے پردے سے ہو کر لفظوں کی صورت فضا میں بکھرنے لگیں۔
☆☆☆
شاہ سائیں کوئی آج پہلی دفعہ تو حویلی نہیں آ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا گھر ہے جب دل چاہتا آ جایا کرتے یا اگر زیادہ دن گزر جاتے تو ملکانی سائیں خود ہی ان کو فون کر کے بلا لیا کرتیں، لیکن ملکانی سائیں کے انداز میں اتنا جوش و خروش تو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ جس طرح وہ آج اتنی پرجوش نظر آ رہی تھیں اور یہی بات کنیزاں سمیت تمام ملازماؤں نے بھی محسوس کرتے ہوئے ایک دوسرے سے دریافت کر کے ٹوہ لگانے کی کوشش تو کی مگر ناکام ہی رہیں۔
یوں بھی کنیزاں جو باقی تمام کی نسبت ملکانی سائیں کے زیادہ قریب ہوا کرتی تھی اس امر سے وہ خود لاعلم تھی تو بھلا دوسروں کو کیا بتاتی۔ اسے تو بس اتنا علم تھا کہ کوئی خاص بات آج حویلی کے در و دیوار کے بیچ موجود ضرور ہے مگر کیا اور کون سی، کس کے متعلق اور کیسے جیسی کوئی خبر اس کے پاس بھی نہیں تھی۔ کھانے میں بھی خصوصی اہتمام تو تھا ہی مگر اس دفعہ ملکانی نے خاص طور پر اپنے بیڈ روم کی ٹک سک بھی درست کروائی تھی۔
یہاں وہاں ان کے قدموں کی رفتار کو اپنا ساتھی سمجھے گھومتی رہنے والی سوئی البتہ خراماں خراماں یوں چل رہی تھی گویا ان کی ہم راز ہو اور سبھی کچھ جانتی ہو۔
منشی زمینوں کے لیے ٹھیکوں کا حساب دینے آیا تو وہ بھی ملکانی سائیں کی خوشی کو بھانپ گیا اور تبھی اس نے جہاندیدہ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے خود اپنی خواہش کا اظہار بھی کرنے کا مناسب وقت اُسی دن کو تصور کرتے ہوئے کھاتوں کے وزن سے لدے رجسٹر بند کیے اور چند لمحے یہاں وہاں دیکھنے کے بعد آخر بولا۔
"ملکانی سائیں! اللہ آپ کو ہمیشہ ہمیشہ سکھی، تندرست اور یونہی خوش باش رکھا کرے، آپ کے دل کی تمام مرادیں پوری کرے، تو سائیں ایک عرض میری بھی ہے اگر۔۔۔ آپ اجازت دیں تو۔۔۔"
"ہاں ہاں، چاچا بول کیا بات ہے؟"
اپنی خوش طبعی برقرار رکھتے ہوئے ملکانی سائیں نے اسی نرم لہجے میں کہا تو منشی کے دل کو بھی سہارا ہوا اور چند لمحوں پہلے در آنے والی جھجک دور ہونے لگی۔
"وہ ملکانی سائیں! اگر آپ کی اجازت ہو تو سائیں، مشرق کی طرف سبزی منڈی کے روڈ کی طرف جاتی زمین میں سے تھوڑی سی زمین کا ٹھیکہ اپنے بیٹے کو دے دوں۔۔۔"
"دے تو چلو تم دو، مگر وہ کیا کرے گا ان کا؟"
ملکانی سائیں کی نیم رضامندی نے منشی کو بے حد حوصلہ دیا۔ جبھی اب بولا تو پہلے سے کہیں زیادہ پرجوش اور بااعتماد تھا۔
"وہ ملکانی سائیں! دراصل اس میں لہسن کاشت کر کے منڈی میں بیچا کرے گا تو اپنے بیوی بچوں کا گزارا بہتر طریقے سے کر پائے گا نا۔"
"چاچا، شادی کب کی اُس کی؟"
"شادی کو تو کچھ برس گزر ہی گئے ہیں بلکہ اب تو اس کا چھوٹا بیٹا بھی اسکول جانے لگا ہے۔"
"اوہ اچھا اچھا، میکوں تے یاد ہی نہیں رہا۔"
مسکراتے ہوئے بات کر کے ملکانی سائیں نے منشی چاچا کو بھی حیرت میں ڈال دیا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ ایک مخصوص فاصلہ ذہن میں رکھتے ہوئے یوں بات کیا کرتیں کہ سامنے والے کو ان کے ذہن میں موجود مخصوص فاصلہ ان کے لہجے، الفاظ اور رویوں میں بھی نظر آیا کرتا۔
مگر ظاہر ہے آج بات کچھ اور تھی۔ آج ان کے دل پر چھایا پانچویں موسم کا رنگ انہیں آنے والے وقت کے خوب صورت اور خوش کن خیال سے ہی

مدہوش کیے دے رہا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس یا اس جیسے کسی بھی غیر فطری قدم کو اٹھانے سے پہلے انہیں شاہ سائیں کی مکمل حمایت، تائید اور سپورٹ چاہیے تھی اور اسی وجہ سے وہ اس دفعہ یوں بے تابی سے شاہ سائیں کی منتظر تھیں۔ ان کا خیال تو اب یہ تھا کہ اس وقت وہ اپنا بہت ٹائم ضائع کر چکی تھیں اور یہ خیال انہیں آج سے پہلے کیوں نہیں آیا مگر بہر حال ہر کام کرنے کے لیے ایک درست وقت کا ہونا ضروری ہوا کرتا ہے اور اب انہیں یقین تھا کہ ان کے لیے درست وقت خوش خبری کا جھنڈا لیے وہ ساری رکاوٹیں توڑتا آن پہنچا ہے جو انہیں اس قسم کی خوشیوں سے روکے رکھتی تھیں۔

☆☆☆

اُس دن اکمل ابھی شام کو جاگنگ کرنے کے لیے پارک میں داخل ہوا ہی تھا کہ ٹراؤزر کی جیب میں رکھے موبائل کی آواز پر متوجہ ہوا۔

دوسری طرف عائشہ تھیں، جس پر اس کا حیران بھی لازمی تھا کیونکہ عائشہ کا اس کو فون کرنا معمولات میں سے نہیں تھا بلکہ وہ خود ہی کبھی کبھار انہیں فون کر کے خیریت معلوم کر لیا کرتا۔ ورنہ ممی سے بات ہوتی رہتی تھی ان کی زبانی پتا چلتا رہتا مگر حیران کے باوجود اس نے اپنی حیرت کو بڑی خوب صورتی سے چھپا کر ان سے بات چیت کا آغاز کیا۔

"واہ جی واہ، کیا بات ہے۔ آج تو خیر سے مجھے فون کیا جا رہا ہے۔۔۔ نمبر غلطی سے تو نہیں مل گیا نا۔"

"تمہیں پتا ہے میرے معاملات میں غلطیوں کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔" اکمل کے چھیڑنے پر عائشہ نے جواب دیا تو وہ مسکرا دیا۔

"یعنی اس وقت تو آپ سپر پاور بنی بیٹھی ہیں۔"

"چھوڑو فضول باتیں نہ کرو، یہ بتاؤ مصروف تو نہیں ہو ابھی۔"

"آپ سے باتیں کرنے میں مصروف ہوں بس۔"

"تم سے ایک بات کرنے کے لیے فون ملایا تھا آج۔"

"ہاں بولیں اتنی تمہید کیوں باندھ رہی ہیں ڈائریکٹ بات کریں، میں دراصل جاگنگ کے لیے آیا تھا اور بالکل فارغ ہوں۔"

ان کا انداز اب اکمل کو کچھ عجیب لگنے لگا تھا جس دل بے چین سا ہونے لگا کہ جانے کون سی بات ہے جس کے لیے خاص طور پر انہیں فون کرنا پڑا۔

"ہم ندی کی شادی کر رہے ہیں۔"

بڑے آرام سے انہوں نے اکمل کی سماعتوں پر گویا بم پھوڑا تھا۔

"ندی کی شادی؟ مگر کس سے؟"

"ظاہر ہے کسی لڑکے سے ہی۔" اب کے وہ مسکرائی تھیں۔

"اوہو مگر کون ہے وہ، جس سے آپ اس کی شادی کرنے جا رہی ہیں۔ وہ راضی ہے؟ آپی ندی کیا کہتی ہے؟"

پہلے کی بات اور تھی مگر اب کے وہ اپنی حیرت قطعی طور پر چھپا نہیں پایا تھا اور نہ ہی وہ ایسا کچھ کرنا چاہتا تھا جبھی جو الفاظ جس تاثر کے ساتھ منہ سے نکلے اس نے بغیر پروا کیے ادا کر دیے۔

"مگر تم اتنے ہونق کیوں ہو رہے ہو؟"

"آپی! دیکھیں اگر تو آپ نے مجھے فون کر ہی لیا ہے تو پلیز جس مقصد سے کیا ہے اسے واضح کریں اور اس طرح پہیلیاں بوجھنے میں ٹائم ضائع نہ کریں۔"

"ابھی تو تم کہہ رہے تھے فارغ ہو، اب تمہارا ٹائم ضائع ہونے لگا ہے۔"

آج انہیں اکمل کو چھیڑنے میں مزا آ رہا تھا جبکہ بس یونہی تنگ کیے گئیں اور یہی بات محسوس کرتے ہوئے اکمل نے بھی اپنا انداز بدلا۔

"مرضی ہے آپ کی، نہیں بات کرنی تو ٹھیک ہے اس نیوز کو ہیڈ لائن میں ہی بنا رہنے دیں۔"

"اچھا بابا، بتاتی ہوں۔"

اب وہ باقاعدہ سنجیدہ ہوئی تھیں۔

"دراصل ہم آج کل ندی کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ مگر فی الحال تو جہاں رشتے کی بات چلتی ہے لوگ یہ جاننے کے بعد کہ یہ وہی لڑکی ہے جو پچھلے دنوں اخباروں کی زینت بنی رہی، دوبارہ رابطہ ہی نہیں کرتے۔"

"کیوں۔۔۔" اکمل نے کچھ سوچتے ہوئے گہری سانس خارج کی تھی۔

"لیکن آپ تو کہہ رہی تھیں کہ شادی کر رہی ہیں ہی کی، اور اب کہہ رہی ہیں کہ ابھی کوئی رشتہ ہی نہیں مل رہا۔"

"دونوں باتیں ہی سچی ہیں کیونکہ دو تین دن میں ہی اس کی رخصتی ہو جائے گی، یہ بات خود ناصر نے مجھ سے کہی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے ثروت آپا کو بھی واپس سسرال جانے سے روک لیا ہے تاکہ وہ بھی اس وقت گھر میں موجود رہیں۔"

"آپ کی باتیں کم از کم میرے تو سر پر سے گزر رہی ہیں۔ رشتہ ملا نہیں اور تین دن میں رخصتی کر رہی ہیں۔"

ان کی باتوں سے اکمل اب بری طرح جھنجھلا چکا تھا۔

"رشتہ آج شام تک فائنل ہو جائے گا کیونکہ صبح ناصر بہت پر امید تھے اور کہہ رہے تھے کہ شام تک کام ہو جائے گا۔"

"آپی آپ کی اور ناصر بھائی کی منطق کم از کم میری سمجھ سے تو باہر ہے۔ ایک چھوٹی سی غلطی کی سزا اتنی بڑی دے رہے ہیں کہ گھر کی بنیادیں تک ہلا دی ہیں آپ دونوں نے۔"

"تم خوامخواہ اس کی طرف داری کر رہے ہو اور خود مان بھی رہے ہو کہ اس سے غلطی ہوئی۔"

"یہ غلطی میں نے آپ کے مطابق کہا ہے۔ ورنہ میرے نزدیک وہ قطعاً قصوروار نہیں ہے اور آپی آپ یہ بات یاد رکھیں کہ کسی پر بے جا ظلم و زیادتی کا بدلہ بہت گھناؤنا ہوا کرتا ہے۔"

"میں نے تم سے کوئی لیکچر لینے کے لیے فون نہیں کیا بلکہ تمہیں یہ خبر دینے کے لیے فون کیا تھا کہ پھر یہ نہ کہو کہ آپی مجھے بتانا تو تھا۔"

عائشہ اس کی تلخ بات کو برداشت نہیں کر پاتی تھیں جبھی لہجہ سخت ہو گیا۔

"اچھا آپی! اگر آپ یہ غصہ کرنے کا شوق دو منٹ کے لیے ختم کریں تو ایک بات کہوں؟"

"ہاں بولو۔"

اکمل کے کہنے پر وہ چند لمحوں میں کول ڈاؤن ہو گئیں ــــ کہ آخر کو ان کا بھائی تھا اور وہ بھی لاڈلا۔۔۔

"آپ خوامخواہ ندی کے لیے رشتہ ڈھونڈنے میں اتنی ہلکان ہو رہی ہیں اور پھر جس کسی کے ساتھ آپ اس بے چاری کی ان حالات میں شادی کریں گی، کیا خیال ہے کہ وہ اسے خوش رکھے گا؟ ہرگز نہیں آپی بلکہ وہ تو میرا خیال ہے کسی زرخرید غلام سے بھی بدتر سلوک کرے گا اس کے ساتھ۔"

"یہ سب تو اس کی اپنی قسمت ہے نا چھوٹے بھائی، تم پریشان نہ ہو۔"

اکمل کی اس قدر فکر محسوس کر کے انہوں نے سر جھٹکا۔

"اور ویسے بھی آگے جا کر اس کی زندگی کیسی ہو گی یہ تو اس کا اپنا نصیب ہے اور تم خود جانتے ہو کہ نصیب بدلا نہیں جا سکتا۔"

"یہ آپ کہہ رہی ہیں مگر میرا تو ماننا یہ ہی ہے کہ اپنا نصیب اور قسمت ہم خود اپنے اعمال سے بناتے ہیں۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ جب کوئی اعلا اور بہترین قسمت کا حامل قرار پاتا ہے تو وہ اسے اپنی کامیابی اور انتھک محنت گردانتا ہے اور اگر کسی طور حالات کی گردش کی زد میں آ جائے تو پھر بُرے واقعے، اور اپنی ہر ناکامی کی ذمہ داری (نعوذ باللہ) خدا پر ڈال کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں کہ اللہ نے تو ہماری قسمت ہی ایسی لکھی تھی اور ہمارا تو نصیب ہی خراب تھا۔"

جاگنگ ٹریک پر دھیرے دھیرے چلتا اکمل اب نصب کی گئی سنگی بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔

"اگر ایسا ہے تب بھی مان لو کہ اس نے اپنے ہی اعمال سے نہ صرف اپنی قسمت خراب کی ہے بلکہ دوسروں کے نصیب میں بھی کئی پریشانیاں اور رسوائیاں ڈال دی ہیں۔" وہ بھی عائشہ تھیں بھلا کیسے ہار مان جاتیں۔

"اللہ کے خوف سے ڈریں آپی! جب اس کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آگئی تو۔۔۔ کبھی سوچا ہے آپ نے کہ اگر اس کے اذیت میں گزرے ہوئے ایک ایک پل کا آپ کو سود سمیت حساب لوٹانا پڑا تو کیا کریں گی۔"

"تم فوج میں بھرتی ہوئے ہو یا کسی مدرسے میں؟"

بات کو ختم کرنے کے انداز میں انہوں نے لہجے میں مسکراہٹ سموئی مگر وہ اکمل کا موڈ بحال نہ کرسکی۔

"آپی! مختصراً مجھے یہی کہنا ہے کہ وقت کا پہیہ مسلسل حرکت میں رہتا ہے۔ آج جو لوگ اس پہیے کے نیچے والی سائیڈ پر ہیں تا کل وہی اوپر ہوں گے۔ اس لیے آج جب آپ کو قدرت نے اوپر والی جگہ پر بٹھایا ہے تو نیچے والوں کا ہاتھ تھام لیں تاکہ کل جب پہیے کے گھومنے سے آپ ان کی جگہ پر ہوں تو آپ بھی ان سے کوئی اچھی امید رکھ سکیں۔"

"اچھا اچھا سن لیا۔ بہت ہو گیا تمہارا لیکچر۔ چلو اٹھ کر اب جاگنگ شروع کرو۔" عائشہ کی بات کے جواب میں کچھ بھی کہے بغیر چند لمحے کے لیے دونوں طرف خاموشی چھا گئی تھی۔

"اکمل۔۔۔! کیا ہوا؟ کہاں ہو؟"

"آپی! آپ کو ندی کے لیے کوئی رشتہ ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

کچھ لمحے سوچنے کے بعد جب وہ بولا تو لہجے کی مضبوطی اس کے لفظوں کو مزید طاقت بخش رہی تھی اور اسی وجہ سے عائشہ کا چونکنا بھی لازم ٹھہرا تھا۔

"نہیں ہے کا کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ میں کروں گا ندی سے شادی۔"

"تم۔۔۔؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔"

اس دفعہ حالت متضاد تھی کہ عائشہ کی سماعتوں پر ضرب اکمل کے الفاظ سے لگی تھی اور ان کی حیرانی اکمل کی حیرت سے کئی گنا زیادہ بھی تھی۔

"بالکل بھی نہیں۔۔۔ میں جو بھی کہہ رہا ہوں مکمل طور پر ہوش و حواس میں رہتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔"

"اپنی جاب پر دھیان دو اکمل، اور فضول میں خدا ترسی کی عادت چھوڑ دو۔۔۔ اور پھر دیکھو وہ وقت اور تھا جب خود میں نے تم سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مگر اب حالات قدرے مختلف ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور تم سب کچھ جانتے بھی ہو اور۔۔۔ اور پھر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی۔۔۔" حیرت کے مارے عائشہ کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

یہ سب اس انداز میں ہونا تو ظاہر ہے انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ جبھی ایک دم ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کن لفظوں کا سہارا لے کر اکمل کو روک لیں۔

"جی آپی! یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں ندی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ اور اس سلسلے میں آپ جس سے بھی کہیں میں بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔۔۔ یہاں تک کہ ناصر بھائی سے بھی۔"

وہ جانتا تھا کہ اب عائشہ جذباتی ہو جائیں گی اسے یہاں وہاں کی باتیں کر کے سمجھائیں گی، مثالیں ـــــ مختلف حوالے دیں گی مگر اس نے جو سوچا تھا وہ اسے اب کرنا ہی تھا، اسی لیے اس نے بات کرتے ہی فون بھی بند کر دیا۔

☆☆☆

میران کی زندگی یونیورسٹی سے نکالے جانے کے بعد سے ابھی تک باقاعدہ طور پر کسی ڈھب پر نہیں آسکی تھی۔ نہ کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں گھومنے نکل جاتا تو کبھی شہر والے فلیٹ پر ہی سب دوستوں کو جمع کر کے وقت گزاری کا سامان کیا جاتا۔ یوں بھی یہ فلیٹ شاہ سائیں نے اسے یونیورسٹی میں داخل ہونے کے بعد ہی لے کر دیا تھا جس کا مقصد بھی یہی تھا کہ اگر وہ دوستوں کے ساتھ مل کر پڑھائی کرنا چاہے تو گاؤں آنے کے بجائے سہولت سے سب کو یہیں مدعو کر سکے۔

اس کی غیر موجودگی میں وہاں ایک ملازم رکھ چھوڑا تھا۔ جو نہ صرف صفائی ستھرائی اور باقی گھریلو امور کا خیال رکھتا بلکہ میران اور اس کے دوستوں کے جانے پر خانساماں کے فرائض بھی نبھاتا۔ اپنے بچوں کو اعلا تعلیم دلانا شاہ سائیں کا خواب تھا جو میران کی شکل میں پورا ہونے کا یقین تو انہیں اول روز سے نہیں تھا اسی لیے انہوں نے میران کی ہزار مخالفت اور ملکانی سائیں کے تمام خدشات کو رد کرتے ہوئے مہربانو کو اس منزل پر رواں دواں رکھا ہوا تھا۔

اور اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود پڑھے لکھے تو ضرور کہلائے جاتے تھے مگر پھر بھی ہائی کوالیفائیڈ نہ تھے۔ جس بات کا اظہار وہ بعض اوقات اپنے بچوں کے سامنے بھی کیا کرتے اور جب انہوں نے دیکھا کہ مہربانو کا رجحان تعلیم کی طرف ہے تو پھر اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ روایت، منصب اور ماضی کی تمام اقدار جو اس کی تعلیم کی راہ میں رکاوٹ بنیں گی وہ انہیں ہٹاتے جائیں گے۔

ایف ایس سی تک تو مہربانو پڑھتی رہی نہ کوئی شور ہوا نہ غوغا۔

لیکن جیسے ہی سب کو پتا چلا کہ شاہ سائیں نے اسے صرف پڑھائی کی غرض سے نہ صرف اتنی دور بلکہ ہاسٹل میں رہنے کی بھی اجازت دے ڈالی ہے تو جس نے سنا دانتوں تلے انگلیاں دباتے ہوئے انہیں اس عمل سے باز رہنے اور نتائج کے بعض اوقات امیدوں کے برعکس بھیانک ہونے کی طرف بھی توجہ دلائی مگر اس معاملے میں انہوں نے کسی کی بھی نہیں سنی تھی۔ سو جس نے کہا اسے ایک ہی جواب دیا۔

"تم لوگ مجھے جو مثالیں دیتے ہو وہ کسی اور کی ہوں گی مگر مہربانو میرا خون ہے، میری بیٹی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی میرا سر نیچا نہیں کرے گی۔"

سننے والے قدامت پسند ذہن کے حامل لوگوں نے شاہ سائیں کی تمام باتوں کو محض دیوانے کا خواب قرار دے کر لڑکی کی ذات پر اس قدر بھروسے اور اعتماد کو ان کی بڑی غلطی قرار دیا اور خاموش ہو گئے مگر در پردہ ہر وقت ان کی سماعتیں کسی ایسی بات سننے کی منتظر ضرور رہتیں جس کے بعد وہ جا کر شاہ سائیں کو کہہ سکتے تھے کہ "کاش تم نے ہماری بات مانی ہوتی۔"

میران کے متعلق البتہ کئی باتیں ایسی سننے میں آئیں مگر ان کے نزدیک یہی تو مرد کی اصل شان ہوتی ہے کہ وہ چادر لپیٹ کر گھر میں بیٹھا نہ رہے اور باہر نکل کر اپنی زندگی کو بہترین طریقے سے گزارے۔

مرد اور عورت کی تفریق ان کے چاروں اطراف بڑی شدت سے موجود تھی۔ ہر وہ بات جو مرد کے لیے قابل گرفت نہ تھی بعض اوقات اسی بات پر عورت کو اگر دیوار میں چنوانے کا اختیار ان کے پاس ہوتا تو شاید وہ لوگ کم نہ کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ میران کی ذات میں اپنے آپ کو دوسروں سے اعلا اور برتر خیال کرنے کے جراثیم اس قدر طاقت ور تھے کہ وہ یہ تصور نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کوئی اس بارے میں سوچے بھی۔

اس روز بھی وہ اپنی جیپ میں تیز آواز کے میوزک کے ساتھ اپنے علاقے کی حدود میں داخل ہوا ہی تھا کہ سامنے منشی چاچا کو زمینیں ناپتے دیکھ کر چونک گیا۔ شیشہ نیچے کر کے آواز لگائی تو منشی چاچا دونوں ہاتھ باندھے اس کے سامنے آن حاضر ہوئے۔

"سلام چھوٹے سائیں!"

"یہ کیا کر رہے ہو چاچا زمینوں میں؟"

"وہ سائیں! ملکانی سائیں کی اجازت سے اپنے بیٹے کو زمین کا ایک ٹکڑا دینے کے لیے ان کے بتائے گئے حجم کی پیمائش کر رہا تھا۔"

"زمین کا ایک ٹکڑا؟ تمہارے بیٹے کو؟ لیکن کس خوشی میں؟"

ناگواری سے پیشانی پہ جا بجا لکیریں ابھری تھیں۔ کالے شیشوں کی عینک کے پیچھے سکڑتی

نہیں البتہ منشی چاچا سے او جھل ضرور تھیں مگر وہ انہی کے سامنے پلا بڑھا تھا اور وہ جانتے تھے کہ ان آنکھوں میں اس وقت کس قدر چبھن شروع ہو چکی ہو گی۔

"دراصل سائیں! زمین کا ٹکڑا اُس کے نام نہیں کرنا ہے سائیں بس وقتی طور پر کاشت کے لیے دینا ہے۔"

"وہ سب مجھے سمجھ آرہا ہے چاچا! لیکن کیوں دینا ہے؟ میں یہ پوچھ رہا ہوں۔"

"اُس کا ذرا آج کل ہاتھ تنگ ہے سائیں! کہہ رہا تھا اگر تو تھوڑی سی زمین مل جائے تو اس میں سبزی وغیرہ لگا کر گزر بسر میں آسانی ہو جائے گی۔ اب تو سائیں اس کا بیٹا بھی اسکول جاتا ہے نا، تو ذرا فکر کرنے لگا ہے سائیں۔"

"ایسا کرو تم زمین کو چھوڑو اور یہ پیسے رکھو اپنے پاس۔ دے دینا اپنے بیٹے کو۔"

"لیکن سائیں۔۔۔ وہ۔۔"

"تم جیسے لوگوں کو زمین کی قدر نہیں ہوتی چاچا! اور تمہیں پتا ہے نا کہ زمین کی بے قدری مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ کل کلاں کو میں نے اسے کچھ کہہ دیا تو پھر روتا رہے گا۔ بہتر ہے کہ یہ روپے دے کر اس کی مدد کر دینا اور بس۔"

ہزار ہزار کے دو تین نوٹ نکال کر میران نے منشی چاچا کے حوالے کیے تو وہ بہت کچھ منہ میں آنے کے باوجود محض زبان کی نوک سے ہی واپس لے گئے۔

کیونکہ میران کے ساتھ کسی بھی معاملے میں بحث کرنے کا صاف مطلب اپنی ہی بدبختی کو دعوت دینا تھا۔

حالانکہ وہ جس جوش اور ولولے کے ساتھ زمین ناپ رہے تھے اس نے انہیں پھر سے نوجوان بنا ڈالا تھا۔ سوچ رہے تھے کہ اب ان کا بیٹا اس میں لہسن وغیرہ اگائے گا۔ جب شہر جا کر بیچا کرے گا تو خود کفیل ہو جائے گا اور زندگی کے دن بہترین انداز میں گزار پائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا اور میران کی نظر پڑ گئی۔ اور میران بھی وہ جسے حقیقی معنوں میں اپنی زمینوں کی مکمل تفصیل تک سے آگہی نہیں تھی۔ ایسے میں اگر آج وہ نہ دیکھتا تو کئی برسوں تک بھی اسے بھنک نہ پڑتی۔

مگر شاید اس زمین کی روزی منشی چاچا کے بیٹے کے رزق میں نہیں لکھی گئی تھی جبھی وہیں کھڑے کھڑے اپنے ساتھ آنے والے پٹواری کو اشارہ کر کے واپس چلنے کا کہا تو میران نے بھی دوبارہ شیشہ اوپر کر کے "ہونہہ" کے انداز میں سر جھٹکا اور ملکانی سائیں کی "دریا دلی" کا حساب لینے کو اپنی ترجیح قرار دیتے ہوئے حویلی کے اندر داخل ہوا تو شاہ سائیں کو بھی وہیں موجود پایا۔

"بابا سائیں! آپ کب آئے؟"

"دو تین گھنٹے ہوئے ہیں، مگر تم کہاں رہ گئے تھے؟ ابھی ابھی کھانا ختم کیا ہے۔ جلدی آجاتے تو اکٹھے کھانا کھا لیتے۔"

"آتو جاتا لیکن بابا سائیں! رستے میں منشی چاچا زمینوں کی پیمائش کرتے ہوئے نظر آئے تو وہیں رک گیا۔"

"زمینوں کی پیمائش؟"

شاہ سائیں نے ناسمجھی کے انداز میں سوال کیا۔

مگر میران نے انہیں براہِ راست جواب دینے کے بجائے سامنے بیٹھی ملکانی سائیں کو مخاطب کیا۔

"اماں سائیں! کیا ضرورت تھی انہیں زمین کے ٹکڑے پر کاشت کی اجازت دینے کی؟ اس طرح تو یہ لوگ خود ہمارے سامنے آ کھڑے ہوں گے۔ بچہ تو خیر سے ابھی سے اسکول جاتا ہے۔ کل کو شہر والے اسکول میں داخل کروائے گا تو اس کی تو اپنی آنکھیں کھل جائیں گی۔"

"بیٹا پریشان تھا بے چارہ تے میکوں ترس آگیا۔"

"میں نے اسے زمین استعمال کرنے سے روک دیا ہے۔"

میران نے اطلاع دی تو ملکانی سائیں چونک گئیں۔

"پر میرا پتر! میں نے اسے زبان دی تھی۔"

"ارے اماں سائیں! پریشان نہ ہوں، عورتوں کی دی ہوئی زبان سبزی کے اتارے ہوئے چھلکوں کی طرح کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔"

شاہ سائیں چپ چاپ دونوں ماں بیٹے کی بات چیت سن رہے تھے۔

"آئندہ کسی پر ترس آئے تو روپے پیسے دے کر ان کی امداد کر دیا کریں کیونکہ جب تک یہ ہم سے امداد لیں گے ہمارے محکوم رہیں گے۔ خود کفیل ہوئے نا تو پھر ہمارے ہی سامنے کھڑے ہو کر ہمیں ہی آنکھیں دکھائیں گے۔"

میران نے خالصتاً کسی کاروباری شخص کی طرح نفع اور نقصان بیان کرتے ہوئے اُن کے سامنے سودے کے اصول واضح کیے تھے۔ جنہیں سننے کے بعد ملکانی سائیں کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب واقعی ایک سمجھ دار مرد کے روپ میں ڈھل چکا ہے۔

"میکوں پہلے ہی پتا تھا کہ میرا بیٹا اتنا عقلمند ہو گیا ہے۔ اسی لیے تو آج شاہ سائیں کو خاص طور پر بلایا ہے۔"

ملکانی سائیں مسکرائیں مگر میران اُن کی بات پر توجہ دیے بغیر شاہ سائیں سے ملکی سیاست کے امور ڈسکس کرنے لگا۔ جس سے شاہ سائیں کو بھی لگا کہ وہ اب واقعی زندگی کو سنجیدگی سے سمجھنے لگا ہے اور یہ بات جہاں ان کے لیے تقویت کا باعث تھی وہیں ایک انجانا سا دھڑکا بھی تھا۔ جس کے تحت وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ زندگی کو سنجیدگی سے یوں سمجھنے لگے کہ پھر زندگی اس پر اپنا آپ عیاں کر دے۔ اُس دن اس لمحے سے اجتناب برتنا ان کی مجبوری ہی تو تھی۔

اس لیے وہ میران کو اس کی ایکٹیویٹیز میں مگن ہی رہنے دیتے۔ زندگی کی حقیقت میران کے لیے تلخ ہو سکتی ہے یہ بات اس کے علم میں بخوبی تھی مگر وہ بھی کبوتر کی طرح جب تک ممکن ہوتا اپنی آنکھیں بند رکھنا چاہتا تھا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ جو ذہن اول روز سے جانتا ہو دل اسے قبول کرنے میں برسوں لگا دیتا ہے اور یہی کچھ میران کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔

☆☆☆

کٹھن ہے زندگی کتنی
سفر دشوار کتنا ہے
کبھی پاؤں نہیں چلتے
کبھی رستہ نہیں ملتا
ہمارا ساتھ دے پائے
کوئی ایسا نہیں ملتا
فقط ایسے گزاروں تو
یہ روز و شب نہیں کٹتے
ہماری جان نکلتی ہے
مجھے پھر بھی میرے مالک
کوئی شکوہ نہیں تجھ سے
میں جاں پہ کھیل سکتا ہوں
میں ہر دکھ جھیل سکتا ہوں
اگر تو آج ہی کر دے
محبت ہمسفر میری

امی کے مشورے کے بعد اس نے ثروت آپا کا موبائل لے کر شاہ زین سے بات کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اسی مقصد کے لیے وہ ان کو اکیلا دیکھ کر اس وقت کچن میں چلی آئی جب عائشہ بھابھی فون پر کسی سے بات چیت میں مصروف تھیں۔

ثروت آپا اپنے بیٹے کے لیے کسٹرڈ بنا رہی تھیں اور ان کا فون اوون کے اوپر رکھا تھا۔

"آپا۔۔۔!" ندی نے پیچھے کھڑے ہو کر انہیں پکارا تو وہ بے طرح چونک گئیں کیونکہ اب ندی بہت کم یوں گھر میں اِدھر اُدھر نظر آتی۔ زیادہ تر وقت اس کا امی کے ساتھ ہی گزرا کرتا تھا۔

"تم۔۔۔؟ ہاں بولو ندی! کیا بات ہے؟"

"مجھے آپ کا موبائل چاہیے، اگر آپ دینا چاہیں تو۔۔۔"

ہزار نا چاہنے کے باوجود بھی آخر اُسے ثروت آپا سے درخواست کرنی ہی پڑی تھی کیونکہ اب اس کے سوا

کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔
"موبائل۔۔۔؟ لیکن کرنا کیا ہے تم نے؟"
چند لمحے سوچنے کے بعد سامنے رکھا موبائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے انہوں نے سوال کیا مگر ندی نے جواب دینا ضروری خیال نہ کرتے ہوئے تھینکس کہہ کر واپسی کی طرف قدم بڑھائے تو ایک مرتبہ پھر وہ بولیں۔
"تمہارے پاس محض دو تین دن ہیں ندی! میں تو کہتی ہوں ناصر بھائی کو راضی کر لو، کسی طرح اُن سے معافی مانگ لو، دراصل یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ بعض اوقات انسان سے غلطی یا غلطی پر غلطی ہوتی ہی چلی جاتی ہے جو کہ تم سے بھی ہوئی۔۔۔ اس لیے میری مانو تو اس گھر سے رخصت ہونے سے پہلے ہاتھ جوڑ کر بھی ناصر بھائی کو راضی کرنا پڑے تو کر لو۔"
اپنی دانست میں وہ بہت دانشمندانہ مشورہ دے رہی تھیں مگر شاید انہیں یہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت یہ بات کرتے ہوئے مکمل طور پر جانبداری کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ ویسے بھی تعلقات میں بگاڑ بھی پیدا ہوتا ہے جب رشتوں میں توازن نہ رہے اور آج ثروت آپا کے الفاظ بھی اُن کے جانبدار ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔
ندی نے درزدیدہ نظروں سے انہیں دیکھا جو اپنے تئیں اس سے ہمدردی جتا رہی تھیں جبکہ درحقیقت وہ اس فعل میں مکمل طور پر ناکام نظر آ رہی تھیں۔
"ایک دو جگہ سے ناصر بھائی کو مثبت جواب ملا ہے، اُن میں سے کسی کو بھی کل فائنل کر دینے کے بعد پرسوں نکاح کے لیے بلا لیا جائے گا۔"
شاید وہ ابھی مزید باتیں کرتی رہتیں مگر ندی کا دل نہ صرف ان کی باتوں بلکہ خود اُن سے بھی دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ جبھی بوجھل دل سے وہاں سے نکل کر دوبارہ کمرے کی طرف بڑھی تو ابھی تک عائشہ بھابھی کو فون پر ہی مصروف پایا۔
پورے گھر میں اگر کوئی اس کے لیے حقیقی معنوں میں متفکر تھا تو وہ صرف امی ہی تھیں اور وہ صرف امی بابا ہی تھے جنہوں نے اس سے کچھ بھی پوچھے بغیر اس کی حمایت کرتے ہوئے ناصر بھائی، عائشہ بھابھی اور ثروت آپا کے سامنے اس کا دفاع کیا تھا۔
ابھی بھی وہ موبائل ہاتھ میں لیے کمرے میں داخل ہوئی تو انہیں بڑی پریشانی میں ٹہلتے ہوئے پایا کیونکہ اُن کے سامنے ایک آپشن یہ بھی تھا کہ شاید ندی کو فون دینے سے معذرت کرے، مگر ایسا نہ ہوا اس لیے کمرے میں آئی ندی کے ہاتھ میں فون دیکھ کر اُن کی جان میں جان آئی اور سکون کا سانس لیتے ہوئے وہیں بیڈ کی پائنتی پر ٹک گئیں۔
حالات کے پے در پے وار نے ان کی ٹانگوں سے وہ توانائی چھین لی تھی جو انہیں توانا رکھتی تھی۔
"میرے بیٹے میری جان میری شہزادی۔۔۔!"
ندی ان کے قریب آ کر بیٹھی تو فرطِ جذبات سے انہوں نے اسے لگا لیا۔
"رات کو ناصر سے بات کرنے کے بعد مجھے اندازا ہو گیا ہے کہ وہ اب اس فیصلے سے کسی طور پیچھے نہیں ہٹے گا اور میں نہیں جانتی کہ وہ کیسے لوگوں میں تمہیں وداع کرے۔" خود سے الگ کر کے انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔
"میں چاہتی ہوں کہ کسی بھی طریقے سے تم شاہ زین سے بات کرو، اسے ساری صورت حال بتاؤ۔ کیونکہ اس کے علاوہ اب اور کوئی راہ کم از کم مجھے تو سجھائی نہیں دے رہی۔" امی کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ وہ اپنی شہزادی کو حالات کے جادوگر سے بچا لینا چاہتی تھیں اور اس لیے اپنی طبیعت کی ناسازی کو پسِ پشت ڈال کر وہ کچھ بھی کر لینے کو تیار ہو گئی تھیں۔
پہلی کوشش کے طور پر رات کو ناصر بھائی سے التجائیہ انداز میں درخواست بھی کی مگر انہوں نے بغیر کوئی بدتمیزی کیے سرد لہجے میں ان کی ہر درخواست رد کر دی۔ جواز تھا تو یہ کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہیں اور اب وہ ندی کو جو اس تمام جگ

ہنسائی کا باعث بنی مزید اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتے اور اس کا واحد حل یہی ہے کہ اس کی شادی کر دی جائے۔

ان کے صاف انکار کے بعد تمام رات امی نے آنکھوں میں گزاری تھی اور پھر بالآخر ثروت آپا سے موبائل لے کر شاہ زین سے ندی کو بات کرنے کو کہا کہ شاید کوئی بہتری کی صورت نکل سکے۔

مگر مسئلہ تھا تو یہ کہ اس کا نمبر موبائل میں ایڈ تھا۔ آج سے چند سال پہلے تک جب لینڈ لائن فون ہی استعمال ہوا کرتے تھے تب ڈائریز میں نمبر لکھے جاتے اور مخصوص نمبرز خود بخود ذہن نشین بھی ہو جایا کرتے۔ مگر اب موبائل میں صرف نام پر کلک کرنے سے رابطہ ہو جانے کی وجہ سے شاذ ہی کسی کو نمبر یاد ہوتا بلکہ اکثر اوقات تو اپنا نمبر بھی لوگ موبائل سے دیکھ کر ہی بتایا کرتے۔ ایسے میں شاہ زین کا نمبر تو کیا کسی کا بھی نمبر اُس کے ذہن میں نہیں تھا۔

مگر اس کا حل یہ نکالا گیا کہ یونیورسٹی لے جائی جانے والی کتابیں، نوٹس اور نوٹ بکس کے ایک ایک صفحے کو دیکھا گیا اور بالآخر پبلک ریلیشنز کے نوٹس کے کونے میں ایک نمبر کے ساتھ شاہ زین کا نام لکھا نظر آیا تو اسے محسوس ہوا جیسے صحرا میں تپتی دھوپ اور جھلستی ریت پر سفر کرنے والے مسافر کو پانی کے ٹھنڈے، میٹھے چشمے کا سراغ مل گیا ہو۔

ندی اور خود امی نے اپنے اندر ایک نئی توانائی اور خون میں ایک عجب حرارت محسوس کی تھی۔

ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اب سفر کچھ لمحوں کا ہی باقی ہے اور منزل سامنے موجود ہے۔

"ندی! تمہارا کیا خیال ہے، ان حالات میں کیا وہ تم سے دو دن کے اندر اندر شادی کرنے پر رضامند ہو جائے گا۔"

آس نراس کی عجیب سی کیفیت میں معلق امی کے سوال پر ندی کچھ بھی کہہ نہیں پائی تھی۔

"اچھا تم وقت ضائع نہ کرو، اُس کا فون نمبر ملاؤ میں اس سے اور اس کی والدہ سے خود بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"امی۔۔۔!" ندی ایک بار پھر کسی ننھی بچی کی طرح اُن کے سینے سے جا لگی تھی مگر چاہنے کے باوجود رونے پر کمال کا ضبط قائم رکھا ورنہ دل تو اس وقت دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔

امی نے اس کے نرم اور چمکیلے بالوں پر بوسہ دیتے ہوئے خود سے الگ کیا۔

"میری بچی یہ دو تین دن تمہاری زندگی کے لیے بہت اہم ہیں۔ ناصر کے ارادے مضبوط اور وہ اپنے فیصلے پر مکمل قائم ہے مگر۔۔۔ مگر میں نہیں چاہتی کہ تمہیں ناکردہ گناہوں کی سزا ملے۔"

"امی اگر آپ نہ ہوتیں تو شاید اب تک تو میں مر ہی جاتی۔"

آنسوؤں کو اپنے اندر اتارتے ہوئے ندی نے کہا تو چند آنسو بغاوت کر کے آنکھوں میں ڈھلکنے لگے۔

"ندی۔۔۔!"

امی نے ایک جھٹکے سے اس کے آنسو اپنی لکیروں بھری ہتھیلی سے خشک کیے اور خود اپنے آنسوؤں کو سختی سے آنکھوں کی دہلیز پر جمائے رکھا۔

"یاد ہے نا تمہارے بابا کیا کہتے تھے؟"

انہوں نے اپنے ناتواں چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائی تھی۔

"وہ کہتے تھے نا کہ تمہاری آنکھیں کانچ سی ہیں ایسی جیسے شیشہ اور شیشہ اگر دھندلا ہو تو کتنا برا لگتا ہے۔"

ندی نے بھی تائید میں گردن ہلاتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی اور اس کی یہ مسکراہٹ بلاشبہ امی کا دل چیر گئی تھی۔

"شیشے کی خوب صورتی اس کے چمکدار اور شفاف ہونے میں ہی ہوتی ہے، سمجھیں نا۔" اپنے دل کی کیفیت بہرحال اس وقت انہیں چھپانا تھی۔

"جی امی۔۔۔!"

سوچتی نظروں سے ندی نے اُن کی جانب دیکھا جو محض اس کا غم بانٹنے کے لیے اپنا کرب کس خوب صورتی سے چھپا رہی تھیں۔

"وقت بہت کم ہے بیٹا! تم جلدی سے نمبر ملاؤ۔" انہوں نے خود ہی جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے اچھی طرح بند ہونے اور اُس سے پہلے لاؤنج خالی ہونے کی تصدیق کی اور اس کے پاس آ بیٹھیں۔

"کیا ہوا؟ فون بزی ہے؟"

ندی کے چہرے پر موجود پریشانی دیکھ کر انہوں نے اندازہ لگایا تھا۔

"بند ہے۔" لب بھینچتے ہوئے ندی نے جواب دیا تو وہ بھی پریشان ہو گئیں۔

"بند ہے؟"

"جی امی۔۔۔!"

"پھر ملاؤ، ہو سکتا ہے نیٹ ورک یا سگنل میں کوئی مسئلہ ہو۔"

اور پھر ندی کے ہزار بار کوشش کرنے کے باوجود بھی نہ تو فون ملنا تھا اور نہ ہی ملا۔ دماغ اس قدر گنجلک ہو چلا تھا کہ اپنی بے بسی پر چیخ چیخ کر رونے کو جی چاہا۔ زندگی میں کبھی ایسا وقت بھی آئے گا یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ امی کی موجودگی کے باعث اس نے خود کو رونے سے باز رکھا کہ جانتی تھی اس وقت خود وہ بھی اسی کیفیت سے دوچار ہیں۔

وہ جو اکثر اوقات ابتدائی شب میں دوا لے کر سو جانے کی عادی تھیں اس کے لیے رات رات بھر جاگا کرتیں اور دن میں بھی دونوں ایک دوسرے کی دل جوئی کیا کرتیں۔

ایسے میں ایک انوکھا خیال ندی کے ذہن میں جو ابھرا تو کچھ دیر خود ہی اُس پر غور کرنے کے بعد آخر اُس نے امی سے کہہ دیا۔

"امی! کیا آپ میری ایک بات مانیں گی؟"

"یعنی اب تم بھی بات کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا کرو گی؟"

یونہی ماحول کا بوجھل پن کم کرنے کو وہ مسکرائیں۔

"امی۔۔۔! وہ دراصل اگر آپ کی اجازت ہو تو میں شاہ زین سے خود ملنا چاہتی ہوں۔"

کسی پرانی حویلی کے سنسان اور بوسیدہ کمرے میں دی گئی آواز کی طرح۔۔۔ اس کا لہجہ بے حد ہلکا اور کھوکھلا محسوس ہوا تھا۔

"یہ۔۔۔ تم کیا کہہ رہی ہو ندی! کیسے ممکن ہے یہ سب؟"

اُن کے کانپتے لہجے کی نمی نے خود ندی کے جسم پر کپکپاہٹ طاری کر دی تھی۔ آنے والے کل کا خوف کسی پھنکارتے ہوئے اژدھے کی طرح اُن کے سامنے اپنی تمام تر دہشت کے ساتھ لہرا رہا تھا۔

"یقین کیجیے امی! میں آپ کا اعتبار نہیں توڑوں گی۔"

اُن کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ندی نے انہیں یقین دلانا چاہا تھا۔

"اور اگر ان تینوں میں سے کسی کو پتا چل گیا تو۔۔۔"

وسوسے، واہمے، خدشات اور پھر یہ اگر مگر بھی امی کو شش و پنج میں ڈالے ہوئے مگر اس سے پہلے کہ وہ انہیں قائل کرتی وہ بولیں۔

"پہلے اُس سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرو اور اگر ممکن نہ ہوا تو۔۔۔

ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ ہوں، اپنی ذات کے لیے کچھ کر سکتی ہو تو کر لینا۔" اظہار تشکر سے ندی نے اُن کا ہاتھ چوم لیا تھا۔

"ناصر آج دوست سے ملنے کسی گاؤں گیا ہوا ہے تم اگر اپنی زندگی کے لیے کوئی رسک لینا چاہتی ہو تو میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔"

"جی امی! بس اب آر یا پار!"

ندی کے سامنے اپنے لہجے کو مضبوط بنا کر وہ اسے ڈھارس تو دے رہی تھیں مگر اس کی اس تجویز کو سننے کے بعد سے اُن کا دل بھربھری ریت کی دیوار بنا بیٹھا جا رہا تھا۔

(باقی آئندہ)

فرح طاہر

"السلام علیکم۔" فبیحا نے کمرے میں داخل ہو کر بلند آواز میں سبھی کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" سلام کا جواب دیتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے سبھی افراد نے روم ڈور سے اندر آتی فبیحا کی طرف دیکھا۔

"اٹھ گئی ہماری گڑیا۔" بابا جان نے پیار بھرے انداز میں فبیحا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جی بابا جان اٹھ گئی اور ساتھ ہی تیار بھی ہو گئی ہوں۔ بس عبایا لینا باقی ہے۔" فبیحا نے باپ کو جواب دیتے ہوئے کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اوف۔ ہم تو بھول ہی گئے۔ آج عزت مآب فبیحا ناز کا یونیورسٹی میں پہلا دن ہے۔" عنادل بھیا نے شرارت سے فبیحا کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! بالکل آپ بھول گئے لیکن اب یاد آگیا ہے تو پھر ذہن میں بٹھا لیں۔ آج کے دن ہم سے کوئی پنگا نہ لے ورنہ ہم بادشاہ سلامت، پیارے بابا جان کی خدمت میں آپ کی شکایت درج کرا دیں گے پھر آپ پر گھریلو کارروائی کی جائے گی۔ اس کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔" فبیحا نے بھائی کے اسٹائل میں ہی الٹا وار کیا اور ماں کو آواز دی۔

"پیاری امی جان، ہم آچکے ہیں، پلیز ہمیں ناشتا دے دیجیے ورنہ ہم پہلے ہی دن یونیورسٹی لیٹ گئے تو پورے دو سال یہی حال رہے گا ہمارا۔" فبیحا نے دہائی دی۔

"امی کی جان، یہ لو آگیا ناشتا شروع ہو جاؤ فورا۔" حمیرا بیگم نے پیار سے کہا۔ ناصر علی اور عنادل بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

فبیحا کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ آج اس کا ایک خوب صورت خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔ کالج میں ایڈمیشن ہوتے ہی فبیحا نے خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ "بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی" یعنی ملتان کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں ایم ایس سی میتھ کرے گی۔ اسی خواب کو پورا کرنے کے لیے پورے دو سال ایف ایس سی، بی ایس سی میں سخت محنت کی تھی۔ تب ہی یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل پایا تھا اور آج اس کا یونیورسٹی میں فبیحا کا پہلا دن تھا۔

"بس امی! میں نے کھا لیا، اب میں عبایا لے لوں، یہ نا ہو دیر ہو جائے۔" فبیحا نے ماں، باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک سے کھایا ہے نا بیٹا؟" ناصر علی نے پوچھا۔

"جی بابا ایک دم ٹھیک سے کھایا ہے۔" فبیحا نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

آج تمہارا پہلا دن ہے۔ ٹھیک سے تمہیں پتا بھی نہیں ہے۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ کلاسز آرام سے مل جائیں گی، ورنہ لوگ تمہیں فول بنا دیں گے۔" عنادل نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں فول بنا دیں گے؟ میں آپ سے زیادہ ہوشیار ہوں۔ کالج میں بھی آرام سے کلاسز کا پتا لگا لیا تھا میں نے۔" فبیحا نے کہا۔

"بیٹا وہ کالج تھا یہ یونیورسٹی ہے اور کو ایجوکیشن ہے۔ آپ کو مسئلہ ہوگا۔ عنادل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آپ ان کے ساتھ یونیورسٹی جائیں۔ یہ کلاسز تک آپ کو آرام سے پہنچا دے گا پھر آجائے گا۔" ناصر علی نے کہا۔ حمیرا بیگم نے بھی تائید میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے بابا آپ کہتے ہیں تو میں عنادل بھیا کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔" فبیحا نے جتاتی ہوئی مسکراتی نظروں سے عنادل کو دیکھتے ہوئے ایسے جواب دیا جیسے عنادل پر احسان کر رہی ہو اور ڈائننگ روم سے نکل گئی۔

"بہت خوش ہے آج فبیحا۔" حمیرا بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا تو عنادل اور ناصر بھی مسکرا دیے۔

حمیرا بیگم اور ناصر علی نے بہت اچھے طریقے سے دونوں بچوں کی تربیت کی تھی۔ اس لیے سب اپنی زندگیوں میں خوش تھے۔ ناصر علی کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

"بھیا میں بہت کنفیوز ہو رہی ہوں۔" فبیحا نے

گھبرائی ہوئی آواز میں عنادل سے کہا۔

"ارے کیوں؟ کیوں کنفیوز ہو رہی ہو؟" عنادل نے گاڑی چلاتے ہوئے فبیحا پہ ایک نظر ڈال کر پوچھا۔

"کیا بھیا! میں نے آپ کو کتنا کہا مجھے کلاسز اسٹارٹ ہونے سے پہلے ایک دفعہ یونیورسٹی لے جائیں۔ میں ریلیکس ہو کر سب پہلے سے ہی دیکھ لیتی لیکن آپ ہیں کہ مانتے ہی نہیں۔"

"او ہو... تو بابا جان کی دلاری شہزادی فبیحا کنفیوز ہو رہی ہیں۔" عنادل نے شرارتی انداز میں فبیحا کو ریلیکس کرنے کی خاطر کہا۔

"ہوں... فبیحا ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ، پھر کس بات کی گھبراہٹ ہے میں کس لیے ساتھ آیا ہوں۔ کلاسز تک پہنچا کر اچھی طرح تمام معلومات تمہیں دے کر ہی جاؤں گا تم ایسے پریشان مت ہو۔" عنادل نے بہن کو پیار سے سمجھایا۔

"اب تم خود کو ریلیکس کرو، ہم یونیورسٹی پہنچ ہی گئے ہیں۔" عنادل نے کہا اور یونیورسٹی گیٹ پر گاڑی کو روک دیا۔

"تم اترو ادھر سائیڈ پر کھڑی ہو کر میرا ویٹ کرو۔ میں کہیں جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کر کے آتا ہوں۔" عنادل نے کہا تو فبیحا گاڑی سے اتر کر یونیورسٹی گیٹ کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر میں ہی عنادل فبیحا کے پاس آگیا۔

"چلو بہنا آپ کو یونیورسٹی کی سیر کراتے ہیں۔" عنادل نے بالوں کو ہاتھوں سے سیٹ کرتے ہوئے پھر سے فبیحا کو چھیڑا اور یونیورسٹی گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد عنادل کے قدم ایک گراؤنڈ میں پہنچ کر رک گئے تو فبیحا بھی رک کر خاموشی سے عنادل کی طرف دیکھنے لگی۔

"فبیحا یہ تمہارے ڈیپارٹمنٹ کا گراؤنڈ اور یہ کینٹین بھی تمہارے ڈیپارٹمنٹ کی ہے۔ ایسے ہی ہر ڈیپارٹمنٹ کی کینٹین الگ الگ ہے اور یہ سامنے جو بلڈنگ نظر آرہی ہے۔ اس بلڈنگ میں ایک ساتھ تین ڈیپارٹمنٹ ہیں آؤ اندر چلتے ہیں۔" عنادل نے فبیحا کو سب سمجھاتے ہوئے کہا اور قدم آگے بڑھا دیے، فبیحا بھی ساتھ چل پڑی۔ بلڈنگ میں داخل ہو کر عنادل نے کہا۔

"یہ پہلا ڈیپارٹمنٹ فزکس والوں کا اور یہ سامنے کیمسٹری والوں کا اور یہ تھوڑا آگے میتھ کا۔" عنادل نے سیڑھیاں چڑھ کر میتھ ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"واؤ! بھیا ایک بلڈنگ میں تین ڈیپارٹمنٹ؟ لیکن تینوں ہی بڑے بڑے ہیں اور لوکیشن بھی اچھی ہے۔" فبیحا نے کہا اور سینے سے لگی فائل کے گرد بازو لپیٹے دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ جہاں سے کچھ فاصلے پر اسٹوڈنٹس کا رش لگا تھا۔

"ہاں اچھا ہے سب تم یہیں کھڑی رہو، میں تمہاری کلاسز اور پروفیسرز کا پتا کرتا ہوں۔" عنادل نے کہا اور رش کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر میں عنادل واپس آکر بولا۔

"لو بہنا! یہ تمہارا ٹائم ٹیبل اور پروفیسرز کا اتا پتا۔" عنادل نے اپنی ڈائری میں سے جس صفحہ پر تفصیل لکھی تھی وہ صفحہ نکال کر فبیحا کی طرف بڑھایا۔

"شکریہ بھیا! اگر آپ نہ ہوتے تو میں کیسے اس رش میں گھس کر یہ سب پتا کر پاتی۔" فبیحا نے صفحہ پکڑتے ہوئے کہا۔

"شکریہ وکریہ بعد میں، اب چلو میں تمہیں کلاسز کا بھی پتا کر دوں کہ کون سی کلاس کہاں ہوتی ہے پھر مجھے آفس بھی جانا ہے۔ بابا انتظار کر رہے ہوں گے میرا۔" عنادل نے کہا۔ تمام کلاسز کا سمجھا کر عنادل نے فبیحا کو اس کی پہلی کلاس میں چھوڑا اور بیسٹ آف لک کہہ کر آفس کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو..." ایک لڑکی نے فبیحا کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"ہیلو۔" جواباً فبیحا نے کہا۔

"میں آنسرا! آج میرا بھی میتھ ڈیپارٹمنٹ میں پہلا دن ہے اور آپ...؟" آنسرا نے اپنا بتاتے ہوئے ساتھ ہی فبیحا سے بھی سوال کر ڈالا۔

"جی میں فبیحا! میں بھی میتھ کی اسٹوڈنٹ ہوں میرا بھی پہلا دن ہے۔" فبیحا نے جواب دیا۔

"او کے... آپ کو سب کلاسز اور پروفیسرز کے بارے میں ضروری معلومات مل گئیں؟" آنسرا نے پھر سوال کیا۔

"جی نوٹس بورڈ سے ٹائم ٹیبل لے لیا۔" فبیحا نے مختصر جواب دیا۔

"آپ کہاں رہتی ہیں؟"

"میں قادر پور ــــ سے تعلق رکھتی ہوں۔ آنے جانے میں پرابلم تھی سو اب ہوسٹل میں رہتی ہوں۔" آنسرا نے اپنے متعلق بتانے کے ساتھ ساتھ اس سے بھی دریافت کر ڈالا۔

"جی میں تو یہیں ملتان میں رہتی ہوں آدھا گھنٹہ کی دوری پر گھر ہے میرا۔" فبیحا نے بتایا۔

"او کے کین یو فرینڈشپ ود می؟ ایکچولی ویسے تو کلاس میں کافی گرلز ہیں بٹ آپ مجھے الگ اپنی نیچر کے مطابق لگیں تو اس لیے میں پہلے آپ ہی کے پاس آئی۔" آنسرا نے فبیحا کو فرینڈشپ آفر کرتے ہوئے ساتھ ہی وجہ بھی بتائی۔

"جی ہاں کیوں نہیں ہم دوست ہیں۔" فبیحا نے کہا اور دوستی کا ہاتھ آنسرا کی طرف بڑھا دیا۔ اتنے میں سر حافظ ارشاد روم میں داخل ہوئے۔

"گڈ مارننگ کلاس..." سر نے مسکراتے ہوئے کلاس کو گڈ مارننگ کیا۔

"گڈ مارننگ سر۔" تمام اسٹوڈنٹ نے بیک وقت جواب دیا۔

"میں آپ کے ــــــــــ پیپر نمبر فرسٹ کا استاد ہوں سر حافظ ارشاد۔" انہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگوں کو میتھ ڈیپارٹمنٹ میں خوش آمدید دعا ہے جس عزم کے ساتھ آپ لوگ میتھ ڈیپارٹمنٹ میں آئے ہیں سب ہی کامیاب ہو کر یہاں سے جائیں۔ اب آپ سب پلیز اپنا اپنا تعارف کرا دیں۔" پھر کلاس نے باری باری اپنا تعارف کرایا۔ کلاس میں ایک طرف بوائز بیٹھے تھے دوسری طرف لڑکیاں۔ سامنے سر کے لیے ڈائس تھا پھر سر نے اپنے سبجیکٹ ــــــــــ کے متعلق کچھ بنیادی باتیں بتائیں اور اگلی کلاس کے سر کے متعلق کچھ نصیحتیں کیں اور کلاس ختم ہونے پر چلے گئے۔

ایسے ہی تمام سبجیکٹس کے سر آئے ہر سر نے اپنا تعارف کرایا اسٹوڈنٹس سے تعارف لیا اور سبجیکٹ کے متعلق بنیادی باتیں بتا کر چلے گئے اور ایسے ہی یونیورسٹی کا ٹائم ختم ہو گیا۔ سب اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئے۔

☼ ☼ ☼

"فبیحا بیٹا کیسا رہا یونیورسٹی کا پہلا دن۔" حمیرا بیگم نے پوچھا۔

"جی ماں اچھا تھا بہت، کوئی مسئلہ نہیں ہوا بھیا سب بتا کر گئے تھے۔" فبیحا نے ماں کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا جہاں ناصر علی اور عنادل بیٹھے ٹی وی پر کوئی ٹاک شو دیکھ رہے تھے۔ جو ماں بیٹی کو آتے دیکھ کر سیدھے ہو بیٹھے۔

"پتا ہے بابا آج میری یونیورسٹی میں ایک فرینڈ بھی بنی ہے آنسرا بہت اچھی لگی مجھے وہ ہوسٹل میں رہتی ہے۔" فبیحا نے چائے کا کپ ناصر علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"گڈ بیٹا، لیکن یونیورسٹی میں فرینڈ بناتے ہوئے احتیاط سے کام لینا۔ کالج اور یونیورسٹی کے ماحول میں بہت فرق ہوتا ہے۔" ناصر علی نے چائے لیتے ہوئے فبیحا کو سمجھایا۔

"جی بابا میں آپ کی بات پر عمل کروں گی۔" فبیحا نے کہا اور اپنا چائے کا کپ لے کر کشن پر بیٹھ گئی۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

خدا ایک ہے سب اسی کے بندے ہیں، مسلمان اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر یقین رکھتے ہیں اللہ کے بتائے راستے پر چلتے ہیں دین اسلام پر عمل کرتے ہیں، لیکن یہ مسلمان کیسے مسلمان ہیں اللہ پر اس کے رسول پر یقین تو رکھتے ہیں، لیکن اس کے بتائے راستے پر کیوں نہیں چل پاتے۔ نیناں کافی دیر سے ایک ہی جگہ پر بیٹھی آنکھیں بند کیے یہ سب سوچ رہی تھی۔

"نماز دین اسلام کا ایک اہم رکن ہے، لیکن میں نے تو مسجدوں کو اکثر ویران ہی دیکھا ہے اکا دکا لوگ ہی نماز کے لیے آتے ہیں اور مندر، مندر میں تو..." "آپی ممی بلا رہی ہیں آپ کو" تب ہی نیہا نے نیناں کو پکارا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن کلاس ٹائم سے کچھ پہلے فبیحا کلاس میں پہنچ گئی جہاں تمام اسٹوڈنٹس کے ساتھ آنسرا بھی موجود تھی جس نے فبیحا کے لیے اپنے ساتھ سیٹ رکھی تھی۔ فبیحا کلاس میں آئی تو آنسرا نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا فبیحا آگے بڑھ کر آنسرا کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔

تب ہی سر کلاس میں آئے اور لیکچر اسٹارٹ کر دیا سب بہت توجہ سے سر کا بتایا لیکچر نوٹ کر رہے تھے۔ پھر کلاس کے بعد سب ہی ریلیکس ہو کر بیٹھ گئے۔

"ہیلو گائز ہماری کلاس کے ابھی تک "جی آر" اور "سی۔ آر سلیکٹ نہیں ہوئے ہیں آپ سب کچھ آئیڈیاز دیں کس کو سلیکٹ کرنا ہے۔" اچانک لڑکوں کی سے ایک لڑکے نے ڈائس پر آ کر کہا۔

"ہاں یہ ہونا تو ضروری ہے ان کی وجہ سے کام میں آسانی ہو گی بوائز سائیڈ سے " C R " اور گرلز سائیڈ سے " G R " گرلز اور بوائز کی نمائندگی کریں گے ایسے متفقہ طور پر کام ہو جایا کرے گا۔" تقریباً سب ہی نے اس لڑکے کی بات پر ہاں کہی تھی۔

"تو گرلز ٹھیک ہے آپ لوگ آج ڈسائیڈ کر لیں جی آر کون ہو گی اور ہم بھی آج ڈسائیڈ کر لیتے ہیں کہ سی آر کون بنے گا۔" اسی لڑکے نے کہا اور ڈائس سے ہٹ کر جا کھڑا ہوا۔

"او کے گرلز ایسا کرتے ہیں ہم کامن روم میں جاتے ہیں وہیں پر آپ سب ڈسائیڈ کر لینا۔" لڑکیوں میں سے طیبہ نے کہا تو سب ہی اٹھ کر کامن روم میں آ گئیں۔

سب نے اپنا اپنا تعارف پھر سے آپس میں کرایا۔

"گرلز میں چاہوں گی آپ لوگ "جی آر" کے لیے میرا نام دیں ان شاء اللہ میں بہتر طور پر آپ لوگوں کو گائیڈ کر سکتی ہوں۔" لڑکیوں میں سے سعدیہ نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر کہا سب ہی سعدیہ کو دیکھنے لگے جو پردے میں تو تھی، لیکن کچھ اس طرح تھی کہ "صاف چھپتے بھی نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں" عبایا کے نام پر بہت باریک کپڑے کا عبایا پہنا ہوا تھا اور رومال کے نام پر صرف منہ کا کچھ حصہ ہی ڈھانپا ہوا تھا اور اس کا یہ گیٹ اپ "جی آر" بنانے پر کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا اسی وجہ سے سب خاموش ہو گئی تھیں۔

"ہوں۔ سعدیہ ہمیں آپ کو "جی آر" منتخب کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن ہمیں نہیں لگتا آپ لڑکوں کے ساتھ مینیج کر پائیں گی ہم چاہتے ہیں طیبہ جی آر کے طور پر سامنے آئے۔" ہمیرا نے بات کو سنبھالتے ہوئے سہولت سے سعدیہ کو کہا۔

"او کے پھر جیسا آپ لوگوں کو مناسب لگے۔" سعدیہ نے کہا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی پھر سب ہی کے متفقہ فیصلہ پر طیبہ کو "جی آر" بنا لیا گیا۔

☼ ☼ ☼

"دو لوگوں میں اتنا تضاد کیسے ہو سکتا ہے ایک دن تو دوسرا رات، ایک زمین تو دوسرا آسمان... واقعی ٹھیک کہا ہے کسی نے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو خود بہ خود عزت دینے کو دل کرتا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں تو ان کو عزت دیتے ہیں ہم مگر کیا واقعی اصل میں اس شخص کو عزت دی جانی چاہیے کہ نہیں۔

"آپی کیا سوچ رہی ہیں ایسے آسمان کو دیکھ کر۔" نیہا نے پیچھے سے آ کر سوال کیا۔

"کچھ نہیں گڑیا بس ویسے ہی۔" نیناں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"آپی آسمان پہ اڑتے پرندے کتنے خوب صورت لگتے ہیں نا بالکل ایسے جیسے ان کو کوئی فکر ہی نہیں بس اڑ رہے ہیں اڑتے جاتے ہیں اوپر اور اوپر آسمان کی بلندیوں میں اور جب دل بھر جائے تو اپنے ٹھکانے پر لوٹ آتے ہیں بھگوان نے کیا کمال کی سمجھ دی ہے انہیں۔" نیہا نے آسمان میں اڑتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سمجھ... بھگوان... ! نیہا کیا واقعی تمہیں لگتا ہے ان کو سمجھ بھگوان نے دی ہے۔" نیناں نے پر سوچ نظریں نیہا کے چہرے پر گاڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں تو اور کیا بھگوان ہی تو ہے وہی تو سب کرتا ہے۔ آپ کیوں ایسے کہہ رہی ہیں۔" نیہا نے سوال کا جواب دیتے ہوئے ساتھ ہی سوال کر ڈالا تھا۔

"کچھ نہیں بس میں ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔ چھوڑو چلو شام ہو گئی ہے نیچے چلتے ہیں ورنہ ابھی ممی نے اوپر آ کر ڈانٹ دینا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"جی ممی۔" نیناں نے ماں کی پکار پر فوراً جواب دیا تھا۔

"بیٹا آج میں ذرا کچن میں بزی ہوں آپ کے پاپا کی فرمائش پر حلوہ پوری تیار کر رہی ہوں آپ ایسا کریں نیہا کے ساتھ مل کر مندر کی صفائی کر دیں۔"

"اچھا ممی ٹھیک ہے ہم کر دیتے ہیں صفائی۔" نیناں نے کہا اور نیہا کو بلانے اس کے روم کی طرف چل پڑی۔

"نیہا کیا کر رہی ہو؟" نیناں نے نیہا کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں آپی بس یہ ٹی وی سیریل دیکھ رہی ہوں آپ آئیں کوئی کام ہے کیا؟"۔

"ہاں کام ہے ممی بزی ہیں تو مندر کی صفائی کرنی ہے اس لیے تمہیں بلانے آئی ہوں۔" نیناں نے آنے کی وجہ بتائی۔

"چلیں تو پھر چلتے ہیں ابھی صفائی کر دیتے ہیں ورنہ ممی کی ڈانٹ لازمی ہے۔" نیہا نے ٹی وی بند کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں چلو۔" نیناں نے کہا تو دونوں بہنیں کمرے سے نکل کر ساتھ ہی مندر کی طرف چل پڑیں پورے گھر میں سے سب سے الگ اور کھلی جگہ پر ریٹا اور آشوک نے مندر بنایا ہوا تھا جہاں وہ سب مل کر پوجا پاٹ کیا کرتے تھے۔

"نیناں آپی یہ کچھ مہینوں سے آپ اتنی چپ سی کیوں رہنے لگی ہیں پہلے تو ایسی نہیں تھیں آپ؟" نیہا نے دیے صاف کرتے ہوئے مصروف سے انداز میں نیناں سے سوال کیا۔

"پتا نہیں... نیہا مجھے خود بھی نہیں پتا میں ایک دم سے ایسی کیوں ہو گئی ہوں۔" نیناں نیہا کے پاس ہی نیچے زمین میں بیٹھ گئی۔

"نیہا تمہیں اپنا بھگوان کیسا لگتا ہے؟" نیناں نے عجیب سا سوال کیا تو نیہا نا سمجھی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ایسے مت دیکھو میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔ پتا ہے نیہا میں آج لائبریری میں بیٹھی تھی وہاں میں نے ایک واقعہ پڑھا تمہیں بھی سناؤں... اس میں لکھا تھا کہ۔

"بنی اسرائیل میں ایک بت پرست تھا جس نے چار سو برس تک بت پرستی کی تھی کبھی ناغہ نہیں کیا۔ بت کے قدموں میں سر ڈالے رکھتا ایک دن اسے بخار آیا تو دوڑتا ہوا گیا اور بت کے قدموں میں سر رکھ کر کہا تو میرا خدا ہے مجھ سے یہ بخار دور کر دے۔ دیر تک اس سے کہتا رہا پتھر اسے کیا جواب دیتا جب بہت دیر ہو گئی اور بخار میں بھی تیزی آ گئی تو اٹھ کر بولا تو میرا خدا نہیں اور وہاں سے نکل کر چلا گیا۔

راستہ میں اسے ایک مسجد نظر آئی تو اس میں جا کر

آواز دی کہ اے موسیٰ علیہ اسلام کے خدا! اگر تو سچا معبود ہے تو مجھ سے بخار کو دور کردے اتنا کہنا تھا کہ بخار جاتا رہا یہ شخص وہاں سے سیدھا موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا اے موسیٰ! علیہ السلام کوئی شخص چار سو برس تک دم بھر کے لیے بتوں کے قدموں سے اپنا سر نہ اٹھائے، لیکن پھر اسے ترک کردے اور بے زار ہوجائے تو آپ اس کے حق میں کیا فرماتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اے موسیٰ! علیہ السلام میرے بندہ سے کہو کہ چار سو برس تو کیا اگر چار ہزار برس بھی بت پرستی کرتا پھر ان بتوں سے ناامید ہوکر مجھ کو ایک ہی بار پکارتا تو میں اپنے کرم و رحم سے تو جو حاجت چاہتا پوری کرتا۔ غرض موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تیری توبہ قبول ہوئی۔" نیناں واقعہ سنا کر نیہا کی طرف خاموشی سے دیکھنے لگی۔

"آپی ایسا بہت کچھ ہم مسلمانوں کی کتابوں میں بچپن سے پڑھتے آئے ہیں۔ بچپن سے یہیں رہے ہیں ہمارے نام مسلمانوں جیسے رکھے گئے ہیں مسلمانوں کے اسکول کالج میں ہم نے پڑھا ہے ان کی اسلامیات پڑھی ہے اس میں اس سے کہیں زیادہ کچھ ہوتا ہے۔ ہندو مسلم الگ ہوئے تو یہ دادی کی غلطی ہے انہوں نے یہاں سے ہجرت نہیں کی یہیں رہتی رہیں انہیں اپنا گھر عزیز تھا' آگے کا نہیں سوچا ہمیں کتنی مشکلیں ہوں گی مسلمانوں میں رہ کر۔ خود دادی مرگئی ہیں، لیکن ہمیں مشکل میں ڈال گئی ہیں اور یہ جو آپ نے سنایا اس میں وہ بندہ اپنے دین سے پھرا ہے یہ بھی گناہ ہے بھگوان نے اسے جس مذہب میں پیدا کیا وہ اسے چھوڑ کر دوسرے مذہب میں گیا وہ پکا جہنم میں جائے گا۔

ہم ایسے نہیں ہیں ہم اپنے مذہب پر قائم ہیں مرتے دم تک قائم رہیں گے۔ آپ بھی جیسے پہلے سب اگنور کرتی تھیں ایسے کیا کریں۔ ایسی باتیں پڑھ بھی لیا کریں تو ان کو سوچنے مت بیٹھ جایا کریں۔ آپ ایسا سوچتی ہیں جب ہی ایسے گم سم رہنے لگی ہیں اب جھاڑیں اور صفائی کریں ورنہ سب رہ جائے گا۔" نیہا نے سر جھٹکا اور کام میں لگ گئی تو نیناں بھی کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہوا آنسرا یہاں ایسے اکیلے کیوں کھڑی ہو؟" فبیحا یونیورسٹی میں آئی اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے گراؤنڈ میں آنسرا کو اکیلے کھڑا دیکھا تو اس کے پاس رک کر پوچھنے لگی۔

"وہ سبھی گرلز کینٹین گئی ہیں میرا موڈ نہیں تھا ابھی تو ہوسٹل سے ناشتا کرکے آئی ہوں۔" آنسرا نے اپنے وہاں ہونے کی وجہ بتائی۔

"چلو تو ہم بھی یہیں کھڑے ہوجاتے ہیں وہ لوگ آجائیں پھر ساتھ ہی کلاس روم چلیں گے۔" فبیحا بھی آنسرا کے ساتھ وہیں کھڑی ہوگئی۔

تب ہی کچھ دیر بعد کلاس کی سب ہی لڑکیاں آگئیں۔ فبیحا نے سب ہی سے سلام

"یار فبیحا تم ذرا مجھے اپنی شکل تو دکھا دو۔" اچانک باتیں کرتے ہوئے درمیان میں چند دن پہلے آنے والی لیٹ ایڈمشن لڑکی رابعہ شاہ نے فبیحا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"ہیں۔۔۔ یہ اچانک تمہیں کیا ہوا جو تم ایسی فرمائش پر اتر آئیں۔" سعدیہ نے ہنستے ہوئے رابعہ کو کہا جبکہ فبیحا کچھ کنفیوز کھڑی تھی۔

"ہاں یار دیکھو اس کی گرے آنکھیں کتنی خوب صورت اور گہری ہیں۔ یہ نقاب میں ہے تو آنکھیں اور زیادہ واضح ہورہی ہیں تو مجھے اس کا چہرہ دیکھنا ہے یہ کیسی ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے وہ بس تمہیں ایسا لگ رہا ہے۔" فبیحا نے فوراً" کہا۔

"ہاں آنکھیں تو اس کی پیاری ہیں، لیکن اتنے مہینے ہوگئے ہمیں ایک ساتھ' ہم لوگوں نے اس کو بنا نقاب کے نہیں دیکھا یہ لڑکیوں میں بھی نقاب نہیں اتارتی۔" طیبہ نے فبیحا کے پاس آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آنسرا تم تو فبیحا کی کلوز فرینڈ ہو تم نے تو ضرور اسے دیکھا ہوگا کیسی ہے یہ؟" رابعہ نے اشتیاق بھرے انداز میں آنسرا سے سوال کیا۔ آنسرا جو باقی لڑکیوں کے ساتھ خاموش کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی ایک دم مسکرادی۔

"ہاں میں نے دیکھا ہے پیاری ہے فبیحا۔" آنسرا نے جواب دیا۔

"پھر تو ہمیں بھی دیکھنا ہے فبیحا پلیز دکھاؤ نا۔" رابعہ نے فبیحا کے نقاب پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"رابعہ پاگل ہوئی ہو کیا ہم گراؤنڈ میں کھڑے ہیں جہاں صرف ہم لوگ نہیں یونیورسٹی کے بہت سے اسٹوڈنٹس موجود ہیں کیوں میرا تماشا بنا رہی ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہی ہو۔ پلیز میرا اسکارف چھوڑو ورنہ اتر جائے گا۔" فبیحا نے دبی آواز میں چیختے ہوئے کہا۔ تب رابعہ نے اسکارف سے ہاتھ ہٹایا۔

"اوف عجیب پاگل ہو تم۔" فبیحا نے سر جھٹکتے ہوئے پھر سے کہا۔

"ہاں ہوں پاگل' لیکن' تم۔۔۔" رابعہ نے عجیب نظروں سے فبیحا کو دیکھتے ہوئے کہا اور درمیان میں بات چھوڑ دی۔

فبیحا کو کافی دیر سے خود پہ کسی کی نظروں کا احساس ہورہا تھا تب ہی اسکارف ٹھیک کرتے ہوئے نظریں گھمائیں تو سعدیہ کے ساتھ کھڑی نادیہ پر نظریں رک سی گئیں عجیب اسرار تھا نادیہ کی نظروں میں طیبہ نے کلاس ٹائم شروع ہونے کی اطلاع دی تو فبیحا نے انجانے احساس سے سر جھٹکا اور سب ہی کے ساتھ کلاس کی طرف چل پڑی۔ کلاس میں آنے کے کچھ دیر بعد ہی سر فیصل کلاس میں داخل ہوئے۔ سر کا لیکچر اسٹارٹ ہوا۔

"یو اسٹینڈ اپ۔" لیکچر کے دوران اچانک سر نے بوائز کی طرف بیٹھے ظہیر کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"می سر؟" ظہیر نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یس یو۔ اینڈ ناؤ گیٹ آؤٹ مائے کلاس۔" سر نے دبے دبے لہجے میں غصے سے کہا۔

"وائے سر؟ میں نے کیا ہے؟" ظہیر نے سوال کیا۔

"شٹ اپ آئی سے گیٹ آؤٹ مائے کلاس۔" سر فیصل غصے سے چلا پڑے۔

"اوکے سر۔" ظہیر خاموشی سے اپنی کتابیں اٹھا کر دروازے تک پہنچا۔

"نیکسٹ ٹائم کوئی میری کلاس میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر نہ بیٹھے ماسٹر لیول تک آپ لوگ پہنچ چکے ہیں' لیکن تمیز آپ میں ہے نہیں آپ کا استاد کھڑا ہوکے آپ کو پڑھا رہا ہے اور آپ بڑے ریلیکس انداز میں ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھے ہیں۔" سر فیصل نے ظہیر کو کلاس سے نکالنے کی وجہ اور اپنے رول ساتھ بتائے تھے۔

"اف گاڈ سر واقعی بہت سخت ہیں۔" جیسے ہی سر لکھنے کے لیے وائٹ بورڈ کی طرف گھومے فوراً" ہی فبیحا نے رجسٹر کے ایک سائیڈ پہ لکھ کے آنسرا کو کہنی مار

کے بڑھایا جوابا" آنسرا مسکرائی اور جیسے ہی سر نے رخ ادھر کیا ویسے ہی کمال مہارت سے اپنی مسکراہٹ کو چھپا گئی۔ نقاب میں فبیحا مسلسل مسکرا رہی تھی۔

جیسے ہی سر کا لیکچر ختم ہوا سر کلاس سے باہر گئے سب ہی اسٹوڈنٹ نے لمبی سانس چھوڑتے ہوئے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھالی اور سر کے رویے کو ڈسکس کرنے لگے۔

"سچ میں جیسے ہی سر نے ظہیر کی طرف اشارہ کیا مجھے ایسا لگا سر نے مجھے اشارہ کیا ہے اور ابھی مجھے اٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔" حسن نے ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ پہلا پیریڈ سر حافظ ارشاد کا ہوتا ہے سر فیصل کیسے آگئے پہلے پیریڈ میں؟" طیبہ نے سب سے سوال کیا۔

"ہاں" G R "پتا کرو اب سیکنڈ پیریڈ میں کون سے سر نے آنا ہے؟" تہمینہ نے طیبہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں عبداللہ کو کہتی ہوں وہ پتا کر آئے۔" طیبہ نے جواب دیا۔

"گرلز اگلی کلاس فری ہے آج سر حافظ ارشاد نہیں آئے ہیں تو ان کا پیریڈ بھی فری ہوگا۔ تھرڈ اور فورتھ سر شاہد اور سر اشرف لیں گے ففتھ فری اور لاسٹ پیریڈ سر رضا لینے آئیں گے۔" کچھ ہی دیر بعد طیبہ نے اعلان کیا۔

"او ہو ایک ساتھ دو دو پیریڈ فری۔" کچھ نے خوشی کا اظہار کیا تو کوئی افسوس کر رہا تھا۔

"یار میں نے تو Complex "کے کچھ لیکچر" C R "سے ڈسکس کرنے ہیں اگر تم لوگوں میں سے کسی نے میرے ساتھ آنا ہے تو آجاؤ۔" طیبہ نے سب ہی سے پوچھا۔

"ہاں میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔" فریحہ نے کہا اور اپنے نوٹس اور رجسٹر سمیٹنے لگی۔

"ارے تمہیں" C R "ہی سے کیوں پوائنٹ سمجھنے ہیں؟" جیسے ہی فریحہ اور طیبہ اپنی چیزیں سمیٹ کے جانے لگیں رابعہ شاہ نے پیچھے سے بڑے گھٹیا انداز میں آواز لگائی تھی۔

"مس رابعہ شاہ مجھے یہ پوائنٹ" C R "سے اس لیے سمجھنے ہیں کیوں کہ پوری کلاس میں complex کے نوٹس ان کے بہترین ہوتے ہیں وہ ہی ہمیں زیادہ ٹھیک سمجھا سکیں گے۔ ہاں اگر تم اتنی ذہین ہو تو تم مجھے یہ سمجھا دو۔" طیبہ نے غصے سے جوابی کارروائی کی تھی۔

"یار یہ لڑکی بھی عجیب ہے اخلاق سے گری حرکات کرتی ہے تو کبھی گندی باتیں کرتی ہے اف۔" آنسرا نے رابعہ شاہ کی بات پر لڑکوں کو مسکراتے دیکھ کر فبیحا سے کہا تھا۔

"چھوڑو اسے۔۔۔ اٹھو ہم لائبریری چلتے ہیں مجھے کچھ بکس لینی ہیں۔" فبیحا نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں چلو چلتے ہیں۔" آنسرا نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی جیسے ہی دونوں اپنی رو سے باہر نکلیں شہلا نے پوچھا۔

"تم دونوں کدھر جا رہی ہو؟"

"ہم لائبریری جا رہے ہیں۔" آنسرا نے جواب دیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" ساتھ ہی سوال کیا۔

"مجھے بھی جانا ہے لائبریری چلو ساتھ ہی چلتے ہیں۔" شہلا کے ساتھ سمیرا بھی جانے کو تیار ہو گئی۔

"ٹھیک ہے تو چلو۔" چاروں لائبریری کی طرف چل پڑیں۔

فبیحا کے ساتھ شہلا اور سمیرا بھی نقاب میں تھیں، لیکن لائبریری میں آکر بیٹھتے ہوئے شہلا اور سمیرا نے نقاب اتار دیا تھا جبکہ فبیحا نقاب میں ہی تھی۔

"میں بک ایشو کرالوں پھر آتی ہوں۔" فبیحا نے کہا اور لائبریرین کی طرف بڑھ گئی۔

بک ایشو کر کے واپس آتی فبیحا کے قدم کچھ فاصلے پر رک گئے۔

شہلا، سمیرا اور آنسرا کے ساتھ کرسی پہ اب نادیہ

سعدیہ، تہمینہ اور رابعہ شاہ بھی بیٹھی ۔۔۔ باتوں میں مشغول تھیں، لیکن رابعہ کی نظریں فبیحا پر گڑی تھیں۔

"اف پتا نہیں کیسی لڑکی ہے دیکھتی بھی ایسے ہے جیسے کھا جائے گی۔" فبیحا نے رابعہ کو دیکھ کر سر جھٹکا اور آگے بڑھ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یار فبیحا یہ کون سی بکس اٹھا لائی ہو اتنی موٹی موٹی۔" سمیرا نے سوال کیا۔

"یہ اسٹیٹکل اور الجبرا کی بکس ہیں۔" فبیحا نے بکس میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ اسی وقت تہمینہ کے موبائل کی ٹون بجی اور وہ ایکسکیوز کرتی لائبریری سے باہر چلی گئی۔ فبیحا کے ساتھ والی کرسی خالی دیکھ کر رابعہ فورا" اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس پر بیٹھ گئی۔ رابعہ کو اگنور کر کے فبیحا بکس کھول کر آنسرا کی طرف رخ موڑ گئی۔

"فبیحا اب تو نقاب اتار دو یہ شہلا اور سمیرا نے بھی تو اتار دیا ہے۔ تم آخر اپنا چہرہ کیوں نہیں دکھاتی ہو۔" رابعہ نے فبیحا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"پلیز رابعہ ڈونٹ ڈسٹرب می۔" فبیحا نے کندھے سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"کیا یار دکھا دو تم بھی ضد پہ آئی ہو اور یہ بھی ضد پہ آئی ہے۔" سعدیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں سعدی بات ضد کی نہیں ہے، بس میں کوئی تم لوگوں سے الگ تو ہوں نہیں جو میں ضد کروں نہ دکھانے کی۔ اصل میں، میں نقاب اتاروں تو پھر یہ ٹھیک سے سیٹ نہیں ہوتا ہے ۔۔۔ اترنے کا ڈر لگا رہتا ہے۔" فبیحا نے وضاحت دی تھی۔

"ابھی تو یہاں کوئی نہیں ہے صرف لڑکیاں ہی ہیں تو تم اتار لو پھر آرام سے سیٹ بھی کر لینا۔" خاموش بیٹھی نادیہ نے بھی باتوں میں حصہ لیا۔ رابعہ بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

"او کے۔" فبیحا نے اقرار میں سر ہلایا اور نقاب اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"خوش ہو جاؤ فبیحا آج اپنا دیدار کرا رہی ہے۔" شہلا نے ہنستے ہوئے رابعہ سے کہا۔

"آج یہ نہ کراتی تو مجھے زبردستی کرنا بھی آتی ہے۔" رابعہ نے عجیب لہجے میں کہا تو نقاب اتارتی فبیحا کا ہاتھ ٹھہر گیا۔

"تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے، مس رابعہ شاہ؟" فبیحا نے ہاتھ ٹیبل پر رکھ کر سرد لہجے میں رابعہ سے سوال کیا تھا۔

"مسئلہ کوئی نہیں جانو بس آئی لو یو۔" رابعہ نے فبیحا کے ٹیبل پہ رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"واٹ؟ لو۔۔۔ مس رابعہ آئی تھنک آپ کی نظر خراب ہے، میں ایک لڑکی ہوں، لڑکا نہیں۔ آپ اپنی حدود میں رہیں تو بہتر ہوگا۔" فبیحا نے غصے میں رابعہ کی طرف انگلی کر کے کہا۔ باقی سب خاموش تماشائی بنی بیٹھی تھیں۔

"لڑکی ہو تو کیا ہوا فبیحا؟ مجھے لڑکوں میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے پتا نہیں کیوں مجھے لڑکیاں متاثر کرتی ہیں اور تم تو بہت ہی زیادہ۔" رابعہ نے کہا۔

فبیحا نے بہت چونک کر رابعہ کی طرف نظر کی تھی۔ گندمی سے کچھ ڈارک کچھ کچھ سیاہ رنگت مناسب قد فربہی مائل بدن کی مالک رابعہ شاہ نے جن نظروں سے دیکھتے ہوئے فبیحا کو یہ بات کہی تھی اس سے اس کی سائیکی کا خود بہ خود اندازہ ہو رہا تھا۔

فبیحا نے اپنی کتابیں سمیٹیں بیگ اٹھایا اور لائبریری سے باہر نکل گئی۔ آنسرا نے بھی فبیحا کی تقلید کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ممی کوئی کام ہے تو بتائیں میں اس وقت فارغ ہوں۔" نیناں نے آشوک سے باتیں کرتی ریتا سے پوچھا۔

"تم کام کرو گی؟ تمہیں تو آج کل خود اپنا پتا نہیں ہوتا ہے نادیہ! میں کوئی کام دوں اور تم اپنی سوچوں میں

گم ہو کر کسی کونے میں ٹک کر کام سے بے پروا ہو جاؤ اور کام وہی جوں کا توں رہ جائے۔" ریشا نے طنزاً کہا۔

"ریشا ایسے کیوں بات کر رہی ہو؟ اپنی نادیہ تو بہت فرماں بردار بیٹی ہے۔" آشوک نے نادیہ کی حمایت میں کہا تھا۔

"میں کیوں بات کر رہی ہوں آپ اسی سے پوچھ لیں ہر وقت گم سم رہتی ہے۔" ریشا نے سر جھٹکتے ہوئے جواب دیا پھر کہا۔

"آپ بیٹھیں میں چائے بنا لاتی ہوں۔" ریشا گئی تو آشوک نادیہ کی طرف متوجہ ہو کر اس سے مخاطب ہوا۔

"نیناں بیٹی آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟ کوئی پریشانی ہے تو بیٹا ہم سے کہو ایسے خود کو پریشان مت کرو۔"

"نہیں تو پاپا پریشانی تو کوئی نہیں ہے۔" نیناں نے انکار میں سر ہلایا۔

"نینا بیٹا بتاؤ کیا پریشانی ہے؟" آشوک نے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

"پاپا مسلمان پردہ کیوں کرتے ہیں؟" نیناں نے نظریں جھکائے باپ سے سوال کیا۔ آشوک نے غور سے بیٹی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"ہم نے کبھی مسلمانوں کی کتابیں نہیں پڑھیں بس سنا ہے، میں زیادہ تو نہیں جانتا، لیکن مسلمانوں کے ـــــــ آخری نبیؐ پر جو کتاب اتاری اس میں مسلمانوں کو پردہ کا کہا گیا ہے تو اس لیے مسلمان پردہ کرتے ہیں۔"

"لیکن پاپا سارے مسلمان تو پردہ نہیں کرتے نا۔" نیناں نے پھر سوال کیا۔

"تو بیٹا..." ابھی آشوک کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ریشا سب کے لیے چائے لے آئی ریشا کے ساتھ نیہا بھی تھی۔ آشوک کچھ کہتے کہتے رک گئے نیناں بھی خاموش ہو گئی۔

"ممی کل میری فرینڈ نے گھر آنا ہے ہم کمبائن اسٹڈی کرنا چاہتے ہیں۔" نیناں نے ماں سے کہا۔

"تو ٹھیک ہے یہ تو اچھی بات ہے یہ لو چائے پی لو۔" ریشا نے چائے کا مگ نیناں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"رابعہ نے ایسے کیسے کہہ دیا اور جس انداز سے کہہ رہی تھی اس میں کہیں مجھے کچھ غلط کا احساس کیوں ہو رہا ہے۔ بے شک وہ میری کلاس فیلو ہے لیکن مجھے کتنا جانتی ہے، میں تو بات بھی کم ہی کرتی ہوں اس سے کہتی ہے "تم مجھے اپیل کرتی ہے اسے" کیا ہے یہ سب... اللہ پاک میری مدد فرمائیں، بہت پریشان ہوں رابعہ مجھے کچھ سائیکی لگتی ہے۔ تہمینہ بھی تو کہہ رہی تھی اس نے مجھے بھی زبردستی ساتھ رکھا ہوا ہے الٹی سیدھی دھمکی دیتی ہے۔"

"فبیحا بیٹا چائے بنا رہی ہو تو میرے لیے بھی بنانا آج ٹھنڈ بہت ہے۔" حمیرا بیگم نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے فبیحا کو چائے بناتے دیکھا تو فرمائش کر دی۔

"جی ماں۔" فبیحا جو اپنی ہی سوچوں میں گم تھی ماں کی پکار پر چونک کر پلٹی تو کیتلی پر ہاتھ لگنے سے چائے الٹی اور گرم چائے ہاتھ پر گر گئی۔

"آ... آ" فبیحا کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ حمیرا بیگم تیزی سے فبیحا کی طرف بڑھیں اور چائے سے جلا فبیحا کا ہاتھ تھام لیا۔

"کن سوچوں میں گم تھیں جو ایسے چونک کر پلٹیں تم۔" حمیرا بیگم نے فبیحا کا جلا ہاتھ الٹ کر دیکھتے ہوئے کہا جو گرم چائے کی وجہ سے جل کر سرخ ہو گیا تھا۔

"ماں وہ بس۔" فبیحا نے کچھ کہنے کو منہ کھولا اور یکدم چپ ہو گئی۔

"کیا ماں کو بتانا ٹھیک ہو گا؟ نہیں امی خوامخواہ پریشان ہو جائیں گی۔" فبیحا نے سوچا۔

"کیا وہ... ؟ بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟" حمیرا بیگم نے فبیحا کے ہاتھ پر ٹیوب لگاتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں ماں وہ بس اسٹڈی کی فکر ہے سمسٹر بھی نزدیک ہے ہیں بس اس لیے اسٹڈی کا سوچ رہی تھی۔" فبیحا نے دماغ میں آئی سوچوں کو جھٹکتے ہوئے ماں کو جواب دیا۔

"اسٹڈی کے لیے اتنا بھی مت سوچا کرو خوامخواہ سر پر سوار کر لیتی ہو ــــ لے کر اپنا ہاتھ جلا ڈالا جاؤ تم میں بنا کر لاتی ہوں۔" ماں کا دھیان بٹنے پر فبیحا نے سکون کا سانس لیا اور کچن سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼
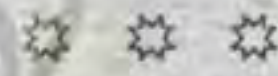
"السلام علیکم شہلا یہ آنسرا نہیں آئی کیا تمہارے ساتھ؟ تم اکیلی کیوں کھڑی ہو؟" فبیحا کلاس میں آئی شہلا کو اکیلے کھڑے دیکھا تو پوچھا۔

"نہیں آنسرا کے ماموں اچانک اسے لینے آ گئے تو اسے گھر جانا پڑا۔ کہہ تو رہی تھی میں نے فبیحا کو میسج کر دیا ہے، لیکن پھر بھی تمہیں کہہ دوں کہ سر جو پڑھائیں اپنے ساتھ اس کے بھی نوٹس لکھ لینا۔" شہلا نے آنسرا کا پیغام فبیحا کو دیا تو فبیحا نے فوراً بیگ سے سیل نکال کر آئے میسجز میں سے آنسرا کا ٹیکسٹ پڑھا۔

"اوہ... میں نے اس کا ٹیکسٹ اب پڑھا ہے۔" فبیحا نے شہلا کو دیکھ کر کہا۔

"کوئی بات نہیں چلو آج تو سر حافظ آئے ہوئے ہیں ٹائم ہو گیا ہے آتے ہی ہوں گے ہم پہلے سے سیٹ پر بیٹھتے ہیں۔" شہلا نے کہا اور دونوں اپنی سیٹس کی طرف بڑھ گئیں۔ سر کلاس میں آئے تو سب اسٹوڈنٹس اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ ابھی سر نے لیکچر شروع ہی کیا تھا کہ "مے آئی کم ان سر۔" کی آواز پر سب چونک گئے رابعہ شاہ ــــ کمرے میں آنے کی اجازت چاہ رہی تھی۔

"یس کم ان ہری اپ۔" سر نے جواب دیا۔

رابعہ اندر آئی اور فبیحا کی دائیں طرف پڑی خالی سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ باقی سب کے ساتھ فبیحا نے بھی ایک نظر رابعہ کو دیکھا اور سر کی طرف متوجہ ہو گئی جنہوں نے لیکچر شروع کر دیا تھا۔

"ایں یہ تمہارے ہاتھ پہ کیا ہوا؟" جیسے ہی فبیحا نے سر کا لیکچر نوٹ کرتے ہوئے اپنا بایاں جلا ہوا ہاتھ رجسٹر پر رکھا تو رابعہ نے ہاتھ اپنی گرفت میں لے کر پوچھا۔

"یہ کیسے اتنا جل گیا؟" فبیحا نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو رابعہ نے پھر سوال کر ڈالا۔

"رابعہ میرا ہاتھ چھوڑو مجھے لیکچر نوٹ کرنا ہے۔" فبیحا نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"کیسے تم نے اپنا ہاتھ جلا لیا۔" رابعہ جھکی اور اپنے لب فبیحا کے جلے ہاتھ پر رکھ دیے۔ فبیحا کا ہاتھ اچانک اٹھا اور رابعہ کے رخسار پر اپنا نشان چھوڑ گیا۔

پوری کلاس میں یک دم خاموشی ہو گئی سر بھی خاموش کھڑے رہ گئے جیسے ہی رابعہ نے فبیحا کا ہاتھ چھوڑ کر اپنا ہاتھ اپنے رخسار پر رکھا فبیحا اپنی سیٹ سے کھڑی ہو گئی۔

"کیا مسئلہ ہے یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" کچھ لمحوں بعد سر ڈائس سے ہٹ کر فبیحا کی سیٹ کے پاس آ کر بولے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے یا یہ کیا مسئلہ ہے سر آپ یہ رابعہ سے پوچھیں یہ بہت بہتر طریقے سے آپ کو بتائے گی۔ پورے لیکچر میں مسلسل یہ مجھے ڈسٹرب کر رہی ہے نہیں، میں کچھ بھی ڈھنگ سے نوٹ نہیں کر پائی ہوں۔" فبیحا نے خود پہ کنٹرول رکھ کر سر کو جواب دیا۔

"واٹ از دس مس شاہ؟" سر حافظ نے رابعہ سے سوال کیا۔

"نو سر کچھ نہیں سوری فور ڈسٹربنس۔" رابعہ نے کہا اور اپنے رجسٹر پر جھک گئی۔ سر نے رابعہ کی طرف دیکھا اور فبیحا سے کہا۔

"فبیحا آپ اگلی رو میں بیٹھ جائیں۔" فبیحا نے اپنی بکس اٹھائیں اور سمیرا کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ خود پہ کنٹرول کرتے آنسو پینے کی کوشش میں دو آنسو آنکھوں سے نکل کر نقاب میں جذب ہو گئے۔

فبیحا نے پھر سے ذہن سر کی طرف موڑا اور لیکچر نوٹ کرنے لگی۔

سر حافظ کلاس سے گئے تو فوراً" ہی سر فیصل کلاس میں آگئے۔ کوئی بھی فبیحا سے کوئی سوال نہ کر پایا۔ سر نے لیکچر اسٹارٹ کیا تو سب خاموشی سے نوٹ کرنے لگے۔

"جو لڑکی پردے میں قیامت ہو تو وہ بنا پردے کے کیسی لگتی ہوگی۔" رابعہ نے پھر لیکچر کے دوران فبیحا کی طرف آہستگی سے فقرہ اچھالا جو آسانی سے اگلی سیٹ پر بیٹھی فبیحا کے کانوں تک پہنچ گیا تھا۔ رابعہ مسکرا رہی تھی۔

"اسٹینڈ اپ" سر فیصل نے رابعہ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"جی سر۔" رابعہ نے ڈھٹائی سے کھڑے ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"گیٹ آؤٹ۔" سر نے غصے سے کہا۔

"اوکے سر جی۔" رابعہ نے کہا اور کتابیں اٹھا کر کلاس سے نکلنے لگی جب سر نے کہا۔

"آپ ذرا کلاس کے بعد مجھے آفس میں ملیے گا" رابعہ نے ذرا دیر کو ٹھہر کر سنا اور کلاس سے نکل گئی۔ انہوں نے سر جھٹکا اور پھر سے لیکچر دینا شروع کردیا۔ جیسے ہی کلاس ختم ہوئی تمام لڑکیوں نے فبیحا کو گھیر لیا۔

"کیا بات تھی فبیحا کیوں ہوا وہ سب؟" طیبہ نے سوال کیا۔

"میں انہیں کیا بتاؤں ویسے ہی تماشا بن گیا ہے اور تماشا بن جائے گا۔" فبیحا نے سوچا۔

"تمہیں پتا تو ہے کیسی ہے وہ بس اپنی عادت سے مجبور ہو کر وہی حرکات شروع کردیں۔ میں لیکچر نوٹ کررہی تھی تو میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چھڑانا چاہا تو نہیں چھوڑا تب اچانک میرا ہاتھ اٹھ گیا۔" فبیحا نے اصل بات گول کرتے ہوئے آدھی بات بتادی۔

"عجیب مصیبت ہے یہ لڑکی پتا نہیں تہمینہ کیسے اس کے ساتھ ٹائم گزار لیتی ہے۔" سمیرا نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اور سر فیصل سے دیکھا کس طرح بات کی اس نے تب ہی سر نے آفس میں بلایا ہے۔ دیکھنا خیر نہیں اس کی۔" فریحہ نے ڈرے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

اسی وقت رابعہ کلاس میں داخل ہوئی تھی۔ بڑا ہی بے نیازانہ انداز تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"رابعہ سر فیصل نے تمہیں بلایا تھا آفس میں۔ کیا کہا سر نے؟" شہلا نے اونچی آواز میں پوچھا جو لب سننے کی چاہ میں لڑکے بھی خاموش ہوگئے۔

"ارے کہنا کیا تھا۔ میں جانتی ہوں ان حبسوں کی نفسیات اوپر سے سخت اندر سے ایسے ہوتے ہیں جیسے بہتا ہوا پانی۔ یہ سب لڑکے ایک جیسے ہوتے ہیں اوپر سے کچھ اندر سے کچھ۔ سر نے بھی کیا کہنا تھا' میں آفس میں گئی بلانے کی وجہ پوچھی تو ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے میڈم جتنا بولنا ہے اب بول لیں مجھے کوئی مسئلہ نہیں بس ذرا میری کلاس میں خاموش رہا کریں۔" رابعہ نے بڑے ہی لوفرانہ انداز میں ہنستے ہوئے سب کہا۔

"اوبی بی مس شاہ ذرا تمیز کے دائرے میں بات کیا کریں آپ' یہ آپ کی دوستیں ہی آپ کو برداشت کرسکتی ہیں ہم بوائز کے متعلق ایسے کچھ کہا تو ہم بھی پھر چپ رہنے والوں میں سے نہیں ہیں۔" لڑکے تقریباً" سب ہی غصہ میں تھے' لیکن خرم نے غصے میں بلند آواز میں رابعہ کو چلا کر کہا تھا۔

بات بڑھتی دیکھ کر طیبہ اور عبداللہ نے درمیان میں پڑ کر بات رفع دفع کرائی تب سب خاموش ہوئے۔

"تہمینہ تم پلیز اسے باہر لے جاؤ۔" طیبہ نے تہمینہ سے رابعہ کو باہر لے جانے کے لیے کہا۔ دونوں کلاس سے باہر گئیں تو سب سکون کا سانس لیتی ہوئی اپنی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"یہ لڑکی تو جان کا وبال بنتی جارہی ہے۔ مجھے لگتا ہے مینجمنٹ تک اس کی شکایت کرنی پڑے گی۔" طیبہ نے پریشانی سے کہا۔

"غلطی تو کہتی ہوں جیسے فبیحا نے اسے ایک جھانپڑ رسید کیا ہے ایسے ہی دو چار اسے اور پڑنے چاہئیں تب ہی عقل ٹھکانے آئے گی اس کی۔" فریحہ نے کہا تو سب ہی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ فبیحا خاموش تھی یونیورسٹی ٹائم خیریت سے ختم ہوجانے کی منتظر تھی اور نادیہ پورے وقت میں بہت خاموش رہ کر فبیحا کو دیکھ رہی تھی۔ جانے کیا تھا جو وہ ایسے دیکھتی تھی شاید کچھ الگ لگتا تھا اسے۔

☼ ☼ ☼

"فبیحا اٹھو بیٹا روز تو ٹائم پر خود ہی ریڈی ملتی تھیں آج ٹائم کم رہ گیا ہے۔ اب اٹھ جاؤ۔"

"امی آج یونیورسٹی میں اسٹرائک ہے کلاسز نہیں ہوں گی' میں نہیں جارہی۔" زندگی میں پہلی بار فبیحا نے کمبل میں منہ چھپاتے ہوئے ماں سے جھوٹ بولا تھا۔

"اوہ۔۔۔ پھر ٹھیک ہے اچھا ہے ایک دن آرام کا مل گیا تم اور سولو۔" حمیرا بیگم نے کہا اور کمرے سے نکل گئیں دوسرے دن حمیرا بیگم فبیحا کو اٹھانے آئیں تو فبیحا بستر سے اٹھ بیٹھی۔

"امی مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟" فبیحا نے ہمت کرتے ہوئے ماں سے کہا۔

"ہاں بولو جلدی' لیکن ٹائم کم ہے تم بستر چھوڑ کر اٹھ جاؤ اب۔" حمیرا بیگم کھڑکیوں کے پردے ہٹاتے ہوئے مصروف سے انداز میں گویا ہوئیں۔

"امی مجھے یونیورسٹی نہیں جانا ہے۔" فبیحا نظریں جھکائے بولی۔

"کیا مطلب۔۔۔ یونیورسٹی نہیں جانا ہے؟ سمسٹر تمہارے نزدیک ہیں' تو ان چھٹیوں کا مطلب؟" حمیرا بیگم نا سمجھی کے عالم میں سوالیہ نظروں سے دیکھتی بیٹی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"مجھے پتا ہے میری اسٹڈی کا حرج ہورہا ہے۔ لیکن کلاس میں پرابلم ہے۔ جس کی وجہ سے میں جاتے ہوئے گھبرا رہی ہوں۔" فبیحا نے تیزی سے کہا۔

"کیا پرابلم ہے بتاؤ مجھے؟" حمیرا بیگم نے پوچھا۔

"امی میری کلاس فیلو ہے رابعہ شاہ وہ میرے لیے بہت پرابلم پیدا کررہی ہے۔" پھر فبیحا نے شروع سے آخر تک سب حمیرا بیگم کو بتادیا۔ حمیرا بیگم حیرت سے بیٹی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"کیا اتنا کچھ ہوگیا اور تم نے کسی کو کچھ بتایا ہی نہیں اپنے ڈیپارٹمنٹ کی مینجمنٹ کو جاکر کہنا تھا۔" حمیرا بیگم حیرت بھرے لہجے میں بولیں۔

"امی میں کیسے کہہ دیتی ان کو جاکے ویسے ہی کلاس میں میرا اتنا تماشا بن گیا۔ پھر پورے ڈیپارٹمنٹ کے سامنے تماشا بن جاتا اور وہ لڑکی مجھے نہیں لگتا کسی سے ڈرتی ہے وہ سر کے کلاس میں ہوتے ہوئے اتنی گھٹیا حرکات کرتی ہے۔" فبیحا نے ماں سے کہا۔

"لیکن بیٹا۔" حمیرا بیگم نے فبیحا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیا؟ مجھے تو خود کچھ سمجھ نہیں آئی۔ جس انداز سے وہ بولتی ہے۔ جس انداز سے وہ دیکھتی ہے۔ مجھے بہت ناگوار گزرتا تھا۔ میں بہت پریشان تھی۔ تب ہی میں اپنی اسٹڈی کا حرج کیے گھر بیٹھی ہوں۔" فبیحا پریشانی سے بولی۔

"اوکے بیٹا آپ خود کو ریلیکس کرو میں کچھ سوچتی ہوں۔ آپ کے بابا سے بات کرتی ہوں۔ مجھے امید ہے وہ بہت اچھے طریقے سے اس مسئلے کا حل سوچ لیں گے۔" حمیرا بیگم نے تسلی بھرے انداز میں بیٹی کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"اب موڈ ٹھیک کرو اور اٹھو میرے ساتھ چلو ناشتا کرو سب کے ساتھ۔" حمیرا بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"جی امی آپ چلیں میں آتی ہوں فریش ہولوں ذرا۔" فبیحا نے جواب دیا۔

فریش ہوکر جیسے ہی فبیحا ڈائننگ ٹیبل پر پہنچی عنادل اور ناصر علی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے فبیحا آج پھر آپ یونیورسٹی نہیں جارہیں کیا؟" ناصر علی نے چائے کا سپ لیتے ہوئے

سوال کیا۔

"بابا کل سے جاؤں گی۔" فبیحا نے نظریں جھکائے جواب دیا۔

"لیکن کیوں؟" عنادل نے بھی سوال کیا۔ تب حمیرا بیگم نے جو کچھ فبیحا نے انہیں بتایا وہ سب ناصر اور عنادل کو بتادیا۔

"واٹ نان سینس۔۔۔ مسئلہ کیا ہے اس گھٹیا لڑکی کے ساتھ پوچھتیں اس سے۔" عنادل نے غصے سے پوچھا۔

"بھیا میں نے پوچھا تھا۔ لیکن وہ چیپ حرکتیں کرنا شروع ہوگئی۔" فبیحا نے شرمندگی بھرے لہجے میں نظریں جھکائے عنادل کو بتایا۔

"تو ٹھیک ہے تم ڈر کے گھر کیوں بیٹھ گئی ہو پہلے ہی ہمیں بتادیتیں تو پہلے دن ہی اس کا بندوبست کردیتا میں اٹھو تم تیار ہو۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ دیکھ لوں گا اسے۔" عنادل نے جارحانہ انداز میں تیزی سے کہا۔

"عنادل بیٹا یہ غصہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ فبیحا بیٹا آپ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی کسی فی میل ٹیچر کو یہ سب بتائیں وہ خود نبٹ لیں گی۔" خاموش بیٹھے ناصر علی نے پانی کا گلاس عنادل کی طرف بڑھاتے ہوئے فبیحا سے کہا۔

"ٹھیک ہے بابا میں اپنی کلاس کی GR کو سب بتا دیتی ہوں وہ خود میم سے بات کرے گی پھر میم جو کریں گی دیکھ لیں گے۔" فبیحا نے چائے کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے باپ کو جواب دیا۔

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" حمیرا بیگم نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے ناصر علی کی طرف نظریں کیں جو خود بھی ہاں میں سر ہلا رہے تھے۔

"ٹھیک ہے تم یہ کرکے دیکھ لو وہ باز آتی ہے تو ٹھیک ورنہ پھر ہم اپنے طریقے سے بات کرلیں گے۔" عنادل نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

فبیحا نے طیبہ کو کال کرنے کا سوچ کر سیل فون اٹھایا ہی تھا کہ طیبہ کی کال آگئی۔

"میں ابھی تمہیں ہی کال کرنے والی تھی کہ۔" فبیحا نے کال پک کرکے سلام کے بعد طیبہ سے کہا۔

"ہاہاہا۔۔۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ چلو میں نے کرلی۔" طیبہ نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا تم یہ بتاؤ تم آج بھی کلاس لینے کیوں نہیں آئیں۔" طیبہ نے ساتھ ہی پھر سوال کیا۔

"ہاں وہ بس رابعہ کی وجہ سے اس کی گھٹیا حرکتیں بڑھتی ہی جارہی تھیں تو میں ڈر گئی اور گھر بیٹھ گئی۔" فبیحا نے طیبہ کو بتایا۔

"ارے تم اس کی فکر مت کرو بلکہ ڈر ختم کرو۔ اس کی ہم نے چھٹی کرادی ہے۔" طیبہ نے فبیحا کی بات کے جواب میں بڑے ریلیکس انداز میں کہا تھا۔

"چھٹی کرادی؟ کیا مطلب، تم کھل کے بتاؤ نا۔" فبیحا نے ناسمجھی کے عالم میں پوچھا۔

"تم فرائیڈے کو یونیورسٹی نہیں آئیں تو۔ رابعہ شاہ نے ہم سے تمہارا پتا کیا۔ ہم خود نہیں جانتے تھے تم کیوں نہیں آئیں ہم نے لاعلمی کا اظہار کیا تو بی بی نے فوراً" ہی تمہارا نمبر ہم سے مانگا ہم نے دینے سے انکار کردیا۔ ہم سے مایوس ہوکر وہ آفس پہنچ گئی۔ تمہارا نمبر مانگا لیکن میڈم نے کہا ہم کسی کا نمبر کسی کو نہیں دے سکتے تو اپنی عادت کے مطابق رابعہ بھڑک اٹھی اول فول بکنے لگی۔ میڈم نے مجھے اور "سی آر" کو آفس میں بلایا۔ رابعہ بھی وہاں موجود تھی۔ میڈم نے ہمیں سب بتایا تو ہم نے بھی رابعہ کی تمام حرکتوں کا بتادیا۔ یہ بھی کہ اس نے تمہیں کس طرح تنگ کیا۔ میڈم بہت زیادہ غصہ میں تھیں فوراً" ہی ایکشن لیا۔ رابعہ کو ہی یونیورسٹی سے فارغ کردیا۔ تب سے آج تک وہ یونیورسٹی نہیں آئی ہے۔" طیبہ نے تفصیل سے سب بتایا۔

"اوہ ویری گڈ یہ تو اچھا ہوا شکر جان چھٹی۔" فبیحا نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے طیبہ سے کہا۔

"ہاں نا۔" طیبہ نے فوراً" ہی کہا۔

"او ہاں یاد آیا تم کیوں کال کرنے والی تھیں؟" طیبہ نے پوچھا۔

"رابعہ ہی کا بتانا تھا۔ لیکن بتانے سے پہلے تم نے ہی خوش خبری سنادی۔" فبیحا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ باقی سب کیسی ہیں؟" فبیحا نے جلدی سے سوال کیا۔

"ہاں سب ٹھیک ہیں۔ اگلی کلاس کا ٹائم شروع ہونے والا ہے۔ پھر بات کروں گی اور ہاں تم کل ضرور کلاس میں ملو مجھے سمجھیں۔" طیبہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں ان شاءاللہ۔" فبیحا نے جواب دیا۔

"اوکے۔۔۔ پھر اللہ حافظ۔" طیبہ نے کہا اور کال ڈس کنیکٹ کردی۔

"امی۔۔۔ امی۔۔۔" سیل رکھ کر فبیحا ماں کے پاس آکر بولی۔ حمیرا بیگم جو دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگی تھیں۔ فوراً" ہی فبیحا کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"جی بیٹا۔" حمیرا نے فبیحا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"امی ابھی طیبہ نے مجھے کال کی تھی۔ اس نے سب میڈم کو بتادیا ہے اور میڈم نے فوری ایکشن لیتے ہوئے رابعہ کو یونیورسٹی سے نکال دیا۔" فبیحا نے خوشی سے بھرپور لہجے میں ماں کو طیبہ سے ہوئی سب بات تفصیل سے بتادی۔

"چلو جان بچی سو لاکھوں پائے۔" حمیرا بیگم نے لمبی سانس لے کر کہا۔ "لیکن دکھ بھی ہے اگر وہ لڑکی آرام سے رہتی تو اپنی تعلیم مکمل کرسکتی تھی۔ لیکن اپنی حرکتوں کی وجہ سے پڑھائی سے ہاتھ دھو بیٹھی۔" حمیرا بیگم نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

"جی امی یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" فبیحا نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اچھا چلو اب تم فارغ تو ہو ماسی کو دیکھ لو۔ وہ کمروں کی صفائی کررہی ہے۔ تم ٹھیک سے کرالو سب۔" حمیرا بیگم نے کہا۔

"جی امی ٹھیک ہے میں جاتی ہوں۔" فبیحا نے کہا اور کچن سے نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

رات کے کسی پہر نیند میں کچھ شور سنائی دیا تھا۔ تب ہی فبیحا کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو وہ سمجھ ہی نہ پائی یہ سب کیا ہورہا ہے۔ کچھ دیر بعد جب حواس مکمل طور پر بیدار ہوئے تو گھبرا کر بستر سے نکل کر ننگے پاؤں کمرے سے باہر آئی تھی۔

فبیحا کمرے سے نکلی تو عنادل کو فون پر کسی سے بات کرتے دیکھا۔

"فبیحا بابا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ہمیں ان کو فوراً" ہاسپٹل لے کر جانا ہوگا۔" فبیحا کے قدموں تلے سے اچانک ہی زمین سرکی تھی۔

وہ ناصر علی کے کمرے کی طرف بھاگی جہاں حمیرا بیگم پریشانی کے عالم میں ناصر علی کا سینہ مسل رہی تھیں۔

"بابا، بابا کیا ہوا آپ کو؟" فبیحا بھاگ کر بے سدھ پڑے ناصر علی کا کندھا ہلا کر پوچھ رہی تھی۔

"امی میں نے گاڑی نکال لی ہے۔ اسپتال میں ہارون کو کال کردی ہے۔ وہ باقی ڈاکٹرز کو فوری بلا رہا ہے۔ ہم نے بابا کو وہیں لے کر جانا ہے۔" عنادل نے خود پر ضبط کرتے ہوئے دھیمی سی آواز میں کہا۔

ناصر علی کو گاڑی میں ڈال کر فوراً" اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں ڈاکٹرز پہلے ہی سب تیاری کیے ان کے منتظر تھے۔ عنادل ICU کے دروازے کے باہر کھڑا شیشے میں سے باپ کو مختلف مشینوں میں جکڑے دیکھ رہا تھا۔ فبیحا اور حمیرا بینچ پر بیٹھ کر مسلسل دعاگو تھیں کالی تاریک رات پریشانی میں گزر گئی تھی۔ فجر کی اذان ہوئی تو حمیرا بیگم اور فبیحا وضو کرکے ٹھنڈے فرش پر ہی خدا کے حضور سربسجود ہوگئی تھیں۔

خدا کے کرم اور دعاؤں کا اثر تھا کہ ICU کا دروازہ کھلا۔ کئی ڈاکٹر ایک ساتھ باہر آئے تھے۔

"ہارون کیا ہوا، بابا ٹھیک تو ہیں نا؟" عنادل ڈاکٹر ہارون کی طرف بڑھا تھا۔

"شکر ہے اللہ کا انکل اب ٹھیک ہیں۔ ہارٹ اٹیک

جان لیوا تھا۔ لیکن کرم ہو گیا اللہ کا اب انکل کی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ تم نے اچھا کیا جو فوراً" ہی انکل کو ادھر لے آئے۔" ڈاکٹر ہارون' عنادل کے ساتھ چلتے ہوئے تفصیل بتا رہا تھا۔

ناصر علی کو ہوش آیا تو حمیرا اور فبیحا اندر چلی گئی تھیں۔ عنادل بھی ڈاکٹر ہارون سے سب تفصیل معلوم کر کے ان کے پاس آگیا تھا۔ جہاں ناصر علی پہلے سے بہتر حال میں تھے۔

فبیحا باپ کے پاس بیٹھی مسلسل رو رہی تھی۔

"بیٹا اب تو میں ٹھیک ہوں نا۔" ناصر علی نے عبائے میں چھپی فبیحا کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی دن نکل آیا ہے۔ آپ فبیحا کے ساتھ اب گھر چلی جائیں خود فریش ہوں۔ ناشتا بنا کر مجھے بتا دیجیے گا۔ میں آکر لے جاؤں گا۔" عنادل نے کہا۔

"میں تو یہیں رکتی ہوں تم ایسا کرو فبیحا کے ساتھ گھر چلے جاؤ۔ یہ ناشتا بنا دے گی تمہیں پھر تم ادھر آجاؤ گے تو میں گھر چلی جاؤں گی۔" حمیرا بیگم بولیں۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ چلو فبیحا پھر ہم گھر چلتے ہیں۔" عنادل نے فبیحا سے کہا۔ فبیحا نے باپ سے پیار لیا اور عنادل کے ساتھ گھر آگئی۔

☼ ☼ ☼

پورے تین دن اسپتال رہنے کے بعد ناصر علی کو جب گھر شفٹ کیا گیا۔ تب جاکر سب نے سکون کا سانس لیا۔ ناصر علی اب پہلے سے بہت بہتر تھے۔ آنے جانے والوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ ناصر علی کی عیادت کے لیے بہت سے مہمان آرہے تھے۔ مصروفیت بڑھ گئی تھی پھر جب ناصر علی مکمل طور پر صحت یاب ہو گئے تو فبیحا نے اگلے دن سے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا۔

آج پورے ہفتے بعد فبیحا یونیورسٹی آئی تھی۔ اپنے یونیورسٹی نہ آنے کی وجہ وہ پہلے ہی سب کو بتا چکی تھی۔ اس لیے جیسے ہی کلاس میں داخل ہوئی سب ہی فیلوز نے اس سے ناصر علی کی طبیعت کا پتا کیا تھا۔ سب کو بابا کی طبیعت کا بتاتے ہوئے فبیحا چونک کر بولتی ہوئی چپ ہوئی تھی۔

"یہ کیا شہلا' تمہارا عبایا تمہارا نقاب کدھر ہے؟ اتار کیوں دیا؟" فبیحا نے بڑی بے حیرت سے شہلا سے سوال کیا تھا جو عبائے کے بغیر کانوں میں بڑے بڑے ایئر رنگ ڈالے ہلکا سا میک اپ کیے بلیک ڈریس میں دوپٹا اوڑھے کھڑی تھی۔

"بس یار عبائے میں تھوڑی الجھن ہوتی تھی تو اتار دیا۔" شہلا نے لاپروائی سے جواب دیا۔

لیکچر ختم ہونے کے بعد فبیحا نے تمام اپنی دوستوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے کہا تھا۔

"دوستو بابا کی صحت یابی کی خوشی میں ہم نے گھر پر میلاد شریف کا اہتمام کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ سب میرے گھر میلاد میں آئیں۔" تقریباً" سب ہی نے ہامی بھری تھی۔

"سوری یار میں نہیں آسکتی۔" نادیہ نے کہا اور ایکسکیوز کرتی روم سے چلی گئی۔

"اسے کیا ہوا؟" فبیحا نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ نہیں آئے گی فبیحا یہ ہندو ہے۔" سعدیہ جو نادیہ کی بیسٹ فرینڈ تھی۔ نے فبیحا کے پاس آکر جیسے پٹاخہ پھوڑا تھا۔

"کیا' کیا نادیہ ہندو؟ تمہیں کیسے پتا۔" سعدیہ کی بات پر فبیحا نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"مجھے پتا ہے میں اس کی دوست ہوں یار۔ کئی بار اس کے گھر گئی ہوں اچھی طرح جانتی ہوں۔" سعدیہ نے اسی انداز میں جواب دیا تھا۔

"یہ تب ہی اتنا خاموش رہتی ہے کسی سے گھلتی ملتی نہیں ہے بلکہ فبیحا یہ مسلمانوں پہ اکثر ہنستی ہے بھی کبھی مجھے یہ ٹھیک بھی لگتا ہے۔ ہم مسلمانوں کا حال بھی تو ایسا ہے۔ جھوٹ بولتے ہیں جبکہ میں نے نادیہ اور اس کی فیملی کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں پایا۔ میں اس کے گھر جاتی ہوں' وہاں میری نماز رہ جاتی ہے۔ لیکن یہ لوگ پوجا پاٹ ٹائم پہ کرتے ہیں روز۔ ہاں یہ نادیہ اپنی فیملی سے کچھ الگ ہے۔ پوجا پاٹ میں کم بیٹھتی ہے اور اب تو بہت خاموش رہنے لگی ہے پتا نہیں کیوں۔" سعدیہ نے تفصیل سے بتایا تھا۔

"لیکن اس نے کبھی نہیں بتایا اور اس کا نام نادیہ مسلمانوں والا کیوں؟" فبیحا نے پھر الجھے لہجے میں پوچھا۔

"بچپن سے یہ لوگ یہیں رہتے ہیں بلکہ یہ تو پیدا ہی پاکستان میں ہوئی تو اس وجہ سے نادیہ نام رکھا۔ مکمل نام نادیہ نین ہے۔ ایک بہن بھی ہے جس کا نام نیہا ہے۔ نادیہ کو گھر میں نیناں کہتے ہیں۔" سعدیہ نے پھر جواب دیا۔

"اف آج کے دن نہ جانے کتنے انکشاف ہونے باقی ہیں۔" فبیحا نے سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ پاک میں نہیں جانتی لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا ہے۔ نادیہ بھی میرے گھر میلاد پر آئے۔" فبیحا نے دل میں سوچا۔ پھر سارا وقت وہ نادیہ پر غور کرتی رہی تھی۔ آج اسے نادیہ کا غور سے اسرار بھری نظروں سے دیکھنا سمجھ میں آیا تھا۔ شاید نادیہ کا دل تبدیل ہو رہا تھا۔ کہیں کوئی اشارہ ہونے کی دیر تھی۔ کلاس ختم ہونے کے بعد فبیحا' نادیہ کے پاس گئی اور سرسری انداز میں سوال کیا۔

"نادیہ تم میرے گھر کیوں نہیں آرہی ہو؟"

"کچھ نہیں فبیحا۔ بس ویسے ہی۔ میں کبھی کسی کے گھر نہیں گئی' سوائے سعدیہ کے۔"

"ہاں مجھے آج سعدیہ نے ہی تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ نادیہ میں کچھ کہوں' تم برا مت منانا۔ نادیہ بے شک ہم ایک مذہب سے تعلق نہیں رکھتے تو کیا ہوا ہمارا انسانیت کا رشتہ تو ہے نا؟ ہم ایک دوسرے کی خوشی میں غم میں تو شریک ہو سکتے ہیں نا؟ اور انسانیت کے ناتے اگر تم کل میرے گھر آؤ گی تو مجھے بہت خوشی ہو گی اور... نادیہ..." یہ کہہ کر وہ درمیان میں چپ ہوئی تو نادیہ نے فوراً" پوچھا تھا۔

"اور... اور کیا فبیحا؟" فبیحا نے اس کی طرف دیکھا پھر کہا۔

"اور شاید تمہیں تمہارے سوالوں کے جواب بھی مل جائیں۔" نادیہ نے بے اختیار چونک کر اسے دیکھا تھا۔ پھر آرام سے بولی۔

"میں کوشش کروں گی۔"

"تم کوشش کرو گی اور میں دعا کہ تم کو حق کا راستہ مل جائے۔" فبیحا نے کہا اور واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے اور نادیہ اس کو دیکھتی رہ گئی۔

"جس بات کو میں خود سے چھپاتی پھر رہی تھی وہ بات' وہ الجھن میرے بغیر کہے فبیحا نے کیسے جان لی۔" نادیہ حیرت سے سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"کیوں میرا دل چاہ رہا ہے میں بھی فبیحا کے گھر جاؤں۔" نادیہ کتاب ہاتھ میں لیے سوچوں میں گم تھی۔ ایسا تو میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ مسلمانوں میں اٹھنا بیٹھنا رہا۔ میری سب ہی دوستیں مسلمان تھیں۔ کبھی ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔ پھر اب ایسا کیوں ہے۔ کیوں فبیحا کو دیکھ کر دل میں عجیب سی فیلنگ آجاتی ہیں۔ کیوں میں ان کے اللہ اور اپنے بھگوان کے فرق کو سوچنے بیٹھ جاتی ہیں۔ کچھ تو ہے ایسا جب ہی دل میں خود بخود اس کے لیے عزت سمائی جاتی ہے۔

ایسا کیوں ہے۔ کیا اس کا پردہ کرنا مجھے متاثر کر رہا

ہے؟ لیکن پردہ تو شہلا بھی کرتی تھی پھر سمیرا بھی تو پردے میں ہوتی ہے۔ نہیں فبیحا کی آنکھوں میں جو تاثر ہوتا ہے نادو۔۔۔ وہ مجھے متاثر کرتا ہے۔ وہی تاثر مجھے اس کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ لیکن وہ تاثر کیا ہے؟ ایک ہی کلاس میں ہم آٹھ لڑکیوں میں ایک میں ہندو ہوں تو سات مسلمان ہیں۔ ان سات میں سے رابعہ' شہلا مسلمان ہوتے غلط کام کرسکتی ہیں تو مسلمان تو فبیحا بھی ہے۔ ایسا کیا ہے پتا نہیں کیوں میں اتنا سوچنے لگی ہوں۔ نادیہ سر پکڑے بیٹھی عجیب دوراہے پر کھڑی تھی۔ جہاں وہ سوچ میں تھی۔ وہ ایسے کیوں سوچ رہی ہے۔ شاید کاتب تقدیر نے عرش معلی پہ فیصلہ کرڈالا تھا۔ کہیں کچھ اچھا ہونے والا تھا۔

گھر آکر نادیہ ریٹا کے سامنے کھڑی تھی۔

"مجھے اپنی یونیورسٹی فیلو کے گھر جانا ہے۔ کیا میں جاسکتی ہوں؟" نادیہ نے ماں سے اجازت مانگی تھی۔

"کیوں جانا ہے ان کے گھر؟" ریٹا نے پوچھا۔

"ممی اس کے بابا کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ اب وہ بہتر ہیں تو ان ہی کی عیادت کے لیے سب فیلوز ان کے گھر جارہی ہیں تو ساتھ مجھے بھی چلنے کا کہا ہے۔" نادیہ نے وضاحت دی۔

"ٹھیک ہے لیکن جاؤ گی کیسے؟" ریٹا نے نادیہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کل جانا ہے۔ ممی فرسٹ دو پیریڈز کے بعد سب ہی ایک ساتھ یونیورسٹی سے ان کی طرف جائیں گی۔" نادیہ نے بتایا۔

"ٹھیک ہے چلی جانا۔" ریٹا نے اجازت دے دی۔

★★★

"طیبہ ہم فبیحا کے گھر جائیں گے کیسے؟" سعدیہ نے کلاس سے فری ہوکر طیبہ سے سوال کیا۔

"فبیحا نے مجھے اپنے گھر کا ایڈریس سمجھایا تھا اور جہاں اس نے گھر بتایا وہاں میری خالہ کا گھر بھی ہے۔ میں کئی دفعہ ادھر گئی ہوں۔ اس لیے ہم اس کے گھر آسانی سے جاسکتے ہیں۔" طیبہ نے تفصیل سے بتاکر ان کی پریشانی دور کی تھی۔ طیبہ کے بتانے پر سب مطمئن ہوگئے۔ پھر سب دوستیں طیبہ کی گاڑی میں فبیحا کے گھر پہنچ گئیں۔

گیٹ پر پہنچ کر طیبہ نے گاڑی کا ہارن دیا تو گیٹ کے باہر بیٹھے چوکیدار نے پاس آکر ان سے ان کا نام پوچھا۔ طیبہ نے اپنا بتایا تو چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ طیبہ گاڑی اندر لے آئی۔ گیٹ سے دائیں طرف بنے پورچ میں گاڑی پارک کی تو سب اتر کر باہر نکل آئیں اور چاروں طرف دیکھنے لگیں۔ دائیں طرف پورچ سے پرے سرسبز درختوں اور پھولوں سے بھرا لان تھا بائیں طرف لمبا سا کوریڈور تھا۔ جس کے ساتھ ہال کمرہ تھا۔ سب ہی ہال کی طرف بڑھ گئیں۔

اندر محفل شروع ہوچکی تھی۔ سب خواتین زمین پر بچھے قالین پر بیٹھی تھیں یہ سب بھی اندر آکر ایک طرف خالی جگہ دیکھ کر بیٹھ گئیں۔ فبیحا کو ان کے آنے کی اطلاع ملی تو کچھ دیر بعد وہ ان کے پاس آکر سامنے بیٹھ گئی۔

"ٹھیک سے پہنچ گئیں نا تم لوگ؟ گھر ملنے میں کوئی دشواری کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟" سب حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ فبیحا کو دیکھ رہی تھیں۔ فبیحا ہولے سے مسکرادی۔

"اتنا حیران ہوکر مت دیکھو یہ میں ہی ہوں فبیحا ناز۔"

طیبہ' شہلا' سمیرا' فریحہ' نادیہ' سعدیہ' تہمینہ سب فبیحا کو دیکھ رہی تھیں جو نماز کے اسٹائل میں دوپٹا لپیٹے ان سے مخاطب تھی۔ گوری رنگت' بڑی بڑی آنکھیں جن پر گھنی پلکوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ بھرے بھرے سے گلابی ہونٹ' بھرا ہوا کتابی چہرہ' کھڑی ستواں ناک سب کچھ ہی تو قابل تعریف تھا۔ خوب صورت متناسب سراپے والی فبیحا واقعی تعریف کیے جانے کے لائق تھی۔

"تم پردہ کرتی ہو تو اچھا کرتی ہو۔" سعدیہ نے مسکرا کر کہا تھا۔ فبیحا ہولے سے مسکرائی۔ پھر نادیہ کو دیکھ کر کہا۔

"نادیہ تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہورہی ہے اور میں دل سے تم سب کی اور نادیہ کی آمد کی مشکور ہوں۔ اب تم سب یہیں بیٹھو۔ مجھے بھی نعت پڑھنی ہے۔ اب میلاد کے بعد ملاقات ہوگی۔" فبیحا نے کہا اور اٹھ کر سامنے جاکر بیٹھ گئی۔

کچھ ہی دیر میں فبیحا نے نعت پڑھنی شروع کی تھی۔

محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کا روضہ قریب آرہا ہے

بلندی پہ اپنا نصیب آرہا ہے
فرشتوں یہ پیغام ان کو دے دو
کہ خادم تمہارا قریب آرہا ہے

بہت خوب صورت لب و لہجے میں فبیحا نے نعت پڑھنی شروع کی تھی۔ ہال میں موجود تمام خواتین عقیدت سے نظریں جھکائے نعت کے بولوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ سب میں صرف نادیہ تھی جو نظریں اٹھائے فبیحا کی طرف یک ٹک دیکھے جارہی تھی۔ اس وقت فبیحا سب سے الگ کوئی آسمان سے اتری مخلوق لگ رہی تھی۔ جس کے گرد نور کا ایک ہالہ تھا۔ اتنا نور کہ نادیہ نظریں ہٹا ہی نہیں پارہی تھی۔

تمہیں کچھ خبر ہے کہاں جارہا ہوں
رسول خدا ہیں وہاں جارہا ہوں
تمہیں کچھ خبر ہے میں کیا پارہا ہوں
محبت کا ان کی مزا پارہا ہوں
چلو جاکر رہنا مدینہ میں اب تو
قیامت کا منظر قریب آرہا ہے
خبر جاکے دے دو ان کو فرشتوں
کہ خادم تمہارا قریب آرہا ہے

فبیحا نعت کے بولوں میں گم سب سے بے خبر ایک تڑپ لیے نعت پڑھ رہی تھی۔ اس کی تڑپ میں ایک سکون تھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ اسی شدت سے نعت پڑھ رہی تھی۔ نادیہ جو یک ٹک فبیحا کو دیکھ رہی تھی۔ فبیحا کو دیکھنے میں اس قدر مگن تھی کہ اس کی اپنی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہوگئے اور وہ بے خبر بس دیکھے جارہی تھی۔

محمدؐ کا روضہ قریب آرہا ہے
بلندی پہ اپنا نصیب آرہا ہے

نادیہ نجانے کس جہاں میں پہنچی ہوئی تھی۔ فبیحا نعت ختم کرچکی تھی۔ نعت ختم کرکے فبیحا نے آنکھیں کھول کر حاضرین محفل پر نظر ڈالی۔

فبیحا نے غور کیا تو محسوس کیا نادیہ اسے دیکھ تو رہی تھی' لیکن وہ وہاں سب کے ساتھ محفل میں موجود نہیں لگ رہی تھی ——— کچھ ہی دیر بعد محفل اختتام پذیر ہوئی فبیحا دعا مانگ کر اٹھی اور خاموشی سے ہال سے نکل کر کچن میں آئی جہاں بانو (ملازمہ) کام میں لگی تھی۔

فبیحا بانو کی کام میں مدد کرنے لگی۔ فبیحا آہٹ پر پلٹی تو کچن کے دروازے میں نادیہ کو ایستادہ پایا جو

خاموشی سے کھڑی ـــــ دیکھ رہی تھی۔
"نادیہ! تم یہاں؟ کیا کچھ چاہیے تھا؟" فبیحا نے مسکرا کر پوچھا۔
"نہیں چاہیے تو کچھ نہیں۔ میں بس ویسے ہی آگئی میرا دل چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر تم سے بات کروں۔ تو میں اٹھ کر ادھر آگئی۔"
"ہوں ٹھیک کیا آجاؤ اندر ادھر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" فبیحا نے پلٹتے ہوئے کچن ٹیبل کے ساتھ رکھی چیئر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ نادیہ فبیحا کی بات سنی ان سنی کر کے اس کے پاس آکھڑی ہوئی پھر خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
"کیا بات ہے نادیہ؟ میں نے محسوس کیا ہے یونیورسٹی کے شروع کے دن سے آج تک تم مجھے اس طرح خاموشی سے دیکھ رہی ہوتی ہو کوئی الجھن ہے تو بتاؤ نا۔" فبیحا نے نادیہ کو گم سم پایا تو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے سوال کیا۔
"ہوں، ہاں ہاں میں ٹھیک ہوں۔" نادیہ نے چونک کر جواب دیا۔ پھر فبیحا کو پکارا تھا۔
"فبیحا..."
"ہاں نادیہ بولو نا۔" فبیحا نے پوری توجہ نادیہ پر مرکوز کی تھی۔
"فبیحا تمہارے اللہ اور بھگوان میں کیا فرق ہے؟" نادیہ نے ایک دم ہی سوال کر ڈالا۔ فبیحا مسکرائی تھی جیسے اسے علم ہو نادیہ ایسا ہی کچھ پوچھنے والی ہے۔
"سمجھو تو کوئی فرق نہیں اور اگر سمجھو تو بہت فرق ہے ایک دم آسمان سے زمین جتنا۔ یہ تو دلوں پر منحصر ہے، جو صراط مستقیم پر ہے وہ سیدھے راستے پر ہے اللہ کی طرف ہے اور جو شیطان کے راستے پہ ہو وہ اللہ کو بھگوان بنا دیتا ہے، لیکن میرا ذاتی خیال ہے غیر مذہب کے لوگ بھی در پردہ مخاطب تو اللہ ہی سے ہوتے ہیں۔ اسی سے طلب کرتے ہیں بس وہ سیدھے راستے سے انجان ہوتے ہیں اگر کوئی ان کی اصلاح کر دے، ان کو خیر اور شر میں فرق بتا دے ان کو سیدھا راستہ دکھا دے تو وہ بھی خیر کی طرف پلٹ آئیں۔ وہ اوپر جو ایک ہستی ہے نا وہ اگر توفیق دے تو سب کچھ ہو سکتا ہے وہ بھی جو ناممکن ہے اس کا ایک اشارہ ہو تو سب اس کے راستے کی طرف اس کی طرف پلٹ سکتے ہیں۔
پتا ہے نادیہ اگر اللہ چاہے تو تمام ہندوؤں کو تمام غیر مذہبوں کو ایک اپنے راستے پر لے آئے، لیکن اس نے انسان کے سامنے دو راستے رکھ دیے ایک راستہ وہ جو سیدھا اس کی طرف جاتا ہے اور دوسرا راستہ وہ جو شیطان کا راستہ ہے پھر اس نے انسان کو شعور دیا کہ وہ اپنے لیے ٹھیک راستہ چن لے اور اس چناؤ میں ایک اشارہ ہو تو انسان غلط راستے سے بھی صحیح راستے پر آجاتا ہے۔" فبیحا نے نادیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھاتے ہوئے تفصیلی جواب دیا تھا۔
"اللہ" نادیہ نے آہستگی سے ایک لفظ بولا تھا اور پھر بے اختیار بولتی ہی چلی گئی۔
"اللہ اللہ میرا اللہ"
ایسا لگ رہا تھا جسے وہ کھوج رہی تھی وہ کہیں کہیں فبیحا کے لفظوں میں مل گیا جس اطمینان کی تلاش میں وہ تھی وہ مل گیا ہو۔
"مجھے مل گیا مجھے میرا اللہ مل گیا۔"
"لا الہ اللہ محمد رسول اللہ" نادیہ بے ربط انداز میں کلمہ پڑھ رہی تھی۔
"فبیحا میں نے کتابوں میں ایسے کلمہ پڑھا ہے تم بھی مجھے کلمہ پڑھاؤ۔" تب نادیہ اور فبیحا نے ایک ساتھ پھر کلمہ پڑھا تھا۔
"تم مسلمان ہو گئیں نادیہ میرے سامنے۔ مجھ عام سی ہستی کے سامنے اللہ نے اتنا خاص کام کرایا اللہ اللہ" فبیحا خوشی سے کانپتے ہوئے وہیں زمین پر سجدہ ریز ہو گئی۔
"ہاں مجھے اللہ مل گیا میں مسلمان ہو گئی۔" نادیہ بہت پر سکون تھی۔
فبیحا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اللہ نے کتنے خاص کام کے لیے اس بالکل عام سی ہستی کو منتخب کیا تھا۔ سچ کہا ہے کسی نے اللہ کے کاموں میں کیا مصلحت ہے وہ خود ہی جانتا ہے۔ کلمہ تو نادیہ نے کتابوں میں بھی کئی مرتبہ پڑھا تھا، لیکن اس کا دل آج بدلا تھا اللہ نے آج کا دن منتخب کیا تھا نادیہ کو سمجھ و شعور آج بخشا تھا۔
وہ اللہ ہی ہے جو جب چاہے سب کر دیتا ہے جیسے نادیہ کے سامنے چار لوگ کھڑے کیے فبیحا، سعدیہ، رابعہ اور شہلا۔ ان تین نے اگر غلط اثر ڈالا تو دوسری طرف فبیحا کو لا کھڑا کیا اور فبیحا کے ذریعہ اسے اپنے راستے پر بلا لیا۔ فبیحا بہت احترام سے نادیہ کو دیکھ رہی تھی جب حمیرا بیگم کچن میں آئیں۔ دونوں کو اس طرح کھڑے دیکھا تو پوچھا۔
"کیا بات ہے تم دونوں اس طرح کیوں کھڑی ہو؟"
"امی امی آپ کو پتا ہے نادیہ ہندو تھی اور یہ آج میرے سامنے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوئی ہے۔" فبیحا نے ماں کی طرف دیکھ کر جذبات سے پر انداز میں ماں کو بتایا۔
"ماشا اللہ" حمیرا بیگم نے سن کر بے ساختہ کہا اور آگے بڑھ کر نادیہ کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی چوم لی۔
"بیٹی تمہیں مسلمان ہونا بہت مبارک ہو۔ اللہ تمہیں ایمان پر ثابت قدمی عطا فرمائے۔ تم بہت خوش نصیب ہو نادیہ بیٹی کہ اللہ نے تمہیں ایمان جیسی دولت عطا فرمائی۔ اب ایمان کی دولت پا کر تم مسلمان تو ہو گئیں، لیکن تمہارے گھر والے تو ابھی اس دولت سے محروم ہیں اور وہ اسی وجہ سے تمہیں پریشان بھی کریں گے۔ تمہارے راستے میں مشکلات بھی آئیں گی، لیکن بیٹی تم ثابت قدمی سے اپنے ایمان پر قائم رہنا۔ خیال رہے تمہارا ایمان سلامت رہے تمہارے قدم ڈگمگائیں نہیں۔ اگر تم اس امتحان میں اس جہان میں کامیاب ہو گئیں تو وہ رب العزت اس جہان میں تمہیں اعلا مقام سے نوازے گا۔ تم کسی مشکل سے گھبرانا مت۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جہاں تک ہو سکے گا ہم تمہاری مدد کریں گے۔" حمیرا بیگم نے نادیہ کو اپنے ساتھ کی یقین دہانی کراتے ہوئے پیار سے کہا۔
"جی آنٹی جی بس آپ دعا کیجیے گا۔" نادیہ نے نظریں جھکائے جواب دیا۔
"اب جب اللہ نے اس کو ہدایت بخشی تھی تو ان شاء اللہ نادیہ کے لیے اللہ آگے کا سفر بھی ضرور سہل کرے گا۔ وہ بہت جلد اپنے گھر والوں کو بھی اللہ اور بھگوان کا فرق سمجھا پائے گی۔" اس نے سوچا اور طمانیت سے مسکرا دی۔
"بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے وہ جب انسان کی بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے اپنے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔"
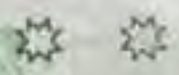
☆ ☆

ریحانہ امجد بخاری

فرزان ایک دن کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو چائے پینے کی نیت سے باہر جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات چند علماء کرام سے ہوتی ہے جو اسے باقاعدگی سے مسجد آنے اور نیک اعمال کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ فرزان کی ان سے بحث ہو جاتی ہے۔ تو تکرار سے بہت سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی دوران پولیس آ جاتی ہے جو ان سب کو پکڑ کر تھانے لے جاتی ہے وہاں پر بھی فرزان پولیس والوں سے عجیب و غریب گفتگو کرتا ہے۔ پولیس والے اسے پاگل قرار دے کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اذان کو ایک اسٹیج پلے کرنے کی آفر ملتی ہے۔ ساری ذمہ داریاں اسی پر ہوتی ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ تیاریوں میں لگ جاتا ہے۔ اسکرپٹ کے مطابق ڈرامے میں ایک لڑکی کی ضرورت ہے مگر ان کی ٹیم میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ ایک دوست رانا فہیم اسے بتاتا ہے کہ وہ ایک ایسی لڑکی کو جانتا ہے جو یہ کردار بہت اچھا کر سکتی ہے۔ اذان اس لڑکی ماہم سے ملتا ہے۔ ماہم بہت پر اعتماد اور خوب صورت لڑکی ہے جو پوری ذمہ داری سے اپنا کام کرتی ہے۔ اذان اس کے حسن اور صلاحیتوں سے متاثر ہو جاتا ہے مگر اس کے سامنے اعتراف نہیں کرتا۔ ماہم اس کے گروپ کے تمام لڑکوں سے فری ہو جاتی ہے اور باری باری سب کو اپنا موبائل نمبر دیتی ہے۔ اذان کو یہ بات بہت بری لگتی ہے۔ مگر وہ اس سے موبائل نمبر نہیں مانگتا۔ اذان کا اسٹیج پلے بہت پسند کیا جاتا ہے مگر اسی دوران اس کے اپنے دوست رانا فہیم سے تلخی ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ماہم اب تمہارے پلے میں کام نہیں کرے گی۔ تم کوئی متبادل انتظام کر لو۔ اذان جیسے تیسے باقی کے پروگرام کرتا ہے مگر وہ ماہم کو بھول نہیں سکا۔ وہ دل ہی دل میں اسے یاد کرتا ہے۔ اس کے دوست اور ٹیم ممبرز اسے بتاتے ہیں کہ ماہم فون پر سب ہی سے بات کرتی ہے لیکن وہ ملنے کے سخت خلاف ہے اور ایک مخصوص حد تک بات کرتی ہے۔ وہ دوستی کرنے کے حق میں نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ جو شخص اس سے مخلص ہوگا اور اس سے شادی کا خواہش مند ہوگا وہ اسی سے تعلق رکھے گی۔ ماہم کے خیالات سن کر اذان کو خوشی ہوتی ہے۔ ماہم کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہوتا ہے اس کی ماں ایک اسکول میں کینٹین چلاتی ہے اور باپ سائیکل پر گھوم کر صبح کے ناشتے کے لیے چھولے بیچتا ہے۔ مگر وہ اپنی غربت کے باوجود ماہم کو اعلا تعلیم دلا رہے ہیں۔ ماہم بی کام کی اسٹوڈنٹ ہے۔ ذہین اور حساس مگر اپنی غربت سے نالاں ہے۔ اذان کو اپنے ایک دوست سے پتا چلتا ہے کہ ماہم ایک کرسٹل آدمی سے ٹیلی فونک رابطے میں ہے اور اس کی دوستی کا دم بھرتی ہے۔ اذان کو تشویش ہوتی ہے مگر وہ اپنے دوستوں سے اس کا نمبر پوچھنا پسند نہیں کرتا۔ اسی دوران اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ اس کا ایک دوست رشتے میں ماہم کا چچا لگتا ہے۔ اذان اس سے ماہم کا نمبر حاصل کر لیتا ہے۔ اذان اور ماہم کی دوستی ہو جاتی ہے۔ جو رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ محلے دار فیضی صاحب سے فرزان کی الٹی سیدھی حرکتوں کی شکایت کرتے ہیں۔ فیضی صاحب بہت شرمندہ ہوتے ہیں اور فرزان سے سخت رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ دو ٹوک انداز میں کہتے ہیں کہ یا تو اپنے دوستوں کو چھوڑ دو یا اس گھر کو...... فرزان ضد میں آ کر اپنی بیوی زارا کو ساتھ لیتا ہے اور گھر چھوڑ دیتا ہے۔ فرزان کے گھر چھوڑنے کے بعد فیضی صاحب فرزان کی بہت کمی محسوس کرتے ہیں مگر اس کا اظہار نہیں کرتے۔ ذکیہ بیگم جو ایک ماں ہیں۔ بیٹے کی جدائی ان پر بھی بہت اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ بیٹے کی وکالت کرتی ہیں مگر فیضی صاحب انہیں سمجھا دیتے ہیں کہ وہ یہ سختی بیٹے کی بھلائی کے لیے کر رہے ہیں۔ فرزان گھر چھوڑنے کے بعد مالی پریشانیوں کا شکار ہے اور اس کے گھریلو حالات بہت خراب ہیں۔ اس کا ایک دوست اسے ایک این جی او میں کام کرنے کی دعوت دیتا ہے جہاں اس کی ملاقات نیلم سے ہوتی ہے۔ نیلم کو فرزان بہت اچھا لگتا ہے مگر وہ اسے بتا دیتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے یوں نیلم کے دل میں فرزان کی محبت پروان چڑھنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ فیضی صاحب کو بیٹے کی نافرمانی اور جدائی نے مل کر اندر سے توڑ دیا ہے۔ انہی دنوں فیضی صاحب کا دوسرے شہر جانا ہوتا ہے۔ وہ وہاں جا کر شدید بیمار ہو جاتے ہیں۔ اذان فرزان سے کہتا ہے کہ وہ جا کر ان سے معافی مانگ لے اور انہیں گھر لے آئے مگر فرزان اس سے بھی بدتمیزی کرتا ہے اور اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ فرزان کو فیضی صاحب کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو اسے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر دل ہی دل میں بہت شرمندگی ہوتی ہے مگر بجائے اس کے کہ وہ اپنی اصلاح کرتا اور غلط کام کرنے لگتا ہے۔ تدفین والے دن شراب کے نشے میں دھت ہو کر الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے۔ فرزان کی وہی روٹین ہوتی ہے اب تو اسے روکنے ٹوکنے والا بھی کوئی نہیں

ہے۔ اس کی اور اس کے دوستوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ زارا دبے لفظوں میں اسے سمجھاتی ہے مگر وہ اسے ڈانٹ دیتا ہے۔ فرزان سنجیدگی سے سوچتا ہے کہ اسے اپنے آپ کو بدلنا چاہیے اور ڈھیر ساری دولت کمانی چاہیے وہ ان باتوں کا ذکر محبوب خان سے کرتا ہے۔ محبوب خان جلال زئی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور لنڈی کوتل کا رہائشی ہے جو اسے منشیات اور اسلحہ کے کاروبار کے متعلق معلومات دیتا ہے جس میں فرزان خاصی دلچسپی لیتا ہے۔ معاشی حالات اور تنگ دستی سے گھبرا کر وہ محبوب خان کے ساتھ لاہور چلا جاتا ہے۔ ان کا پروگرام ہوتا ہے کہ کچھ دن لاہور رہ کر سیر و تفریح کریں گے پھر وہاں سے لنڈی کوتل روانہ ہو جائیں گے لیکن وہاں ایک حادثہ میں فرزان شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ محبوب خان فرزان کو زخمی حالت میں اسپتال چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے لیکن وہ فون کر کے نیلم کو اس کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ فرزان ہوش آنے پر ڈاکٹر فریال سے حسب عادت عجیب و غریب گفتگو کرتا ہے تو ڈاکٹر فریال کو اس سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اذان اور ماہم میں بے تکلفی پیدا ہوتی ہے تو اذان اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے لیکن ماہم انکار کر دیتی ہے جس پر اذان سخت ناراض ہو جاتا ہے۔

—۱۵—

پندرہویں قسط

حسرتوں کے چہرے پر صورتوں کے پردے ہیں
دور سے نہیں ہوتا آدمی کا اندازہ

وہ پلکیں جھپکائے بغیر اس کے چہرے کو تکے جارہی تھی اور خود اس کے اپنے چہرے پر ایک عجیب سی مدوجزر کی کیفیت تھی۔ یہ انکشاف اس کے لیے خاصا چونکا دینے والا تھا کہ نیلم نا صرف اس کی فیملی سے واقف تھی بلکہ اس کے بھائی فرزان سے شناسائی کا دعوا بھی کررہی تھی۔

مختصر سے اس کمرے میں وقت جیسے تھم سا گیا تھا اور کمرے کی فضا پر ایک بوجھل سا سکوت طاری تھا۔ اس پر سکوت ماحول میں اپنے ہی تنفس کی آواز نے ماہم کو چونکا دیا۔ اس نے گھبرا کر نظریں جھکائیں اور پھر اس گہری خاموشی کا سینہ چاک کرتے ہوئے بے اختیار اس کے ہونٹوں پر ایک سوال مچل اٹھا۔

''آپ فرزان کو کیسے جانتی ہیں؟ اور آپ کی ان سے ملاقات کس سلسلے میں ہوئی؟'' ماہم کا جملہ ختم ہوا تو کمرے کی ٹھہری خاموشی میں جیسے دیر تک نقرئی صوتی لہجے کی لہروں کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔

اپنی کرسی پر براجمان کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکن نیلم کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ وہ ماہم کے سوال پر چونک کر خیالات کی دنیا سے باہر نہیں نکلی بلکہ ماضی کے کسی لہراتے ہوئے خیال کی گرفت میں اور محصور ہوتی چلی گئی۔ اس کی نظریں فضا میں موجود کسی ان دیکھے غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔

لیکن اس کی یہ کیفیت بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا، بے اختیارانہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسایا پھر اس کی نظروں کا زاویہ تبدیل ہوا اور ماہم کا صبیح چہرہ اس کے سامنے واضح ہوتا چلا گیا۔ چند لمحوں کے بوجھل اور بے جان سے توقف کے بعد کمرے کی فضا ایک بار پھر ترنم ریز ہوگئی۔ نیلم کے یاقوتی لب حرکت میں آچکے تھے اور اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ ماہم کو اس کے ذوقِ لطیف سے آگاہ کرنے لگا۔

جہاں ہر وقت ایک محفل سی سجی ہو اس کی یادوں کی
اسے عشرت کدہ کہتے ہیں غم خانہ نہیں کہتے
جو ہو جائے کسی کا مستقل بلا شرکت غیرے
وہ دل کعبہ ہے اس دل کو صنم خانہ نہیں کہتے
جنوں کی شرطِ اول ضبط ہے اور ضبط مشکل ہے
جو دامن چاک کرلے اس کو دیوانہ نہیں کہتے
نہایت شکریہ اس پرسشِ احوال کا لیکن
ہمیں عادت نہیں ہم اپنا افسانہ نہیں کہتے

ماہم نے غور سے نیلم کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا لیکن اس کی بینائی اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں پر طاری برفیلے اور پتھریلے سکوت سے ٹکرا کر واپس پلٹ آئی۔ وہ اس کے تاثرات کا تخمینہ لگانے میں ناکام رہی تھی۔ ایک عجیب سی سردمہری تھی جس نے نیلم کے پورے وجود کا احاطہ کررکھا تھا اور ماہم کو یہ ساری صورت حال ہضم کرنا دوبھر ہوگئی۔ وہ زیادہ دیر تک سنجیدہ نہیں رہ سکی تھی۔ بے اختیار ہی ایک سوال جیسے خود بخود اس کی زبان سے پھسل کر باہر آگیا۔

''مس نیلم! آپ ہنستی نہیں ہیں؟''

اور اس سوال نے نیلم کے تصورات کے تانے بانے بکھیر کر رکھ دیے۔ اس نے حیرت سے ماہم کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی بذلہ سنجی پر مسکرانے سے قاصر رہی۔ پھر جیسے اس کی سسکاری سی سنائی دی۔

آخری بار ہنسی آئی تھی کب، یاد نہیں
اور پھر آئے ہنسی اس کی تمنا بھی نہیں

اور نیلم کے اس جواب نے ایک بار پھر ماہم کو سنجیدگی کا لبادہ اوڑھنے پر مجبور کردیا۔

''میں سمجھ گئی شاید میرا سوال نامناسب ہے یا آپ اس کا جواب دینا نہیں چاہتیں۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ آپ بھی خاصی باذوق واقع ہوئی ہیں۔''

ماہم خاموش ہوئی تو اس کی نظروں میں مقید نیلم کے چہرے کے تاثرات میں کچھ تبدیلی رونما ہوئی۔ اس نے خاموشی سے چند لمحوں تک ماہم کی نظروں سے نظریں ملائیں پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''مس ماہم! آپ شاعری کرتی ہیں اور مجھے اچھے اشعار یاد رہ جاتے ہیں۔ آپ کی اس بات کا جواب بھی ایک شعر میں ہی دے دیتی ہوں۔''

''جی، جی ضرور۔۔۔ ارشاد۔'' نیلم کا جملہ ختم کرتے ہی ماہم نے بے تکلف ہوتے ہوئے کہا تو نیلم کی آواز ایک مرتبہ پھر اس نفیس اور محدود کمرے کی فضا پر گل افشانی کرنے لگی۔

ہمارے دل میں ہیں محفوظ چند تاج محل
جنہیں ہم اپنا مقدر بنائے بیٹھے ہیں
ہمارا ذوق جدا وقت کا مزاج جدا
ہم ایک گوشے میں خود کو چھپائے بیٹھے ہیں

''واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ بہت خوب، بہت ہی اعلا۔ مجھے بہت خوشی ہورہی ہے مس نیلم! کہ آپ بہت ہی نفیس اور اعلا ذوق کی حامل ہیں اور ساتھ ہی اس بات کا افسوس بھی کہ میری ملاقات آپ سے اب تک کیوں نہیں ہوئی تھی۔'' ماہم نے کولڈ ڈرنک کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے خالی بوتل کو خوب صورت بلوریں ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

نیلم نے بھی بوتل کو اپنے سامنے موجود ٹیبل کے ایک کونے پر رکھا اور پھر سنہری منقش باکس میں سے ٹشو پیپر نکال کر ہونٹ صاف کرتے ہوئے ماہم کی طرف دیکھ کر گردن خم کی۔ ماہم نے اپنی کلائی پر بندھی نازک سی گھڑی کی جانب دیکھا اور پھر اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''اپنے وقت میں سے یہ چند قیمتی لمحات میرے نام کرنے اور اس کولڈ ڈرنک کے لیے بہت شکریہ مس نیلم!''

ماہم نے کولڈ ڈرنک کی خالی بوتل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اس کے ہونٹوں پر وہی شریر سی مسکراہٹ سجی ہوئی تھی جو اس کی شخصیت کا حصہ تھی۔

''آپ کا بھی بے حد شکریہ کہ آپ نے ہمیں اور ہمارے ادارے کو کسی قابل سمجھا اور یہاں تشریف لائیں۔''

اس دوران نیلم جو اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی میز کے عقب سے گھوم کر باہر نکلتے ہوئے بولی اور پھر وہ ماہم کو کمرے کے خارجی دروازے تک چھوڑنے کے لیے اس کے ہم قدم ہوگئی۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ماہم کے قدم ایک لمحے کے لیے رکے اور پھر اس نے پلٹ کر نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''تو پھر میں۔۔۔ کب سے آپ کے ساتھ شامل ہوں مس نیلم؟''

نیلم اپنا نرم ہاتھ اس کی طرف مصافحہ کے لیے بڑھاتے ہوئے گویا ہوئی۔

''آپ آج۔۔۔ بلکہ ابھی سے ہمارے ادارے کا حصہ ہیں، آپ کل سے باقاعدہ جوائن کرلیجیے۔''

اور ماہم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے نیلم کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام کر گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور بولی۔

''تھینکس آلاٹ مس نیلم! خوشی اس بات کی ہے کہ ''خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔۔۔ بلکہ دیوانیاں۔۔۔ اپنا خیال رکھیے گا۔۔۔ اللہ حافظ۔''

پھر وہ غڑاپ سے باہر نکل گئی۔

دروازہ بند ہوا تو نیلم چند لمحوں تک پُرخیال انداز میں وہیں کھڑی جیسے کچھ سوچتی رہی، پھر آہستہ قدمی سے چلتی ہوئی اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر اس کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اس کے حلق سے ایک طویل سانس خارج ہوئی پھر کرسی پر آگے پیچھے جھولتے ہوئے کمرے میں ایک بار پھر اس کی آواز رقص کناں تھی۔

اپنے ہاتھوں آرزوؤں کا گلا گھونٹا کیے
زندہ رہنے کے لیے ہم خودکشی کرتے رہے
ہر طرف جلتے رہے بجھتے رہے جھوٹے چراغ
اور ہم سامانِ جشنِ تیرگی کرتے رہے

خود اندھیروں میں بسر کرتے رہے ہم زندگی
دوسروں کے گھر میں لیکن روشنی کرتے رہے
خود کو دیتے بھی رہے ترکِ تعلق کا فریب
اور در پردہ کسی کو یاد بھی کرتے رہے
حالِ دل کہہ دیں کسی سے بارہا سوچا مگر
اس ارادے کو ہمیشہ ملتوی کرتے رہے

☆☆☆

بجھا لو اپنی آنکھیں جس طرح ہم نے بجھائی ہیں
نہ خوفِ تیرگی ہوگا نہ فکرِ روشنی ہوگی
دلوں کو نور بخشو تاکہ گھر گھر روشنی پھیلے
چراغوں سے اگر ہو بھی تو کتنی روشنی ہوگی

ذکیہ بیگم نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اذان کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ اذان سر جھکائے سلائس پر مکھن لگانے میں مصروف تھا۔ یہ اندر کا کوئی احساس ہی تھا جس نے اسے اس بات سے باخبر کر دیا کہ ماں کی نظریں اس کے چہرے پر کچھ تلاش کر رہی ہیں۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا تو اس کے احساس نے یقین کی چادر اوڑھ لی۔

ذکیہ بیگم، زارا کے جانے کے بعد گھر میں بالکل یکا و تنہا ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ جتنی بھی باہمت اور بلند حوصلہ خاتون تھیں پے در پے رونما ہونے والے حادثات نے ان کی خود اعتمادی کو متزلزل کر دیا تھا اور انہیں اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ لگاتار ہاتھوں سے چھوٹتی رشتوں کی ڈوریں ان کی ساری خود اعتمادی کو اپنے ساتھ کسی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اڑا لے گئی تھیں۔ فیضی صاحب خالقِ حقیقی سے جا ملے، فرزان ایسے لاپتا ہوا کہ پھر اس کا سراغ تک نہ مل سکا اور اب زارا بھی منہ موڑ گئی تھی۔ محبت کرنے والے رشتے جب ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑنے لگیں تو انسان بکھر کر رہ جاتا ہے۔ شکست و ریخت کا یہ عمل صرف ذکیہ بیگم کے ساتھ ہی نہیں تھا یہ جوار بھاٹے تو ہر اس شخص کے اندر سے پھوٹنے لگتے ہیں جو اپنے چاہنے والوں، اپنے پیاروں کو اس طرح سے گنوا دیتا ہے۔

ذکیہ بیگم بھی ان ہی آزمائشوں سے گزرتے گزرتے نڈھال ہو گئی تھیں۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی کہیے یا حوادث زمانہ۔۔۔۔ جو بھی تھا اس سانحے نے ذکیہ بیگم کی پوری شخصیت کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ تھکن سے نڈھال تھیں اور اس سب نے صرف ان کی شخصیت پر ہی نہیں ان کے مزاج پر بھی گہرا اثر ڈالا تھا۔ ان کا سلیقہ، وضع داری اور رکھ رکھاؤ اپنی جگہ لیکن زارا کے بچھڑ جانے کے بعد وہ بالکل خاموش ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہ ضرور ہوتا کہ صبح ناشتے کے وقت اور رات کو کھانے کے وقت وہ اذان کا ساتھ دیتیں لیکن بغیر کچھ کہے بالکل خاموشی کے ساتھ اذان دکان پر چلا جاتا تو سارا سارا دن اس وسیع و عریض گھر میں کسی خزاں رسیدہ پتے کے مانند، اِدھر سے اُدھر ڈولتی اور ڈگمگاتی پھرتیں۔

یہ گھر جس کی ایک ایک اینٹ سے انہیں انس تھا ایک لگاؤ تھا کبھی اس گھر میں فیضی صاحب کی رعب دار آواز گونجا کرتی تھی، زارا کی ہنسی، فرزان کی بے تکی باتیں اور اذان کی بذلہ سنجی نے اس گھر کو مل کر اس طرح سے مکمل کر دیا تھا کہ ذکیہ بیگم کو زندگی سے کبھی کوئی شکایت پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب وہی گھر جو کبھی کشتِ زعفران ہوا کرتا تھا اس پر سناٹے طاری رہتے تھے۔ ہر دیوار سے یاسیت ٹپکتی تھی۔ اتنے بڑے گھر میں سارا دن ذکیہ بیگم کے علاوہ کوئی ذی نفس دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن پھر بھی ذکیہ بیگم کی زبان پر کوئی شکوہ نہیں آ رہا تھا بلکہ انہوں نے خود کو خاموشی کی عمیق گہرائیوں میں اتار لیا تھا۔

اور آج زارا کی وفات کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اذان کو ان کی نظروں نے کچھ ایسا احساس دلایا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

اذان کا دل مچل اٹھا اور یہ خیال شدید ہو گیا کہ جو کچھ بھی ان کی آنکھیں کہنا چاہ رہی ہیں وہ ان کی زبان سے ادا ہو جائے اور پھر اذان کے اسی خیال نے الفاظ کا روپ دھار لیا۔

"جی امی! آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں؟ بولیں۔"

پھر ذکیہ بیگم کی ٹھہری ہوئی آواز بلند ہوئی۔

"اذان! تمہارے بابا نہیں رہے، زارا بھی ساتھ چھوڑ گئی، فرزان کا کچھ پتا نہیں چل رہا، تم سارا دن دکان پر ہوتے ہو، کیا تمہیں اپنی امی جان پر ترس نہیں آتا؟"

اذان نے امی کا یہ لہجہ اور الفاظ سنے تو وہ تڑپ کر رہ گیا۔ ان کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا ہونے کے ساتھ ساتھ حقائق پر مبنی بھی تھا۔ اذان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ لیکن بہت دنوں کے بعد ماں کے منہ سے آواز سنی تھی کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔

اس نے مسمار ہوتے ہوئے حوصلے کے ستونوں کو کندھا دیتے ہوئے جی کڑا کر کے سلسلہ کلام کا آغاز کیا۔

"امی جان! میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کس کرب سے دوچار ہوں گی۔ جدا ہونے والے سارے رشتے میرے سینے کو بھی زخما گئے ہیں۔ لیکن امی جان! قدرت کے آگے تو کسی کا بھی زور نہیں چلتا۔ آپ نے تو ہمیشہ مجھے تسلی دی ہے۔ آپ تو میرے لیے حوصلے کا پہاڑ ہیں۔ اگر آپ ہی ایسے الفاظ بولنے لگیں گی تو مجھے سنبھالا کون دے گا۔ میں آپ کے دکھ سمجھ سکتا ہوں اگر میرے بس میں ہوتا اور یہ کسی انسان نے کیا ہوتا تو میں اس کے سامنے ہاتھ پاؤں جوڑ کر بھی اپنے بابا کی زندگی کی بھیک مانگ لیتا۔ بھابھی کے راستے کی دیوار بن جاتا۔ فرزان کا سراغ مل جاتا تو چاہے وہ پاتال میں بھی چھپا ہوتا تو میں اپنی امی جان کی خوشی کی خاطر اسے کھینچ کر باہر لے آتا۔ لیکن آپ جانتی ہیں کہ یہ سب ممکن نہیں تو بتائیے میں کیا کر سکتا ہوں؟ اگر آپ کی تنہائی کا احساس کرتے ہوئے میں بھی گھر میں بیٹھ جاؤں، دکان نہیں کھولوں تو گھر کیسے چلے گا۔"

اذان کی اس طویل گفتگو کے دوران ذکیہ بیگم کے چہرے کے تاثرات دھوپ چھاؤں کی طرح مسلسل تبدیل ہوتے رہے۔ حزن و ملال، حسرت و یاس، بے بسی اور پھر شفقت جو شاید ان تمام کیفیات پر حاوی آ گئی تھی۔ انہیں اذان پر بے تحاشا پیار آیا تھا جو کبھی نہیں آیا۔

چند لمحے توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئیں۔

"تم بہت اچھا بولتے ہو اذان! لیکن تمہاری زبان سے ادا ہونے والا پہلا لفظ تمہیں میں نے ہی سکھایا تھا، جو باتیں تم نے میرے علم میں اضافے کے لیے کہیں کیا میں یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتی؟ بیٹوں کا سر چاہے آسمان سے جا ٹکرائے، وہ ماں سے زیادہ ذہین نہیں ہو سکتے کیونکہ اولاد کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہی ہوتی ہے۔

میں بھی یہ سب کچھ جانتی ہوں، میری زبان پر یہ الفاظ اگر آ ہی گئے ہیں تو ان سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش ہرگز مت کرو کہ مجھے ہادی برحق کے فیصلوں سے کوئی اختلاف ہے، میں نے شکایت نہیں کی، میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اس گھر کے در و دیوار اور اس میں جڑی ہوئی ایک ایک اینٹ مجھ سے ہم کلام ہوتی ہے، باتیں کرتی ہے اور ان سب کا ایک ہی تقاضا ہے کہ اس گھر میں ہم دونوں کے علاوہ کسی تیسرے فرد کی ضرورت ہے اور یہ ہمارے اختیار میں بھی ہے۔ قدرت کے فیصلوں پر تو ہمیں سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہی ہے لیکن کچھ فیصلوں کا اختیار تو انسان کے اپنے ہاتھ میں بھی ہوتا ہے نا اور میں نے اسی اختیار سے کام لیتے ہوئے تم پر اپنا حق جتایا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم میرے اس حق کو تسلیم کرو گے۔"

ذکیہ بیگم خاموش ہوئیں تو اذان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی پھر وہ قدرے شوخ سے انداز میں بولا۔

"امی جان! دو باتیں ہیں یا تو اس گھر کی تنہائی نے آپ کی ذہنی ساخت پر کوئی منفی اثر ڈالا ہے یا پھر آپ میں فرزان کی روح حلول کر گئی ہے۔

اتنی گہری اور فلسفیانہ باتیں آج آپ کیسے کر رہی ہیں؟ جو کچھ بھی کہنا ہے سیدھے سے کہہ دیجیے، میں آپ کی حق تلفی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ صرف اتنا کہیں کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟"

اذان کی بات سن کر ذکیہ بیگم نے بغور اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''وقت آگیا ہے اذان ۔۔۔! اب تم شادی کرلو۔''

اذان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھتے ہوئے طویل عرصے کے بعد ذکیہ بیگم کی رگِ ظرافت بھی پھڑک اٹھی۔

''بس اب منہ بند کرلو کیونکہ زیادہ منہ کھولیں تو کھیاں ہی پڑتی ہیں اور مجھے بھنبھناہٹ سے شدید نفرت ہے۔ مجھے اس گھر میں کھیاں نہیں بلکہ ایک عدد بہو کی ضرورت ہے۔''

اذان نے لاشعوری انداز میں کھل جانے والے منہ کو بے اختیار گھبرا کر بند کرلیا

''امی جان! آپ بھی پتا نہیں کہاں کی بات کہاں جا ملاتی ہیں۔ بھئی آپ میری ماں ہیں، پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے تو میرا اچھا برا بھی آپ سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے۔ اگر آپ سمجھتی ہیں کہ مجھے اب شادی کر لینی چاہیے تو ۔۔۔ تو آپ ٹھیک سمجھتی ہیں ۔۔۔ آپ کو کیا لگتا ہے کہ میں آپ کی بات سے انکار کردیتا ۔۔۔ ہیں؟''

اذان کی بات سن کر ذکیہ بیگم کے چہرے پر مسرت کے تاثرات نمودار ہوگئے اور پھر وہ خوش دلی سے بولیں۔

''جیتے رہو، مجھے تم سے اسی سعادت مندی کی توقع تھی۔''

''جی، جی، سعادت مندی کا تقاضا بھی یہ ہی تھا لیکن اب عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ میں اٹھ کر دکان پر چلا جاؤں۔''

اذان نے بے اختیار سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور جلدی سے اٹھ کر باہر کی طرف لپکتے ہوئے بولا۔

''اللہ حافظ امی جان ۔۔۔! میں تو چلا۔''

اور ذکیہ بیگم کے ہونٹوں پر بے اختیار محبت بھری مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

☆☆☆

یہ حسنِ اتفاق ہے یا حسنِ اہتمام ہے
جس جگہ فرات وہیں کربلا بھی ہے
ہم پھر بھی اپنے چہرے نہ دیکھیں تو کیا علاج
آنکھیں بھی ہیں چراغ بھی ہے، آئینہ بھی ہے

فرزان اور فریال ڈائننگ ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے جب بوڑھی ملازمہ نے اپنے ہاتھ میں موجود آخری ڈش میز پر رکھنے کے بعد کھانا لگ جانے کا اعلان کیا۔ ٹھیک اسی وقت ٹاول سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے یاور زمان کمرے میں داخل ہوا اور پھر ٹاول ایک چیئر پر ڈالنے کے بعد کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''واہ بھئی واہ! آج تو بہت بڑی بات ہے کہ فرزان صاحب بھی رات کے کھانے میں ہمارے ساتھ موجود ہیں۔''

اور پھر سالن کا ڈونگا اپنی جانب سرکا کر پلیٹ میں سالن نکالا۔

''بزنس کیسا چل رہا ہے فرزان؟ خاصے مصروف ہوگئے ہو، تین تین چار چار دن تک نظر ہی نہیں آتے۔''

سالن ڈالنے کے بعد روٹی کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے یاور زمان نے حیرت سے فرزان کی جانب دیکھا کیونکہ یاور زمان کی تمام تر گفتگو کے باوجود ابھی تک فرزان کی جانب سے جواب میں ایک لفظ نہیں کہا گیا تھا۔

یاور زمان نے پہلا لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے سلسلۂ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے کہ کامیابیاں تمہارے قدم چوم رہی ہیں ۔۔۔ ہوتا بھی یہ ہی ہے۔ جب انسان انتھک محنت کرتا ہے اور اللہ پر پورا بھروسا رکھتا ہے تو کامیابیاں ضرور قدم چومتی ہیں۔''

فرزان بریانی کی ڈش اپنی جانب سرکاتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

''اللہ پر بھروسا رکھنے والا بھی اتنا ہی لاعلم ہوسکتا ہے جس کا اس سے انکار کرنے والا۔''

یاور زمان نے چونک کر اس کی جانب دیکھا پھر قدرے حیرت سے بولا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں صرف یہ ہی کہنا چاہتا ہوں کہ زندگی میں بڑی پیچیدگیاں ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی ہم جن چیزوں کو حقیقت سمجھ بیٹھتے ہیں دراصل وہ حقائق کے برعکس ہوتی ہیں یا کبھی ہم جن چیزوں کو حقائق کے برعکس سمجھتے ہیں وہ آگے چل کر درست ثابت ہوجاتی ہیں۔ زندگی اضداد کا مجموعہ ہے یہ ایسی ہرگز نہیں ہے جیسی ہم اسے سمجھتے ہیں۔ اس میں بڑی وسعت ہے۔''

یاور زمان نے دوسرا لقمہ منہ میں ڈال کر کچھ دیر سنا۔

''میں ابھی بھی تمہاری بات کو سمجھ نہیں سکا فرزان ۔۔۔!'' یاور زمان نے کہا تو فرزان متانت سے بولا۔

''میں نے علم اور لاعلمی کی بات کی ہے اور یہ کہا ہے کہ خدا پر بھروسا رکھنے والا بھی اتنا ہی لاعلم ہوسکتا ہے جتنا اس سے انکار کرنے والا۔ یہاں دو باتوں کو بطورِ خاص سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی بات کو بغیر تحقیق اور تصدیق کے مان لیا جائے تو یہ ذہنی دماغ کی علامت ہے۔ مثال کے طور پر روسی اپنی فکر میں لامذہب اور بدعقیدہ لوگ ہیں۔ انڈین اپنی فکر میں تواہماتی حد تک مذہب پرست ہیں اور میرے خیال میں دونوں ہی اندھے عقیدوں میں گرفتار ہیں۔ نہ تو روسیوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ ''خدا نہیں ہے'' اور نہ ہی ہندوستانیوں نے اپنے بھگوان کو ماننے سے پہلے اس امر کی تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ بھگوان موجود ہے۔ اس لیے یہ غلط فہمی دل سے نکال دیں کہ خدا پر یقین رکھنے والا ہی علم کا حامل ہوتا ہے۔''

اگر آپ نے ریاضی پڑھی ہے تو یوکلڈ کے اس نظریے سے بھی ضرور واقف ہوں گے کہ ایک لائن کی لمبائی ہوتی ہے، چوڑائی نہیں۔ اب آپ ہی بتایئے اس سے زیادہ وہم کی شکل اور کیا ہوگی، چوڑائی کے بغیر کسی لکیر کا تصور کیسے ممکن ہے؟

بچوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ نقطے میں نہ تو لمبائی ہوتی ہے نہ چوڑائی، یہاں تک کہ بڑے بڑے سائنس دان اسی مفروضے کو بنیاد سمجھ کر آج تک جھک مار رہے ہیں۔ بھلا کیا کوئی نقطہ لمبائی اور چوڑائی کے بغیر ہوسکتا ہے؟ اب ہم سب ایک سے نو تک ہندسے استعمال کرتے ہیں۔ اب کوئی پوچھے کہ کیا یہ کسی وہم سے کم ہے ۔۔۔ نو ہندسے ہی کیوں؟ یہ بات آپ کو کوئی سائنس دان نہیں بتا سکے گا۔ چلیں آپ بتائیں صرف نو ہندسے کیوں؟ سات کیوں نہیں؟ سات میں خرابی ہے؟

تین کیوں نہیں، بہت سے ریاضی دان ہیں جن میں سے ایک ''لائبنز'' بھی تھا جو تین ہندسوں تک محدود رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک، دو، تین کے بعد دس، گیارہ، بارہ، بیس اکیس بائیس اور تئیس۔ وہ اسی نمبر شمار پر عمل کرتا تھا اور بغیر کسی پریشانی کے اسی کو استعمال کرتا رہا۔

جو لوگ اس کے طریقے کو غلط کہتے وہ چیلنج کر کے ان کے طریقے کو غلط ثابت کر دیتا۔ اس کی مرضی ۔۔۔ وہ نو ہندسوں کی ضرورت کا قائل بھی نہیں تھا۔ آگے چل کر ''آئن اسٹائن'' نے تین ہندسوں کو بھی غیر ضروری قرار دیا۔ وہ ایک کے بعد صرف دو کو کافی کہتا تھا۔ کیونکہ ایک ہندسے کے ساتھ آگے نہیں چلا جاسکتا۔ البتہ دو ہوں تو قابل عمل ہے۔ لیکن سائنس دان ایسے نظریے کو ترک کرنے پر راضی ہی نہیں۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ نو سے کم ہندسوں کے ساتھ کیسے کام کریں؟ حالانکہ ''لائبنز'' اپنی پوری زندگی تین ہندسوں کے نمبر شمار پر عمل کر کے گزار گیا۔

اگر آپ کسی مذہب پرست سے پوچھیں کہ تم نے خدا کو کیسے پہچانا تو وہ کہے گا کہ آسمانی صحیفوں میں لکھا ہوا ہے اور جب کوئی یہ پوچھے کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ حساب میں نو ہندسے ہیں تو وہ ریاضی کی کتابوں کا

حوالے کرے گا۔"

فرزان ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکا۔

"او بھائی! اب نہ تو تم لائبنز ہو اور نہ میں آئن اسٹائن، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں آپ کی تسلی کے لیے کچھ مختصر کرتا ہوں۔۔ ایک سادہ اور آسان مثال دیتا ہوں۔ ایک بار ایک شخص پر قتل کا مقدمہ چلا۔ اس نے ایک آدمی کو قتل کیا۔ جن لوگوں نے قتل ہوتے ہوئے دیکھا وہ اس وقوعہ کے گواہ بن گئے۔ پہلے گواہ نے بیان دیا کہ جرم کھلے آسمان کے نیچے کیا گیا اور آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ دوسرے گواہ نے بیان دیا کہ جرم گھر کے اندر دروازے کے قریب دیوار کے پاس کیا گیا اور میرے بیان کی تصدیق دیوار پر پڑے ہوئے خون کے وہ چھینٹے کریں گے جو ابھی تک موجود ہیں۔ یہ واقعہ گھر کے اندر پیش آیا۔

جج بے چارہ پریشان ہوگیا کہ کس کی بات پر یقین کروں یقیناً ان دونوں میں سے کوئی ایک جھوٹا تھا۔

جج کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر ملزم ہنسنے لگا۔

جج نے وجہ معلوم کی تو اس نے بتایا کہ یہ دونوں صحیح کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ گھر کی چھت ابھی نہیں ڈالی گئی تھی۔"

فرزان کا جملہ ختم ہوتے ہی فریال بے اختیار کھلکھلا کر ہنسنے لگی جس کا فرزان نے تو کوئی اثر نہیں لیا البتہ یاور زمان نے گھور کر اس کی جانب دیکھا تو ایک دم اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔

"مختصر یہ کہ حقائق سے لاعلم یقین رکھنے والے بھی ہوتے ہیں اور انکار کرنے والے بھی۔ دوسری بات یہ کہ خود اعتمادی اپنی جگہ لیکن تحقیق کے بغیر بولے ہوئے جملے اکثر شرمندگی کا باعث بھی بنا کرتے ہیں۔ کاروبار یا بزنس محنت کا محتاج تھا۔ محنت کی تو آج اس قابل ہوں کہ آپ کی دی ہوئی رقم شکریے کے ساتھ واپس لوٹا سکوں۔ البتہ آج کی میری خاموشی یا پریشانی کا باعث میری کامیابی نہیں بلکہ ایک بہت بڑی ڈیل کا ہاتھ سے نکل جانا ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں مجھے اپنے اوپر اعتماد ہے اور یہ یقین بھی کہ یہ ڈیل میرے معیار کی نہیں تھی۔ یقیناً اس سے زیادہ بڑی ڈیل کروں گا۔ آپ کی دی ہوئی رقم کا چیک کل آپ کے آفس میں پہنچ جائے گا اور میرے خیال میں ایگریمنٹ کی کاپی آپ چیک لانے والے شخص کے حوالے ضرور کریں گے۔ بہرحال آپ کے احسان کا بوجھ ہمیشہ میرے کندھوں پر رہے گا اور فرزان احسان فراموش نہیں ہے۔"

فرزان نے ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر پانی سے بھرا شیشے کا گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کرنے کے بعد ٹیبل پر رکھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

مجھے ملال نہیں اپنی بے گناہی کا
جو دیدہ ور ہیں انہیں بھی نظر نہیں آتا

اور پلٹ کر ڈائننگ ہال سے باہر نکل گیا۔ یاور زمان نے فریال کی طرف دیکھا اور پھر بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔

"عجیب کردار ہے یہ بھی۔۔۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کس وقت کیا کہہ جاتا ہے اور اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟"

اور فریال کی بے اختیار ایک مرتبہ پھر ہنسی چھوٹ گئی۔

یاور زماں نے گھور کر دیکھا تو فریال جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ کر سنجیدہ ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

سادگی میں جان دے بیٹھے ہزاروں کوہ کن
آدمی سوچے تو اتنی سادگی بھی جرم ہے
دشمنی تو پھر بھی ہر صورت میں ہوتی ہے گناہ
ایک معین حد سے آگے دوستی بھی جرم ہے

ذکیہ بیگم کے چہرے پر اس وقت رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ خوشی اور مسرت کے رنگ۔ ان کے چہرے کی اجڑی ہوئی لکیروں پر خوشیوں کا یہ غازہ

دور سے چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔

اور ایسا بہت عرصے کے بعد ہوا تھا۔ خوشی اور مسرت یا شادمانی کے مفہوم سے مدت ہوئی ذکیہ بیگم نا آشنا تھیں لیکن آج ضرور ایسا کچھ خاص تھا کہ ان کے چہرے پر یہ مخصوص تبدیلی رونما ہوئی تھی۔

ان کے بالکل سامنے صوفے پر براجمان شخصیت گو کہ ان کے لیے نئی نہیں تھی لیکن آج ان کی گفتگو کا انداز بے اختیارانہ اور والہانہ تھا۔ اور ان کے چہرے پر چھائے ہوئے تاثرات ان کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کی کیفیات سے مختلف نہیں تھے۔

"مختاراں! تم نے تو میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔۔۔ خوشی ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھل رہی۔"

یہ جملہ ادا کرتے ہوئے اگر ان کے چہرے پر رنگوں کی دھنک تھی تو لہجے میں مسرت کے کھنک۔۔۔ مختاراں نے انکسارانہ لہجے میں جواب دیا۔

"ہاں لیکن میرے لیے تو یہ بہت بڑا کام تھا۔ اگر تم مجھے وہاں لے کر نہیں جاتیں اور ان لوگوں سے نہیں ملواتیں تو شاید میرے لیے خاصی مشکل ہو جاتی۔"

"ارے نہیں نہیں۔۔۔۔ آپ تو خوامخواہ شرمندہ کیے جا رہی ہیں۔۔۔ میں نے ایسا کون سا تیر مارا ہے۔۔۔ آپ نے ذکر کیا تو مجھے یاد آیا کہ ان لوگوں نے بھی مجھے کہہ رکھا تھا کہ کوئی اچھا گھرانہ اور شریف لوگ ہوں تو بتانا۔۔۔ بھلا آپ کے گھرانے کو مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا۔ بس میں نے یہ ہی تو کیا ہے کہ آپ کو لے جا کر ان لوگوں سے ملوا دیا۔ باقی ساری باتیں تو خود بخود ہوتی چلی گئیں۔ ویسے آپس کی بات ہے اب ہم گھر پر بیٹھے ہیں آپ یہ بتائیے کہ آپ کو گھر کیسا لگا؟ لوگ کیسے ہیں؟ اور لڑکی کی کون سی بات پسند آئی آپ کو۔۔۔"

مختاراں نے کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے انکساری کا عالی شان مظاہرہ کرنے کے بعد سوال بھی داغ دیا۔

ذکیہ بیگم نے اس کی بات سنی پھر اپنی مسرت چھپاتے ہوئے بولیں۔

"ارے یہ ہی سب تو ہوتا ہے گھر چھوٹا سہی مگر صاف ستھرا تھا۔ ایک ایک چیز سے سلیقہ اور قرینہ ٹپک رہا تھا۔ ذات اور برادری بھی ایک ہے۔ لوگ سلجھے ہوئے ہیں۔ لڑکی پڑھی لکھی ہے سلیقہ شعار بھی لگ رہی تھی، باادب بھی ہے۔ شکل وصورت بھی اچھی ہے اور چاہیے بھی کیا؟

میں تو یہ ہی کہوں گی کہ تم نے بہت بڑی نیکی کی ہے۔ سچ میں تو اپنی تنہائی سے بہت پریشان ہو گئی تھی۔ بس اب جلدی سے اسے بیاہ کر گھر میں لے آؤں تو دل میں ٹھنڈک اتر جائے۔"

ذکیہ بیگم خاموش ہوئیں تو مختاراں قدرے ان کی جانب جھک کر رازدارانہ انداز میں گویا ہوئی۔

"ذکیہ بہن! یہ سب تو ٹھیک ہے۔ آپ نے اذان سے بھی پوچھا؟ وہ راضی تو ہو جائے گا؟"

مختاراں کی بات سن کر ذکیہ بیگم کے چہرے پر قدرے ناگواری کے تاثرات پھیل گئے۔

"تم کیا سمجھتی ہو، اذان اتنا بدتہذیب ہو سکتا ہے کہ میرے فیصلے سے انحراف کرے؟ اس کی تربیت میں نے کی ہے۔ وہ میرا بیٹا ہے سمجھیں؟" جملے کے اختتام تک ذکیہ بیگم کے لہجے میں ہلکا سا احساسِ تفاخر چھلک آیا تھا۔

"پھر تو ٹھیک ہے۔۔۔ اصل میں آج کل کی جوان اولادیں ماحول کے رنگ میں رنگ گئی ہیں۔ جدت کے نام پر بدتمیزی کرنا ان کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ میں نے تو بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ آپ مطمئن ہیں تو ٹھیک ہے اگلے چکر جائیں گے تو تاریخ بھی طے کر کے آئیں گے۔"

ٹھیک اسی وقت ڈور بیل کی آواز سنائی دی تو ذکیہ بیگم جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور چہرے پر رقم مسرت کے تاثرات لیے بیرونی دروازے کی جانب لپکتی ہوئی بڑبڑائیں۔

"یہ لو اذان بھی آگیا۔"

چند ہی لمحوں بعد ذکیہ بیگم کے ساتھ ساتھ اذان

بھی اسی کمرے میں آن پہنچا۔ جو ذکیہ بیگم کی خواب گاہ تھا۔

"السلام علیکم!" اذان نے اندر داخل ہونے کے ساتھ ہی مختاراں کو ادب سے سلام کیا اور ایک جانب بیٹھ گیا۔ اذان کے چہرے پر ہلکی سی حیرت کے تاثرات بھی محسوس کیے جاسکتے تھے جو یقیناً مختاراں کو دیکھ کر نہیں بلکہ ذکیہ بیگم کے چہرے پر طاری مسرت انگیزی کو دیکھ کر پیدا ہوئے تھے۔

ذکیہ بیگم کی بے پایاں خوشی کا اندازہ ان کی حرکات وسکنات سے بھی بخوبی لگایا جاسکتا تھا اور یہ بات اذان کے لیے حیرت کے ساتھ ساتھ اطمینان کا باعث بھی تھی کیونکہ وہ بہت دنوں کے بعد اپنی ماں کو خوش دیکھ رہا تھا۔

"خیریت تو ہے امی جان! آج ماشاء اللہ آپ بہت خوش نظر آرہی ہیں۔"

اذان سے رہا نہ گیا اور آخر کار اس نے پوچھ ہی لیا۔

"ہاں خوش تو ہوں۔۔۔ بات ہی خوشی کی ہے۔۔۔ لیکن اس خوشی کا محرک تم ہی ہو۔ میری خوشیاں اب تمہارے علاوہ ہوں گی بھی کیا؟ اب تم ہی تو بچے ہو، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے تمہاری بہتری اور بھلائی ہی کے خواب بنتی رہتی ہوں۔

ذکیہ بیگم نے جیسے خوشی سے جھوم کر جواب دیا۔

"یہ سب تو آپ کی محبت ہے امی جان! مگر کچھ پتا تو چلے کہ آخر۔۔۔"

اذان کا جملہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ایک مرتبہ پھر ڈور بیل کی آواز سنائی دی اور ذکیہ بیگم جلدی سے اٹھ کر خوشی خوشی باہر کی جانب لپک گئیں اور اذان جملہ ادھورا چھوڑ کر حیرت سے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھتا رہ گیا۔

"اور سنائیں آنٹی! آپ کیسی ہیں؟ گھر میں سب خیریت ہے نا۔" اب اذان کی توجہ مختاراں کی جانب مبذول ہوگئی۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹا! سب ٹھیک ہے۔۔۔ بس تم اپنی خیر مناؤ۔" مختاراں نے جواب دیا۔

"کیوں؟ مجھے کیا ہوا ہے؟" اذان نے اپنے دونوں ہاتھ سامنے کر کے دیکھنے کے بعد ارد گرد دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوا تو نہیں ہے، ہونے والا ہے۔ بہت جلد تمہیں کھونٹے سے باندھ دیا جائے گا۔" مختاراں کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

"کھونٹا۔۔۔؟" اذان نے حیرت سے دوہرایا۔

ٹھیک اسی وقت ذکیہ بیگم کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

"اذان بیٹا! وہ تمہارا کوئی دوست ہے رانا فہیم۔۔۔ وہ آیا ہے، کہتا ہے اذان سے ملنا ہے۔"

"جی امی جان!" اذان نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور باہر کی طرف چل دیا۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولنے کے بعد اس نے فہیم کو بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی اس کے سامنے جا بیٹھا۔

"جی رانا صاحب خیریت! کیسے آنا ہوا؟"

"ہاں بھئی بڑے لوگ ہوگئے ہو۔ اب دوستوں سے ملنے پر بھی آمد کا مقصد معلوم کرو گے؟ کیا دنیا کا کوئی کام مقصد کے بغیر نہیں کیا جاتا۔ پوچھتے ہو کیسے آنا ہوا۔ گل بنتی ہے؟"

"ارے نہیں یار! میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔ تم بتاؤ چائے پیو گے یا ٹھنڈا۔" اذان نے جلدی سے بات سنبھالتے ہوئے دریافت کیا۔ ٹک ٹک کی آواز سنائی دینے پر اذان نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈرائنگ روم کا وہ دروازہ جو گھر کی اندرونی سمت کھلتا تھا اس پر دستک دی گئی تھی۔ اذان نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ذکیہ بیگم نظر آئیں جن کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی۔ جس میں چائے کے لوازمات اور مٹھائی بچی ہوئی صاف نظر آرہی تھی۔ وہ ٹرے اذان کی جانب بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"بیٹا! میری خوشی تو درمیان میں ہی رہ گئی۔ مختاراں بیٹھی ہوئی ہے۔ میں کب سے انتظار کر رہی تھی کہ تم آؤ تو تمہیں وہ خوشی کی خبر سناؤں جو مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی۔ لیکن خیر کوئی بات نہیں۔ جہاں اتنا انتظار کیا تھوڑا اور سہی۔ تم اس کے ساتھ ساتھ مٹھائی سے اپنا بھی منہ میٹھا کرو اور اپنے دوست کا بھی کروا دو۔ باقی بات میں تمہیں اس وقت بتاؤں گی جب تم فری ہو کر اندر آؤ گے۔"

"ٹھیک ہے امی جان! میں ادھر سے فارغ ہو کر ابھی آتا ہوں۔ آپ نے تو میرا اشتیاق بھی بڑھا دیا ہے۔" اذان کا جملہ ختم ہوا تو اسی وقت فہیم نے بدستور اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔

"آنٹی! اذان ہمارا بہت اچھا دوست ہے خوشی کی خبر ہے، مٹھائی بھی کھلا رہی ہیں اور بتائیں گی اذان کو اکیلے میں۔۔۔ گل بنتی ہے؟

دوست تو دوست کی خوشی میں خوش ہوتا ہے۔ ہمیں بھی تو بتائیے۔" فہیم کی بات سن کر اذان نے ترچھی نظروں سے اسے گھورا۔

"کیوں نہیں بیٹا! جیتے رہو۔ اذان کے دوست ہو تو میرے لیے تم بھی اذان جیسے ہو۔ چلو میں بتا ہی دیتی ہوں۔ چند ہی دنوں میں تمہارے دوست کے سر پر سہرا سجنے والا ہے۔ میں اس کے لیے لڑکی دیکھنے گئی تھی اور بات بھی پکی کر آئی ہوں۔"

اذان جو اس دوران چائے کی ٹرے فہیم کے سامنے ٹیبل پر رکھ رہا تھا بے اختیار اس کے ہاتھ لرزے اور چائے چھلک گئی۔

اس کے سر پر حیرتوں کے پہاڑ ہی ایسے ٹوٹے تھے کہ وہ حواس باختہ ہوگیا۔ اس کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ ذکیہ بیگم کے منہ سے کوئی ایسی بات نکلے گی۔

"اوہ واقعی۔۔۔! پھر تو اس موقع پر میں خوامخواہ ہی مخل ہو رہا ہوں۔" فہیم نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ پھر بیرونی دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

"اوکے اذان! چائے اور مٹھائی ادھار رہی۔۔۔ اس وقت تم اندر جاؤ اور آنٹی کے ساتھ خوشیاں بانٹو۔۔۔ میں پھر آجاؤں گا۔"

دروازے کے عقب سے ذکیہ بیگم کی آواز بلند ہوئی۔

"ارے بیٹا! رکو تو منہ تو میٹھا کرتے جاؤ۔۔۔"

ذکیہ بیگم کی آواز سن کر فہیم کے بڑھتے ہوئے قدم ایک لمحے کے لیے رکے پھر وہ واپس پلٹا اور ٹرے میں سے ایک گلاب جامن اٹھا کر تھوڑا سا کھاتے ہوئے بولا۔

"لیجیے آنٹی! میں نے منہ میٹھا کرلیا۔ اب اذان آپ کے حوالے ہے آپ اس کا منہ میٹھا کروائیے، میں تو چلا۔"

اور پھر باقی کا گلاب جامن ہاتھ میں تھامے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اذان ہکا بکا کھڑا کبھی ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھتا اور کبھی اندرونی دروازے کی طرف۔

آواز میں تو آپ کی بے شک خلوص ہے
لیکن ذرا نقاب تو رخ سے اٹھائیے
ہم مانتے ہیں آپ بڑے غم گسار ہیں
لیکن یہ آستیں میں کیا ہے؟ دکھائیے

☆☆☆

"ہاں جانی کیا حال ہیں؟"

آفس میں داخل ہونے والے نو وارد نے نعرہ بلند کیا تو فہیم نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ دبلا پتلا، لمبے قد کا مالک، چہرے پر باریک باریک نوک دار مونچھیں اور موٹی موٹی آنکھیں چہرے پر سجائے ہوئے کھڑا یہ شخص رانا فہیم کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ پھر وہ گرم جوشی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"آہاہ۔۔۔ فرید خان۔۔۔ زہے نصیب وہ آئیں دفتر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے، کبھی ہم دفتر کو دیکھتے ہیں تو کبھی فرید خان کو۔"

فرید خان کے لبوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے آثار دکھائی دیے۔ پھر وہ آگے بڑھ کر کرسی گھسیٹتے ہوئے بے تکلفی سے بیٹھ کر بولا۔

"اے بھائی! تو بیٹھ کے اسکول چلا وہی بہتر ہے۔ چچا غالب بننے کی کوشش نا کر۔ جس کا کام اسی کو ساجھے۔"

"یہ ہی تو بدقسمتی ہے۔" فہیم نتھنے پھلاتے ہوئے دوبارہ اپنی سیٹ پر براجمان ہو کر بولا۔

"آج کل تو جس سے کام پڑ جائے وہ بھی کام نہیں کرتا۔ تم سے ایک کام بول تو دو اس کے بعد تم ایسے غائب ہوئے کہ جیسے ایک شریف جانور کے سر سے سینگ، آج پورے ڈیڑھ مہینے کے بعد شکل دکھا رہے ہو، گل بنتی ہے۔ وہ کسی نے کیا خوب کہا ہے لیکن ایک بات واضح کر دوں کہ چچا غالب نے نہیں کہا۔ ہاں تو عرض کرتا ہوں۔

کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر"

فرید خان جو فہیم کی اس تمام تر گفتگو کے دوران ٹیبل پر کہنیاں ٹکائے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر ان پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھا پوری محویت سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ طویل سانس لے کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

"ابے بھائی! تم تو جانتے ہو کہ ہم مصروف لوگ ہیں۔ این جی اوز کے کام آسان نہیں ہوتے، اوپر سے جواب دہی کرنے والا سونے پہ سہاگہ ہے۔ پوری ڈسٹرکٹ میں شاید کوئی مرد کا بچہ تھا ہی نہیں جو اس آفت کی پرکالہ کو ہمارے سر پر بٹھا دیا ان لوگوں نے۔"

فرید خان کا جملہ ختم ہوا تو فہیم کی اس ناگواری کو نظر انداز کرتے ہوئے داہنی آنکھ دباتے ہوئے لوفرانہ انداز میں بولا۔

"ویسے یار ہے تو عجب غضب چیز تمہاری وہ آفت کی پرکالہ اور تم ہو کہ شکوؤں کے پہاڑ کھڑے کر رہے ہو۔ مجھے اگر اسکول کی ذمہ داریاں سنبھالنی نہ پڑتیں تو میں تو خود تمہاری این جی او جوائن کر لیتا۔"

فرید خان نے گھور کر اسے دیکھا اور پھر دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔

"اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ تم وہاں کام کرنے کے اہل ہو۔ اگر ایک دن بھی اس سے پالا پڑ گیا تو نانی یاد آجائے گی۔ میاں صاحب زادے وہ صرف عجب غضب چیز ہی نہیں ہے غضب ڈھاتی بجلی ہے۔ ہم لوگوں کا تو جینا حرام کر رکھا ہے اس نے۔ آفس ٹائمنگ کے بعد بھی آفس کا ہی کام کرتے پھرتے ہیں۔ آخر مردانگی کی لاج بھی تو رکھنی ہے۔ اب کون جواب دے اس کے سوالوں کا۔"

فرید خان کا جملہ ختم ہوا تو فہیم نے ہونٹوں کو گول دائرے کی شکل میں سکوڑتے ہوئے چچ چچ کی آواز نکالتے ہوئے کہا۔

"میرا شونا۔۔۔ میرا مظلوم بچہ۔۔۔ ماں صدقے۔۔۔ اتنا ظلم ہوتا ہے اس ناتواں جان کے ساتھ۔"

اور فرید خان اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔ اس کے انداز پر فہیم فوراً ہی چوکنا ہو گیا اور پھر جلدی سے موضوع تبدیل کرتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے۔ چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔ تم یہ بتاؤ کہ میرے کام کا کیا ہوا۔ اتنے دنوں بعد بھی کوئی اچھی خبر لائے ہو یا نہیں۔"

فرید خان کرسی کی پشت سے سر ٹکانے کے بعد پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ہاہ۔۔۔ اچھی خبر۔۔۔ ابے یار وہ پھولن دیوی جان چھوڑے تو بندہ کچھ کرے۔ پی ای ایف کے ڈائریکٹر سے تو تعلق نکال لیا ہے۔ لیکن جس بندے کا تعلق ہے اسے ساتھ لے جا کر بات کرنا پڑے گی۔ تمہارا سائنٹیفک انسٹی ٹیوٹ یقیناً اپرو ہو جائے گا لیکن وقت بھی تو ملے۔ دعا کرو کہ محترمہ کچھ دنوں کے لیے آفس نہ آئے تاکہ میں تمہارا معاملہ نمٹا دوں۔ تم سناؤ تمہاری ماڈل گرل کیسی ہے؟"

فرید خان اپنی بات ختم کر کے استفہامیہ نظروں سے فہیم کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے گویا ہوا۔

"ابے کاہے کی ماڈل گرل یار۔۔۔! اور ہماری کہاں۔۔۔ وہ تو ہماری چھاتی پر دن دہاڑے مونگ دلتی رہی اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔"

"اچھا۔۔۔ وہ کیسے؟" فرید خان نے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

"فیضی صاحب کا نام سنا ہے؟" فہیم نے جوابی سوال داغا تو فرید خان سر ہلاتے ہوئے گویا ہوا۔

"فیضان فیضی صاحب نا! وہ جو شاعر تھے۔"

"ہاں وہی۔۔۔" فہیم نے ایک اور ٹھنڈی سانس بھری پھر کچھ لمحوں کے توقف کے بعد سلسلہ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے کہا۔

"ابے بھائی! وہ تو نیک شریف آدمی تھے اس لیے جلدی چلے گئے میں تو اذان فیضی کی بات کر رہا ہوں جو ایک ہی ہے۔"

تو فرید خان جلدی سے بولا۔

"ایک نہیں ہے دو ہیں۔ ایک فرزان فیضی بھی تو ہے۔"

"ہے نہیں تھا۔۔۔ وہ تو شکر ہے کہ عرصے سے اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ ہمیں تو ایک نے ہی عذاب میں ڈال دیا دو ہوتے تو کیا کیا نہیں ہوتا۔" فہیم نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"ابے ہوا کیا یار کچھ پتا تو چلے؟ پہیلیاں کیوں بوجھوا رہے ہو سیدھی طرح پتا چلے کہ معاملہ کیا ہے؟"

"وہ جسے تم "ہماری" ماڈل گرل کہہ رہے ہو آج کل اس کا شمار شہیدانِ اذان فیضی میں ہوا کرتا ہے۔"

"ہیں۔۔۔؟" فرید خان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"تم کیا جھک مارتے رہے اور یہ شہیدان کا کیا مطلب ہوا؟ کیا دو چار اور بھی ہیں؟" فرید خان نے حیرت سے پوچھا۔

"شاعر ہے اور شاعروں کے تو کام ہی ایسے ہوتے ہیں۔ پتا نہیں اور کتنی ہوں گی۔ ادھر نین مٹکا اور ادھر کام پکا۔ پیار کی پینگیں بڑھانے کے بعد اب چلے ہیں گھوڑی چڑھنے۔"

فہیم نے سر جھٹکتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"اچھا۔۔۔ یہ اذان کو گھڑ سواری کا شوق بھی ہے۔" فرید خان کے چہرے پر حیرت نے بسیرا کر لیا تھا۔ جس نے فہیم کو تاؤ دلا دیا۔ وہ گھونسا تان کر اسے دکھاتے ہوئے غصے سے بولا۔

"ابے گھونچو! وہ شادی کر رہا ہے۔"

"کیا۔۔۔ کیا۔۔۔ شادی۔۔۔؟ کیا ماہم سے۔۔۔؟" اس بار فرید خان کی حیرت حقیقی تھی اور فہیم اس کی کم عقلی پر جل بھن کر رہ گیا۔ لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ غلطی اس کی اپنی ہے۔ وہ خوامخواہ بات کو طول دے رہا تھا اور ٹکڑوں میں ادا ہونے والی بات کو سن کر سامنے والا اپنی مرضی کے نتائج اخذ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

اس نے حلق تک ابھر آنے والی کڑواہٹ کو بمشکل نگلا اور پھر قدرے تحمل سے بولا۔

"دیکھو بات سنو۔ اس نے ماہم کو صرف سبز باغ دکھائے ہیں، چکمہ دیا ہے۔ ملاقاتیں ماہم سے کرتا رہا ہے اور اب شادی اپنی اماں جان کی مرضی اور پسند سے کر رہا ہے۔ مطلب بھی پورا اور اماں جان بھی

خوش۔۔۔"

"اوہ۔۔ آئی سی۔۔۔" فرید خان نے سیٹی بجانے کے سے انداز میں ہونٹ سکوڑ کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اب معاملہ پوری طرح اس کی سمجھ میں آچکا تھا۔ چند لمحے وہ متاسف نظروں سے فہیم کی جانب دیکھتا رہا پھر قدرے رازدارانہ لہجے میں آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

"کیا یہ بات ماہم کو بھی پتا ہے؟" پھر خود ہی نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں بھلا اسے کیسے پتا ہو سکتا ہے۔

خاک ہو جائیں گے ہم ان کو خبر ہونے تک

جل میرے راج دلارے کہ جلنا ہی تیرا مقدر ہے۔"

"جلتی ہے میری جوتی۔۔" فہیم اس کی بات کاٹ کر نسوانی انداز میں غرایا۔

"میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔۔۔ میں نے یہ سب کچھ اس انداز میں ماہم تک پہنچایا ہے کہ۔۔۔" فہیم نے ایک لمحے کے لیے رک کر دائیں ہاتھ کو اپنے گلے پر پھیر کر کاٹنے کا اشارہ دیا اور پھر بولا۔

"جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا لیکن اب ڈور فہیم کے ہاتھ میں ہے۔ اذان کا تو ہو گیا بوکاٹا۔۔۔ اور وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ شادی تو وہ کرے گا مگر اب کبھی زندگی میں دوبارہ ماہم سے بات نہیں کر سکے گا۔" فرید خان جو بغور فہیم کا مشاہدہ کر رہا تھا اسے اس کے چہرے پر جنونی سی کیفیات نظر آئیں۔ نہ جانے کیوں فہیم کی بات سن کر وہ بولا۔

"اچھا بھئی فہیم! پھر ملیں گے، چلتا ہوں۔"

اور پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ باہر نکلتے نکلتے ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے ایک طنزیہ سی مسکراہٹ فہیم کی جانب اچھالی اور پھر چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بلی اگر کھاتی نہیں ہے تو لڑھکاتی ضرور ہے۔" اور پھر اگلے ہی لمحے وہ فہیم کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

مسجد ابھی حال میں تعمیر ہوئی ہے
کعبہ ہی لگے نہ صنم خانہ لگے ہے
درویش نما لوگوں سے بچ بچ کر گزریو
انداز فقط ان کا فقیرانہ لگے ہے
کوچے میں تیرے کون سا جادو ہے نہ جانے
جو لوٹ کے آوے ہے وہ دیوانہ لگے ہے

گہرے سیاہ تارکول کی ٹیڑھی میڑھی بل کھاتی اور لہراتی سڑک پر گاڑی اس وقت پوری رفتار سے فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔ دائیں بائیں چڑھے ہوئے گاڑی کے شیشوں سے تیزی سے تبدیل ہوتے مناظر صاف دکھائی دے رہے تھے مگر عقبی سیٹ پر براجمان گاڑی کے اکلوتے مسافر کی توجہ ان مناظر کی جانب ہرگز نہیں تھی۔

سڑک کے دونوں اطراف لگے ہوئے اکا دکا بلند قامت سفیدے کے درخت جا بجا دکھائی دے رہے تھے جو نیم تاریک ماحول میں کسی بلند و بالا عفریت کی مانند سر اٹھائے کھڑے سڑک پر چیونٹیوں کی طرح رینگتی چھوٹی موٹی گاڑیوں کو حقارت کی نظر سے گھور رہے تھے۔ یہ سڑک شہر کی کوئی بارونق شاہراہ نہیں تھی بلکہ ایک اور قریبی بڑے شہر کو اس شہر سے ملانے والی مرکزی شاہراہ تھی لیکن رات کے اس پہر ٹریفک برائے نام ہی تھا۔

ڈرائیور پوری تندہی اور مہارت سے اپنے فرائض سر انجام دے رہا تھا۔ عقب میں آنے والی دونوں جیپوں کے ڈرائیور بھی آگے جاتی گاڑی کا ساتھ دینے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے مگر لیڈ کرنے والی شاندار لینڈ کروزر کے انتہائی طاقتور انجن کا مقابلہ کرنا ان جیپوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

جیپیں بلاشبہ نئے ماڈل کی اور اعلا تھیں لیکن آگے والی گاڑی ہر لحاظ سے بہتر تھی۔ اس لیے عقبی گاڑیوں کے ڈرائیورز کی تمام تر جانفشانی کے باوجود آگے والی گاڑی سے ان کا فاصلہ جوں کا توں برقرار تھا جو کئی سو

گز پر محیط تھا۔

یہ فاصلہ فرزان اینڈ کمپنی کے مالک فرزان فیضی اور اس کے سیکورٹی گارڈز پر مشتمل تھا جو ایک دوسرے شہر میں کامیاب بزنس ڈیل کرنے کے بعد واپسی کا سفر طے کر رہا تھا اور شاید فرزان کا ذہن بھی واپسی کے سفر پر تھا۔ گاڑی منزلوں پہ منزلیں طے کرتی جا رہی تھی اور فرزان کا ذہن بھی جادہ بہ جادہ گام بہ گام پرت در پرت ماضی کے صفحات پلٹتا جا رہا تھا۔ اور ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا۔ یادوں کی ہوا چلتی تھی تو اس کا ایک ایک جھونکا اسے بیتے ہوئے لمحوں کی یاد دلا جاتا تھا۔

ماضی جو اپنے اندر بہت سی کہانیاں بہت سے حقائق بہت سی یادیں اور بہت سے کردار چھپائے ہوئے کہیں منہ ڈھانپے سو رہا تھا۔ لیکن خواہشِ نفس کے پتھریلے ستونوں سے ٹکراتی ہوئی ماضی کی یہ ہوائیں جب چلتی تھیں تو فرزان کا ضمیر لہولہان ہو جاتا تھا۔ اس کی سماعتیں اپنے ہی ماضی کی سسکاریوں سے زخمی ہو کر رہ جاتی تھیں۔

سفید داڑھی، کندھوں تک دراز زلفیں، نورانی چہرہ، ماتھے پر محراب کا نشان لیے پردہ ذہن پر نمودار ہونے والا یہ عکس اس کا تھا۔ فرزان فیضی بذات خود جس کا عکس تھا لیکن کتنا فرق ہے مجھ میں اور ان میں۔۔۔ کیا تھے وہ۔۔۔ اور میں کیا ہوں۔" اسے جیسے اپنی ہی پھنکارتی ہوئی آواز سنائی دی اور اس کی نس نس میں جیسے زہر بھر گیا۔

تقدس اور سادگی کو گوندھ کر تشکیل دیا ہوا ایک اور چہرہ اس کے احساس کے کینوس پر لہرایا جو یقیناً ذکیہ بیگم کے علاوہ اور کسی کا نہیں تھا۔ ذکیہ بیگم جو اس کی ماں تھیں وہ جس کے قدموں تلے جنت تھی اور وہ اپنی جنت خود تعمیر کرنے نکلا تھا۔

پھر ایک اور صورت ان ڈوبتی ابھرتی شکلوں کے درمیان واضح ہوئی وہ جو ابھی [illegible] کے ساتھ سانس لیتی تھی۔ تو زندگی مسکرا اٹھتی تھی۔ اس کے ہر دکھ، ہر سکھ میں اس کا ساتھ دینے والی اس کی شریکِ سفر، شریکِ حیات زارا، جیتی جاگتی صورتوں کے اس جنگل میں پھر ایک اور ستارہ سا ٹمٹمایا اور اس جنگل میں ایک اور چھوٹا سا پودا پھوٹ کر دیکھتے ہی دیکھتے تناور درخت بن گیا اور یہ چہرہ بھی اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔۔ یہ اس کا بھائی تھا اذان فیضی۔

"کیا میں نے گھاٹے کا سودا کیا ہے؟" اس نے بے اختیار سوچا۔

لوگ جو رشتوں کی تلاش میں دربدر بھٹکتے ہیں اور رشتوں کو اپنے خون سے سینچتے ہیں اور ایک وہ تھا جو ان سارے رشتوں کو چھوڑ کر بن باس لے چکا تھا۔

آخر وہ کس سے فرار حاصل کر رہا تھا۔ فیضان فیضی سے؟ ذکیہ بیگم سے؟ اذان سے یا زارا سے؟

محبت کرنے والے سارے رشتوں کا خون کر کے اگر اس نے اپنی خوشیوں کے تاج محل کی دیواریں کھڑی کر لی ہیں تو کیا یہ خوشیاں ہمیشہ اس کا مقدر رہیں گی؟ کیا یہ خوشیاں دائمی ہیں؟ سونا، جاگنا، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا ان تمام کاموں میں اس کے ساتھ اس کے ہمقدم اس کی ساتھی صرف اور صرف اس کی تنہائی تھی

کون تھا جس سے وہ دل کا حال کہہ سکتا۔ اپنے دکھ درد بانٹ سکتا، کوئی بھی تو نہیں تھا۔ وہ تھا۔ اس کی انا تھی اور دولت کا وہ ڈھیر تھا جو اس نے اپنا دن رات ایک کر کے جمع کر لیا تھا۔

لیکن اس دولت کا وہ کرے گا کیا؟ اس نے تو اپنے تمام رشتوں سے فرار کی راہ اختیار کی تھی۔ وہ ایک مفرور تھا۔۔ ایک مفرور مجرم۔ جو مستوجب سزا تھا۔

کفِ دستِ ہنر ہے اور پتھر
دکان شیشہ گر ہے اور پتھر
غم ختم سفر ہے اور پتھر
پلٹ جانے کا ڈر ہے اور پتھر
میرا گھر اور میں کب تک نبا ہیں
کہ بوسیدہ کھنڈر ہے اور پتھر
غرورِ عمر کا حاصل نہ پوچھو
خموشی کا نگر ہے اور پتھر

اور پھر یہ بھر جیسے اچانک اس کے سر پر آ لگا۔ چند لمحوں تک وہ صورت حال کا اندازہ نہ کر پایا کہ آخر ہوا کیا ہے۔

حواس بحال ہوئے تو بات سمجھ میں آئی۔ ڈرائیور نے ہارن پر ہاتھ رکھنے کے ساتھ ساتھ زور سے پینڈل دبایا تھا۔

رات کے اس نیم تاریک ماحول اور گہرے سناٹے میں ہارن کی پرشور آواز کے ساتھ بریکوں کی کریہہ چرچراہٹ بلند ہوئی تھی اور یہ ہی نہیں انتہائی تیز رفتاری سے سفر کرتی ہوئی گاڑی اچانک سے اس طرح رو کے جانے پر شدید تشنج پا ہوئی تھی جس کے نتیجے میں اس نے ایک زور دار جھٹکا لیا اور اس جھٹکے کے نتیجے میں فرزان جو سطحِ خیال پر مشقِ تیرا کی فرماتے ہوئے انتہائی پرسکون تھا۔ اس مدوجزر کے نتیجے میں اچھل کر اگلی سیٹوں سے ٹکرایا اور پھر دوبارہ عقبی نشست پر آ رہا۔ چند لمحوں کے لیے اس کے حواس مختل ہو کر رہ گئے تھے لیکن پھر جلد ہی وہ اعتدال پر آ گیا اور پھر اگلے ہی لمحے اس کی غراتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

"کیا مصیبت ہے؟ کیا تمہیں ٹھیک سے گاڑی ڈرائیو کرنا نہیں آتی؟ بریک لگانے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟"

"س۔۔۔ س۔۔۔ سوری سر!۔۔۔ ویری سوری۔ میں ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا تھا کہ سڑک کے درمیان میں کیا پڑا ہوا ہے۔ ش۔۔۔ شاید ۔۔۔ کوئی لاش ہے۔"

خوف کے باعث ڈرائیور کی گھگھی بندھ گئی تھی اور اس کی گھگھیائی ہوئی آواز بمشکل فرزان کی سماعتوں تک پہنچی تو فرزان نے چونک کر اور اپنی سیٹ سے اٹھ کر قدرے اونچا ہوتے ہوئے ونڈ اسکرین سے باہر جھانکا۔ سامنے ہی ایک مڑا تڑا وجود سڑک کے درمیان میں پڑا دکھائی دیا۔ جسے باقاعدہ بے داغ سفید چادر سے ڈھانپا گیا تھا۔ ٹھیک اسی لمحے فضا ایک بار پھر بریکوں کی تیز چرچراہٹ سے گونج اٹھی۔

ڈرائیور نے سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا پیچھے آنے والے گارڈز کی گاڑیاں قریب پہنچ کر رک چکی تھیں اور ان میں موجود سیکورٹی اہلکار انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ گاڑیوں میں سے اترنے کے بعد اس لاش کے اردگرد جمع ہو گئے۔ ان کی گنیں ان کے ہاتھوں میں اور انگلیاں ٹرائیگر پر تھیں وہ انتہائی چوکنے نظر آ رہے تھے۔ ڈرائیور کے حواس قدرے معتدل ہو چکے تھے۔ شاید گارڈز کی آمد نے اسے کچھ حوصلہ بخشا تھا۔ اور یہ بات بھی فرزان کی سمجھ میں اب آئی تھی کہ ڈرائیور فرزان کی ناراضی کی وجہ سے نہیں بلکہ رات کے اس پہر سنسان سڑک پر ایک لاش کی موجودگی کی وجہ سے خوف زدہ تھا۔

چند لمحے توقف کے بعد فرزان دروازہ کھول کر نیچے اترا اور پھر آہستہ قدمی سے چلتا ہوا لاش کے قریب جا پہنچا۔

سارے گارڈ اپنی اپنی جگہ چوکس کھڑے اردگرد دیکھتے ہوئے کسی بھی متوقع خطرے سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار حالت میں تھے۔ لیکن ابھی تک کسی نے بھی اس لاش کی جانب توجہ دینے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی یہ جاننے کی آخر وہ لاش ہے کس کی۔

سب سے پہلے یہ خیال فرزان ہی کے دماغ میں پیدا ہوا۔ اس ہی لمحے فرزان کے سر پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور فضا میں ایک خوف ناک اور دل دوز چیخ کی آواز لہرا گئی۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اتنا آناً فاناً ہوا تھا کہ فرزان ہونق بنا اپنی جگہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

گاڑی کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز سنائی دی تو فرزان نے پلٹ کر ایک لمحے کے لیے گاڑی کی جانب دیکھا۔ ڈرائیور بے چارہ جو گارڈز کی آمد اور فرزان کے باہر نکلنے پر کچھ نہ کچھ حوصلہ مجتمع کر کے گاڑی سے باہر نکل آیا تھا۔ اس محیر العقول اور ناقابل یقین منظر کو دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ پایا اور چیخ مار کر واپس گاڑی میں جا بیٹھا اور اب وہیں سیٹ پر دبک کر بیٹھا خوف زدہ انداز میں اس حیرت ناک منظر کو دیکھ رہا تھا

فرزان نے ڈرائیور پر سے توجہ ہٹائی اور وہ بھی اس ناقابل یقین منظر میں واپس پلٹ کر اس منظر کا حصہ بن گیا۔ گارڈز بھی بے اختیار کئی قدم پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن ان کی خوف ناک گنوں کے سیاہ دہانے اب لاش کی جانب اٹھے ہوئے تھے۔

دراصل ہوا یہ تھا کہ جوں ہی فرزان نے لاش کے منہ سے کپڑا ہٹایا لاش نا صرف اٹھ کر بیٹھ گئی بلکہ اگلے ہی لمحے اچھل کر کھڑی بھی ہو گئی اور ستم یہ کہ یہ صورت فرزان کے لیے اجنبی نہیں تھی یہ وہی فقیر صفت شخص تھا وہی مجذوب تھا جو اس سے پہلے بھی فرزان کے ساتھ اکثر چھیڑ خانیاں کر چکا تھا۔ شکر یہ تھا کہ اس کے بوسیدہ حال کو دیکھ کر فرزان کے سیکورٹی گارڈز قدرے تذبذب کا شکار ہو گئے اور انہوں نے فائر نہیں کھولا۔

مجذوب نے ایک طائرانہ سی نظر تمام سیکورٹی گارڈز پر ڈالی پھر اس کے ہونٹوں پر تمسخرانہ سی مسکراہٹ پھیل گی۔ پھر وہ حقارت آمیز لہجے میں بولا۔

"شاہ کے مصاحبو! اپنی منجنیقوں کے رخ پھیر دو۔ ایسا نہ ہو کہ چنگیز خان تمہارے سر قلم کر دے اور پھر ان سروں کے مینار بنا کر ہلاکو خان ان پر آ چڑھے اور کتھک ناچ شروع کر دے۔"

پھر فرزان کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"تم اپنی ان نازی فوجوں کو واپس کیوں نہیں بھیج دیتے۔

تم اگر شاہ ہو تو ہم بہادر شاہ ہیں، ہم پر ان کا رعب نہیں چلے گا۔ ہٹ جاؤ سامنے سے۔"

وہ دوبارہ گارڈز کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"اگر تم نہیں ہٹے تو ہمیں غصہ آ جائے گا اور ہم تمہاری دم میں نمدہ فٹ کر دیں گے۔"

پھر لپک کر آگے بڑھتے ہوئے ایک گارڈز کی گن کی نال پر ہاتھ رکھ کر اسے نیچے کی طرف جھکاتے ہوئے دوسرا ہاتھ اس کے کان پر رکھ کر قریب کرتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

یہ الگ بات ہے کہ وہ سرگوشیانہ لہجہ بھی ایسا تھا کہ اس کی آواز سب کو سنائی دے رہی تھی۔
"تمدہ سمجھتے ہو؟ بڑا ہی عمدہ ہوتا ہے۔"
"جاؤ تم سب گاڑی میں بیٹھو۔" فرزانہ کی پارعب آواز سنائی دینے پر گارڈز ایڑیوں کے بل گھومے اور پریڈ کرنے کے سے انداز میں آگے پیچھے چلتے ہوئے اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔
مجذوب لپک کر فرزان کے قریب آیا اور بولا۔
"مخلوق ہی دوسری مخلوق کی دشمن ہے۔ ہنڈولوں میں بیٹھنے والوں کو زمین کی مخلوق کیڑے مکوڑے دکھائی دیتی ہے۔ اچھا خاصا سو رہے تھے ہماری نیند خراب کر دی۔ لیکن افسوس کہ تمہاری نیند ختم نہیں ہو رہی۔۔۔"
پھر وہ بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔ ایک طویل ہنسی کے بعد یک دم خاموش ہو گیا اور پھر آگے کی طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔
"ہوتا ہے۔۔۔ ہوتا ہے۔۔۔ ہنڈولوں کا نشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔۔۔ لیکن یہ سب نشہ ہرن ہوتا ہے تو اچھے خاصے ہرن کو گیدڑ بنا دیتا ہے۔ کہا تو تھا کہ جاگ جاؤ۔ تم نہیں جاگے، لیکن یاد رکھو جب وقت نے تمہاری دم میں دھاگا فٹ کیا تو چوہے کی طرح بھاگتے پھرو گے۔ چوہے کی طرح۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا چوہے کی طرح۔۔۔"
پھر وہ اپنے مخصوص بے ڈھنگے پن سے سڑک پر اچھل کود مچانے لگا۔ کسی درخت کی مڑی تڑی وہ شاخ جو اس کے گیٹ اپ کا حصہ معلوم ہوتی تھی، تمام تر گفتگو کے دوران اس کے ہاتھ میں تھی۔ جسے وہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سر پر بلند کیے جنونی انداز میں رقص کر رہا تھا۔ اس کے پھٹے پرانے لباس کے چیتھڑے ہوا کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ اس کے بڑھے ہوئے بے ہنگم بال اور بے ترتیب داڑھی بھی ادھر سے ادھر جھکولے کھا رہی تھی۔
ہیڈ لائٹس کی روشنی میں فرزان کو اس کے منہ سے بہ کر داڑھی میں جذب ہوتی رال صاف نظر آرہی تھی۔ وہ بے ترتیب انداز میں ناچتے ہوئے مسلسل بڑے ردھم میں گا رہا تھا۔

چوہے کی دم میں دھاگا
چوہا دم دبا کے بھاگا

اور پھر وہ بگٹٹ بھاگتا ہوا اندھیرے میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جیسے اندھیرے میں کھوج رہا تھا۔ لیکن بے سود۔۔۔ ٹمٹماتی ہوئی زردی مائل روشنیوں کے علاوہ اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ گزشتہ آدھے گھنٹے سے خاموش کھڑا ہر طرف سرسراتے ہوئے ان اندھیروں کی سرگوشیوں کو سننے اور سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اندھیرے جو اس کے اندر اور باہر ہر سمت امڈتے ہی چلے آ رہے تھے اور دل تھا کہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ یہ مہیب اندھیرے اس کو اپنے حصار میں لے کر مدہوش کیے جا رہے تھے۔ اور وہ تھا کہ سنبھلنے کی کوشش میں آگے ہی آگے لڑھکتا جا رہا تھا۔
اس نے سنبھلنے کی کوشش میں دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور پھر جیسے چونک کر عالم شعور میں واپس آپہنچا۔ بے خیالی کی یہ کیفیت کتنی دیر کی تھی وہ اس کا اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ لیکن اب وہ یہ بات بخوبی محسوس کر سکتا تھا کہ وہ اپنے بیڈ روم میں ہے اور پردہ ہٹائے گلاس ونڈو کی دوسری جانب جیسے اسی عکس کو تلاشنے میں مصروف تھا جو اس کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے بجائے جھلملا کر بجھ گیا تھا۔ اور اب چہار سو صرف اور صرف اندھیروں کا راج تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر مضبوطی سے تھامے ہوئے پردے کو چھوڑ کر سست روی سے چلتا ہوا اپنے بیڈ پر آبیٹھا۔
یاسیت کی یہ کیفیت اس پر خاصی دیر سے طاری تھی اور اگر ایسا تھا تو اس کی وجہ تھی۔ جس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس کی من پسند چیز اس سے چھن جائے۔ کوئی بہت ہی پیار کرنے والی ہستی ساتھ چھوڑ دے۔
اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔

وقت دھیرے دھیرے سسکتا ہوا رینگتا چلا جا رہا تھا۔ جب لمحے روٹھ جائیں تو وقت وبال جان بن جایا کرتا ہے۔ کاٹے نہیں کٹتا۔ خوشی انسان کی زندگی میں پرسکون رات کی طرح آتی ہے۔ ادھر آنکھ بند ادھر کسی نے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ اٹھو صبح ہو گئی اور پوری رات گزارنے کے بعد بھی پہلا احساس یہی ہوتا ہے کہ ابھی تو سویا تھا اتنی جلدی دن نکل آیا۔ لیکن دکھ جون جولائی کے تپتے ہوئے دن کی مانند ہوتا ہے۔ جس میں انسان صبح سویرے اٹھتا ہے، ناشتا کرتا ہے پھر کام پر نکلتا ہے۔ سارے دن کی ان تھک محنت اور مشقت چلچلاتی ہوئی دھوپ، شدید گرمی، نہ بجھنے والی پیاس، حلق میں پڑے ہوئے کانٹے اور تپتا سلگتا دھیرے دھیرے رینگتا ہوا یہ دن جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔
اس وقت اس کی عجیب حالت تھی، کمرے میں سناٹا، گھر میں خاموشی اور چاروں طرف لہراتی ہوئی گہری چپ دھوئیں کی طرح لہریں لیتا ہوا اندھیرا جس نے نا صرف باہر کے تمام تر مناظر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بلکہ اس کے وجود میں بستے اندرونی شہر محبت کو بھی کسی کالی سیاہ چادر کی مانند ڈھانپ رکھا تھا لیکن دوسری جانب اسی اندھیرے کی آغوش سے دکھ کا سورج طلوع ہوا تو اس کے اندر وہی قہر برساتا، تپتا، سلگتا کبھی نہ ختم ہونے والا دن نکل آیا۔
کہنے کو ایک انسان لیکن اس کی ذات میں پرت در پرت کتنے اسرار پوشیدہ ہیں۔ ایک ہی وجود جس میں ایک جانب گہرے اور ٹھہرا دینے والے اندھیرے موت کی طرح سرد خاموشی تو دوسری جانب درد و غم کی دھوپ سے نمودار ہونے والا قہر بار دن، اس کے اندر دھوپ اور چھاؤں کی یہ جنگ نہ جانے کب سے جاری تھی۔ کبھی دھوپ جیت جاتی تو کبھی چھاؤں کبھی روشنی آگے آجاتی تو کبھی اندھیرا۔۔۔ وہ اپنی اس دوغلی کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا اور وہی کیا اندھیرے اور اجالے کے اس کھیل کو تو آج تک کوئی سمجھ نہیں پایا۔ یہ جنگ تو ازل سے جاری ہے اور یہ ابد تک رہے گی۔ کبھی اجالا اندھیرے کو پچھاڑ دیتا ہے تو کبھی اندھیرا روشنیوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ یہ اس دنیا کی ریت ہے جو اس مالک کے لیے کھیل ہے۔
کہتے ہیں کہ ہر اندھیرے کے بعد روشنی ضرور ہوتی ہے۔ ہر رات کے بعد دن ضرور نکلتا ہے لیکن کچھ لوگوں کے مقدر میں صرف اندھیرے لکھ دیے جاتے ہیں اور وہ ان اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے، ادھر ادھر سر پٹختے تھک ہار کر سپر ڈال دیتے ہیں اور ان کی زندگی کا سفر یوں ختم ہو جاتا ہے۔
کل کیا ہونے والا ہے کسے معلوم؟ کل کس نے دیکھی، اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں سچ کڑوا ہوتا ہے اور اذان کی آج جس سچ سے آشنائی ہوئی تھی اس کی کڑواہٹ اس کے روم روم میں گھل گئی تھی۔ وہ نڈھال ہو گیا تھا۔
سارا دن اس نے لگاتار یہ کوشش کی تھی کہ اس کا رابطہ ماہم سے قائم ہو سکے۔ لیکن ماہم نے ایک بار بھی اس کی کال ریسیو نہیں کی تھی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن جو کبھی نہیں ہوتا وہ کبھی نہ کبھی ہوتا ہے اور ایسا آج ہو گیا تھا جو اذان کے لیے ناقابل یقین تھا۔
وہ سوچ سوچ کر ادھ مرا ہو گیا تھا کہ کیوں آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ماہم کہیں مصروف ہے؟ کسی مصیبت میں ہے؟ بیمار ہے یا وہ جان بوجھ کر اس کی کال اٹینڈ نہیں کر رہی اور اس سے آگے سوچنے کی اذان میں سکت باقی نہیں رہی تھی۔
خیالوں کے اس پاتال میں وہ نیچے ہی نیچے اور نیچے گرتا جا رہا تھا لیکن پتا نہیں کب سے اور پتا نہیں کب تک وہ معلق رہتا کیونکہ شاید اس پاتال کا کوئی دوسرا کنارہ ہی نہیں تھا۔
اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے بیڈ پر اکڑوں بیٹھا دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے اور آنکھیں بند کیے ہوئے دہلا دینے والی سوچوں کے لشکر سے نبرد آزما تھا۔
اس نے بے بسی سے تکیے کے دائیں جانب رکھے ہوئے موبائل کو دیکھا، کچھ سوچ کر اس کا کپکپاتا

ہوا ہاتھ دھیرے دھیرے موبائل کی جانب بڑھا اور پھر اگلے ہی لمحے وہ ماہم کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

ایک بیل۔

دوسری بیل۔

تیسری بیل۔

اور۔۔۔ پھر چوتھی بیل سے پہلے کال ریسیو کر لی گئی اور اذان کو جیسے یقین نہ آیا۔

"ہیلو۔۔۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے بے چینی سے جیسے کسی کو صدا دی ہو۔ ایک ایسی صدا جو کسی گنبد میں بلند ہونے کے بعد چاروں جانب سے ٹکرا کر واپس اپنی ہی سماعتوں کو مجروح کر دے۔

اس کی تمام تر کیفیات شاید اس کے اپنے لیے ہی تھیں کیونکہ دوسری جانب سے سنائی دی جانے والی آواز ماہم کی آواز ہونے کے باوجود اسے اجنبی اور غیر مانوس سی لگی تھی اور وہ بھونچکا رہ گیا۔

"مسٹر اذان فیضی! آخر مسئلہ کیا ہے آپ کے ساتھ۔۔۔؟ اگر کوئی آپ کی کال ریسیو نہیں کر رہا تو کیا آپ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے کہ وہ شخص آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا۔۔۔ صبح سے کتنی کالز کر چکے ہیں آپ۔ اب تک تو آپ کو سمجھ آ جانا چاہیے تھا۔" ماہم کی غصیلی آواز سنائی دی۔

اذان چند لمحے تو کچھ بول ہی نہیں سکا۔ پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے جیسے اس کی کراہ سنائی دی۔

"مم۔۔۔ مگر ماہم! کیا یہ تم ہو؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ایسا کیوں؟"

"اذان فیضی صاحب! میں اس کی ضرورت تو نہیں سمجھتی لیکن پھر بھی ہم لوگوں کا جتنے دن بھی کچھ تعلق رہا اس تعلق کی خیرات سمجھتے ہوئے یہ چند الفاظ میں آپ کے دامن میں ڈال رہی ہوں سنبھال کر رکھیے گا۔

ہمارے درمیان ہونے والی پہلی گفتگو میں، میں نے آپ پر واضح کر دیا تھا کہ مجھے جھوٹ سے نفرت ہے لیکن شاید آپ نے تعلق محبت اور رشتوں کو کھیل سمجھ رکھا ہے۔ محبت کے جھانسے تو شاید آپ پہلے بھی کئی لڑکیوں کو دے چکے ہوں گے لیکن میرا نام ماہم نظامی ہے اور جو جواب میں آپ کو دے رہی ہوں اس جواب کو یاد کر کے ہمیشہ بلبلاتے رہیں گے۔

اور وہ جواب یہ ہے کہ ماہم نظامی اذان فیضی صاحب نامی کسی شخص کو نہیں جانتی۔ میرا اگر کوئی تعلق آپ سے رہا ہے تو میں اس پر شرمندہ ہوں اور اس تعلق پر آج ابھی آخری مرتبہ معافی مانگتی ہوں۔۔۔ آپ کا یہ کھیل یہیں ختم ہوتا ہے۔ دی اینڈ مسٹر اذان فیضی۔۔۔!

اگر آپ میں غیرت نام کی ذرا سی بھی کوئی چیز باقی ہے تو آئندہ مجھے کال کرنے کی کوشش مت کیجیے گا۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ شادی مبارک ہو۔" اور اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہو گئی۔

ماہم کی زبان سے نکلا ہوا زہر برساتا ایک ایک لفظ کسی تیر کی مانند سیدھا اذان کے دل میں پیوست ہوا تھا۔ ایک زوردار دھماکا تھا جو اس کے اندر ہی اندر کہیں ہوا تھا اور پھر ہر جانب آگ ہی آگ پھیلتی چلی گئی جس میں سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔

سانس کی ڈور پہ چلتی آگ
کب تک روح میں ڈھلتی آگ
کتنے شہر اجاڑ گئی
راکھ بدن پر ملتی آگ
آج کا روز تھا حشر کا روز
کاش اس روز نہ جلتی آگ
دریاؤں کو پھانک چکی
پیاس کی گود میں پلتی آگ
آ پہنچی ہے دار کے پاس
عشق کے پھول مسلتی آگ

(باقی آئندہ)

"میم واش روم جاؤں۔" اور علینہ صحیح معنوں میں جھنجلا گئی تھی اس نرسری کلاس میں دوسرا دن تھا اور یہ بچی کوئی پچاس بار واش روم جا چکی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد لنچ باکس کھول کر لنچ کرتی کبھی حلق پھاڑ کر رونے لگتی کام کرنے کی باری آتی تو اس کا ایک ہی جملہ تھا۔

"میم کرا نہیں جا رہا" علینہ کو تاؤ سا آ گیا عجیب شکل و صورت کی بچی تھی۔ اگرچہ نقوش اچھے تھے رنگت زردی مائل سفید تھی نچی کھنچی بھنویں، اڑی اڑی سی پلکیں اور سر کے بال جا بجا ٹکڑیوں کی صورت اڑے ہوئے تھے جو اسے عجیب سی ہیئت دے رہے تھے یہ اچھے پوش علاقے میں شہر کے ٹاپ اسکولوں میں سے ایک تھا۔ علینہ نے یہاں پندرہ دن پہلے جوائن کیا تھا، تنخواہ پرکشش، اسپوکن انگلش پر زیادہ توجہ تھی۔ اٹھارہ برس انگلینڈ میں رہنے کی وجہ سے علینہ کی انگلش بے حد اچھی تھی وطن واپسی پر گھر وغیرہ سیٹل کرنے کے بعد علینہ نے اپنی بی ایس سی کی ڈگری کا استعمال مثبت انداز میں کرنے کا سوچا تھا۔

فہد اور علینہ کے دونوں بیٹوں نے تین ماہ بعد پاکستان آنا تھا سو اس وقت تک یہ مصروفیت اسے غنیمت لگ رہی تھی۔ اس کلاس کی ٹیچر بچے کی پیدائش کے سلسلے میں چھ ماہ کی چھٹی پر تھی اور کل سے علینہ اس کلاس میں کلاس ٹیچر کے طور پر تھی اور تھوڑی دیر بعد اس بچی نے کلاس میں ہی گند کر دیا تھا۔

"میم بیا نے شو شو کر دیا ہے۔" مختلف بچے مختلف انداز میں اظہار خیال کر رہے تھے۔ علینہ کو اس بچی پر رحم سا آیا تھا پھر اس نے آیا کو بلا کر کمرہ صاف کروانے کے لیے سوئپر کو بلوایا اور بچی کو آیا کے ساتھ کیا، تاکہ اس کو چینج کروا دے۔

"میم لنچ کر لوں" اس کا باجا علینہ کے کانوں میں ہر پانچ دس منٹ کے بعد بجتا رہا تھا آخر کار کلاس کا ٹائم ختم ہوا۔ مختلف بچوں کو ان کے ماں باپ لینے آتے تھے اور اس بچی رابعہ کو بڑی بڑی مونچھوں والا ڈرائیور اور آیا لینے آتے تھے۔ علینہ نے اندازہ لگایا شاید بہت کھاتا پیتا گھرانا ہے۔ خیر اس کے لیے تو مسئلہ کلاس روم ڈسپلن کا تھا جس کی یہ بچی دھجیاں اڑاتی تھی کبھی وقت بے وقت کھا کر رو کر، واش روم جا کر۔ علینہ سوچتی ہوئی کلاس سے نکل آئی

اگلے دن قبول صورت پینتیس چھتیس سالہ خاتون رابعہ کے ساتھ آئی تھیں، تیز پرفیوم، مہنگے کپڑے اور بے تحاشا سونے کا زیور پہنے ہوئے۔

"آپ رابعہ کی نئی ٹیچر ہیں؟"

"جی بالکل۔"

"رابعہ کو شوگر ہے، اس لیے اسے وہ سب کچھ کرنے دیں جو یہ کرے۔"

"جی لیکن۔"

"اصل میں یہ دو تین دن سے اسکول آنے سے انکار کر رہی ہے۔ پہلے اس نے ایسا کبھی نہیں کیا۔" اس کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی وجہ تم ہو۔

"دیکھیں مجھے بہت افسوس ہے اس سلسلے میں لیکن کلاس روم ڈسپلن کے لیے بعض اوقات ہمیں بچوں پر روک ٹوک کرنا پڑتی ہے۔"

"اس کے دادا اس اسکول کے ٹرسٹی ہیں اور بورڈ آف گورنرز کے اہم رکن۔" اس کا انداز دھمکی آمیز تھا، گو علینہ کو ملازمت کی ضرورت نہیں تھی لیکن فہد کے آنے کے بعد بھی اس کے دونوں بیٹے بیرون ملک ہی رہتے تعلیم کے سلسلے میں تو علینہ کو یہ ملازمت فارغ وقت کا اچھا مصرف لگ رہی تھی۔ پھر اس کا اصول تھا کہ اپنی بساط کے مطابق محنت کرو چاہے اس کا معاوضہ کسی ضرورت مند کو ہی دے دو۔ اس خاتون کے ہتک آمیز رویے پر علینہ کو غصہ تو بہت آیا لیکن اس نے نرمی سے کہا۔

"ہمارے لیے سب بچے ایک جیسے اہم اور پیارے ہیں آپ فکر نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے ایسا ہی کرنا اب۔" وہ ٹھک ٹھک کرتی نوکرانیوں کے جھرمٹ میں کلاس روم سے نکل کر چلی گئی علینہ نے بمشکل خود کو سنبھالا تھا۔ ایک تو جاگیردار اور چار پیسے رکھنے والا طبقہ خود کو خدا سمجھتا ہے اس ملک میں اس نے کڑھ کر سوچا اور بچوں کو لکھائی کی مشق کروانے لگی دن بے حد مصروف گزرا تھا کہ ہوم ٹائم میں رابعہ کو لینے اس کا باپ آ گیا جسے دیکھ کر علینہ جہاں تہاں رہ گئی تھی۔

"کیا یہ شخص۔" اس نے سوچا وہ بھی اسے دیکھ کر رک سا گیا تھا اور پھر سر جھکائے رابعہ کو لے کر چلا گیا اور علینہ سر تھام کر بیٹھی رہ گئی اسے کچھ خبر نہ ہوئی کہ کس بچے کو کون لے کر گیا سارا وقت وہ غائب دماغی سے بیٹھی زمین کو گھورتی رہی۔

✲ ✲ ✲

"علینہ واپس آ جاؤ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔" نورین علینہ کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتی ہوئی کہہ رہی تھی علینہ چونک کر ایک جھینپی ہوئی سی ہنسی ہنس دی۔

"اب تو 'اپنا مراقبہ' فرمانے کی وجہ خود اگلیں گی یا میں زحمت کروں؟" اور ابھی علینہ اپنے پیازی لب کھولنے ہی والی تھی کہ وہ دشمن جان ایک بار پھر اپنی حشر سامان شخصیت کے ساتھ ان کے سر پر آ موجود ہوا تھا اور علینہ کے حواس جواب دینے لگے تھے۔

"ہیلو۔" اس نے خوب صورت آواز میں ان کے قریب آ کر کہا تھا۔

"ہائے۔" جواب نورین کی طرف سے آیا تھا۔ کیونکہ علینہ کے تو ہوش حواس سب ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

"کیسی ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں اور مقابلہ جیتنے پر بہت مبارک باد۔" نورین شروع ہو چکی تھی۔ اس کی عادت تھی ہر ایک سے اعتماد سے بات کرنے کی مقابل چاہے لڑکا ہو یا لڑکی اب سے کچھ منٹ پہلے تک علینہ بھی ایسی ہی تھی پر اب یہ شخص شاید جادوگر تھا جس کی ڈارک براؤن آنکھیں لمحے بھر کو علینہ کے چہرے سے نہیں ہٹی تھیں اور اپنی تیز روشنیوں سے اس کے دل کی دنیا اتھل پتھل کرنے میں مصروف تھیں۔

"یہ کون ہیں؟" آخر کار اس نے پوچھا۔

"یہ میری بہت اچھی دوست ہے، چار دن پہلے مائیگریٹ ہو کر آئی ہے ایم ایس سی فزکس کرنا اس کا خواب ہے۔"

"یہ خود نہیں بولتیں۔"

"جب یہ بولتی ہے تو سارے سنتے ہیں، کیوں علینہ میں درست کہہ رہی ہوں نا!"

"او کے علینہ نائس ٹو میٹ یو، مجھے شہریار کہتے ہیں۔" اس نے علینہ کے سرخ و سپید چہرے پر نظر جمائے کہا تھا اور ایک طرف کو بڑھ گیا تھا۔ نورین گھاس پر کتابیں پھینک کر خود بھی ایک سایہ دار درخت کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ چکی تھی۔ نومبر کا آغاز ہو چکا تھا لیکن دھوپ میں بیٹھنا محال تھا۔ پر علینہ وہیں کھڑی ان راستوں پر نظر جمائے کھڑی تھی جہاں جہاں اس جادوگر کے قدم پڑے تھے۔

وہ دسمبر کے پہلے پانچ دنوں میں سے کوئی دن تھا صبح سے شدید دھند ہر طرف پھیلی ہوئی تھی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ نورین نہیں آئی تھی اور علینہ لائبریری میں بظاہر کتاب کھولے بیٹھی تھی لیکن اس سے ایک لفظ بھی پڑھایا سمجھا نہیں جا رہا تھا وہ ہمیشہ لائبریری میں اسی کھڑکی کے سامنے بیٹھا کرتی تھی۔ جہاں سے باہر کا سرسبز لان نظر آتا تھا۔ اسے بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی کہ دلفریب خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی سر اٹھایا تو جیسے سارا وجود آنکھ بن گیا وہ بلیک پینٹ اور لیدر جیکٹ پہنے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"بیٹھ سکتا ہوں" اس نے شائستگی سے اجازت مانگی اور جواب میں علینہ صرف سر ہلا پائی تھی۔

"میں نے شاید آپ کو ڈسٹرب کر دیا ہے۔" گمبھیر آواز میں پوچھا گیا۔

"ن۔۔۔ن۔۔۔ نہیں تو۔" اندر تک میری ہستی کو ہلا کر کتنی معصومیت سے پوچھتے ہو کہ ڈسٹرب کیا ہے یا نہیں وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوئی آنکھیں ان قاتل آنکھوں کی طرف دیکھنے سے مسلسل گریزاں

تھیں۔

"ایک بات کہوں آپ برا تو نہیں مانیں گی۔" وہ سر تاپا کان بن گئی۔

"جی کہیے۔"

"مجھے آپ بہت اچھی لگتی ہیں' لیکن لگتا ہے میں آپ کو پسند نہیں ہوں۔"

"کیا تمہیں کچھ دکھائی دیتا ہے میں تو سر تاپا اپنے دل کا حال بیان کر رہی ہوں شاید۔" وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھی اور صرف اتنا بولی تھی۔

"نہیں ایسا نہیں ہے۔"

"کیسا نہیں ہے" اس کے چہرے پر شرارت بکھر گئی تھی اور آنکھوں میں نجانے کون سے رنگ تھے' علینہ پہچان ہی نہیں پائی تھی یا پہچاننا نہیں چاہتی تھی

"یہی کہ..." الفاظ ختم ہو گئے تھے شاید۔

"کیا؟"

"آپ پلیز۔" وہ لب کاٹ کر رہ گئی اسے بھی اس پر ترس آیا۔

"اوکے اس کا مطلب ہے کہ آپ مجھے پسند کرتی ہیں۔" وہ فخر سے مسکرایا تھا اور علینہ کی پلکوں پر منوں بوجھ آگرا تھا۔ وہ نجانے کب اٹھ کر چلا گیا تھا۔ اس روز علینہ کے پاؤں زمین کی بجائے ہوا میں اڑ رہے تھے ہر سو پھول ہی پھول کھلے ہوئے لگ رہے تھے حالانکہ وہ دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی رات تھی۔ اس نے اماں کی جھاڑ کے جواب میں بھی مسکرانا جاری رکھا تو وہ بولیں۔

"علینہ تیرا دماغ پھر گیا ہے۔"

"ارے نہیں میری پیاری اماں۔" اس نے مسکرا کر اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"تیرا کچھ سوچنا پڑے گا لڑکی۔" اماں سر ہلاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تھیں اور کمرے میں صرف علینہ رہ گئی۔

وہ اگلے دن یونیورسٹی گئی۔ سب کچھ حسین لگ رہا تھا۔ وہ آج پھر سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ علینہ کیفے ٹیریا کے باہر دھوپ میں بینچ پر بیٹھی تھی کہ وہ چلا آیا۔ دیر تک وہ دونوں آنکھوں کی زبان سے نجانے کیا کہتے سنتے رہے جب وہ دھیرے سے بولا۔

"میں یہاں تمہارا رہتا ہوں' ماما پاپا آ نہیں سکتے' کیا تمہارے گھر والے تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں گے۔" علینہ نے صرف پل بھر کے لیے پلکیں اٹھائی تھیں پھر جھکا گئی۔

"میں اب تمہارے بنا ایک پل نہیں رہ سکتا۔" گمبھیر آواز دل کو چھو لینے والا لہجہ وہ بے بس ہو گئی۔

"کچھ تو بولو۔" اس نے ضد کی۔ وہ کیا کہتی کہ اسے سامنے پا کر سارے الفاظ ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑ جاتے تھے۔ اس سے بات کی ہی نہیں جاتی تھی۔

"اچھا یہ بتاؤ میرے لیے گھر پر بات کرو گی؟" وہ پھر خاموش تھی کچھ نہ بولی۔

"بولو یار کچھ تو کہو ہاں یا نہ۔" علینہ کی سیاہ پلکیں گلابی عارضوں پر پھڑپھڑا رہی تھیں یا قوتی لب لرز رہے تھے نجانے کتنے پل وہ اس کیفیت میں رہی تھی کہ بالآخر وہ بولا۔

"اس کا مطلب ہے ہمیں راستے جدا کرنے پڑیں گے' چلو خیر ہے محبت پا لینے کا نام ہی تو نہیں ہے۔" وہ اٹھ کر جانے لگا تھا کہ علینہ عجلت میں بول اٹھی۔

"پلیز نہیں۔" وہ رکا مڑ کر مسکرایا' علینہ نے سوچا مسکراتے ہوئے کتنا اچھا لگتا ہے شاید اسی لیے کنجوسی سے کام لیتا ہے۔

"اوکے میں اپنے دوست اور اس کی بیوی کو بھیجوں گا تم میرے لیے صرف میرے لیے بنی ہو اور میرے لیے ہی ہاں کرو گی ٹھیک ہے۔" اور علینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ چلا گیا اور علینہ جلدی سے اٹھ کر لائبریری میں چلی آئی وہاں موٹی سی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے لائبریری کے پرسکون ماحول میں لکڑی کے میز کی شفاف سطح پر نظریں جمائے علینہ مستقبل کے بارے میں سوچتے سوچتے مسکرانے لگی۔ اس سے اور پڑھا نہیں جا رہا تھا وہ جلدی گھر آگئی تھی۔

اگلے دن نورین نے نہ آنے کی وجہ بیان کی اس کی

خالہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اور ان کی ضد پر نورین کا نکاح ان کے اکلوتے بیٹے سے کر دیا گیا تھا۔ اب نورین پڑھائی چھوڑ کر پیا دیس سدھارنے کی فکر میں تھی اور علینہ کو بھی وقت بے وقت ہاتھ بٹانا پڑتا یوں علینہ اپنے دل کی واردات کے بارے میں اسی کو بتا ہی نہیں پائی تھی کہ شہریار نے رشتہ بھیج کر سب کو حیران کر دیا۔ اس کا دوست جمیل رشتہ لے کر آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی ہما تھی۔ وہ پھل اور مٹھائی ڈھیروں ڈھیر لائے تھے۔

"بس خالہ جی ہمیں لڑکی چاہیے تین کپڑوں میں اور کچھ بھی نہیں۔"

"لیکن بیٹا یوں کیسے' بغیر کسی بڑے کے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا لیا جائے۔" اماں افتاں و خیزاں بولیں۔

"اصل میں خالہ شہریار کے والدین بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ اسے اس کے دور کے چچا نے پالا پوسا۔ اب سال بھر پہلے ان کا بھی انتقال ہو گیا' اب یہ کس کو لائے رشتے کے لیے۔" جمیل اور ہما دکھیاری صورت بنا کر بولے تھے۔ اماں کا دل بھر آیا پر بیٹی کا معاملہ تھا وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"آپ گھر کے مردوں کے ذریعے جیسی چاہیں تسلی کروا سکتی ہیں۔"

اب اماں کیا کہتیں' علینہ کے والد اکلوتے تھے۔ دور پرے کے اگر کچھ عزیز تھے بھی تو وہ ملک سے باہر تھے اماں کا اپنا کوئی میکا نہیں تھا۔ ایک بھائی تھا وہ بیرون ملک ایسا گیا کہ پھر مڑ کر خبر نہ لی۔ علینہ کا بھائی روزگار کے سلسلے میں چار برس سے سعودیہ میں تھا۔ جو سال بھر پہلے شادی کروا کر بے گانہ سا ہو گیا تھا۔ جس نے شادی کے بعد پہلے تو خط لکھنے کم کیے اور اب رقم بھی سکڑتی جا رہی تھی پوچھنے پر پتا چلتا کہ اتنی مہنگائی ہے پورا نہیں پڑتا۔ علینہ بلک اٹھتی۔

"اماں میں ملازمت کروں گی آپ کا سہارا بنوں گی۔"

"تیرے منہ میں خاک تو کیوں بنے گی میرا سہارا تو اپنے گھر کی ہو جا خیریت سے بس یہی خواہش ہے میری۔" اور پھر دونوں ماں بیٹی نم آنکھیں لیے گھنٹوں سوچے جاتیں لامحدود سوچیں پر یہ سب زخم اماں کے دل پر تھے۔ ابھی شہریار غیر تھا۔ اسے یہ سارے زخم دکھائے نہیں جا سکتے تھے۔ بعد میں آہستہ آہستہ پتا چل جاتا وہ الگ بات ہوتی اس لیے اماں ابھی سے اسے کچھ بتا کر شیئر نہیں کرنا چاہتی تھیں یوں اماں نے سوچنے کے وقت مانگا اور اپنے بیٹے امجد کو فون کے ذریعے اطلاع دی۔ انہوں نے اس سے وطن آ کر چھان پھٹک کرنے کا بھی کہا' پہلے تو وہ ٹالتا رہا پھر بھابھی نے اپنے گھر والوں کے ذریعے یہ کام کروانے کی ہامی بھر لی' بھابھی نے دو دن بعد فون پر اماں کو کہا کہ وہ شکر کرتے ہوئے سادگی سے علینہ کو رخصت کر دیں۔

"لیکن بیٹا لڑکا اکیلا ہے نہ کوئی آگا نہ پیچھا میرا دل ہولتا ہے۔" اماں بولیں۔

"لیں اکلوتے کی خوب کہی' ارے لوگ تو ترستے ہیں ایسے رشتوں کے لیے اور کیا چاہیے۔"

"لیکن بیٹا میں آج ہوں کل نہیں ہوں گی دکھ سکھ میں تم لوگوں کو ہی دیکھنا پڑے گا۔" اماں نے ایک اور کوشش کی لیکن وہاں نہ پہلے کبھی اثر ہوا تھا نہ اب ہوا یوں علینہ ایم ایس سی پارٹ ون کے پیپر دینے سے پہلے ہی دلہن بن کر پیا دیس سدھار گئی۔ اسے شہریار کے دو کمروں کے فلیٹ میں رہنا تھا۔ صرف نکاح ہوا تھا جس میں شہریار کی طرف سے قریبی رشتہ داروں نے شرکت نہیں کی تھی صرف چند دوست تھے اور علینہ کے چند عزیز شریک ہوئے تھے۔ بھابھی کا خاندان بھی آیا تھا۔ اب نہ علینہ کو بھابھی کے بھائی کی آنکھوں سے نکلتے ہوس کے شعلوں نے بھسم کیا تھا نہ ان کی اماں کی دل پر بھالے چلاتی زبان نے پریشان کیا تھا وہ تو من پسند سپنے بننے میں مگن تھی۔

اماں نے ساری رسمیں کی تھیں اور شہریار کو دیکھ کر سب لوگوں نے انگلیاں دانتوں تلے داب لی تھیں۔ شادی کے بعد علینہ گھر کے کونے کونے کو چمکاتی' جی لگا کر شہریار کے لیے کھانا بناتی اور دیوانوں کی طرح محبت کیے جاتی۔ اس کے سگھڑاپے کو اگر اماں دیکھ لیتیں تو

ضرور بے ہوش ہو جاتیں وہ شروع سے ایسی ہی تھی ٹوٹ کر محبت کرنے والی' یہاں شیری جواب میں اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا اسے سوچنے کی فرصت کہاں تھی۔ اس کے لیے تو دن عید راتیں شب برات تھیں اماں بیٹی کے چہرے پر کھلتا گلال دیکھ کر نہال تھیں۔

شادی کے بعد چار ماہ اسی طرح گزر گئے کہ ایک دن دوپہر کا کھانا بناتے بناتے علینہ کچن میں گر پڑی' پھر اسے چکر اور قے آتے رہے۔ شہریار کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ اماں کے ساتھ جا کر لیڈی ڈاکٹر کو چیک اپ کروا آئی۔ چار دن بعد رپورٹس ملیں اس نے لا کر دراز میں رکھ دیں۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی۔ وہ پاؤں کہیں رکھتی اور پڑتا کہیں تھا۔ شام کو شیری واپس آیا۔ طبیعت کی خرابی کی باوجود علینہ نے کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کیا تھا۔ شیری نے کھانا کھایا۔ اپنے معمولات نمٹانے کے بعد بیڈ کی سائیڈ دراز کھول کر کچھ کاغذات نکال رہا تھا کہ علینہ کی رپورٹس ہاتھ لگ گئیں علینہ کو اپنی مشکل حل ہوتی محسوس ہوئی جو بات وہ حیا کے مارے اسے بتا نہیں پا رہی تھی۔

"اف اب خود پڑھ کر وہ کتنے خوش ہوں گے۔"

یہ سوچ کر وہ کچن میں چلی گئی مارے حیا کے اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ نجانے کون کون سے میٹھے خیالات اسے مسکرانے پر مجبور کر رہے تھے شہریار نے بے حد اونچی آواز میں اسے پکارا۔

"علینہ۔"

وہ جلدی سے بیڈ روم کی طرف بھاگی وہ رپورٹس کا لفافہ ہاتھ میں تھامے حیران و پریشان کھڑا تھا۔

"یہ کس کی ہیں؟"

"نام لکھا ہے اوپر۔" علینہ نے شرمیلی مسکان لبوں میں چھپائی تھی۔

"لیکن یہ۔ یہ کیسے کب میرا مطلب ہے تم کب گئیں ڈاکٹر کے پاس؟" وہ عجیب بے ربط انداز میں بات کر رہا تھا۔

"وہ آپ گھر پر نہیں تھے میں اماں کے ساتھ گئی تھی۔" علینہ حیران پریشان سی اس صورت حال سے نبرد آزما تھی۔ اس نے تو اب تک ڈراموں وغیرہ میں ہیرو وغیرہ کو ایسی صورت حال پر خوشی سے بے قابو ہوتے دیکھا تھا۔ پھر یہ شیری کیوں اتنا عجیب ری ایکٹ کر رہا تھا۔

"او کے ہاں اچھا وہ میری بلیو فائل نظر نہیں آ رہی۔" وہ پر سوچ انداز میں بولا اور علینہ نے اسے فائل ڈھونڈ کر دے دی۔ پھر رات کے کھانے تک وہ عجیب گم سم کچھ سوچتے ہوئے سارے کام نبٹاتا رہا۔ علینہ منتظر رہی کہ وہ اسے خوشی اور پیار سے مخاطب کر کے کوئی جذبوں بھرا اظہار کر کے دکھائے گا لیکن وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔

اس نے کھانا بھی برائے نام کھایا تھا اور کھانے کے بعد وہ علینہ کے پاس چلا آیا علینہ اس وقت سارے کام نبٹا کر بالوں میں برش کر رہی تھی۔

"یہاں آؤ علینہ" اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا وہ چپ چاپ اس کے پاس چلی آئی۔

"بیٹھو۔" وہ ذرا سے فاصلے پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو علینہ ابھی ہم یہ سب افورڈ نہیں کر سکتے۔" وہ پر سوچ انداز میں بولا۔ علینہ نے حیرانی سے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے یہ بچہ وغیرہ اس لیے تم کل میرے ساتھ چلنا ہم اسے ختم کروا دیتے ہیں۔" علینہ کو جھٹکا سا لگا۔

"لیکن شیری آپ ایسا کیوں؟" علینہ گنگ سے ہو گئی تھی اس کو لگ رہا تھا الفاظ اس سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئے ہوں۔

"میں نے کہا نا ہم ابھی افورڈ نہیں کر سکتے یہ سب اور پھر اولاد مرد کی مرضی سے ہوتی ہے وہ چاہے یا نہ چاہے عورت کو اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔" شہریار فیصلہ سنا کر جیسے مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ ساری رات تڑپتی رہی یہ کیا تھا' کیوں تھا اولاد تو میاں بیوی کے بندھن کو مضبوط کیا کرتی ہے۔ اس نے اپنی محبت

کرنے والی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان گنت خواب آنے والے کے لیے جاگتی آنکھوں سے دیکھ ڈالے تھے اور اب شہریار اسے ختم کروانے کے لیے کہہ رہا تھا لیکن کیوں؟ آخر ایسا کیوں؟

اس نے سوچا وہ صبح شہریار کو منا لے گی کہ ایسا نہ کرے اسے بچوں سے دیوانگی کی حد تک پیار تھا۔ پھر وہ کیسے اپنی کوکھ چپ چاپ اجڑنے دے نہیں وہ ایسا نہیں ہونے دے گی اس نے مضبوط ارادہ کیا اور جانے کب سو گئی۔

صبح اتوار تھا۔ وہ حسب معمول اٹھ کر روزمرہ کام نبٹاتی رہی شہریار دس بجے کے قریب اٹھا اس نے اس کی پسند کا ناشتا بنایا اور ٹیبل سیٹ کر کے شہریار کو بلانے لگی اس کے ناشتا شروع کرنے پر وہ ذہن میں خیالات کو ترتیب دیتے ہوئے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں مسل رہی تھی کہ شہریار نے اس کی طرف دیکھا۔

"بیٹھو۔" اور وہ بے دم سی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی شہریار مسلسل ناشتا کر رہا تھا۔ اس نے دوبارہ علینہ سے کچھ نہیں کہا۔ آخر اس نے خود ہی ہمت کی۔

"وہ مجھے آپ سے بات کرنا ہے۔" وہ جھجکی۔

"ہاں بولو۔" شہریار نے بے تاثر انداز میں کہا تھا۔

"وہ اصل میں۔" اسے لفظ کھوئے ہوئے لگے۔

"تم جلدی سے ناشتا کر لو پھر ڈاکٹر کی طرف نکلنا ہے۔" شہریار کا انداز بالکل عام سا تھا وہ بڑی اچھی طرح ناشتے سے انصاف کر رہا تھا۔

"شہریار پلیز میں ایسا نہیں چاہتی۔" اس نے ہمت کی اور شیری نے اس کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھا تھا۔

"پلیز دیکھیں میں پال لوں گی بچے کو آپ پلیز مجھے ایسا کرنے پر مجبور نہیں کریں۔" انداز میں التجا تھی لیکن چہرے پر ایک عزم کی کیفیت تھی۔

"میری بات سنو وہی ہو گا جو میں چاہوں گا' سمجھ میں آیا؟" شہریار اچانک کرسی دھکیل کر کھڑا ہوا اور اس کے لاکھ انکار کے باوجود اپنی مرضی کر کے رہا وہ روتی سسکتی ڈاکٹر کے کلینک سے اپنی خالی کوکھ لیے واپس گھر آئی تھی۔ اس کا دل ہر طرف سے اچاٹ ہو گیا تھا کہ شام میں ایک اور واقعہ طوفان لے آیا۔ وہ بے دلی سے شام کی چائے بنا رہی تھی کہ اسے شہریار فون پر بات کرتا دکھائی دیا اس نے خاموشی سے چائے کا کپ اس کے سامنے لے جا کر رکھ دیا گو کمزوری کی وجہ سے کھڑا ہونا بھی محال تھا لیکن شہریار کے کام وہ معمول کے مطابق کر رہی تھی وہ واپس مڑ رہی تھی کہ اس کے قدم دہلیز کے پاس رک گئے۔

"جی ابا جی جیسے آپ کہیں۔"

"ارے نہیں ابا جی اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے میں آج ہی اسے فارغ کرتا ہوں۔"

"آپ ادھر نہ آئیں میں آرہا ہوں آپ کی طرف۔"

"اچھا خدا حافظ۔" وہ فون رکھ کر چائے پینے لگا تھا کہ علینہ تیر کی طرح اس کی طرف بڑھی۔

"آپ کے بابا زندہ ہیں؟" وہ چونکا تھا پھر پرسکون ہو کر بولا۔

"ہاں۔"

"لیکن آپ نے تو۔"

"ارے وہ تم سے شادی کرنے کے لیے تھا۔" اس نے یوں بات کی جیسے کسی معمولی بات پر کسی بچے کو بہلایا جائے۔

"پھر آپ اپنے گھر والوں سے مجھے کب ملوائیں گے۔"

"مجھے گاؤں جانا ہے کسی کام کے سلسلے میں۔" سوال گندم جواب چنا' لیکن ہکا بکا رہتے ہوئے علینہ نے اس کے ساتھ گزرے وقت کو کھنگالا تو بہت واضح بات سامنے آئی کہ ان گزرے مہینوں میں دیوانگی چاہت قربانی پیار سب علینہ کی طرف سے تھا وہ تو بس اپنا حق وصولنے کے بارے میں سنجیدہ تھا روز اول سے ہی۔

اب بھی وہ اپنی چیزیں بیگ میں منتقل کرتا جا رہا تھا کہ علینہ نے پہل کی۔

"آپ کب تک واپس آجائیں گے؟؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" وہ پر سکون تھا اور اب دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"اپنا بہت خیال رکھیے گا۔" علینہ اپنے ابارشن کے سلسلے میں ناراضی کے باوجود اسے کہے بغیر رہ نہیں پائی تھی جبکہ اس نے بس ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر فلیٹ سے نکل کر سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ علینہ وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی کچھ نہیں بہت غلط تھا لیکن اسے اس کا اندازا نہیں ہو رہا تھا۔ پھر شہریار اس دن کا گیا دوبارہ کبھی نہیں آیا علینہ کے انتظار کو ایک رجسٹری اور خط نے ختم کر دیا تھا۔ اسے خود نہیں پتا چلا کہ وہ انتظار کرتے ہوئے زیادہ اذیت میں تھی یا اس انتظار کے ختم ہو جانے پر۔

وہ اماں کو بمشکل اپنے ساتھ رہنے پر راضی کر پائی تھی شام کا وقت تھا پوسٹ مین اسے رجسٹری دے کر گیا تھا۔ علینہ نے الجھن آمیز پریشانی سے اسے اپنے کمرے میں آکر کھولا اس میں سے ایک خط برآمد ہوا وہ شہریار کی رائٹنگ پہچانتی تھی۔

"علینہ مجھے تمہیں مخاطب کرنا پڑ رہا ہے صرف اس لیے کہ تم میں عقل سمجھ کی شدید کمی ہے۔ ورنہ میں شہریار گوارا یہ ایک دو ٹکے کی لڑکی کو خط لکھوں امپاسبل بہرحال میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میں اپنے والدین کا اکلوتا وارث ہوں میرے دادا کے پانچ بیٹوں میں صرف میرے ابا کی نرینہ اولاد ہے میرے دادا کی ملکیت بارہ گاؤں تھے جو اب میرے قبضے میں ہوں گے ہم لوگ تو نوکر رکھنے سے پہلے اس کا حسب نسب دیکھتے ہیں پھر بیوی تو زندگی بھر کا ساتھی ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں دیکھا مجھے تمہاری طلب ہوئی پھر تم خود مجھ پر مرمٹی تھیں اس لیے میں نے نکاح کا کھٹ راگ پال لیا۔ بہرحال کل میری بچپن کی منگیتر کے ساتھ شادی ہے اس خط کو پڑھ کر جذباتی مت ہو جانا کچھ دنوں میں تمہیں طلاق نامہ اور مہر کی رقم مل جائے گی اور ویسے بھی تم مجھ پر عاشق تھیں تمہیں تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ تمہارے ساتھ میں نے وقت گزارا رہ گیا بچہ تو ہم لوگ کتوں تک کی نسل کا خیال رکھتے ہیں میں کیسے ایک ادنی خاندان کی لڑکی سے اپنی اولاد پیدا کر لیتا۔ زیادہ مت سوچنا کیونکہ میری زندگی میں تم سے پہلے لاتعداد آئی اور گئیں کچھ دولت کا شکار ہو گئیں کچھ میری وجاہت کا تم تنہا تھیں جسے میں نے خوامخواہ میں بیوی بنایا اور چار مہینے کا ساتھ بخشا یقیناً" تم شکر گزار ہو گی۔"

اس سے آگے کیا لکھا تھا علینہ سے پڑھا ہی نہیں گیا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کی بے وفائی کا ہی غم نہیں تھا۔ اپنی حرماں نصیبی کا غم 'بے وقوفی کا' بے عقلی کا' لاعلمی میں لٹ جانے کا۔ اماں جب اس کی چیخوں کو سن کر کمرے میں آئیں تو وہ ہوش و خرد سے بے گانہ فرش پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

پھر نجانے اماں نے کیسے حوصلے سے کام لے کر فلیٹ کے بقایا بلز اس کا زیور بیچ کر ادا کیے اور اسے گھر لے آئیں وہ دن رات آنسو بہاتیں یا جائے نماز پر نوافل ادا کیے جاتیں طلاق وصول کرنے کے بعد علینہ گم سم سی ہو گئی تھی اس نے دوبارہ پڑھائی کرنے کا سوچا لیکن ذہن ہر وقت خالی سا رہنے لگا تھا اس کی یہ کوشش ناکام رہی تھی وہ ہر دم پریشان سی نجانے کیا سوچے جاتی کہ اچانک بڑی پھپھو کی آمد نے ہلچل مچا دی علینہ کی عدت گزر چکی تھی لیکن گھر میں ہر وقت سوگ سا چھایا رہتا وہ ماں بیٹی جیسے ساری دنیا سے منہ چھپائے پھرتیں۔

"بھابھی علینہ کو مجھے دے دو فہد کے لیے۔" اماں حیران پریشان سی بیٹھی رہ گئیں۔

"لیکن آپا وہ علینہ تو......"

"ارے ہاں میں جانتی ہوں طلاق ہوئی ہے اسے لڑکا کوئی جاگیردار تھا شاید تم نے بھی تو لالچ کیا تھا پہلے اچھی طرح چھان پھٹک کر لیتیں لیکن چلو خیر ایک بات یاد رکھنا اپنا مارے گا تو بھی چھاؤں میں ہی ڈالے گا۔" انہوں نے جیسے اماں کو عقل کی بات سمجھائی۔ اماں اچھی طرح سے بڑی پھپھو کے بارے میں جانتی تھیں۔ ان کی زبان سے بڑے بڑے پناہ مانگتے تھے لیکن اب علینہ کے مستقبل کا معاملہ تھا اماں نے نہ صرف ہاں کر دی بلکہ دو تین دن بعد علینہ کا فہد کے ساتھ نکاح کر دیا گیا۔ پھر جھٹ پٹ کاغذات بنوا کر علینہ انگلینڈ روانہ ہو گئی تھی۔ اماں اپنے بیٹے کے پاس سعودیہ چلی گئیں انگلینڈ میں زندگی علینہ کے لیے نہ تو پھولوں کی سیج تھی نہ کانٹوں کا بستر فہد کی بھی یہ دوسری شادی تھی ان کی پہلی انگریز بیوی پھپھو کو ناکوں چنے چبوا کر صرف چار ہفتوں میں ہی چلی گئی تھی اور بڑی پھپھو نے بڑی عقل مندی سے علینہ کو لانے کا سوچا تھا جس کی ماں نے ان کی ہر الٹی سیدھی برداشت کر کے ہمیشہ سر جھکائے رکھا تھا یوں پھپھو اپنی ساری بدزبانی کے ہنر اسی پر آزماتیں لیکن فہد ٹھنڈی میٹھی چھاؤں جیسے تھے۔ جن کے ساتھ علینہ زندگی کا سفر کاٹتے ہوئے مطمئن سی تھی کہ اب اتنے برسوں کے بعد یہ شخص پھر چلا آیا تھا اس نے بہت سوچ کر اپنا استعفیٰ لکھ کر پرنسپل کو دے دیا رولز کے مطابق اس کا استعفیٰ منظور ہونے کے بعد اسے ایک ماہ تک جاب پر آنا تھا نوکری اس کی مجبوری نہیں تھی۔ اس نے سوشل ورک کرنے کی ٹھانی تھی وہ اس شخص کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ انگلش کا سبق پڑھانے کے بعد بکس پر تیزی سے ڈیٹ لکھ رہی تھی کہ رابعہ اس کے پاس آکھڑی ہوئی ایک ناگوار سی بو ہر وقت اس کے وجود سے اٹھتی رہتی تھی۔ جس میں سانس لینا دشوار ہو جاتا تھا۔ علینہ نے نظریں اوپر اٹھائیں۔

"میم اپنا نمبر یہاں لکھ دیں۔" اس نے ڈائری آگے کی۔

"میں اپنا نمبر کسی کو نہیں دیتی بیٹا ماما سے کہنا وہ آکر بات کر لیں۔" علینہ نے حتی الوسع لہجہ نرم بنایا گو اسے اس مغرور عورت سے بات کرنے کے خیال سے ہی کوفت ہو رہی تھی۔ بہرحال اسے اپنے فرائض تو ادا کرنا ہی تھے۔ وہ بچی واپس مڑ کر چلی گئی اور اس تھوڑے سے وقت میں علینہ نے نوٹ کیا تھا بچی کے سر کی جلد پر جا بجا سکری کے کھرنڈ سے تھے اور اتنے سے بالوں میں جوئیں بھاگی پھر رہی تھیں جو تھوڑے سے بال اس کے سر پر تھے وہ لیکھوں سے اٹے پڑے تھے۔ علینہ کو کراہیت کے ساتھ ساتھ ترس بھی آیا۔

سب ٹھیک چل رہا تھا کہ ایک دن ہوم ٹائم میں علینہ اگلے دن کے لیے بچوں کی کاپیاں تیار کر رہی تھی کہ اس کلاس کی آیا اس کے پاس چلی آئی۔

"میڈم جی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"کون؟" علینہ نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

"وہ جی کلاس کی بچی کے فادر ہیں جی۔"

"اچھا ٹھیک ہے بھیجو۔" اس اسکول میں والدین اور ٹیچرز کا باہمی رابطہ بے حد مضبوط تھا اور انتظامیہ یہ کوشش کرتی تھی کہ بچوں کے مسائل اساتذہ اور والدین باہمی گفت و شنید سے حل کر لیں تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں تھوڑی دیر بعد جو شخص اسے کمرے میں آتا دکھائی دیا اس نے اسے ٹھٹکا دیا وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکی تھی آنے والا خود ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

"علینہ وہ میں۔"

"مسز فہد باجوہ ہے میرا نام۔" علینہ کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔

"میں اصل میں تم میرا مطلب ہے آپ سے۔" آج برسوں بعد علینہ کو لگ رہا تھا کہ الفاظ شہریار سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ رہے تھے ایک کامیاب مقرر علینہ کے سامنے مناسب الفاظ تلاشنے میں مصروف تھا۔

"وہ میں رابعہ کے سلسلے میں آپ سے بات کرنے آیا تھا۔" علینہ نے نظر اٹھائی سارے نقوش وہی تھے لیکن پختہ عمری نے اسے گریس عطا نہیں کی تھی بلکہ ایک بے نام سی یاسیت اس پر چھائی نظر آتی تھی۔

"اسے شوگر ہے۔"

"میں جانتی ہوں آپ کی مسز نے بتایا تھا۔"

"پلیز تم' آپ دعا کریں کہ وہ ٹھیک ہو جائے ایسا ہو سکتا ہے نا۔"

"میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔" علینہ نے جیسے اکتا کر کہا تھا اور پاہر دروازے کے باہر دیکھا آیا اپنی کرسی سے غائب تھی وہ یقیناً "چائے پینے کچن میں چلی گئی تھی ابھی باقی اسکول میں کلاسز چل رہی تھیں صرف نرسری کی باقی اسکول سے ڈھائی گھنٹے پہلے چھٹی ہوتی تھی۔

"پلیز اس کے لیے دعا کیجیے گا وہ ٹھیک ہو جائے اس کی اذیت دیکھ کر جینا بہت مشکل ہے۔"

"لیکن آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں اگر آپ کے ذہن میں بیس برس والی علینہ ہے تو وہ اسی روز مر گئی تھی جس دن آپ نے اس کا زبردستی ابارشن کروایا تھا اور آپ کے شکار تو بہت سے لوگ تھے ان سب سے معافی مانگیں جا کر۔" ضبط کے باوجود علینہ کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔

"لیکن مجھے لگتا ہے یہ سب تمہاری بد دعا کا نتیجہ ہے یہ میری تیسری شادی میں سے زندہ رہنے والی واحد اولاد ہے پہلے میرے پانچ بچے مر چکے ہیں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میرے....."

"فار گاڈ سیک مسٹر گورایہ میں آپ کی فیملی ڈاکٹر نہیں ہوں اگر آپ نے بچی کی ایجوکیشن کے بارے میں کچھ ڈسکس نہیں کرنا پلیز آپ جا سکتے ہیں مجھے بچوں کی رائٹنگ کاپیاں تیار کرنی ہیں۔" اور وہ شکستہ قدموں کے ساتھ چلا بھی گیا۔ علینہ اس کے بعد ایک بھی کاپی تیار نہیں کر سکی تھی اور فوراً "دوبارہ اسکول میں کبھی نہ آنے کا بتا کر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر چلی آئی۔

☼ ☼ ☼
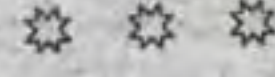
"میں آپ سے پوری بات نہیں کر پایا یہ ٹھیک ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں کو تکلیف دی لیکن ان میں کوئی بھی ایسا مخلص نہیں تھا جیسا کہ آپ پلیز میری بچی کے لیے دعا کریں کہ میرے گناہوں کی سزا اسے نہ ملے۔"

یہ علینہ کا گھر میں رہتے ہو چوتھے دن دوپہر کا واقعہ ہے جب اسے یہ طویل ایس ایم ایس ملا تھا۔ اسکول کے ٹرسٹی اور بورڈ آف گورنرز میں ہونے کی وجہ سے علینہ کو شہریار کے پاس اس کا نمبر ہونے پر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس نے خاموشی سے موبائل میں سے سم نکال کر توڑ دی اسے کچن میں جا کر فہد اور اپنے دونوں بیٹوں کی پسند کی ڈشز تیار کروانا تھیں آج رات اس کے گھر خوشیاں اتر رہی تھیں اور ان لمحوں میں اس نے اپنا تجزیہ کیا اس نے شہریار کے بارے میں شاید ان دنوں میں کبھی سوچا ہو جب پھپھو اسے طعنے دیا کرتی تھیں اس کے بعد تو اسے ایسا سوچنے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔ وہ شہریار سے یہ نہ کہ سکی یہ اس کی بد دعا بھی ہو سکتی ہے جسے اس کے غرور نے دنیا میں آنے ہی نہیں دیا تھا۔

"کیا میرے دل میں اس کی محبت ہے؟ اس نے جیسے اپنے دل کو ٹٹولا تھا۔

"شاید نہیں کیونکہ اس دھوکے باز کے ساتھ میں کیسے کوئی تعلق رکھ سکتی ہوں۔" یہ درست ہے کہ محبت مر نہیں سکتی لیکن جب دوسرا فریق صریحاً "دھوکا کرے تو محبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"اللہ اس بچی کے ساتھ بہتر کرتا۔" علینہ نے صدق دل سے دعا کی اور کام والی کو ہٹا کر خود فہد کے لیے کچے قیمے کے کباب بنانے لگی کہ اب وہی تو اس کے لیے ٹھنڈی چھاؤں تھے اس بچی کے لیے دعا بھی اس نے انسانیت کے ناتے کی ورنہ اسے شہریار سے مطلب تھا نہ اس کی خوشیوں اور غموں سے۔

جب ہم کسی سے زیادتی کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے حالانکہ خالق نے تو اس کائنات کی بنیاد ہی توازن پر رکھی ہے لیکن انسان یہ بھول جاتا ہے نجانے کیوں؟

☼ ☼

حدیث قدسی

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ "میں نے پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں میں رکھ دیا ہے۔ لوگ انہیں دوسری چیزوں میں تلاش کرتے ہیں بھلا وہ کیسے پائیں گے۔ میں نے اپنی رضا کو مخالفت نفس میں رکھ دیا ہے، لوگ اسے موافقت نفس میں تلاش کرتے ہیں بھلا وہ کیسے پائیں گے۔

میں نے آرام کو جنت میں رکھ دیا ہے، لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں بھلا وہ کیسے پائیں گے۔

میں نے علم و حکمت کو بھوک میں رکھ دیا ہے، لوگ اسے سیری میں تلاش کرتے ہیں بھلا وہ کیسے پائیں گے۔

میں نے عزت کو اپنی اطاعت میں رکھ دیا ہے، لوگ اسے بادشاہوں کے دروازوں پر تلاش کرتے ہیں بھلا وہ کیسے پائیں گے۔

صغریٰ یاسین..... کراچی

رزق منجانب اللہ

مشہور صوفی شفیق بلخی کی خدمت میں ایک امیر نے اشرفیوں کی ایک تھیلی پیش کی آپ نے اسے قبول نہ کیا امیر نے پوچھا!

"حضرت یہ اشرفیاں ہیں جن سے انسان اپنی ضروریات پوری کرتا ہے اور کوئی شخص کتنا ہی متقی کیوں نہ ہو رزق کی ضرورت اسے بھی ہوتی ہے اور یہ اشرفیاں رزق کی خریداری میں بہت دنوں تک کام آتی رہیں گی۔"

شفیق بلخی نے جواب دیا۔ "افسوس کہ تم نے جو کچھ بھی کہا میں اس کی تردید نہیں کروں گا، لیکن اس میں احتمال موجود ہیں۔" امیر نے پوچھا "کون کون سے احتمال ___؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اول یہ احتمال کہ یہ اشرفیاں چوری ہو جائیں دوسرے یہ کہ اس بخشش پر بعد میں خود نادم ہو جاؤں، تیسرے یہ احتمال کہ تمہیں میری کوئی بات ناگوار گزرے اور تم یہ اشرفیاں واپس لے جاؤ اور جہاں تک میرے رزق کا سوال ہے وہ اللہ کی طرف سے آتا ہے اور وہ ان تمام عیوب سے پاک ہے۔"

امبر گل..... جھڈو، سندھ

ستارے

☆ انسان کی غلطیاں اسے وہ درس دیتی ہیں جو کسی درس گاہ سے نہیں ملتا۔

☆ صبر ایک ایسی سواری ہے جو کبھی گرنے نہیں دیتی نہ کسی کے قدموں میں نہ کسی کی نظروں میں۔

☆ تین رشتے زندگی میں بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ (1) بڑھاپے میں اولاد، (2) مصیبت میں دوست، (3) غربت میں بیوی۔

☆ جس کا رابطہ اللہ کے ساتھ ہو وہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ ناکام وہ ہوتا ہے جس کی امیدیں دنیا والوں سے وابستہ ہوں۔

☆ اچھے دوست ہاتھ اور آنکھ کی طرح ہوتے ہیں۔ ہاتھ کو تکلیف ہوتی ہے تو آنکھ روتی ہے اور جب آنکھ روتی ہے تو ہاتھ آنسو پونچھتا ہے۔

☆ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں پتھروں سے ٹھوکر

کھاتا ہے۔

ام ایمان۔۔۔ کوٹ چھٹہ

لمحہ فکریہ

اپنے ہی آنسوؤں اور عرق ندامت میں ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ امریکا میں 5758 یونیورسٹیاں ہیں، ہندوستان میں 8407 جبکہ پوری مسلم دنیا یعنی 57 مسلمان ملکوں میں یونیورسٹیوں کی مجموعی تعداد صرف 500 ہے اور پورے عالم اسلام میں ایک یونیورسٹی بھی ایسی نہیں جسے دنیا کی ٹاپ 500 یونیورسٹی میں شامل کیا جاسکے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہماری سیاسی، فکری، مذہبی قیادتیں یہ سوچتیں کہ صرف چودہ (14) ملین یہودیوں نے ہم ڈیڑھ بلین مسلمانوں کو اس بری طرح کیوں پچھاڑ رکھا ہے؟ دنیا میں ہر پانچواں انسان مسلمان ہے۔ ہر ایک، صرف ایک یہودی کے مقابلے پر 107 مسلمان ہیں۔ گزشتہ 105 سال میں مٹھی بھر یہودیوں نے 80 نوبل پرائز حاصل کیے جبکہ ان سے سینکڑوں گنا زیادہ مسلمانوں کے حصے۔۔۔ صرف اور صرف 3 نوبل پرائز! معاملہ اتنا غیر متوازن کیوں ہے؟

(حسن نثار۔۔۔ جنگ)

جبرانیات

☆ حقیقی روشنی وہ ہے جو انسان کے باطن سے پھوٹ کر اس کے نفس کی تاریکیاں اس پر واضح کرتی ہے۔ اسے زندگی سے فرصت حاصل کرنا سکھاتی ہے، روح کے نام پر اسے نغمہ ساز کرتی ہے۔ لیکن حقیقت اس عالم کی ان تمام حسین چیزوں کی طرح ہے، جو اپنے دلکش اثرات اسی شخص پر ظاہر کرتی ہے، جسے بے رحم جھوٹ کی تاثیرات کا علم ہو۔ حقیقت وہ مخفی جذبہ ہے جو ہمیں زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونا سکھاتا ہے اور جس کے اثر سے ہم یہ تمنا کرنے لگتے ہیں کہ یہ مسرتیں ساری دنیا کے لیے عام ہو جائیں۔

☆ باطل ہیں وہ تمام اعتقادات اور تعلیمات، جو انسان کو اس کی زندگی میں بد قسمت بنائیں اور جھوٹے ہیں وہ سارے جذبے جو اسے مایوس، اداسی اور بدبختی کی طرف لے جائیں۔ انسان کا حق ہے کہ وہ زمین پر کامیاب زندگی بسر کرے، کامرانی کی راہوں سے باخبر ہو اور ہر جگہ سعادت کی تبلیغ و تلقین کرے۔ ہم اس دنیا میں ذلیل جلاوطنوں کی حیثیت سے نہیں لاعلم بچوں کی صورت آئے ہیں تاکہ زندگی کے اسرار و محاسن سے ازلی و ابدی روح کی عبادت سیکھیں اور اپنے نفس کی باریکیوں سے واقف ہوں۔ (جبران)

عنبرین مفتی۔۔۔ کراچی

عالمی آلودگی میں امریکی جرائم کی تفصیل

☆ امریکا دنیا کی آبادی کا صرف 5 فیصد ہے سائنسی ترقی کی بدولت عالمی آلودگی میں اس کا حصہ 35% ہے۔

☆ گھروں / گلیوں / محلوں سے برآمد ہونے والی گندگی اور فضلہ 250 ملین ٹن سالانہ

☆ صنعت و حرفت سے پیدا ہونے والی آلودگی، 110 ملین ٹن سالانہ، زراعت سے پیدا ہونے والی آلودگی، 550 ملین ٹن سالانہ، جانوروں سے پیدا ہونے والی آلودگی، 2000 ملین ٹن سالانہ

★ کان کنی سے پیدا ہونے والی آلودگی، 1100 ملین ٹن سالانہ

★ مجموعی آلودگی 4010 ملین ٹن سالانہ

(شفیع حیدر دانش کی کتاب "ارض مکدر" سے انتخاب)

صابرہ خان۔۔۔ کراچی

آگ کا دریا ہے

ہے عشق جنوں پیشہ، ہاں عشق جنوں پیشہ
آج اک ستم گر کو ہنس ہنس کے رلاتا ہے
یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

انیقہ انا۔۔۔ چکوال

محبت

محبت وقت کا اک کھیل ہے
دل کے کھلونوں سے کبھی کھیلے، کبھی توڑے
کبھی محفوظ کر کے رکھ دے
یا پھر
کبھی اکتا کے سب دفنا دے
لمحوں کی قبروں میں

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

عقل مندی

برنارڈ شاہ کے ایک دوست، جو افسانہ نگار بھی تھے، برنارڈ شاہ سے مشورہ طلب کرنے آئے۔

"میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ کے خیال میں یہ بہتر رہے گا؟"

برنارڈ نے جواب دیا۔ "جو عورت تم سے شادی کے لیے رضامند ہوگی، وہ یقیناً احمق ہوگی اور احمق عورتیں اچھی بیویاں ثابت نہیں ہوتیں۔"

حرا قریشی۔۔۔ بلال کالونی ملتان

واپسی

ہم اپنی گور کے
سونے پن میں
بیج بنیں گے
پھر سے اگیں گے

یسریٰ انعم۔۔۔ چیچہ وطنی

چراغ راہ

○ ضمیر حق و راستی کا دوسرا نام ہے۔
○ گھر، خوشی، مروت اور محبت باہمی اتحاد سے بنتے ہیں، ریت اور سیمنٹ سے نہیں۔
○ منافقت شرک کی اور خیانت جھوٹ کی بہن ہے۔
○ انسانی انا کا کمال یہ ہے کہ وہ خدا سے مشابہہ ہو جائے۔

○ کسی کی قلت عقل کا اس کے کثرت کلام سے اندازا لگائیں۔

○ بے شک، بہت دیر تک سوچو مگر سوچ سمجھ کر جو فیصلہ کرو اس کو مستند سمجھو۔

○ ادب میں نیا پرانا کوئی چیز نہیں۔ جس کلام میں تازگی، جدت اور خیالات کی گہرائی ہے، وہ ہمیشہ نیا ہے اور جس میں یہ نہیں وہ پرانا ہے گو کہ وہ آج ہی کی تصنیف کیوں نہ ہو۔

○ دنیا ایک ایسا بازار ہے، جو عنقریب بند ہو جائے گا۔

حرا قریشی...... بلال کالونی ملتان

بجلی

وطن میں لوڈ شیڈنگ ایکا ایکی رک نہیں سکتی
ابھی تو یہ عذاب اے بھائی! صبح و شام آئے گا
لگیں گے پانچ سال اس کام کی تکمیل میں
"خم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا"

(انور شعور)

حمیرہ مہتاب...... سعودی عرب

انمول ہیرے

☆ انسان ایک دکان ہے اور زبان اس کا تالا، تالا کھلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے دکان سونے کی ہے یا کوئلے کی۔

☆ انسان بزدل اتنا ہے کہ سوتے ہوئے خواب میں بھی ڈر جاتا ہے اور بے وقوف اتنا ہے کہ جاگتے ہوئے بھی اپنے رب سے نہیں ڈرتا۔

☆ دنیا نصیب سے ملتی ہے اور آخرت محنت سے، جبکہ آج ہماری ساری محنت دنیا کے لیے ہے اور آخرت کو ہم نے نصیب پر چھوڑ دیا ہے۔

☆ زندگی ایک بار ملی ہے اسے نیک کام کر کے آخرت کے لیے سنواریں ایسا نہ ہو وقت چلا جائے اور اعمال میں کچھ بھی نہ ہو۔

☆ دل ٹوٹنا کیا ہوتا ہے اس چڑیا سے پوچھو جس کا ایک ایک تنکے سے بنا ہوا گھونسلا کسی سنگ دل نے اس کی آنکھوں کے سامنے توڑ دیا ہو یا پھر اس ماں سے پوچھو جس کا جوان بیٹا کسی حادثے میں چل بسے۔

☆ زندگی کو رمضان جیسا بنا لو تو موت عید جیسی ہو جائے گی۔

علمہ شمشاد حسین۔ کورنگی

کہتا ہوں سچ

☆ آپ فرشتہ یا دیوتا نہیں بلکہ انسان ہیں اور مشکلات انسانوں ہی کو پیش آتی ہیں۔

☆ تین آدمیوں میں راز، راز رہ سکتا ہے بشرطیکہ ان میں سے دو مر چکے ہوں۔

☆ ایک لمبی زبان انسان کو بہت چھوٹا کر دیتی ہے۔

☆ بعض لمحے چاقو کی دھار جیسے ہوتے ہیں غلط فیصلہ ہو جائے تو ان کی کاٹ سے نہ جان بچتی ہے اور نہ ایمان۔

☆ جو راستوں کے عشق میں گرفتار ہو جائیں، منزلیں ان سے دور ہو جاتی ہیں۔

☆ کچھ خوابوں کو پانے کے لیے، کچھ خوابوں سے دستبردار بھی ہونا پڑتا ہے۔

☆ اپنے آپ کو چالاک سمجھنے والے ہی اکثر خطا کر جاتے ہیں اور جان سے جاتے ہیں

☆ اگر فکریں لوگوں کی پیشانی پر رقم ہوتیں تو وہ لوگ جو دوسروں پر رشک کرتے ہیں ان پر رحم کھاتے۔

☆ بعض لوگوں سے مل کر انسان حیرت سے سوچتا ہے کہ وہ اب تک کہاں تھے اور جہاں تھے وہاں واپس کب جائیں گے۔

☆ ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ہم اس پیاری زبان سے دوسروں پر کیچڑ اچھالیں۔

نوشین اقبال نوشی...... گاؤں بدر مرجان

☆ ☆

بشریٰ محمود

نمرہ، اقراء، کی ڈائری میں تحریر
فراق گورکھ پوری کی غزل

رات بھی، نیند بھی، جوانی بھی
ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی

ایک پیغام زندگانی بھی
عاشقی مرگِ ناگہانی بھی

دل کو اپنے بھی غم تھے دنیا میں
کچھ بلائیں تھیں ناگہانی بھی

خلق کیا کیا مجھے نہیں کہتی
کچھ سنوں میں تیری زبانی بھی

دل کو آدابِ بندگی بھی نہ آئے
کر گئے لوگ حکمرانی بھی!

پاس رہنا کسی کا رات کی رات
میہمانی بھی، میزبانی بھی

زندگی، عین دید یا فراق
زندگی ہجر کی کہانی بھی

مریم شہباز، کی ڈائری میں تحریر
جون ایلیا کی نظم

معمول،

جانے کب سے
مجھے یاد بھی تو نہیں جانے کب سے
ہم اک ساتھ گھر سے نکلتے ہیں
اور شام کو
ایک ہی ساتھ گھر لوٹتے ہیں
مگر ہم نے اک دوسرے سے
کبھی حال پرسی نہیں کی
نہ ایک دوسرے کو
کبھی نام لے کر مخاطب کیا
جانے ہم کون ہیں

عظمیٰ، کی ڈائری میں تحریر
سلیم کوثر کی غزل

ملنا نہ ملنا ایک بہانا ہے اور بس
تم سچ ہو، باقی جو ہے فسانہ ہے اور بس

لوگوں کو راستے کی ضرورت ہے اور مجھے
اک سنگِ رہ گزر کو ہٹانا ہے اور بس

مصروفیت زیادہ نہیں ہے مری یہاں
مٹی سے اک چراغ جلانا ہے اور بس

سوئے ہوئے تو جاگ ہی جائیں گے ایک دن
جو جاگتے ہیں ان کو جگانا ہے اور بس

تم وہ نہیں ہو جن سے وفا کی امید ہے
تم سے مری مراد زمانہ ہے اور بس

نیند کا رتجگوں سے الجھنا یونہی نہیں
اک خوابِ رائیگاں کو بچانا ہے اور بس

اک وعدہ جو کیا ہی نہیں ہے ابھی سلیم
مجھ کو ہی تو وعدہ نبھانا ہے اور بس

صدف عمران، کی ڈائری میں تحریر

ز۔خ۔ش کی غزل

کیا ہوئی اے میرے اسلام! وہ شوکت تیری
ہائے کس گوشے میں روپوش ہے سطوت تیری

دوست تو دوست مخالف تھا تیرا مدح سرا
ملک کیا چیز ہے؟ دل پر تھی حکومت تیری

تیری تعلیم نے انسان کو بنایا انساں
دولت علم ملی اس کو بدولت تیری

بر کراں کیوں ہے وہ اوج و حشم و جاہ تیرا
ہمکنار اب بھی ہے گو تجھ سے صداقت تیری

کس لیے ہم سے متنفر ہے تجھے! استقلال
یک دلی! کیوں نظر آتی نہیں صورت تیری

مذہبی جوش پھر اک بار دکھا دے جلوہ
درد اسلام! پھر اٹھ آ کہ ہے حاجت تیری

اے رسول عربی! اے شرف افزائے رسل
اب بھی قرباں ہے تیرے نام پہ امت تیری

جوش زن اب بھی دماغوں میں ہے سودا تیرا
جلوہ گر اب بھی دلوں میں محبت تیری

حرز جاں اب بھی ہے قرآن مقدس اپنا
اب بھی سینوں میں محفوظ ہے امانت تیری

آج بھی مرجع آفاق ہے مولد تیرا
آج بھی مرکز ادوار ہے تربت تیری

اے ماہِ فیض! یہ اندھیر مٹا سکتی ہے
طرفۃ العین میں اک چشم عنایت تیری

خالدہ شیروانی، کی ڈائری میں تحریر

فراز کی ایک نظم

بھلے دنوں کی بات ہے، بھلی سی ایک شکل تھی
نہ یہ کہ حسن تام ہو، نہ دیکھنے میں عام سی
نہ یہ کہ وہ چلے تو کہکشاں سی رہ گزر لگے
مگر وہ ساتھ ہو تو پھر بھلا بھلا سفر لگے
کوئی بھی رت ہو اس کی چھب فضا کا رنگ و روپ تھی
وہ گرمیوں کی چھاؤں تھی، وہ سردیوں کی دھوپ تھی
نہ مدتوں جدا رہے، نہ ساتھ صبح و شام ہو
نہ رشتۂ وفا پہ ضد، نہ یہ کہ اذن عام ہو
نہ ایسی خوش لباسیاں کہ سادگی گلہ کرے
نہ اتنی بے تکلفی کہ آئینہ حیا کرے
نہ عاشقی جنوں کی کہ زندگی عذاب ہو
نہ اس قدر کٹھور پن کہ دوستی خراب ہو
کبھی تو بات بھی خفا، کبھی سکوت بھی سخن
کبھی تو کشت زعفران، کبھی اداسیوں کا بن
سنا ہے ایک عمر ہے معاملات دل کی بھی
وصال جاں فزا تو کیا، فراق جانگسل کی بھی
سو ایک روز کیا ہوا، وفا پہ بحث چھڑ گئی

میں عشق کو امر کہوں، وہ میری بات سے چڑ گئی
میں عشق کا اسیر تھا، وہ عشق کو قفس کہے
کہ عمر بھر کے ساتھ کو بدتر از ہوس کہے
شجر، حجر نہیں کہ ہم ہمیشہ پابہ گل رہے
نہ ڈھور ہیں کہ رسیاں گلے میں مستقل رہیں
میں کوئی پینٹنگ نہیں کہ ایک فریم میں رہوں
وہی جو من کا میت ہو اسی کے پریم میں رہوں
کہ اس کو مجھ پہ مان تھا نہ مجھ کو اس پہ زعم ہی
جب عہد ہی کوئی نہ ہو تو کیا غم شکستگی
سو اپنا اپنا راستہ ہنسی خوشی بدل لیا
وہ اپنی راہ چل پڑی، میں اپنی راہ چل دیا
بھلی سی ایک شکل تھی بھلی سی اس کی دوستی
اب اس کی یاد رات دن نہیں مگر کبھی کبھی

شگفتہ سلیمان

انیقہ انا ــــــــ چکوال

جلنا تو چراغوں کا مقدر ہے ازل سے
یہ دل کے کنول ہیں کہ بجھے ہیں نہ جلے ہیں
جو جھیل گئے ہنس کے کڑی دھوپ کے تیور
تاروں کی خنک چھاؤں میں وہ لوگ جلے ہیں

طاہرہ اقبال ــــــــ گوجر خان

غم کی زد میں اگر بگڑ جائیں
پھر کہاں قسمتیں سنورتی ہیں
ذکر تجدید دوستی نہ کر
اب یہ باتیں گراں گزرتی ہیں

ندا، فضہ ــــــــ فیصل آباد

آئینہ ٹوٹ کے بکھرا ہے تمناؤں کا
کرچیاں چنتے ہوئے عمر گزر جائے گی

نمرہ، اقرا ــــــــ کراچی

پڑی تھیں اپنے چہرے پر خراشیں
میں سمجھی آئینہ ٹوٹا ہوا ہے

آسیہ جاوید ــــــــ علی پور چٹھہ

انکار کی سی لذت اقرار میں کہاں ہے
بڑھتا ہے شوق غالب ان کی نہیں نہیں سے

زاہدہ علیم ــــــــ کراچی

محبت کے ہر اک جذبے سے وہ انکار کرتا ہے
وہ خود نفرت ہے اور نفرت کا کاروبار کرتا ہے
اسے جب موت ہے پیاری تو وہ مر کیوں نہیں جاتا
وہ سارے شہر کو جینے سے کیوں بےزار کرتا ہے

سعدیہ عرفان ــــــــ گمانڈن

وہ تجدید محبت کے لیے بےتاب ہیں اے دل
مزہ جب ہے تری جانب سے اب انکار ہو جائے

شکیلہ شہزادی شالو ــــــــ ملک وال

مجھ کو خود اپنے آپ پہ شرمندگی ہوئی
اس طرح کہ تجھ پہ بھروسا بلا کا تھا

عائشہ، تحریم ــــــــ گوجرہ

تیرے وعدوں پہ کہاں تک میرا دل فریب کھائے
کوئی ایسا کر بہانہ میری آس ٹوٹ جائے

نوشین اقبال نوشی ــــــــ گماؤں بدو مرجان

انہیں، ہم سے محبت ہو رہی تھی
نہ کھلتی آنکھ تو بس ہو گئی تھی

کرن، بینش ــــــــ فیصل آباد

کچھ رنگ تیرے روپ میں یوسف کی طرح ہیں
ورنہ میں تیرے ہجر میں یعقوب نہ ہوتا

علمہ شمشاد حسین ــــــــ کراچی

کسی نے چوم کر آنکھوں کو یہ دعا دی تھی
زمین تیری خدا موتیوں سے نم کر دے

عظمیٰ غلام نبی ــــــــ کراچی

جب کبھی خواب کی امید بندھا کرتی ہے
نیند آنکھوں میں پریشان پھرا کرتی ہے
یاد رکھنا ہی محبت میں نہیں سب کچھ
بھول جانا بھی بڑی بات ہوا کرتی ہے

صائمہ جیمی ــــــــ کراچی

یہ مانا کہ شہ رگ سے نزدیک ہے تو
میں یہ فاصلہ بھی کہاں چاہتی ہوں

خدیجہ سلیم ــــــــ کے، ڈی، اے

نامریل کڑی دھوپ کا عادی تو نہیں ہوں
اب سر پر پڑی ہے تو شجر ڈھونڈ رہا ہوں
اس بار تو ایسا جھنجھٹ میں پھنسا ہوں
سچ مچ میں اسے کچھ دیر کے لیے بھول گیا ہوں

حرا قریشی ــــــــ ملتان

چاند جب دور افق پہ ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

فوزیہ ثروت ______ گجرات
مجھ کو بھی شوق تھا چہروں کی دید کا
رستہ بدل کے چلنے کی عادت اسے بھی تھی
وہ مجھ سے بڑھ کر ضبط کا عادی تھا جی گیا
ورنہ ہر اک سانس قیامت اسے بھی تھی

فرحت ______ خانیوال
لوگ کہتے ہیں کہ تو اب بھی خفا ہے مجھ سے
تیری آنکھوں نے تو کچھ اور کہا ہے مجھ سے

نادیہ ______ کراچی
ٹھہر کے دیکھے تو رک جائے نبض ساعت کی
شب فراق کی قامت ہے کسی قیامت کی

عذرا ناصر ______ کراچی
تمام عمر کی بے تابیوں کا حاصل تھی
وہ ایک شب جو آغوشِ یار میں گزری

اقصیٰ ناصر ______ کراچی
شب وصال ہے گل کر دو ان چراغوں کو
خوشی کی بزم میں کیا کام جلنے والوں کا

فوزیہ کاشف ______ فیصل آباد
اس کی خوشی عزیز تھی کچھ اس سے پیار تھا
اپنی انا کو توڑ کے جھکنا پڑا مجھے!
وہ جس کی یاد خون کی گردش کے ساتھ تھی
کتنی اذیتوں سے بھلانا پڑا مجھے

عاصمہ ندیم ______ کراچی
شب وعدہ تصور کی فسوں کاری کا کیا کہیے
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے

کرن شفیق ______ کراچی
تو جو بدلا بدل گئے ہم بھی
پیار کرتے تھے بندگی تو نہیں
وقت کٹ جائے گا بہرصورت
تو کوئی شرطِ زندگی تو نہیں

رضیہ طاہر ______ ڈیفنس
اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

نمرہ، اقرأ ______ کراچی
مجھ سے بچھڑ گیا جو گئے سال کی طرح
اس کا بھی حال ہو گا میرے حال کی طرح
آیا نہیں وہ رہ گئے رستے سجے ہوئے
یہ سال بھی گزر گیا ہر سال کی طرح

مریم شہباز ______ کراچی
گئے موسم میں جو کھلتے تھے گلابوں کی طرح
دل پہ اتریں گے وہی خواب عذابوں کی طرح
کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

فروا ______ ڈسکہ
دسمبر کی شب آخر نہ پوچھو کس طرح گزری
یہی لگتا تھا ہر دم وہ ہمیں کچھ پھول بھیجے گا

ندا، فضہ ______ کراچی
آج اک اور برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

نادیہ ______ گجرات
رخصت ہوا جو سال تو محسوس یہ ہوا
ہر لمحہ حسرتوں کا لہو چوستا رہا

کرن ______ فیصل آباد
مسئلے تو پچھلے سال کے اپنی جگہ رہے
سب سوچتے رہے کہ نیا سال آ گیا
خوشیاں جو بانٹتا تو کوئی نئی بات تھی
گزرا ہوا یہ سال بھی عمر میں بڑھا گیا

مدیحہ ______ خانیوال
کچھ خوشیاں کچھ آنسو دے کر ٹال گیا
جیون کا اک اور سنہرا سال گیا

ایم۔ آر۔ کے ______ مظفر گڑھ
سمٹی ہوئی شرمائی ہوئی رات کی رانی
سوئی ہوئی کلیوں کی حیا تم تو نہیں ہو

شائستہ رشید ______ لاہور
اک روز اس طرح میرے بازوؤں میں آ
میرے ادب کو تیری حیا کی خبر نہ ہو

ریحانہ امجد بخاری

صحیح وارث

"تم بہت اچھے حجام ہو، تمہاری باتیں سنتے ہوئے پتا ہی نہیں چلتا کہ کب حجامت ہو گئی۔"
ایک صاحب نے حجام کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔
"یہ فن مجھے ورثے میں ملا ہے سر۔" حجام نے انکساری سے کہا۔
"کیا تمہارے والد صاحب بھی حجام تھے؟" ان صاحب نے اشتیاق سے پوچھا۔
"نہیں سر!" حجام نے بتایا۔ "وہ صرف داستان گو تھے۔ میں نے ان کے پیشے کو ترقی دی ہے۔"

اریبہ دانش۔۔۔ والبدین

سنہری موقع

ایک شوہر اپنی بیوی کو ڈرائیونگ سکھا رہے تھے۔ سامنے سے ایک تیز رفتار ٹرک کو آتا دیکھ کر بیوی گھبرا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ دہشت زدہ لہجے میں بولی۔ "اب کیا کروں؟"
"بس۔۔۔ تم یہ سمجھو کہ گاڑی میں چلا رہا ہوں۔ ایسے موقعوں پر تم مجھے جو ہدایات دیتی تھیں ان ہی پر عمل کرو۔" شوہر نے جواب دیا۔

حمیدہ سیف الدین۔۔۔ حیدر آباد

براحال

ایک فقیر ایک کنجوس امیر کے پاس گیا اور اسے اپنی دکھ بھری کہانی سنانا شروع کی، اس کا لہجہ ایسا دردناک تھا کہ امیر آدمی کے آنسو نکل آئے۔ اس نے اپنے نوکر کو آواز دی تو فقیر سمجھا کہ شاید اب کچھ ملے گا۔
لیکن نوکر آیا تو امیر آدمی نے اس سے کہا۔ "اس کم بخت کو دھکے دے کر نکال دو، اس نے رلا رلا کر میرا براحال کر دیا ہے۔"

طوبیٰ سعادت۔۔۔ کورنگی، کراچی

قدردان

ایک صاحب فلم دیکھنے پہنچے تو ان کا بلا بھی ساتھ تھا۔ فلم کے دوران بلے کی حرکتوں سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے اسے فلم دیکھنے میں بہت لطف آ رہا ہو۔ مزاحیہ سین پر اس کی باچھیں کھل جاتیں۔ ولن کو دیکھتے ہی غرانے لگتا اور ہیروئن کو دیکھ کر دم ہلاتا۔
قریب بیٹھے ایک صاحب نے کہا۔ "لگتا ہے آپ کے بلے کو فلم بہت پسند آئی ہے۔ مجھے تو حیرت ہو رہی ہے۔"
وہ صاحب بولے۔ "حیرت تو مجھے ہو رہی ہے۔۔۔ کیونکہ فلم جس ناول پر بنی ہے وہ تو اسے بالکل پسند نہیں آیا تھا۔"

یسریٰ ندیم۔۔۔ میرپور خاص

انٹرویو

ایک بہت حساس اور اہم اسامی کے لیے انٹرویو ہو رہے تھے۔ انٹرویو لینے والے بورڈ کے ایک رکن نے امیدوار سے پوچھا۔ "فرض کرو کہ تم مجھ سے ملنے میرے گھر آئے ہو۔ میری بیوی دروازے پر آ کر تم سے کہتی ہے کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں مگر پھر یہ بھی

کہتی ہے کہ آپ اندر آجائیں..... تو آپ کیا کریں گے؟"

امیدوار نے سوچ کر جواب دیا۔ "کیا آپ اپنی بیوی کی تصویر دکھا سکتے ہیں؟"

رفیعہ خالد..... اسلام آباد

عزت

گاؤں سے عامر اپنے رشتے دار شاہد کے گھر بڑے شہر آئے ہوئے تھے۔ رات کو گپ شپ کے دوران نوکروں کا ذکر چلا تو گاؤں سے آئے ہوئے عامر بولے۔ "بھئی..... گاؤں میں اول تو عام طور سے لوگوں میں نوکر رکھنے کا رواج نہیں ہوتا..... اور اگر کسی گھر میں نوکر یا نوکرانی رکھ بھی لی جائے تو اس کے ساتھ گھر کے فرد جیسا سلوک کرنا پڑتا ہے۔"

"اچھا؟" بڑے شہر میں رہنے والے شاہد صاحب قدرے حیرت سے بولے۔ "بھئی..... یہاں نوکر رکھو تو اس کی بڑی عزت کرنی پڑتی ہے۔"

ہری مرچیں

لڑکا "کیا تم پاکیزہ محبت پر یقین رکھتی ہو؟"
لڑکی "ہاں! شروعات اسی طرح کرنی پڑتی ہیں۔"

☼ ☼ ☼

"ہیلو شبانہ! کیا میں آج تمہارے گھر آجاؤں؟"
"ہاں رضوان آجاؤ۔"
"لیکن میں رضوان تو نہیں بول رہا ہوں۔"
"میں بھی شبانہ بات نہیں کر رہی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

میاں بیوی مارکیٹ جا رہے تھے تو ایک فقیر نے کہا۔ "شہزادی دس روپے دے دو میں اندھا ہوں۔"
شوہر نے کہا۔ "بیگم پیسے ضرور دے دو، تمہیں شہزادی کہہ رہا ہے تو یقیناً "اندھا ہوگا۔"

☼ ☼ ☼

پولیس والے نے موٹر سائیکل پر سوار چار نوجوانوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ موٹر سائیکل چلانے والے نے بڑی عاجزی اور اپنائیت سے کہا۔ "ہم پہلے ہی بڑی مشکل سے بیٹھے ہیں ورنہ آپ کو ضرور بٹھا لیتے۔"

☼ ☼ ☼

ایک عورت سے کہیے۔ "تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" وہ آپ کے بقیہ جھوٹ بھی ہنسی خوشی قبول کرلے گی۔

نذرانہ شاہین..... ملتان

پرانے چاول

ایک نوجوان پولیس میں نیا بھرتی ہوا تو اس کی ڈیوٹی جیل میں لگادی گئی۔ ایک دن ایک قیدی جیل میں مر گیا تو انسپکٹر نے اسے بلا کر کہا۔ "لاش ورثا کے حوالے کر آؤ اور وہاں سے "چائے پانی" لیتے آنا۔"

نئے سپاہی کو بڑا تعجب ہوا۔ اس نے انسپکٹر سے کہا۔ "سر ان کا آدمی مر گیا ہے۔ وہ چائے پانی کس طرح دیں گے؟"

انسپکٹر نے ایک پرانا سپاہی اس کے ساتھ بھیجتے ہوئے کہا۔ "غور سے دیکھنا کہ یہ کس طرح چائے پانی وصول کرتا ہے؟"

دونوں سپاہی مرنے والے قیدی کے گھر پہنچے۔ پرانے سپاہی نے ورثا سے کہا۔ "تمہارے آدمی کا جیل میں انتقال ہو گیا ہے مگر اس کی سزا ختم ہونے میں ابھی تین ماہ باقی ہیں۔ سزا کاٹنے کے لیے اس کی جگہ اپنا بندہ دو..... یا پھر چائے پانی۔"

فوزیہ اعجاز..... بہاولنگر

جواب

ہری چند اختر جوش صاحب سے ملنے گئے۔ جاتے ہی پوچھا۔ "جناب آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

جوش صاحب نے فرمایا۔ "آپ تو غلط اردو بولتے ہیں، یہ آپ نے کیسے کہا کہ آپ کے مزاج کیسے ہیں۔ جب کہ میرا تو ایک مزاج ہے..... نا کہ بہت سے مزاج۔"

کچھ دن بعد اختر کی پھر جوش سے ملاقات ہوئی۔ جوش نے فرمایا۔ "ابھی ابھی جگن ناتھ آزاد صاحب کے والد تشریف لائے تھے۔"

اس پر اختر صاحب نے فرمایا۔ "کتنے؟"

شازیہ پروین..... کورنگی، کراچی

صحیح طریقہ

برطانیہ کے ایک سینما ہاؤس میں ہیٹ پوش خواتین سے تماشائی اور انتظامیہ دونوں تنگ آچکے تھے۔ آخر منیجر نے یہ نوٹس پردے پر دکھایا۔

"انتظامیہ بوڑھی عورتوں کے آرام کا خیال رکھتے ہوئے انہیں مطلع کرنا چاہتی ہے کہ وہ فلم دیکھتے ہوئے بدستور ہیٹ پہنے رہیں، انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

نوٹس پڑھنے کے بعد کوئی عورت ایسی نہ تھی، جس نے فوراً "ہیٹ نہ اتار دیا ہو۔

صبا قمر..... عمر کوٹ

نئی دیوار

ایک شخص نے اپنی محبوبہ سے کہا۔ "تم سے ملنے کے لیے آج میں ایک نئی دیوار پھلانگ کر آیا ہوں۔"

محبوبہ نے تشویش سے پوچھا۔ "دیوار ٹوٹی تو نہیں، تمہیں کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

محبوب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں اینٹوں والی دیوار کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں تمہیں اپنی بیگم کے بارے میں بتا رہا ہوں، جس سے میری شادی چند روز قبل ہی ہوئی ہے۔"

فائزہ صدیقی..... کمالیہ

معذوری

ایک صاحب اپنے دوست کو بتا رہے تھے۔ "سلیم کا دعوا ہے کہ موٹر سائیکل سوار نے اسے ٹکر مار کر عمر بھر کے لیے معذور کر دیا ہے اور وہ کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہا۔ دراصل اس ٹکر سے اس کا انگوٹھا ٹوٹ گیا ہے جس سے اشارہ کر کے وہ لوگوں سے لفٹ لیا کرتا تھا۔"

گل ناز..... ٹھٹھہ

ماسک

ایک بیوٹیشن کی سرراہ اپنے گاہک کے شوہر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا۔ "میں نے آپ کی بیگم کو ملتانی مٹی کا ماسک لگانے کا جو مشورہ دیا تھا، اس سے ان کا چہرہ بہتر ہوا؟"

"جی ہاں! جب تک ماسک لگا رہتا ہے، چہرہ کافی بہتر لگتا ہے۔" شوہر نے جواب دیا۔

الماس شاہد..... ملتان

اعتراف

ٹیکساس جرائم کے لیے کافی مشہور ہے۔ وہاں کا بچہ بھی کسی نہ کسی جرم یا بری عادت میں ملوث ملے گا۔ ایک ماں نے اپنے بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "بیٹے! اب تم پندرہ سال کے ہو چکے ہو، جب تم سگریٹ نوشی شروع کرو تو مجھے ضرور بتانا، وعدہ کرو.....!"

بچے نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں ممی مگر پہلے ایک اعتراف کرلوں۔"

"وہ کیا بیٹے؟" ماں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی کہ ایک سال ہوا میں سگریٹ نوشی ترک کر چکا ہوں۔" بیٹے نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

رعنا عبداللہ..... ملتان

جن پہ تکیہ تھا.....!

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ اپنے ملک کا سب سے شریف آدمی کون ہے؟"

دوست نے کہا۔ "یہ بتا کر میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا۔"

"اچھا.....! تو سب سے زیادہ بے ایمان شخص کون ہے؟" اس شخص نے پھر پوچھا۔

"یہ بتا کر میں تم سے دشمنی مول لینا نہیں چاہتا۔" دوست نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ناہید امید علی..... کراچی

☼ ☼

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

کٹ

اجزا :

ٹماٹر	دو کلو
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسا ہوا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
بھنا ہوا زیرہ (کوٹ لیں)	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
بھنا ہوا بیسن	دو کھانے کے چمچے
املی	حسب ذائقہ
چینی	آدھا چائے کا چمچہ
انڈے	چھ عدد
بگھار کے لیے:	
کڑی پتا	چند پتے
ثابت سرخ مرچ	آٹھ عدد
کلونجی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
رائی	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب :

ٹماٹروں کو دھو کر ایک دیگچی میں پکنے کے لیے رکھ دیں۔ چھلکا نرم ہو جائے تو ٹماٹروں کو ایک پیالے میں چھلنی رکھ کر چھان لیں۔ ٹماٹر ٹھنڈے ہو جائیں تو ان کو کچل کر ان کا رس چھان لیں۔ چھنے ہوئے رس کو پکنے کے لیے چولہے پر رکھ دیں۔ اب اس رس میں کڑی پتا، ہلدی، سرخ مرچ، پسا ہوا دھنیا، نمک، املی، بھنا ہوا بیسن، چینی اور بھنا ہوا زیرہ شامل کر دیں۔ جب یہ تمام اجزا رس میں اچھی طرح مل جائیں تو آنچ ہلکی کر کے پکنے دیں۔ کری وی گاڑھی ہو جائے تو علیحدہ پین میں کوکنگ آئل گرم کر کے رائی، کلونجی، ثابت لال مرچ اور زیرہ کڑکڑا کر کٹ پر بگھار لگائیں۔ ساتھ ہی چھ عدد انڈے ابال کر اسے خوب صورتی سے کاٹ کر کٹ میں ڈال دیں۔

ہری اور کالی مرچ کا گوشت

اجزا :

گائے کا گوشت	ایک کلو
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	ایک کلو
ادرک لہسن کا پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ (چھوٹی والی)	ایک مٹھی
ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا)	ایک گٹھی
گھی	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

دیگچی میں گوشت، پیاز، ادرک، لہسن، نمک اور دو گلاس پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے رکھ دیں۔ جب گوشت گل جائے تو اس میں گھی ڈال کر خوب بھونیں۔ یہاں تک کہ مسالا گھی سے الگ ہو جائے۔ گوشت میں کالی اور ہری مرچ پیس کر ڈال دیں۔ کچھ دیر بھون کر ہلکی آنچ پر دم پر لگا دیں۔ پیش کرنے سے پہلے ہرا دھنیا ڈال دیں۔

کالے چنے کے کباب

اجزا :

کالے چنے	آدھی پیالی
لونگ	دو عدد
...یاہ مرچ	چار عدد
...ار چینی	ایک انچ کا ٹکڑا
...سن کے جوے	دو عدد
...نے کی دال	دو کھانے کے چمچے
...نک	حسب ذائقہ
...درک	ایک انچ کا ٹکڑا
...بل روٹی کے سلائس	دو عدد
...یدہ	آدھی پیالی
...ودھ	آدھی پیالی
...بت لال مرچ	دو عدد
...وکنگ آئل	تلنے کے لیے

...ترکیب :

کالے چنے اور چنے کی دال کو نیم گرم پانی میں دو گھنٹوں کے لیے بھگو دیں۔ پریشر ککر میں دو سے ڈھائی پیالی پانی، کالے چنے اور چنے کی دال ڈھک کر پکنے رکھ دیں۔ چنے اور دال ٹھنڈے ہو جائیں تو گرائنڈ کر لیں۔ ڈبل روٹی کے سلائس آدھی پیالی پانی میں بھگو کر ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر دبائیں، پانی نکل جائے تو انہیں بھی گرائنڈر میں ڈال کر دال اور چنوں کے ساتھ گرائنڈ کر لیں۔ کڑاہی میں کوکنگ آئل گرم کریں۔ اس مکسچر کے کباب بنا لیں۔ میدہ میں دودھ ڈال کر گاڑھا آمیزہ تیار کر لیں۔ ایک ایک کباب کو اس آمیزہ میں لتھیڑ کر آئل ڈال کر سنہری ہونے پر نکال لیں۔

منٹ اینڈ لیمن لیمب باربی کیو

اجزا :

بھیڑ کا گوشت	ایک کلو
چار ٹکڑے کریں (ایک پاؤ کا ایک ٹکڑا)	
پودینے کے پتے اور لیموں کٹا ہوا	

ترکیب :

اس قسم کی ڈش کو مسالا لگا کر چھوڑنے کے لیے پوری رات درکار ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے لیے دس گرام ادرک باریک کٹی ہوئی پیاز اور باریک کٹے ہوئے

پودینے کے پتوں اور زیتون کے تیل کے ساتھ لگا کر اور کالی مرچ اور نمک حسب ذائقہ چھڑک کر رکھ دیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے کے بعد اسے پوری رات کے لیے چھوڑ دیں اور صبح ان ٹکڑوں کو سلاخیں گرم کرکے ان میں پروئیں اور آگ پر بھونیں اور آخر میں ہرے دھنیے کے پتوں، لیموں کے رس اور کٹی ہوئی باریک پیاز کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

باربی کیو فش

اجزا :

تازہ ترین مچھلی	تقریباً" آدھا کلو
زیتون کا تیل	کھانے کے چار چمچے
مرچ	آدھا چمچہ
لیموں کا رس	تین چمچے
ادرک باریک کٹی ہوئی	حسب ذائقہ
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
پیاز	باریک کٹی ہوئی

ترکیب :

مچھلی کو تقریب دو اعشاریہ پانچ سینٹی میٹر کے قتلے کی شکل میں کاٹ لیں اور ایک جانب رکھ دیں۔ نمک، مرچ، لیموں کا رس ادرک اور زیتون کے تیل کو آپس میں اچھی طرح مکس کرلیں۔ اس مسالے کو مچھلی کے قتلوں پر لگائیں اور انھیں سیخ میں پرو کر آگ پر رکھ دیں۔ تقریباً" آٹھ سے دس منٹ تک آگ پر رکھیں۔ جب مچھلی کے قتلے بالکل براؤن ہوجائیں تو باریک کٹے ہوئے پیاز کی مدد سے سرو کریں۔

منٹھار (مٹھائی)

ضروری اشیا :

شکر	ایک کلو
زردے کا رنگ	آدھا چائے کا چمچہ
پانی	تین کپ

ترکیب :

چاشنی بنانے کے لیے :

شکر اور پانی کو پکائیں۔ جب شکر گل جائے تو زردے کا رنگ ڈال کر ایک جوش دلانے کے بعد چولہا بند کردیں۔

بیسن	ایک کلو
گھی	ایک کلو
کھویا	750 گرام
الائچی (پسی ہوئی)	بیس عدد
گوند	250 گرام
بادام، پستے	آدھا کلو

بادام اور پستوں کو موٹا موٹا چوپ کرلیں۔ پتیلی میں گھی گرم کرکے گوند ڈال کر فرائی کریں۔ پھول جائے تو اسے کسی الگ پلیٹ میں نکال لیں۔ اسی گھی میں بیسن اور پسی ہوئی الائچی ڈالیں اور درمیانی آنچ پر بھونیں۔ (خیال رہے کہ جس برتن میں آپ بیسن بھونیں اس کا پیندا موٹا ہو تاکہ چپکنے نہ پائے۔ گھی تھوڑا بچالیں اگر ضرورت پڑے تو بقیہ ڈالیں کیونکہ کبھی گھی زیادہ پڑتا ہے اور کبھی کم یہ بیسن کی کوالٹی پر ہے)۔ بیسن کو اتنا بھونیں کہ یہ لائٹ براؤن ہوجائے چمچہ چلاتے رہیں ورنہ نیچے سے جل جائے گا۔ اس کے بعد اس میں کھوئے کی آدھی مقدار ڈال دیں پانچ سے سات منٹ مزید بھون کر چولہے سے ہٹالیں اور آہستہ آہستہ چاشنی ڈالیں اور ساتھ چمچہ بھی چلاتی رہیں۔ آدھی مقدار گوند، بادام اور پستے بھی ڈال دیں۔ جب تمام چیزیں یکجان ہوجائیں تو دوبارہ چولہے پر رکھ کر بھونیں۔ جب گھی اوپر آنے لگے اور بیسن پیندے سے چپکنا چھوڑ دے یعنی جس سمت میں آپ چمچہ چلا رہے ہیں تو بیسن کا گولا سا بن کر وہ بھی گول گھومے اس کا مطلب ہے منٹھار تیار ہے اب ایک چکنی کی ہوئی ڈش میں یہ مکسچر ڈال دیں اور ہر جگہ سے برابر کرلیں۔ آخر میں بقیہ گوند، بادام، پستے اور کھویا اس پر ڈال کر ہلکا ہلکا پیس لیں پانچ منٹ بعد کیوبز کاٹ کر چاہیں گرم سرو کریں۔

✿ ✿ ✿

حُسن و سلیقہ

اِدارہ

آنکھیں

ہوسکتا ہے کہ آج آپ عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں آنکھوں کے گرد حلقے جھریاں اور دوسری پریشانیاں بہت دور کی باتیں محسوس ہوتی ہوں اور آپ انھیں خاطر میں نہ لاتی ہوں، لیکن آپ کو ابھی سے ان تمام باتوں کا خیال رکھنا چاہیے، کیونکہ کل بھی آتی ہے اور یہ تمام پریشانی آپ کی آنکھوں کے ساتھ بھی پیش آسکتی ہیں۔

تمام جسم میں آنکھوں کے اردگرد کی جلد نہایت حساس ہوتی ہے۔ اس کے بعد چہرے کی جلد! اور یہی وجہ ہے کہ آنکھوں کی جلد دوسرے تمام حصوں کی جلد سے زیادہ نازک ہونے کی وجہ سے جلد ہی متاثر ہوجاتی ہے۔ اگر ان کی دیکھ بھال نہ کی جائے، مناسب توجہ نہ دی جائے اور نیند بھی مکمل نہ کی جائے تو یہی خوب صورت نظر آنے والی آنکھیں چہرے پر سب سے زیادہ بدنما نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ جلد اتنی زیادہ حساس ہوتی ہے کہ ذرا سی احتیاطی سے متاثر ہوسکتی ہے، ان میں درد ہوتا ہے اور سوج بھی جاتی ہے۔

اگرچہ آنکھوں میں گہرے دائرے بننے کی ایک وجہ تو یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ نیند پوری نہیں ہوئی، لیکن اس کی دیگر وجوہات بھی ہیں۔ دراصل اس حصے میں اگر خون کی روانی متاثر ہو تو بھی کالے دائرے پڑ سکتے ہیں یا پھر آنکھوں کے نچلے حصے کی جلد غیر معمولی طور پر حساس ہونے سے بھی ایسا ممکن ہے۔ کیونکہ حد سے زیادہ حساس جلد بھی موسمی تبدیلی اور آب و ہوا کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتی اور فوراً" رد عمل ظاہر کردیتی ہے۔ اس کے علاوہ غلط آئی میک اپ پروڈکٹس، غلط میک اپ تیکنک، پریگنینسی، نزلہ زکام اور دائمی قبض اور الرجی وغیرہ بھی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کی وجوہات میں شامل ہیں۔ ایک وجہ

اور بھی ہوسکتی ہے کہ اگر آپ کے جگر میں کوئی خرابی ہے اور وہ شدت اختیار کررہی ہے تو بھی یہ مسئلہ ہوسکتا ہے۔

ہم میں سے اکثر اپنا زیادہ تر وقت ٹی وی یا کمپیوٹر کے سامنے گزارتے ہیں۔ شاید آپ نے کبھی محسوس کیا ہو کہ زیادہ دیر تک اسکرین کے سامنے بیٹھ کر اٹھنے کے بعد ہم آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کی آنکھیں اس اسکرین سے متاثر ہوچکی ہیں اور کچھ ہی دیر بعد آپ محسوس کرتی ہیں کہ آپ پورے جسم میں تو تھکن نہیں محسوس کررہیں، لیکن آنکھوں میں چبھن سی ضرور ہورہی ہے۔

اس مسئلے کا بہتر حل نیند ہے مکمل اور پرسکون نیند۔ جب آپ سوتی ہیں تو اس وقت آپ کی تمام باڈی کے علاوہ آپ کی آنکھیں بھی مکمل سکون کی حالت میں ہوتی ہیں۔ آنکھیں بند کرنے سے دراصل قدرتی طور پر آنکھوں کے اندرونی پپوٹوں میں پایا جانے والا خاص مائع آنکھوں کو واش کرتا ہے۔ اسی لیے آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ زیادہ ٹی وی دیکھنے کے بعد اگر آپ سوئے بغیر بھی صرف دو منٹ کے لیے آنکھیں بند کرلیں تو بھی آنکھیں بالکل فریش ہوجاتی ہیں۔

آنکھوں کے لیے گرم پانی نقصان دہ ہے۔ انہیں ہمیشہ ٹھنڈے پانی سے دھونا چاہیے اور غسل کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں شیمپو آنکھوں میں نہ چلا جائے۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں آنکھوں کی سفیدی ختم کردیتی ہیں اور ہم غیر محسوس انداز میں اپنی آنکھیں پیلی کرتے چلے جاتے ہیں۔

آنکھوں کی خوب صورتی کو برقرار رکھنے کے لیے ککڑی کا جوس استعمال کریں اور روزانہ سوتے وقت روز واٹر یعنی عرق گلاب کا بھی استعمال کریں۔ گرمی کے دنوں میں آنکھوں کی حفاظت کے لیے سن گلاس کا استعمال نہ بھولیں اور تیز دھوپ میں نکلنے سے بھی پرہیز کریں۔ تیز دھوپ کی تمازت آنکھوں کے گرد حساس جلد کے لیے بے حد مضر ہے۔

آئی ماسک میں آلو کا ماسک کھیرا ماسک اور ککڑی ماسک استعمال کریں اور آنکھوں کی تندرستی کے لیے قدرتی اور ان غذاؤں کو اپنی خوراک کا حصہ بنائیں جن میں پروٹین کی واضح مقدار ہو۔
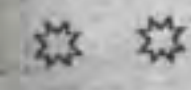
☆ ☆

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جارہے ہیں۔

ذوالقرنین

روبینہ افضال ۔۔۔ لاہور
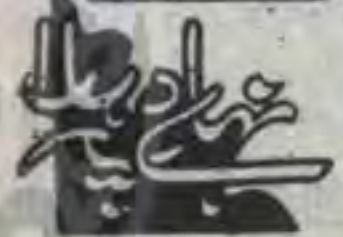
س : بھیا ذوقی! کیا سگریٹ خریدتے اور ڈبیا سے نکالتے وقت وہ ہدایت جو! "خبردار تمباکو نوشی صحت کے لیے مضر ہے وزارت صحت" کی صورت میں ڈبیا پر لکھی ہوتی ہے، نہیں پڑھتے؟"

ج : میری آنکھیں بہت کمزور ہیں۔

عاشی ۔۔۔ وادی کاغان

س : بھیا! لوگ کہتے ہیں شادی ایک ایسا قلعہ ہے جو اس کے اندر ہیں انہیں باہر کا ارمان ہے اور جو باہر ہیں وہ اندر جانا چاہتے ہیں آپ کہاں ہیں؟

ج : دروازے پر کھڑے ہیں اپنی باری کے انتظار میں۔

پھولوں کی شہزادی ۔۔۔ نواب شاہ

س : ذوالقرنین ہاتھ میں سگریٹ کلائی پر گھڑی منہ میں پان بال بے ترتیب یہ آپ چاروں میں سے کس چیز کا اشتہار بنے ہوئے ہیں؟

سگریٹ کا، گھڑی کا پاندان کا یا کہ بیوٹی پارلر کا کچھ تصویر سمجھ نہیں آئی آپ کا کیا خیال ہے؟

ج : خود اپنے آپ کا۔

شنو آرائیں ۔۔۔ اوستہ محمد ٹی

س : عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ شادی کے لیے لڑکی کی عمر لڑکے سے کم ہونی چاہیے کیا ضروری ہے؟

ج : بالکل ضروری ہے۔

مس تعریف ۔۔۔ مردان

س : آپ سگریٹ پی کر شیر سے لڑنے گئے تھے، پھر کیا ہوا کون جیتا کون ہارا؟

ج : بھوپال میں شکار پر پابندی ہے۔

نازش مجاہد علی ۔۔۔ خیرپور میرس

س : کیا یہ ضروری ہے آدمی جس سے محبت کرے اسی سے شادی بھی کرے؟

ج : کوئی ضروری نہیں ہے۔

نین تارہ ۔۔۔ لطیف آباد

س : دل میں جگہ دینے والی بیوی کو بے وقوف بنانے والے شوہر کا انجام؟

ج : میاں کی جیب خالی رہتی ہے۔

راحیلہ یاسمین ۔۔۔ سندھ

س : بھیا جی، کہتے ہیں خدا محبت ہے اور محبت خدا ہے تو پھر آج کل محبت کا مقام اتنا نیچے کیسے ہوگیا؟

ج : ہم آپ نے کیا ہے اس میں خدا کا کیا دوش۔

شہلا نگار۔۔۔۔ فیصل آباد

س : داداجی! آپ کی عمر کے لوگ تو اللہ اللہ کرتے ہیں پھر آپ کیوں۔۔۔۔؟
ج : الحمدللہ ہم بھی کرتے ہیں۔

مسز عمران بٹ۔۔۔۔ کراچی

س : سسی سندھ کی تھی پنوں مکران کا تھا۔ دونوں آپس میں کونسی زبان میں بات کرتے تھے؟
ج : محبت کی۔

ثمینہ رفیع۔۔۔۔ کراچی

س : ارے بھیا۔۔۔۔ آپ تو یہاں نہیں نانی اماں کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔ میں نے خوامخواہ ہی سوال کرڈالا؟
سوال کرکے میں خود ہی پشیماں ہوں بہت
جواب دے کے مجھے اور شرمسار نہ کر
اچھا میں چلی۔ خدا حافظ۔۔۔۔!
ج : آپ نے خود ہی جواب دے دیا اب میں کیا جواب دوں۔ آخر میرے ہی ناول کے کردار ہیں۔

ثمینہ عندلیب۔۔۔۔ ٹیکسلا

س : قرنی بھیا زندگی دکھوں کا سمندر ہے یا غموں کا؟
ج : بی بی۔۔۔۔! یہ عدنان صاحب کا کالم نہیں آئندہ سنجیدہ سوالوں سے پرہیز کیجیے۔

ساجدہ عبدالخالق۔۔۔۔ جہلم

س : بھیا اگر آپ کا قد دس فٹ ہوتا تو پھر آپ کرکٹ میں شامل ہوکر گارنر کا ریکارڈ توڑتے یا ہاکی کے گول کیپر بن کر ہلا منٹی روکنے کے ریکارڈ بناتے؟
ج : مجھ سے تو دونوں چیزیں ٹوٹ جاتیں ہاکی بھی اور بلا بھی۔

فرزانہ کرن۔۔۔۔ ٹیکسلا

س : نین بھیا بعض لوگ دھوکہ کھا کر مسکراتے ہیں اور بعض لوگ دھوکہ دے کر بتایئے جیت کس کی ہوتی ہے؟
ج : دھوکہ کھانے والے کی۔

قدسیہ 'مونا۔۔۔۔ سیالکوٹ

س : ذوقی بھائی شاعر اور شاعرہ کے کلام میں کیا فرق ہے؟
ج : شعر مونث اور مذکر نہیں ہوتے۔

شازیہ الیاس۔۔۔۔ گوجرانوالہ

س : انکل کیا انسانوں کی طرح جانور بھی محبت کرتے ہیں؟
ج : ہاں یقیناً" جانور انسان سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

امینہ تبسم۔۔۔۔ کراچی

س : نین جی لڑکی تو چھوئی موئی کی طرح شرمیلی ہوتی ہے لیکن چھوئی موئی کا پودا کیوں شرمیلا ہوتا ہے؟
ج : تو چلیے یہ تو آپ نے مانا کہ پودوں میں بھی شرم پائی جاتی ہے۔

نصرت حسن انصاری۔۔۔۔ جھنگ سٹی

س : نین بھیا۔ آخر یہ بہنیں انسانیت کا دامن تھام کر اچھے سوالات نہیں پوچھ سکتیں؟
ج : بھلا پانچوں انگلیاں برابر ہو سکتی ہیں۔

راحیلہ سخاوت علی۔۔۔۔ راولپنڈی

س : آپ کی خوش خوراکی کی بڑی دھوم سنی ہے ذرا یہ تو بتایئے جناب کون سی چیز کھانے میں پسند کرتے ہیں؟
ج : چٹنی' روٹی' دال۔

حمنہ حبیب۔۔۔۔ عبدالحکیم

ڈیئر آپی! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ کرن اس بار بہت انتظار کروانے کے بعد 19 اگست کو ملا۔ سرورق بہت خوب صورت تھا تینوں ماڈلز بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد ہم نبیلہ عزیز کے "در دل" کی طرف آئے۔ نبیلہ جی بہت خوب صورت انداز میں ناول کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ وقار آفندی نے دل آور شاہ لوگوں کے ساتھ کیا کیا تھا اس بات سے بھی پردہ اٹھادیں۔
اس کے بعد فوزیہ یاسمین کی "دست کوزہ گر" کی طرف آئے بہت زبردست قسط تھی خرم کا نمل سے اظہار محبت کرنا بہت اچھا لگا اب فوزیہ جی خرم اور نمل کی منگنی دوبارہ سے کیسے ہوگی؟ شگفتہ غفار کتنی بے وقوف نکلیں اب پتا نہیں بریرہ اور شگفتہ نانی اماں کو کون سی اسٹوری سناتی ہیں اور رومیلہ پر بہت ترس آیا۔۔۔۔ اس کے بعد "میرے ہمنوا کو خبر کرو" کی طرف آئے اس بار قسط کچھ خاص نہیں لگی۔۔۔۔ فاخرہ جی بس اب جلدی سے اچھا سا دی اینڈ کردیں۔
انیلا کرن کا مکمل ناول بہت اچھا تھا۔۔۔۔ انیلا جی نے اپنی کہانی میں سچ کہا کہ "محبت اور محنت کبھی نہ کبھی صلہ ضرور دیتے ہیں۔" رابعہ کا انداز محبت بہت اچھا لگا محبت ہو تو ایسی ہو۔۔۔۔ ماورا سے ملاقات خوب رہی۔
اور یہ کیا آپی جی میں نے پچھلی بار بھی خط بھیجا تھا لیکن آپ نے شائع نہیں کیا بہت افسوس ہوا اس بار ضرور شائع کیجیے گا اور کچھ اشعار بھیج رہی ہوں امید ہے آپ ضرور شائع کریں گی۔ اللہ تعالیٰ کرن کو دن دگنی رات چگنی ترقی دے آمین۔

ثمینہ اکرم۔۔۔۔ کراچی

میں تو عید سے قبل ہی کرن ملنے کی آس لگائے بیٹھی تھی۔ مگر عید گزرنے کے بعد جب کرن ملا تو گویا دوبارہ عید ہوگئی۔ ویسے تو یہ عید بہت سوگوار اور اداس گزری مگر کرن ڈائجسٹ ملنے کے بعد کچھ دل کی اداسی کم ہوئی۔ اس مرتبہ کچھ تحریریں میں نے تفصیلاً" پڑھیں تو کچھ کو سرسری سا دیکھا۔ کیونکہ عید کے فوراً" بعد میری نند کے بیٹے عمیر حبیب کی شادی تھی۔ عید کے 3 دن تک عزیز و اقارب کا آنا جانا لگا رہا (افسوس کے لیے) جبکہ لیاری میں عید کا روایتی جوش و خروش اور رونقیں دیکھنے میں نہیں آئیں۔
اس مرتبہ تو خوف کے سائے میں اہلیان لیاری نے عید منائی۔ عید پر بھی تو ہمارے علاقے کے حالات خراب ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ ہمارے رشتہ دار شادی پر گھر بھی نہیں آئے اور ڈائریکٹ شادی ہال میں پہنچے۔ شادی بھی دعائیں کرتے کرتے گزری کہ "یا اللہ امن و امان کر دے۔"
اس مرتبہ شاید میرے دل کا موسم کچھ اداس تھا اسی لیے کسی شے میں بھی دل نہیں لگا۔ جبکہ شادی کی گہما گہمی اور مصروفیات میں کچھ پل میں اپنا غم بھول بیٹھی مگر اس بے دھیانی میں بھی اس کا دھیان رہا۔ کیونکہ معیز کو اپنے عمیر بھائی کی شادی کا بہت ارمان تھا۔ اب تو ہر چہرے میں اس کا چہرہ ڈھونڈنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ عمیر اور ندا کو دائمی خوشیاں نصیب کرے (آمین)
اب کچھ تبصرہ کرن کی تحریروں پر بھی کرتی چلوں۔
ٹائٹل عید کی مناسبت سے خوب لگا۔ سب سے پہلے سلسلہ وار ناولز پڑھے۔ "در دل" تو انڈین سوپ کی طرح چل رہا ہے پلیز اسے تھوڑا فاسٹ کریں۔ جبکہ "دست کوزہ گر" میں خرم اور نمل کے درمیان دوستی نے ناول کو خاصا دلچسپ بنا دیا ہے۔ اب زوبیہ کو بھی مکمل صحت یابی کی طرف لے آئیں۔ خوشیوں پر زوبیہ کا بھی تو پورا حق ہے مکمل ناول "ردائے دعا" فرحین اظفر نے بہترین لکھا ہے۔ مگر جب طلحہ کے گھر والوں نے نیوز پیپر میں خبر دی تو طلحہ کی نظر سے اس کی تصویر بھی نہیں گزری۔ اس کی

صرف یادداشت تو گئی تھی طلحہ کے گھر والوں کو حادثے کے بعد جب اس کی ڈیڈ باڈی نہیں ملی تو پھر انہوں نے اسے مردہ کیسے تصور کر لیا۔ طلحہ وشمہ کو خاص پسند نہیں کرتا تھا پھر بھی اس کے چلے جانے کے بعد وشمہ نے دنیا تیاگ دی کیوں؟

سب سے زیادہ جس تحریر نے متاثر کیا وہ انیلا کرن کا ناول "چاند رات کا ڈھب" ہے۔ سب سے پہلے تو اسٹارٹ میں ہی لکھے نام "معیز" نے میری توجہ اس ناول کی جانب کھینچ لی۔ پھر آگے چل کر بھی اسٹوری لاجواب رہی۔ وہی ازل سے عورت کا قربانی دینے کا جذبہ۔ خاص طور پر ایک بیوی کا اپنے شوہر کو اسٹیبلش کرنے کے لیے جدوجہد کرنا۔ اس طرح کی بہت سی کہانیاں ہم نے پہلے بھی پڑھی ہیں مگر یہ ناول پھر بھی مجھے اوروں سے جدا لگا کیونکہ آخر میں رابعہ کو اس کی قربانیوں کا ثمر مل گیا۔

فاخرہ گل کا ناولٹ "میرے ہمنوا" کی چوتھی قسط پڑھی ۔ یہ غلطی فہمی کچھ زیادہ ہی طویل نہیں ہو گئی ہے۔ اتنی محبت کرنے والے بھائی نے یوں ذرا سی غلطی فہمی کے پودے کو اپنے دل میں ایک تناور درخت کیوں بنا لیا جبکہ وہ کسی کی کوئی بات سننے پر بھی آمادہ نہیں..... ناصر بھائی کو معلوم ہے کہ ندرت یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہے اور اس کی کسی لڑکے سے دوستی کوئی معیوب بات تو نہیں۔ محبت بھرے رشتوں میں اعتماد بہت ضروری ہے۔

مستقل سلسلے سب ہی بہترین لگے۔ کرن کا دستر خوان سب سے بیسٹ رہا۔ کرن کتاب کے ذریعہ بھی مختلف مذاہب کے رسم و رواج اور تہواروں کی معلومات ملی۔

"مقابل ہے آئینہ" میں فوزیہ ثمر بٹ سے مل کر اچھا لگا اللہ آپ کو دائمی خوشیوں سے سرفراز فرمائے۔ (آمین) میں بھی "مقابل ہے آئینہ" میں اپنی انٹری کے لیے محو انتظار ہوں۔ دیکھیں میرا یہ انتظار کب ختم ہوتا ہے۔ ویسے امید پر تو دنیا قائم ہے۔

ناولٹ "اللہ کے رنگ" حنا یاسمین کے قلم سے ایک زبردست تحریر ہے۔ جبکہ افسانے کی ایک طویل فہرست سامنے ہے۔ اس میں "میرا چاند" افسانہ اچھا لگا۔ باقی دیگر افسانے "نذرانہ جاں" پہلا قطرہ" پیسے آنے دو" شکوہ اور رنگ زیست" بھی اچھے لگے۔ اس مرتبہ "وہ اک پری" غائب تھا۔ باقی اللہ تعالیٰ کرن کو مزید ترقی دے۔ (آمین)

آپ سب کو میرا سلام۔ اللہ حافظ۔

وثیقہ زہرہ ..... فیض پور

کرن حسب معمول 12 تاریخ کو مل گیا تین پیاری پیاری ماڈل سے سجا ٹائٹل دل کو خوش کر گیا حمد و نعت سے مستفید ہوئے سب سے پہلے نبیلہ عزیز کے "در دل" تک پہنچے دل آور کا نبیل اور عبداللہ کی فیملی سے علیزے کا تعارف کرانا اچھا لگا زری کے لیے صرف دعا کر سکتے ہیں فوزیہ یاسمین کا "دست کوزہ گر" اچھا تھا خرم اور نمل کی صلح آخر ہو ہی گئی شگفتہ غفار اور ریاض غفار کو چاہیے تھا پہلے نانی اماں کو اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دیتے تو اچھا تھا۔

"میرے ہمنوا کو خبر کرو" بس ٹھیک تھا انیلا کرن کا "چاند رات کا ڈھب" اور فرحین اظفر کا "ردائے دعا" زبردست تھے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کون پہلے نمبر پر ہے کیوں کہ دونوں ناول دل کو چھونے والے تھے ناولٹ "اللہ کے رنگ" اچھا لگا "وہ اک پری" غیر حاضر تھا افسانے سبھی بہت اچھے تھے مستقل سلسلے کی تو کیا ہی بات ہے سب سے اچھا کرن کا دستر خوان ہوتا ہے۔

صائمہ اسلم ..... ٹاٹے پور

بہت عرصے سے کرن ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں لیکن کبھی خط لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی کیونکہ ڈر لگتا تھا کہ میرا خط ردی کی ٹوکری کی نذر نہ ہو جائے۔ لیکن اب جب خط لکھنے کی ہمت کی ہے تو اس کی وجہ ناول "در دل" ہے نبیلہ عزیز اس ناول کو بہت اچھے طریقے سے آگے بڑھا رہی ہیں۔

اس کے علاوہ دوسرا ناول "دست کوزہ گر" بھی اچھا ہے۔ اس میں بھی خرم اور نمل نے ہی ملنا ہے چاہے جتنا دور بھاگ لیں باقی سارا ڈائجسٹ بھی اچھا ہوتا ہے اور سب کو دل سے عید مبارک۔

میں یعنی صائمہ اسلم ٹاٹے پور ضلع ملتان کی رہنے والی ہوں۔ بہت شوق اور محبت سے خط لکھا ہے۔ پلیز شائع ضرور کیجیے گا۔ میں نے سب کو بتایا ہے کہ میں نے کرن ڈائجسٹ میں خط لکھا ہے اگر شائع نہ ہوا سب مذاق اڑائیں گے۔

شمائلہ رفیق ..... سمندری

میں نے کسی بھی ناول افسانہ یا کہانی سے متاثر ہو کر پہلی بار خط لکھا ہے اور جس ناول سے میں شروع سے اب تک متاثر ہوں وہ "در دل" ہے اس ناول نے ہمیں یوں جکڑا کہ اسے چھوڑ نہ سکے میں پرائیوٹ پڑھ رہی ہوں ایم اے اسلامیات اور بی ایڈ کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ ایم اے اسلامیات کا لاسٹ پیپر رمضان سے ایک دن پہلے تھا پھر پورا مہینہ بی ایڈ کی نذر ہو گیا اور میں کرن کے کئی شمارے نہ پڑھ سکی اور جون کا شمارہ میں نے عید کے دن پڑھا "در دل" میں جب دل آور کی ماں کی وفات کا سین آیا تو مجھے بے اختیار وہ وقت یاد آیا جب آج سے اٹھارہ سال پہلے میرے اوپر یہ وقت آیا تھا میں نے بھی دل آور کی طرح اپنی ماں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دفن ہوتے دیکھا تھا اور یہ ایسا منظر ہے کہ میں کبھی بھی اسے بھلا نہیں سکتی۔ نبیلہ صاحبہ آپ نے خوب لکھا ماں کی محبت کو شاید میں نے اسی ناول میں پڑھا خدا کی قسم اگر ہمارے پاس ہماری امی کی تصویر نہ ہوتی تو میں انہیں بالکل ہی بھول چکی ہوتی۔ "در دل" جیم کو کتابی شکل میں جلد لائیے گا۔

باقی کرن سارے کا سارا اچھا ہوتا ہے۔ کرن میں مجھے ثمینہ اکرم اپنے دل کے قریب محسوس ہوتی ہیں۔ آپ نے بیٹے کے لیے جیسے صبر کیا وہ قابل آفرین ہے اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے آمین۔

در ثمین سلیم غائب ہو چکی ہیں انہیں واپس بلا لیں۔ پلیز میرا خط ضرور شائع کریں اور نازیہ کنول نازی سے کہیں کہ وہ کرن کے لیے ناول لکھیں۔

انیقہ انا ..... چکوال

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی، کرن 17 اگست کو ملا۔ رمضان المبارک کا مہینہ اتنی تیزی سے گزرا کہ خبر ہی نہ ہوئی۔ آخری عشرہ خاصی مصروفیت میں بیتا وہ یوں کہ 12 اگست کو میرا بھانجا احمد رضا اس دنیا میں آیا۔ سعدیہ کے بڑے دونوں بچے ام ہانی اور علی اکبر بھی رات کو میرے پاس ہوتے اور سعدیہ کا چونکہ میجر آپریشن تھا وہ ہسپتال ..... تین چار دن خوب مصروف گزرے۔ ارے ہاں! 22 جولائی کو میری بہترین دوست فائزہ بھی "ماں" کے عظیم رتبے پر فائز ہوئی۔ اللہ سب کو خوش و خرم اور آباد رکھے۔ سرورق گو عید کی مناسبت سے اچھا تھا، مگر مجھے کچھ خاص نہ لگا۔ البتہ کرن کتاب خوب پسند آئی معلومات کا ڈھیر لیے۔ مصنفہ عنیقہ محمد کی والدہ کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا ۔ خدا آپ کی امی کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور جملہ اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

"دست کوزہ گر" میں اس بار فوزیہ نے اگلے پچھلے سبھی گلے شکوے دور کر دیے۔ بالآخر تین سال بعد خرم اور نمل کے مابین سب ٹھیک ہو ہی گیا دوسری جانب شگفتہ غفار نے گویا خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری لیکن مجھے لگتا ہے کہ اب نانی اماں ہی رومیلہ کی نجات دہندہ ثابت ہوں گی اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔

"در دل" میں تو دل کی دنیا ہی زیر و زبر ہو گئی۔ (زری کی) شاہ نے اچانک "لو میرج" والی کہانی ہی ایسی سنائی۔ اب یوں لگتا ہے کہ زری کی سانسوں کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ جتنی شدید محبت اسے شاہ سے تھی اس کے بعد اگر وہ نبیل حیات کے لیے سمجھوتہ کرے تو یقین مانیے مجھ جیسا کوئی بھی باذوق قاری یہ برداشت نہیں کر سکے گا اور ایک قاری بہن نے لکھا کہ "شاہ کے سامنے اس کی بولڈنیس کی

حد نہیں ہوتی" تو میرا تو کہنا ہے کہ یہ جرات بھی تو اسے شاہ کے عشق نے ہی سونپی تھی نا! محب اپنے محبوب پر نہیں کھلے گا تو کس پر کھلے گا۔ ایک بزرگ کا قول پتا نہیں آپ کو زری پر فٹ لگے یا نہ لگے' پر مجھے لگتا ہے' وہ یہ کہ "محبت' جب کامل ہو جاتی ہے تو ادب کی شرط گر جاتی ہے۔" زری کی بولڈنیس' محبت کے کامل ہونے کا بھی تو اشارہ کرتی ہے نا!

"میرے ہمنوا" یہ قسط پچھلی تین اقساط سے قدرے بہتر لگی۔ مجھے کیوں لگتا ہے کہ "زین' میران' مہر' ملکانی اور شاہ سائیں" ان سب کا ہی آپس میں خونی رشتہ ہے۔ اب قسمت خوامخواہ ہی تو اسے شاہ سائیں کی فیکٹری میں نہیں لائی نا! ندرت پر جی بھر کر ترس آتا ہے۔ پر امید ہے فاخرہ اب مزید اس کے ساتھ برا نہیں کریں گی۔ عائشہ' ناصر اور ثروت کے بارے میں میرے خیالات تاحال پہلے والے ہی ہیں۔ اب کی بار مجھے اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔

"انیلا کرن" کا ناول' مجھے اس ماہ کی بہترین تحریر لگا "محبت ہو یا محنت صلہ ضرور ملتا ہے" ساری باتیں ایک جانب۔ مزمل کا کردار کہ وہ حقیقتاً" رابعہ سے وفادار تھا اور بھٹک تو انسان جاتا ہے۔ خیر کمی تو رابعہ کی محبت میں بھی نہیں تھی نا! دونوں کی بے لوث محبت نے ہی دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھا۔

"اللہ کے رنگ" ناولٹ بھی خوب رہا۔ سچ ہے کہ اللہ کے رنگ ہی نرالے ہوتے ہیں جس پر چڑھ جائے' بس وارے نیارے۔ (کاش مجھ پر بھی چڑھ جائے۔)

اگست کا کرن عید نمبر + افسانہ نمبر لگا ڈھیر سارے افسانے۔ "نذرانہ جان"۔ اچھا تھا' پر پتا نہیں کیوں مجھے شروع سے ہی فوجی پسند نہیں ٹھیک ہے ملکی سرحدوں کے نگہبان ہیں پر نہیں پسند۔ پہلا قطرہ میں ماہین کی کوششوں کو دل سے سراہا۔ عنیقہ کا افسانہ پسند نہیں آیا دیگر مصنفین نے بھی خوب لکھا۔

مستقل سلسلے بہت اچھے رہے۔ "مجھ سے ملیے" سلسلہ بہت یاد آتا ہے' اس میں تسلسل کیوں نہیں ہوتا؟ اور فوزیہ ثمر سے "مقابل ہے آئینہ" میں مل کر نہیں جان کر خوب اچھا لگا مگر فوزیہ اتنا مختصر کیوں لکھا آپ نے؟ پر جو لکھا' خوب لکھا۔ اللہ آپ کا گھر' سکون اور خوشیاں قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

اب مجھے اجازت دیں اپنا خیال رکھیے گا۔

فوزیہ ثمر بٹ ..... گجرات

امید ہیں آپ سب خیر خیریت سے ہوں گے عید بہت مزے سے گزری ہوگی۔ عیدیاں دیتے اور وصولتے ہوئے ہے نا..... اگست کا کرن مجھے اٹھارہ کی شام کو ملا۔ کیونکہ اس ٹائم عمران صاحب نے دودھ لینے جانا ہوتا ہے۔

عید کا ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ تینوں ماڈل مسکراتی بجی سنوری اچھی لگ رہی تھیں۔ انٹرویوز میں اس بار تمام ہستیاں خوب صورت تھیں سب سے ملاقات اچھی رہی۔ حوریہ فہیم کا انٹرویو آپ نے بغیر کہے کر دیا اچھا لگا۔ ماورا اور اس کی بہن دونوں اسی ٹائم اسکرین پہ چھائی ہوئی ہیں اچھی پرفارمنس ہوتی ہے دونوں کی۔

سب سے پہلے نا مے میرے نام پڑھا۔ خود کو حاضر دیکھ کر خوشی ہوئی اور یہ خوشی میری اس وقت چیخ بن کر فضا میں گونجی جب "مقابل ہے آئینہ" میں خود کو دیکھا۔ واہ میں تو بھول ہی چکی تھی مگر مدیرہ صاحبہ آپ نے تو کمال ہی کر دیا سچی بہت مزا آیا۔ اپنے جوابات پڑھ کر اور رونا بھی آیا۔ مگر سب کے سامنے روئی نہیں بھئی تکیہ جو ہے۔ ایک بار پھر تہ دل سے شکریہ مدیرہ جی کہ آپ نے مجھے خوش ہونے کا موقع دیا۔

مستقل سلسلے اچھے تھے۔ "یادوں کے دریچے" سے سب ہی کا انتخاب اچھا تھا۔ نوشین اقبال' سدرہ وزیر سب کی اچھی شاعری تھی' مسکراتی کرنیں' وضو اور نوے روپے یہ لطیفے میری بہن شازی نے مجھے سنائے تھے دوبارہ پڑھ کر لطف آیا۔

اور مجھے آپ سے یہ کہنا ہے اس بار میں نے کرن کو ابھی شروع نہیں کیا۔ صبح ہم نے شادی پہ جانا ہے اور جب واپس آئیں گے تو خط بھیجنے کی تاریخ نکل چکی ہوگی۔ اس لیے شروع ہی نہیں کیا اس لیے معذرت کے ساتھ شاید آپ میرا خط شامل نہ کریں۔ مگر مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا کہ آپ نے میرے جوابات شامل کیے۔

ان شاءاللہ آئندہ ماہ ضرور تحریروں پہ تبصرہ کروں گی۔

☼ ☼